انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے

اغراض و مقاصد

۳۰۹۹۵

۱۔ پی ایچ ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا۔

۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔

۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا۔

۴۔ ریسرچ کا کام کرنے والے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا۔

۵۔ ایک جامع کتب خانہ قائم کرنا۔

۶۔ مختلف کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنا۔

۷۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔

۸۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور انھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۱۔ یہ رسالہ علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔

۲۔ اس میں اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

۳۔ اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے انھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۴۔ اُردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ بر سرِ عام لایا جائے گا۔

۵۔ رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا

۶۔ رسالہ ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

فہرست مضامین نوائے ادب جنوری تا اکتوبر ۵۲ء

جلد سوم ۱۹۵۲ء

جلد ۳ | جنوری سنہ ۱۹۵۲ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

شذرات

بحمداللہ ہماری کوششیں بار آور ہو رہی ہیں اور اب ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ رسالہ کو وقت پر نکال سکیں، یہ
رسالہ ہمارے تیسرے سال کا پہلا رسالہ ہے، اور زبان اُردو سے متعلق عام دلچسپی اور اس سے متعلق تحقیق اور جستجو کے
سلسلہ میں جو انہماک دیکھا یا پایا جاتا ہے اس کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کے اچھے دن آرہے ہیں۔ اس کی
جہاں دوسری اور نشانیاں ہیں، وہاں ایک سب سے بڑی اور عجیب نشانی یہ ہے کہ اُن صوبوں اور علاقوں میں بھی
جہاں اُردو کا عام طور سے بہت کم رواج تھا، اُردو کے نئے نئے رسالے ہی نہیں نکلنے شروع ہوئے ہیں بلکہ چھوٹے
چھوٹے دارالاشاعت بھی عالم وجود میں آرہے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ چند مہینوں ہی میں مدراس اور میسور کے علاقہ
سے متعدد رسالے نہ صرف شائع ہونے شروع ہوئے بلکہ میسور کے طلبہ علی گڈھ اور لکھنؤ یونیورسٹیوں میں اُردو کے مختلف
مباحث پر پی ایچ، ڈی کیلئے مقالے لکھ رہے ہیں۔ پھر علی گڈھ یونیورسٹی گزٹ کی اطلاعات ہم کو بتاتی ہیں کہ وہ ہمارا
مرکز اُمید ایک مرتبہ پھر بڑی تیزی کے ساتھ اردو کو وہی علمی درجہ دلانے میں جو سرسید اور ان کے رفقاء نے اسے
دلایا تھا، مشغول ہے۔

اسی سلسلہ کی دوسری کڑی صوبہ مدراس میں متعدد عام کالجوں کا قیام ہے، جس میں علوم مشرقی و اسلامی
کے ساتھ اُردو کا خاص انتظام کیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی حال ہی میں حکومت مدراس نے ایسے مدارس کے
معلمین کیلئے جو اُردو کے ذریعہ تعلیم دیتے ہیں، اُردو کا ایک ٹریننگ کالج قائم کرنا منظور کیا ہے۔ خداوند تعالیٰ
اس علاقہ کے اُردو دوست بزرگوں کے جوش میں استقامت اور ہمّت میں وسعت و بلندی عطا فرمائے۔

حیدرآباد بھی اس سلسلہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے، بلکہ اس وقت تک اس نے جس طرح قیادت کی ہے
اس کو اپنے خاموش کارناموں سے باقی رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، چنانچہ اس سلسلہ کا سب سے بڑا کارنامہ
اردو انسائیکلوپیڈیا (مخزن فنون) کے پہلے حصّہ کی اشاعت ہے، اور وہ کام جو وہاں اس وقت بھی نہیں
ہوسکا جبکہ وہاں اُردو کی یونیورسٹی تھی، اسی ادارہ نے ڈاکٹر سید محی الدین زور کی ایک بڑی اہم تصنیف داستانِ

ادب حیدر آباد بھی حال ہی میں شائع کی ہے، ڈاکٹر زور تقریباً ربع صدی سے اردو کی علمی و عملی خاموش خدمت کر رہے ہیں، اور ان کی تصانیف اور ادارۂ ادبیات اُردو کے کارنامے ان کا زندہ ثبوت ہیں، اس وقت تک ڈاکٹر صاحب کی تمام تصانیف ان کی ذہنی کاوشوں کی غماز ہوتی تھیں لیکن موجودہ تصنیف ان کی ذہنی کاوشوں ہی کی نہیں بلکہ ان کے دکھے اور جلے ہوئے دل کی جراحتوں اور سوزشوں کی بھی آئینہ دار۔

اسی حیدر آباد کی اُردو دوستی کا ایک اور ثبوت اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں، یعنی جس طرح بمبئی میں پارسیوں نے اُردو ڈرامہ کی ابتدا و ترقی میں سب سے زیادہ حصہ لیا بالکل اسی طرح حیدر آباد کے پارسی اب اُردو کی عام ترقی کی کوشش میں شریک ہو رہے ہیں، مسٹر تاراپورنے اُردو میں کئی کتابیں حال میں شائع کی ہیں۔ مس منیژہ کادُس جی، اُردو کی ایم۔اے ہیں، وہ زرتشتی دعاؤں کا ایک ترجمہ پہلے شائع کر چکی ہیں ایم۔اے میں ان کے مقالہ کا موضوع "مولانا حالی" تھا۔ اسی کا ایک حصہ اس شمارہ میں شائع ہو رہا ہے۔ اسی طرح حیدر آباد کی اُردو کی اہل قلم خواتین نے بھی ہماری امداد شروع کر دی ہے، اور اس وقت تک محترمہ جہاں بانو نقوی، مسز قطب الدین ہاشمی ایم۔اے، پروفیسر رفیعہ سلطانہ وغیرہ کے مضامین موصول ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ وہاں کے اہل سیف نے اب ہاتھ میں قلم لے لیا اور ان کی یہ ایک نئی جماعت ہمارا ہاتھ بٹانے کیلئے پیدا ہو گئی!

دارالمصنفین بھی اس عرصہ میں خاموش نہیں رہا ہے، وہاں سے بھی سال ڈیڑھ سال کے اندر بلند پایہ تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، اقبال کامل کے بعد تاریخ اندلس حصہ اول۔ امام رازی اور ابھی کتاب صحابہ و تابعین، ہم تک پہنچ چکی ہیں۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) نے بھی اپنا گھر درست کرنا شروع کر دیا ہے، اور اس وقت تک متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، مگر اس وقت اس کا سب سے بڑا لائحہ عمل "اتر پردیش" میں اُردو کو جسے ایک بڑی حد تک دیس نکالا مل چکا ہے اس کا حق دلانا ہے۔ امید کہ انجمن اس سلسلہ میں اُردو دوستوں کا عملی تعاون حاصل کر کے اپنے اس پروگرام کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکے گی۔

اُردو نے گذشتہ ۲۰، ۲۵ سال میں جو اعلیٰ علمی درجہ حاصل کر لیا تھا، اس کا لازمی یہ نتیجہ ہوا تھا کہ ہندوستان کی متعدد

یونیورسٹیوں نے پی، ایچ، ڈی، کے لئے بھی اس کو تسلیم کر لیا تھا، اور ان یونیورسٹی کے طلبہ اپنی اپنی جگہوں پر کام بھی کر رہے ہیں، لیکن چونکہ ایک یونیورسٹی والوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری یونیورسٹی کے طلبہ کن موضوع پر کام کر رہے ہیں اس لئے اکثر مختلف یونیورسٹی کے طلبہ ایک ہی موضوع پر کام کرتے رہتے ہیں اور بہت بعد میں ان کو اس کا پتہ چلتا ہے، اس لئے اگر وہ انجمن معلمین اردو جو اورینٹل کانفرنس کے موقع پر عالم وجود میں آئی ہے اس کام کو اپنے ذمہ لے اور ہر سہ ماہی یا ششماہی پر تمام یونیورسٹیوں سے اُردو سے متعلق موضوع حاصل کر کے ان کو شائع کرے تو یہ تکرار کار کی زحمت و مایوسی ختم ہو سکتی ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان نے اپنا ایک اردو کالج قائم کیا ہے، اور اگرچہ حیدر آباد کے ۲۵ سالہ تجربہ کے بعد کسی رکاوٹ کی ضرورت نہیں ہونا چاہئے تھی پھر بھی مولانا عبدالحق صاحب نے مزید تشفی و تسلی کے لئے تقریباً ایک درجن سے زیادہ علما و ماہرین تعلیم کے سامنے چند سوالات پیش کئے تھے اور اب انھیں سوالوں اور ان کے جوابوں کو ایک رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ ان اصحاب فکر کیلئے جو مادری زبان کے ذریعہ تعلیم اور ہندوستان اور پاکستان میں اس سلسلہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان مشکلات کا مطالعہ و حل پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں یقیناً بہت مفید ہوگا۔ ترکی سے متعلق معلومات بھی بہت معلومات بخش ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے حکومت ہند نے اصطلاحات علمیہ کے تعین کے سلسلے میں ایک کانفرنس منعقد کی تھی اور مولانا عبدالحق صاحب اس کے ایک سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر اپنے خیالات بھی پیش کئے تھے، اگر ان کا یہ بیان بھی اس میں شریک ہوتا تو بہتر تھا۔ انجمن نے معاشیات اور سائنس کے ساتھ اب تاریخ و سیاست کا ایک رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا ہے۔

خود ہمارے علاقہ میں اُردو سے جو عام دلچسپی بڑھتی جاتی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت ہمارے ایک شہر بمبئی سے گیارہ روزنامے، نصف درجن ہفتہ وار، کئی پانزدہ روزہ اور ۶ ماہنامے شائع ہوتے ہیں۔ گذشتہ ماہ میں یہیں سے ایک رسالہ حسرت مولانا حسرت موہانی کی ادبی و فنی خدمات کی یادگار میں شائع ہوا ہے، اگر پہلا شمارہ آئندہ کیلئے پیشین گوئی کا ذریعہ بن سکتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا معیار بلند رہے گا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سینٹ زیویر کالج بمبئی کی اُردو انجمن کا شائع کردہ سالنامہ ہے۔ (باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ ہو)

مہر نیمروز کا ایک خاص نسخہ

(جناب جمیل الدین صاحب)

(گذشتہ سے پیوستہ)

آبرو کا بیان ہے کہ غالب نے نواب وزیر الدولہ کی خدمت میں پہلا قصیدہ ۱۲۷۵ھ میں بھیجا تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ امتیاز علی خاں صاحب عرشی لکھتے ہیں:

"نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خاں بہادر کی مدح میں ان کے دو فارسی قصیدے موجود ہیں۔ ان میں پہلا:

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را

۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) سے پہلے اور جولائی ۱۸۳۵ء (جمادی الاخری ۱۲۵۴ھ) کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ موخر الذکر سنہ کے نوشتہ دیوان میں شامل نہیں، اور پہلی تاریخ کے چھپے ہوئے نسخے میں موجود ہے

دوسرا قصیدہ: "عید اضحی بسر آغاز زمستان آمد"

کسی ایسے سال میں لکھا گیا ہے جس میں بکر عید شروع جاڑوں میں آئی تھی اور ایسا برس از روئے حساب ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، و ۱۲۶۷ میں سے ایک ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ان برسوں میں اکتوبر کی ۱۸ اور ۸ اور ستمبر کی ۲۷ کو ذی الحجہ کی پہلی ہوئی تھی۔ جو موسم سرما کے آغاز کا زمانہ ہے۔ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں نواب محمد علی خاں (ابن نواب وزیر الدولہ) گدی پر بیٹھے تو مرزا صاحب نے ایک تاریخی مثنوی لکھ کر بھیجی تھی۔ اس میں فرماتے ہیں:

ز غالب کہ از روزگار دراز　　بریں عتبہ سایدہ جبین نیاز

یہ میرزا صاحب کی طرف سے کھلا ہوا اقرار ہے اپنی قدیمی نیازمندی کا۔ مرزا صاحب نے ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء سے کچھ پہلے ایک خط سرور مارہروی کو لکھا تھا، اس میں فرماتے ہیں:

"میں نے کسی زمانے میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والی ٹونک کو بھیجا تھا۔ اس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں:

ناموس نگہ داشتی از جود بگیتی — جز پردگیانِ حرم معدن و یم را
دانست کہ این قوم بہر کوچہ و بازار — پرسند ز ہم منشاء رسوائی ہم را

(عود: ۹) اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ میں اس قصیدے کو بھیجے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا ورنہ بطور تذکرہ زمانے کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

صاحبزادہ یار محمد خاں بہادر بھوپالی شوکت تخلص نے انشائے نورچشم (ص ۱۷۴ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۹ھ) میں لکھا ہے کہ "جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے، وزیر الدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا۔ نواب صاحب موصوف نے ارسال صلہ قصیدہ میں عمداً یا سہواً دیر کی۔ مرزا صاحب نے ایک خط لکھ بھیجا۔ نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق جائزہ روانہ کیے۔" اس سے مرزا صاحب کے اس قطعے کی طرف اشارہ ہے جو سبد چین ص ۴۶ میں طبع ہو چکا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:

گفتم بخرد بخلوت انس — اے چشم و چراغ اہل ایماں

ان تمام تصریحات کے پیش نظر تاریخ ٹونک کے جس بیان سے مہر صاحب نے غالب (ص ۲۲۲-۲۲۴ طبع ثانی) میں نتیجہ نکالا ہے کہ پہلا قصیدہ نواب ٹونک کی خدمت میں ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں بھیجا گیا تھا، وہ بیان غلط ہے۔"[۵۱]

۱۲۷۸ھ میں قصیدہ بھیجے جانے کی تردید کرتے ہوئے عرشی صاحب مزید لکھتے ہیں:

"نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خاں بہادر والی ٹونک کی مدح کا قصیدہ ...... کلیات فارسی کے اس نسخے میں بھی موجود ہے جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے، اور ۳۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رامپور پہنچ گیا تھا۔ ۱۲۷۸ھ تقریباً ۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو شروع ہوا تھا جس کا یہ مطلب ہے کہ ۳۰ مارچ ۱۸۶۱ء کو رمضان ۱۲۷۷ھ ہوگا۔ اگر یہ قصیدہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں ٹونک جاتا تو اس نسخے میں اس کا ہونا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح ٹونک کا دوسرا قصیدہ بھی اس نسخے میں موجود ہے۔ لہٰذا اس کو بھی ۱۲۷۷ھ سے قبل کا ہونا چاہیے۔"[۵۲]

۵۱۔ حواشی مکاتیب غالب از امتیاز علی صاحب عرشی ص ۱۴۱ طبع سوم ۱۹۴۵ء

۵۲۔ "غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین" علی گڑھ میگزین غالب نمبر ص ۱۱۷

مرزا غالب نے نواب وزیر الدولہ کی خدمت میں جو قطعۂ تقاضائی بھیجا اس پر خواجہ الطاف حسین حالی ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں:

"مرزا نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے، اور اس کا جواب مدت دراز تک مرزا کو نہیں ملا، تب مرزا نے بطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے۔ جس کو مشکل سے ہجو ملیح کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس قطعے کا مضمون لطف سے خالی نہیں ہے ہم.. اس کا خلاصہ اردو زبان میں لکھتے ہیں؛

... قطعے کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں نے ایسا اور ایسا قصیدہ نواب کی خدمت میں بھیجا تھا، اور اس کے ساتھ عرضداشت بھی گزرانی تھی، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا؟ کیا نواب مجھ سے آزردہ ہوگیا؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی۔ خدا جانے میں نے کیا کہہ دیا ہوگا۔ جس پر نواب کو آزردگی ہوئی۔ عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے؟ نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ بھیجنا چاہتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہوسکتا۔ اس نے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، پہاڑ سے زمرد، عراق سے گھوڑا، دریا سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے ساونڈنی، اصفہان سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت، یہ سب چیزیں فراہم کرکے لائیں، تب غالب کو صلہ بھیجا جائے۔ پس جبکہ یہ ساری ڈھیل اس وجہ سے ہے تو اس کو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہئے۔ جب عقل نے مجھ کو یہ دم دیا تو میری تمام یاس و ناامیدی اُمید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لیے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اس کے لئے آئینہ اور تاج سکندر سے، انگشتری اور تخت سلیمان سے، جام جمشید عالم غیب سے، آب حیواں چشمۂ خضر سے، عمر ابد، نشاط جاوید، دل کی قوت، ایمان کی مضبوطی، اپنے خدا سے اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں [1]۔"

ذیل میں "سبد چین" سے پورا قطعہ نقل کیا جاتا ہے۔

[1] یادگار غالب صفحہ ۸۴

قطعہ

گفتم بخرد بخلوتِ اُنس / کاے شمع و چراغ ہفت ایواں

آیا ز چہ رُو بود کہ نواب / ننوشت جواب نامہ ام ہاں

آں گونہ عریضہ کہ دانی / درویش نوشتہ سوی سلطاں

آں گونہ قصیدۂ کہ گوئی / از صفحہ دمیدہ سنبلستاں

ایں ہر دو رسید و نیست پیدا / زانسو اثرے بہیچ عنواں

رنجید مگر ز مدح نواب / اے کاش نگشتمے ثنا خواں

ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم / از گفتۂ خویشتن پشیماں

عقلم بجواب گفت غالب / زنہار مخور فریب شیطاں

نواب بفکر ارمغانست / تا نامہ فرستدت بہ ساماں

وآنہا کہ بخاطرش گزشت است / زود آں ہمہ جمع کرد نتواں

زود است کہ جمع نیز گردد / دیر است کہ دادہ است فرماں

تا راہ روانِ بحر و بر گرد / آرند بکوششِ فراواں

دیبا ز دمشق و مخمل از روم / الماس ز معدن و زر از کاں

نیل از دکن و زمرد از کوہ / توسن ز عراق و دُر ز عماں

فیروزۂ نغز از نشاپور / یاقوت گزیدہ از بدخشاں

جمازۂ تیز رو ز بغداد / شمشیر برندہ از صفاہاں

پشمینۂ قیمتی ز کشمیر / زربفتِ گراں بہا ز ایراں

بالجملہ ز رنگ چوں ازیں روست / بر رنج و ملال نیست برہاں

چوں پیر خرد بدل فریبی / گفت ایں ہمہ رازہائے پنہاں

گشتم ز دمش امیدواری / مرہم بہ زخم یاس حرماں

گفتم کہ چو با من ایں کرم کرد | آں قبلہ و قبلہ[51] گاہِ اعیاں
ناچار ز راہِ حق گزاری | تا کردہ شود تلافیٔ آں
من نیز طلب کنم برایشں | ایں خواہشں[52] اگرچہ نیست آساں
آئینہ و تاج از سکندر | انگشتر و تخت از سلیماں
از عالمِ غیب جامِ جمشید | از چشمۂ خضر آبِ حیواں
عمرِ ابد و نشاطِ جاوید[53] | نیروئے دل و ثباتِ ایماں
توفیقِ جوابِ نامۂ خویشں | توقیع[54] عطا و بذلِ احساں[55]"

مہر صاحب اور مالک رام صاحب کا خیال ہے کہ یہ گلدستہ "حسن طلب[56]" اور "تقاضے[57]" کے پھولوں سے تیار کیا گیا ہے اور "ہجو" کے کانٹوں سے پاک ہے۔

مرزا غالب کی تصانیف اور ریاستیں مرزا غالب اپنی تصانیف، دوستوں کے توسط سے، رئیسوں کی خدمت میں بھیجتے رہے۔ قلمی بھی اور مطبوعہ بھی۔ قلمی نسخوں کی خزینہ دار ہونے کے اعتبار سے بعض ریاستیں مشہور ہیں اور مطبوعہ نسخوں کے سلسلے میں کئی نام شہرت کے آسمان پر تارے بن کر چمک رہے ہیں۔ یہاں تفصیل سے قطع نظر، اختصار پر قناعت اور چند ناموں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں:

"آپ مولوی صاحب (مولوی مؤیدالدین خاں صاحب) سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میرے کلیات کی پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعہ عنایت سے اس مجلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرنا اور جو کچھ اس کے گزرنے کے

---

51. حدیقۂ راجستان ٹونک میں: کعبہ
52. " " " " مشکل
53. " " " " دائم
54. " " " " تعجیل
55. " " " " احساں
56. "سبد چین" صفحہ ۷۲-۷۳
57. "غالب" صفحہ ۱۵۸ طبع اول
58. "ذکر غالب" صفحہ ۱۰۳ طبع دوم

بعد واقع ہو دریافت کرکے مجھ کو مطلع فرمائیں۔"[۵۱]

باقر علی خاں کامل کو لکھتے ہیں:

"اگلے مہینے سبد چین کی ایک جلد مع عرضی اقبال نشان مرزا افضل حسین خاں کی معرفت الور کو بھجوائی تھی سو اب کے ہفتے میں حضور پرنور مہاراؤ راجا بہادر کا خط انہیں کی معرفت مجھ کو آیا۔ حضور نے از راہ بندہ پروری و قدر افزائی القاب بہت بڑا مجھے لکھا اور خط میں فقرے بہت عنایت اور التفات کے بھرے ہوئے درج کیے۔ تم تو وہیں ہو تم کو اس کی اطلاع ہوئی تھی یا نہیں اور اگر ہو گئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا۔ اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کبھی دربار میں کچھ میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں اور اگر آتا ہے تو کس طرح آتا ہے۔ حضور سن کر کیا فرماتے ہیں۔"[۵۲]

امتیاز علی خاں صاحب عرشی لکھتے ہیں:

"میرزا صاحب کے شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مہر نیمروز کا غالباً مطبوعہ نسخہ شوال ۱۲۷۱ھ (جون ۱۸۵۵ء) کو نواب فردوس مکاں کی خدمت میں تحفۃً ارسال کیا تھا۔ نواب صاحب ۳۰ رجب ۱۲۷۱ھ (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) کو تخت نشین ہوئے تھے۔ شیفتہ کا چند ماہ بعد میرزا صاحب کی تصنیف کا تحفے میں بھیجنا اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ انہوں نے خود مرزا صاحب کے اشارے سے ایسا کیا تھا۔"[۵۳] مہر نیمروز کا جو نسخہ اس مقالے کا موضوع اور مقالہ نگار کے کتب خانے کی زینت ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

غالب کے قصیدوں سے نواب وزیر الدولہ کے ساتھ "قریبی تعلق" یا "گہرے دوستانہ" کا پتا نہیں چلتا البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کی بزم میں ان کا ذکر آتا تھا کہتے ہیں:

در بزم تو گویند سخن میرود از من	از بلبل شیدا کہ خبر کرد ارم را
ہر چند عدو از بیش کم ست اینکہ بہ پرسی	اے کاش بپرسند ز من بیشی کم را

"مہر نیمروز" کا خاص نسخہ | یہ ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء کے ایڈیشن کا ایک نسخہ ہے۔ اس ایڈیشن کی تفصیل مہر صاحب نے "غالب" میں بیان کر دی ہے۔ لکھتے ہیں:

۵۱۔ اردوئے معلیٰ حصہ اول ص ۳۲۱، ۵۲۔ اردوئے معلیٰ حصہ اول ص ۲۰۷، ۵۳۔ دیباچہ مکاتیب غالب ص ۵۵ (حاشیہ)

"اس کے کل ۱۱۶ صفحے ہیں ہر صفحہ میں ۱۲ سطریں اور ہر سطر میں تقریباً ۱۲ الفاظ ہیں۔ سرورق کے پہلے صفحہ پر کتاب کا نام ہے۔ دوسرے صفحے سے کتاب شروع ہو کر ۱۱۳ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے صفحہ ۱۱۴ اغلاط نامہ کے لئے وقف ہے بقیہ دو صفحوں میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی منظوم تقریظ اور تاریخ طباعت ہے۔ سرورق کی پیشانی پر ولیعہد بہادر کی مہر کا نقشہ ہے پھر یہ عبارت درج ہے:" بحول و قوت فیاض مطلق جل جلالہ حسب الحکم حضرت سلیمان رفعت (رتبت) فلک بارگاہ (بارگاہ) انجم سپاہ چشم و چراغ دودمان گورگانی (گورکانی) ثانی صاحبقران ثانی سلطان فخر الدین فتح الملک ولیعہد بہادر دام اقبالہ این کتاب مستطاب ہم نام مہر (نیر) عالم افروز حاوی حالات عالم از ابتدائے آفرینش (آفرنیش) تا عہد فرمانروائی حضرت نصیر الدین ہمایوں پادشاہ (بادشاہ) موسوم بہ "مہر نیمروز" کہ اندیشہ اعجاز پیشہ نواب معلے القاب عطارد نظیر آفتاب (افتاب) ضمیر نوح سفینہ سخن (و) کلیم طور معنی نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ (جنک) غالب تخلص مشرق آن است بہ تصحیح و تحشی نواب سابق الالقاب از (در)، فخر المطابع بہ اہتمام بندہ درگاہ (درکاہ) حافظ عبد اللہ بہ پیرایہ انطباع جلوہ گر (گر) دیدہ[۵۱]

ایک نام نقل ہونے سے رہ گیا ہے۔ یہ نام ہے: "شیخ خدا بخش مصور" (نسخہ الف میں صرف "خدا بخش" کا) جو سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے، فاصلے پر، نظر آتا ہے۔

سرورق اور ص ۲ کے نقش و نگار آپ ہی کے کمال فن کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔

"مہر نیمروز" کا نسخہ طالع یار خاں کی معرفت بھیجا گیا تھا اس نسخے کے سرورق سے پہلے، سادہ ورق پر، یہ عبارت درج ہے:

"این کتاب تاریخ مہر نیمروز بتاریخ بست و ہفتم جمادی الثانی سنہ ۱۲۷۱ ہجری معرفت طالع یار خاں صاحب فرستادہ اسد اللہ خاں غالب در کتب خانہ حضور پرنور داخل شد"

طالع یار خاں (دہلی) کے رہنے والے اور مرزا غالب کے ملنے والوں میں سے تھے۔ (غالباً) معاش کے سلسلے میں

[۵۱] "غالب" ص ۱۴۲ (حاشیہ) طبع چہارم

ٹونک میں قیام تھا اور ایک زمانے میں وہاں مشہور و معروف تھے لیکن زندگی کا چراغ بجھا تو شہرت کی شمعیں بھی گل ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ ان کے شبستان شہرت کے تماشائی تماشاگاہ عالم ہی سے رخصت ہو گئے اور اب ٹونک میں ان کی داستان سنانے والا کوئی نہیں۔[1]

طالع یار خاں کے بارے میں مرزا غالب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں، زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔"[2]

طالع یار خاں کے نبیرہ محمد افضل یار خاں ٹونک میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ آبرو واقعات ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"محمد افضل یار خاں نبیرہ طالع یار خاں مرحوم دہلوی حسب الحکم حضور...... ناظم محکمہ منصفی پرگنہ سرونج بمشاہرہ ہشتاد روپیہ باختیار سماعت مقدمات تا یک ہزار روپیہ مامور ہوئے۔"[3]

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر ۱۸۹۳ء میں افضل یار خاں ناظم پرگنہ نیا ہیڑہ تھے[4] اور ستمبر ۱۸۹۶ء میں منشی رام چندر...... بجائے محمد افضل یار خاں ناظم نیا ہیڑہ مقرر ہوئے۔[5] "دور ایام" (تاریخ پرگنہ نیا ہیڑہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں بھی آپ نیا ہیڑہ کے ناظم تھے۔ سید علی اصغر صاحب ایک عمارت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرزا افضل یار خاں دہلوی ناظم پرگنہ کی تجویز سے یہ مکان بنایا گیا ہے اور انھیں کی نگرانی میں سنہ ۱۸۹۰ء میں اس کی تعمیر کا کام مکمل ہوا ہے۔"[6]

مولف "دور ایام" عہدہ نظامت کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] ایک سن رسیدہ بزرگ نے اتنا بتایا کہ طالع یار خاں کی اولاد سرونج (مالوہ) میں موجود ہے۔ [2] خطوط غالب ص ۱۴۳ اور پنجاب ص ۸۰، اردوئے معلیٰ حصہ اول ص ۲۵۵۔ [3] حدیقہ راجستان ٹونک ص ۲۷۔ [4] ص ۲۵۲۔ [5] ص ۲۶۹۔ [6] دور ایام ص ۲۲۔

"پرگنہ کی نظامت، سب سے اعلیٰ حکومت ہے۔ ۱۸۸۶ء تک اسی عہدہ کو پرگنہ کی عاملی، اور اس کے عہدہ دار کو پرگنہ کا عامل کہتے تھے۔ اور ۱۸۸۶ء سے اسی عہدہ کو پرگنے کی نظامت اور اس کے عہدہ دار کو پرگنے کا ناظم کہتے ہیں۔ اور ملکی و مالی عدالتی و انتظامی وغیرہ پرگنہ کی تمام اہم ذمہ داریوں کی نگرانی اسی عہدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔"[51]

۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں ٹونک کے فرماں روا | جمادی الاخریٰ ۱۲۵۰ھ / اکتوبر ۱۸۳۴ء میں (نواب امیر خاں کے انتقال پر) نواب وزیر الدولہ مسند نشین ہوئے۔ آپ نے ۱۳ محرم ۱۲۸۱ھ (جون ۱۸۶۴ء) کو وفات پائی۔ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء (ورود "مہر نیمروز") کا زمانہ آپ ہی کے دورِ حکومت کا زمانہ تھا۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۱ھ (جون ۱۸۶۴ء) کو نواب محمد علی خاں مسندِ ریاست پر متمکن ہوئے۔ آبرو لکھتے ہیں:

"اسی سال (۱۲۸۱ھ) میں ۔۔۔۔ یہ تینوں سجعے نواب صاحب بہادر کے جدا جدا مہروں میں کندہ ہوئے۔ سجعے: امیر وزیر محمد علی، نگہبان دین محمد علی، چہارم خلیفہ محمد علی۔"[52]

زیر بحث خاص نسخے کے ص ۳ کے حاشیے پر پہلے سجع والی مہر ثبت ہے۔ یہ مہر بیضوی ہے اور اس میں ۱۲۸۱ھ کندہ ہے۔

تزئین و آرائش | غالب اپنی تصانیف رئیسوں اور حاکموں کے نذر کرتے تو ان کی لوح، جدول اور جلد کی آراستگی کی فکر بھی کرتے اور نذر کے نسخے چھاپے کے ہوتے تو یہ بھی چاہتے کہ وہ اعلیٰ قسم کے کاغذ پر چھپے ہوئے ہوں۔ آخر دسمبر ۱۸۵۲ء یا اوائل ۱۸۵۳ء میں مہاراجہ جے پور کی خدمت میں دیوان بھیجنے کا موقع آیا تو پہلے اسے صحاف کے پاس بھیجا۔ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آج، کل آجائے گا۔ پھر اوس کے جزودان کی تیاری کر کے روانا کروں گا۔"[53]

دستنبو آگرہ میں چھپی تو اس کتاب کے چند نسخے اچھے کاغذ پر چھپوائے۔ پھر بڑے شوق اور اہتمام کے ساتھ ان کی دل پسند لوحیں، نظر فریب جدولیں اور پُر تکلف جلدیں بنوائیں۔ یہ اہتمام اس لئے کیا کہ ان نسخوں کو بطور نذر بھیجنا تھا۔[54] تفتہ کو کاغذ کے باب میں لکھتے ہیں:

---

۵۱ ص ۲۳۱ ۔ ۵۲ حدیقہ راجستان ٹونک ص ۶۰ ۔ ۵۳ خطوط غالب ص ۱۰

۵۴ خطوط غالب صفحات: ۵۴، ۲۹۹، ۳۷۸

"فرنچ" کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذر حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں، اور باقی چار ہو "شیورام پوری" پر اور چار ہو نیلے کاغذ پر چھاپو۔ اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں، وہ اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی "شیورام پوری" پر یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلف محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ اون کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ ہوں! اگرچہ ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو، تو خیر دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار "شیورام پوری" پر ہوں: باقی جلدوں میں تمھیں اختیار ہے۔"[۱]

تزئین کے باب میں لکھتے ہیں:

"کہتا ہوں، مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیوں کر کیا چاہیے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں، تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پر تکلف بن سکتی ہے۔"[۲]

۱۸۵۸ء کا زمانہ تھا۔ ان دنوں دہلی میں صحاف اور نقاش موجود نہیں تھے آرزو یہ تھی کہ لوح، جلد اور جدول کی درستی آگرہ میں ہو جائے۔ لکھتے ہیں:

"میرزا تفتہ، تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اوس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں پنجہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں! شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔"[۳]

چنانچہ دستنبو کے سات نسخوں کی تزئین و آرایش، مرزا حاتم علی مہر کے زیر اہتمام، آگرہ میں ہو رہی تھی۔ مہر کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"سبحان اللہ، جلدوں کی آرایش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے! میرے دل میں بھی ایسی ہی ایسی باتیں تھیں۔ یقین ہے کہ متاع شاہوار ہو جائیں گی۔"[۴]

غالب ان جلدوں کے لیے چشم براہ تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سُنا، دل کو دیکھنے

---

[۱] خطوط غالب ص ۱۴۹-۱۴۸ ۔ [۲] خطوط غالب ص ۱۴۷ ۔ [۳] خطوط غالب ص ۱۴۶ ۔ [۴] خطوط غالب ص ۱۰۱

سے زیادہ یقین آیا۔ مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ پیارے شاہ ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا؟"[۵۱]

مہر کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب، ۳۳ کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیونراین کی، کل جمعہ کے دن ۱۲ نومبر کو پہنچیں۔ کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے از روئے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسّر ہو؟ آپ پر گمان تساہل کا گزرے، یہ تو کیوں کر ہو؟ ہاں، صحاف، جلد کے بنانے کی نسبت سے، میرے حق کا جلاد نہ بن جائے، یعنی مدت مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔ اور ہاں حضرت، کچھ ایسی چوکسی ارسال کے وقت کر لیجئے گا کہ وہ پارسل آشوب تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے! مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یا الٰہی، یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے اوس میں یہ مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانا کیا ہے۔

یارب، ایں آرزوے من چہ خوش است!
تو بدیں آرزو مرا برساں"[۵۲]

جس روز یہ کتابیں پہنچیں، غالب کے لئے گویا وہ روز عید تھا۔ اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کل جو جمعہ، روز مبارک و سعید، تھا، گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام:

ساتوں جلدوں کا پارسل پہنچا　واہ کیا خوب برمحل پہنچا

آدمی کو موافق اوس کی تمنا کے آرزو بر آنی بہت محال ہے، میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بتاؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں تو صرف اسی قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور

---

[۵۱] خطوط غالب ص۳۵۵۔ [۵۲] خطوط غالب ص۳۵۶

پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔[1]

زیر بحث نسخہ کاغذ کے اعتبار سے اسی اشاعت کے عام نسخوں کے مقابلے میں امتیازی شان رکھتا ہے۔ سہ رنگی لوح و جدول سے مزین اور پر تکلف جلد سے آراستہ ہے۔

حاشیوں پر غالب کے ہاتھ کی تحریر | اس نسخے کے صفحات: ۱۴، ۴۲، ۵۰، ۵۵، ۵۷، ۵ اور ۶۹ کے حاشیوں پر غالب کے ہاتھ کی تحریر حاشیوں کی رونق اور نسخے کی قدر و قیمت بڑھا رہی ہے۔ تفصیل یہ ہے:

صفحہ ۱۴ | اس کے حاشیے پر غالب نے "آبمند بمعنی صاحب رونق ۵" اپنے قلم سے لکھا ہے۔ "فرہنگِ غالب" (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی) میں "آبمند" کے معنی: سردار، مالدار، صاحب سامان مرقوم ہیں اور فٹ نوٹ میں یہ عبارت ہے: "فرہنگ انجمن آرای میں لکھا ہے: آیں لغت در فرہنگ نیامدہ و از تصرفات مؤلف است۔"

فرہنگ انجمن آرای ناصری کی پوری عبارت یہ ہے:

"بسکون با و فتح میم بوزن دردمند بمعنی صاحب آبرو و عزت و ہر معنی کہ در آب مرقوم شدہ و ایں لغت در فرہنگہا نیامدہ و از تصرفات مؤلف است۔"

اسی صفحے کے حاشیے پر "افدستائی بمعنے ستایش" کے الفاظ چھپے ہوئے ہیں لیکن حروف کچھ مٹے مٹے سے تھے، غالب نے ان دھندلے نقوش کو اپنے قلم سے روشن کیا ہے اور ستایش کے آگے لفظ "شگرف[2]" بڑھایا ہے۔ فرہنگِ غالب میں "افدستائی" کے معنی (مہر نیمروز کے حوالے سے) "ستایش" درج کیے گئے ہیں اور فٹ نوٹ میں لکھا ہے:

لغت فرس: ۵، میں 'افدستا' کو بسکون فا و دال و کسر سین لکھ کر بتایا ہے کہ یہ پہلوی لفظ ہے جو 'افد' بمعنی شگفت اور 'ستا' بمعنی ستایش سے مرکب ہے۔"

صفحہ ۴۲ کے حاشیے پر "اشکوب بروزن اجود بمعنے درجۂ عمارت ۵"

" ۵۰ " " " "یوغ ہندی جوا ۵"

---

[1] خطوطِ غالب ص ۳۰۷ — [2] شگرف: بفتحین مکسور، و اشگرف، بہمزہ مکسور بمعنی نادر و عجیب است، و صفت خوبی و درست می افتد چنانکہ فتح شگرف، و شان شگرف، و شوکت شگرف۔ (فرہنگ غالب)

"مہر نیم روز" کے حاشیوں پر غالب کے ہاتھ کی تحریریں

داشت و کمابیش ہفتصد سال زیسته چار بالش عز و ناز بہمین پور خویش سکیت گذاشت
سکیت که نام دگرش نوح علیه السلام است در وخشوری و پیام آوری آبمند و نامزد نام است
و چارصد و ہشتاد سالگی فرمان بمیری آئین انگریزی یافت مردم با نجود خوانند و بجد اراده نمود گویند

صفحہ ۱۴ کے حاشیے پر "آبمند[۲] بمعنے صاحب رونق لکھا"

ساختند و توغ آنرا بر گردن دو بره گاو نهادند قارلیغ که آنرا خارلیق نیز گویند بمعنی برف است لوقا
جماعتی است که در سفر زمستان با آنکه خاقان اغورخان فرمان داده بود که کس از لشکریان پس نماند

اور
صفحہ ۵۰ کے حاشیے پر "یورغ ہندی جو لکھا"
غالب نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے
(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مہر نیم روز کا ایک خاص نسخہ" صفحہ ۱۶)

صفحہ ۵۵ کے حاشیے پر "بیر یعنے بیدلک"
" " " " "کاچال ترجمۂ اثاث البیت لکا"
" ۵۷ " " "فرگاہ بمعنے حکم ۵"
"فرہنگِ غالب" میں فرگاہ کے معنے "بارگاہ و ترجمۂ حضرت" مندرج ہیں۔ اور فرہنگ انجمن آرای ناصری میں اس لفظ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے :۔ "فرگاہ بروزن درگاہ ترجمہ لفظ حضرت است بپارسی کہ مرکب است بمعنی تخت و زرک با فرو شکوہ"

صفحہ ۶۹ کے حاشیے پر "کاسہ خانہ بمعنے نقارخانہ" تحریر کیا گیا ہے۔ فرہنگِ غالب میں "کاسہ خانہ" نہیں ہے۔

علاماتِ اوقاف | عرشی صاحب لکھتے ہیں:

"میرزا صاحب کی تحریروں میں پرانی علاماتِ اوقاف کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیراگراف کے آخر میں اکثر یہ علامت (فقط) لکھتے ہیں، جو لفظ فقط کی طغرائی شکل ہے۔ کبھی بارہ کا ہندسہ (۱۲) بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں، جو لفظ "حد" کے عدد ہیں۔ اس ہندسے کے بارے میں لطیفے کے طور پر مہر کو لکھتے ہیں: "صاحب بندۂ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔" .....ایک خط میں صفحہ ختم ہو جانے کے باعث کچھ عبارت حاشیے پر لکھنا پڑی تھی۔ اس کے ربط کی طرف اشارہ کرنے کے لئے انہوں نے (۱۵) کا ہندسہ متن کے آخر اور حاشیے کے شروع میں لکھا ہے۔"[1]

حاشیے کی تحریریں غالب کے خط کے مستند نمونوں کے مطابق ہیں اور جن علامات و اشارات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ بھی ان میں موجود ہیں۔ چنانچہ متن میں "آبند" کو جہاں اپنے قلم سے روشن کیا ہے وہاں اس پر ۱۲ کا ہندسہ لکھا ہے اور جب اس لفظ کو حاشیے پر لکھا ہے تو وہاں بھی ۱۲ کا ہندسہ بنا دیا ہے۔ لفظ "آبند" کے نیچے بمعنے صاحب رونق" تحریر کیا ہے تو خلتے پر فقط کا طغریٰ ثبت کر دیا ہے۔ صرف اسی جگہ نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی غالب نے کسی لفظ کے معنے درج کئے ہیں وہاں فقط کی طغرائی شکل ثبت کی ہے۔

"افدستائی" پر ۱۴ کا ہندسہ متن میں بھی لکھا ہے اور حاشیے پر بھی۔ "اشکوب" پر دونوں جگہ ۱۵ کا ہندسہ

---

[1] مکاتیب غالب (دیباچہ) ص ۲۲۹ طبع سوم

تحریر کیا ہے۔ "یوغ" اور "فرگاہ" پر متن ہی میں ۱۲ کا ہندسہ تحریر ہوا ہے۔ "کاسہ خانہ" پر ۱۲ کا ہندسہ متن میں بھی لکھا گیا ہے اور حاشیے پر بھی۔ ہر بات غالب کی ادائے خاص کی آئینہ دار ہے ع عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا!

غالب اور غلط نامے | جب کبھی بھی غالب کی کسی کتاب کے چھپنے کا موقع آیا تو ان کی تمنا اور کوشش یہ رہی کہ کتاب صحیح چھپے اور غلط نامے کی حاجت نہ پڑے۔ عظیم الدین نے میرٹھ میں دیوان اُردو چھاپنے کی خواہش ظاہر کی اور منشی ممتاز علی نے ان سے اس کی زبانی سفارش کی تو کاپی کی تصحیح کا خیال آیا چنانچہ انھوں نے جواب میں کہا:

"اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟"[51]

اور جب اپنا اُردو کا دیوان منشی شیو نراین کے پاس آگرے میں چھپنے کیلئے تو لکھا:

"میرا میاں ذرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو"[52]

دستنبو چھپنے کے لئے بھیجی تو شیو نراین کو لکھا:

"کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامے کی حاجت نہ پڑے۔ آپ خود متوجہ رہیے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیے گا، تو وہ بھی آپ کے شریک رہیں گے۔"[53]

نمونے کے دو ورقے دیکھے تو میرزا تفتہ کو لکھا:

"تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے . . . . اگر بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں، تو اگر اچھا تا اصل نسخے میں سہو کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اوس کو بھی صحیح کر دیں گے۔ تم میری طرف سے اون کو سلام کہنا بلکہ یہ خط دکھا دینا۔ خدا کرے، انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرز تصحیح چلی جائے۔"[54]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"منشی صاحب . . . . مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدر دان ہیں۔ اوس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے، تو کیا میری تفضیح کے روادار ہوں گے؟"[55]

لیکن ہوتا یہ رہا کہ کتابیں غلط چھپتی رہیں اور کس قدر غلط چھپتی رہیں؟ پنج آہنگ کے بارے میں صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

---

[51] خطوط غالب صـ ۱۰۳ ـــ [52] خطوط غالب صـ ۱۴۰ ـــ [53] خطوط غالب صـ ۳۷۷ ـــ [54] خطوط غالب صـ ۲۸۵

[55] خطوط غالب صـ ۱۷۷

کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں[۵۱]

مطبع احمدی سے دیوان چھپ کر نکلا تو دیکھ کر دل جل گیا۔ کاپی نگار اور چھاپنے والوں کی بے پروائی کا حال میر مہدی حسین مجروح کے خط میں لکھتے ہیں:

"دیوان اردو" چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اوس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اوس کے پانی پر اور اوس کے چھاپے پر لعنت! صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا؛ وہ چھپا۔"[۵۲]

"قاطع برہان" چھپی تو "صحت نامہ قاطع برہان" سے بے نیاز نہ رہ سکی۔ اس پر مستزاد یہ کہ "تتمہ غلط نامہ قاطع برہان" تیار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ انوار الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"تتمہ غلط نامہ قاطع برہان کو بھیجے ہوئے تین دن ہوئے تھے کہ کل آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔"[۵۳]

قاطع برہان کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد نکلا تو وہ بھی "صحیح نامہ" کا محتاج رہا۔ "لطائف غیبی" چھپی تو ساتھ ہی تصحیح نامہ لطائف غیبی" بھی چھاپنا پڑا۔ اس کتاب کا صفحہ ۴۸ "صحیح نامہ" کے لئے وقف ہے، پھر بھی بہت سے اغلاط رہ گئے، جن کی تصحیح بعد میں کی گئی میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

"یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے اس میں وہی لطائف غیبی ہے جس کو میں نے اپنے مطالعہ میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے مدعا یہ ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو۔"[۵۴]

اس صورت حال کے پیش نظر اگر "صحیح نامہ اغلاط کتاب مہر نیمروز" میں ظاہر کی ہوئی غلطیوں کے علاوہ اور غلطیاں

---

۵۱ عود ہندی ص۳۹ – ۵۲ خطوط غالب ص۲۷۳ – ۵۳ خطوط غالب ص۱۴۹ – ۵۴ اردوئے معلیٰ حصہ اول ص۱۸

اس کتاب میں رہ گئی ہوں اور ان کی تصحیح کی نوبت بعد میں آئی ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ پیش نظر نسخے میں غالب نے دھندلے الفاظ کو اپنے قلم سے روشن کیا ہے۔[1] ضمہ، تشدید اور مد کا اضافہ کیا ہے۔ نقطوں اور مرکزوں میں کمی اور بیشی کی ہے۔ حروف اور الفاظ بڑھائے بھی ہیں، حذف بھی کئے ہیں اور کہیں کہیں بدلے بھی ہیں۔ دوران تصحیح میں قلم کی نوک کے علاوہ چاقو کی نوک سے بھی مدد لی ہے۔

فہرست اصلاح غالب

صفحہ	سطر	اصل	تصحیح شدہ	صفحہ	سطر	اصل	تصحیح شدہ
۲	۲	بہنجار	بہنجار	۴	۱۲	آفرینش	آفرینش +
۲	۳	ازہرسو جان بسوی اوست	ازہرسُو جان بسُوی اوست	〃	۱۳	ثرنده	ژنده +
۳	۱	ازرقص	ازرقص +	〃	〃	کہ از آب	کہ از آب +
〃	۱۶	اورا	اُورا	〃	۱۴	کاینات	کاینات +
〃	۱۹	تنک	تُنک	〃	〃	نفی	نفی +
〃	۲۱	بشعبده	بشعبده +	〃	۱۵	تاماسوی اللہ راکم بانہرہ آشوب پیدائی	تاماسوی اللہ راکم بانہرہ آشوب پیدائی +
۴	۸	بود	بُود +				
〃	〃	بدریوزهٔ	بدریوزهٔ +	〃	۱۶	پیدائی سلیمان	پیدائی سلیمان +
〃	۹	سنده	شنیده	〃	〃	آه ازین	آه ازین +
〃	۱۰	هست	هست +	۱۰	۲۰	نورنگاه	نورنگاه +
〃	۱۱	پس پردهٔ خیال	پس پردهٔ خیال +	〃	۲۱	عز	عزّ
〃	〃	ذات	ذات +	۱۳	۲	بہ هند آمد	بہ هند آمد +
〃	〃	کدام	کدام +	۱۴	۱۴	مایۂ	مایہ

[1] فہرست اصلاح غالب میں ایسے الفاظ کو صلیبی نشان (+) کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔

صفحہ	سطر	اصل	تصحیح شدہ	صفحہ	سطر	اصل	تصحیح شدہ
۳۰	۱۳	باہم	ہم	۴۰	۱۲	فروگراشت	فروگزاشت
"	۱۴	سپیدانہ	سُپیدانہ	"	۱۴	پوستین	پُوستین
"	۱۴	کشتند	گُشتند	"	۱۵	دوبزہ	دُوبزہ +
۳۱	۲	سنزدکی	نزدکی	۴۱	۱۴	گماشتہ	گُماشتہ
"	۴	شیرم	مشمرم	"	۱۷	چارپالش عزو ناز	چار بالش عزّو ناز +
"	۱۴	رُو بداد	رُویداد	"	۱۸	پیمبری	پیمبری +
"	۱۹	مرغزار آمد	مرغزار آمد	"	۲۱	پیغارہ	پیغارہ +
"	"	خو	خو +	"	"	بخار	بخار +
"	۲۰	فغان	فغان +	۴۲	۲	ریشۂ نہال	ریشۂ نہال +
"	"	کرد	گرد	"	۳	بوم	بُوم +
"	"	دود از اسمان	دُود از آسمان	"	۴	انکہ	آنکہ
۳۱	۲۱	آہنگ این	آہنگ این	۴۳	۱	از ہوا بارید	از ہوا بارید +
۳۵	۴	روی	رُوی	"	"	برد	بُرد
"	۹	بروی	بُروی	"	۲	خود	خود +
"	۱۷	بابل	بابل	"	"	جایگاہ خویش	جایگاہ خویش +
۳۶	۱	کارخانہ خسروی	کارگاہ خسروی	۵۱	۱۰	فرگفت	فرگُفت
"	۳	رستنی	رُستنی	۵۲	۲	موشگافی	مُو شگافی
"	۵	نہ ورق	نُہ ورق	"	۱۲	بادہ آشامید آبگینہ بہ سنگ زد	بادہ آشامید گزشت آبگینہ بر سنگ زد
۳۷	۱۶	نمرود محرود	نمرود مرُدود				
۴۰	۱۲	سری بسوگیری شرشان	سری بسُوگیری سوشان	"	۲۱	زرود	زُرود

صفحہ	سطر	اصل	تصحیح شدہ
۵۴	۲۰	سجدہ	سنجیدہ
"	۲۱	دو ہزاد	دُو ہزار
۵۶	۸	ہر	ہمہ
"	۱۴	انچہ	آنچہ
۵۷	۷	نہہ ماہ	نُہہ ماہ
"	۱۰	لفتند	گفتند
۵۷	۱۱	پور	پُور
"	۱۲	خود رو	خُود رو
۵۸	۸	قراچار نونیاں	قراچار نُویان
"	۱۰	نہہ پسر	نُہہ پسر
"	۱۱	نہہ خسر	نُہہ خسر
"	۱۲	بنگاہ ایں دودہ و دودماں	بُنگاہ این دُودہ و دُودماں
۵۹	۸	قایدون خان	قایدو خان
"	۱۰	جہانیان	جہانبان
"	۱۴	لہند	راند
۶۰	۴	لمعہ	لمعہ +
"	۱۰	اندکرابیر	اندک مایہ
"	۱۱	ابر	بار
"	۱۲	شیرستان ساخت	شیدستان ساخت

صفحہ	سطر	اصل	تصحیح شدہ
۶۱	۱۶	قاجونی بہادر	قاجولی بہادر
۶۳	۲	ہمی مانسد	ہمی ماند
"	۲	ہیگرد	ہیگردد
"	۳	بایں دو شہسوار	بایں شہسوار
"	۴	شاہزادگان را	شاہزادہ را
"	۵	تن ہاے نازنین	تن نازنین
"	۷	باید مرد	باید مُرد
"	"	دسیومین	دو یمین
"	"	خون برادر	خون برادران
۶۴	۶	بابلاں	بُلبلاں +
۶۵	۳	جوجی قار	جوجی قسار
"	۱۸	زود	زودا
۶۶	۲	مادری	نادری +
"	۵	تراچار	قراچار
"	۱۸	ناشتاقتن	تا شتاقتن
۶۷	۱۰	بگیر	شبگیر
۶۹	۲۰	میوہ و سایہ	میوہ وسایہ
۷۰	"	عیکرد	میکرد

کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) کے بعض نایاب اردو مخطوطات

(از جناب سید نصیر الدین ہاشمی صاحب)

کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد کا سرکاری کتب خانہ ہے، اس کو نواب عماد الملک (سید حسین بلگرامی مرحوم) اور مُلا عبد القیوم مرحوم نے ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۱ء میں قائم کیا تھا، اس کے کچھ عرصہ بعد سرکار (گورنمنٹ آصفیہ) سے سالانہ امداد مقرر ہوئی اور اس کو سرکاری کتب خانہ قرار دیا گیا، متعدد اصحاب کے کتب خانے اس کیلئے خریدے گئے۔ اس کے پہلے مہتمم مولوی سید علی حیدر طباطبائی (نظم) (حیدر یار جنگ مرحوم) بنائے گئے۔ ان کے بعد مولوی تصدق حسین مرحوم عرصۂ دراز تک اس کے مہتمم رہے، ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادے مولوی عباس حسین صاحب باپ کی جگہ مہتمم ہوئے، موصوف کے وظیفہ پر سبکدوش ہونے پر ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب ایم، اے پی ایچ ڈی کا کتب خانہ کے "کیوریٹر" کی حیثیت سے تقرر ہوا ہے۔

اس وقت کتب خانہ میں اردو، عربی، فارسی، انگریزی، تلنگی، مرہٹی، کنڑ اور ہندی قلمی اور مطبوعہ کتابیں موجود ہیں، ان کی تعداد آخر دسمبر ۱۹۵۰ء تک تقریباً (۶۰،۷۶۷) تھی جن میں ۴،۲۸۴ قلمی کتابیں ہیں۔

قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی ایک فہرست موجود ہے، مگر یہ بہت کچھ اصلاح و ترمیم طلب ہے، جدید سائنٹیفک اصول پر ڈاکٹر صاحب موصوف اس کی ایک مستقل فہرست مرتب کروا رہے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے میں اس کتب خانہ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتب کر رہا ہوں، یہ انجمن کے سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" میں بہ اقساط شائع ہوگی، کتب خانہ میں تقریباً آٹھ سو اردو کی قلمی کتابیں ہیں، ان میں سے بعض بہت نایاب ہیں، اس لئے یہاں چند نایاب قلمی کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، امید ہے کہ یہ موجب دلچسپی ہوگا۔

(۱) مثنوی غواصی | قطب شاہی دور کے مشہور شاعر غواصی کا نام ہم کو معلوم نہیں اور اگرچہ اس کی زندگی سے متعلق بہت سے حالات سے ہم واقف ہیں پھر بھی یہ نہیں معلوم کہ اس کا پورا نام کیا تھا، اور کب اس کا انتقال ہوا البتہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ابراہیم قلی قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) کے عہد میں پیدا ہوا، محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں

کی شاعری چکی مگر بادشاہ کا تقرب حاصل نہیں ہوا تھا، سلطان عبد اللہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانہ میں اس کو شاہی تقرب حاصل ہوا، وہ دربار کا ملک الشعرا بنایا گیا اور سفیر کی حیثیت سے عادل شاہی دربار میں بیجاپور بھیجا گیا تھا، سلطان عبد اللہ ہی کے زمانہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

غواصی ایک فطرتی شاعر تھا، وہ غزل گو شاعر تھا، اس کے کمال فن کا ثبوت اس کی قادر الکلامی سے ملتا ہے، اس کا اسلوب بیان سادہ اور دلکش ہے، عشق و عاشقی کے جذبات و معاملہ بندی کی بہت عمدہ مثالیں اس کے کلام میں ملتی ہیں، آج تک اس کی دو مثنویاں یعنی سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کا پتہ چلا تھا، ان دونوں کو مجلس اردو مخطوطات حیدر آباد نے شائع بھی کر دیا ہے، اول الذکر کی تصنیف ہو چکی تھی، اگرچہ یہ تصنیف ۱۰۳۵ھ میں سلطان عبد اللہ کی تخت نشینی سے پہلے ہو چکی تھی لیکن شاعر نے اسے عبد اللہ کی تخت نشینی کے بعد اس میں اسکی مدح کے اشعار بڑھا کر اس کے سامنے پیش کیا تھا اس میں ایک فارسی قصہ کو دکھنی نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے، اسکی پوری تفصیل ہم نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" (ص ۳۸) میں کر دی ہے، دوسری مثنوی جو طوطی نامہ ہے یہ بھی فارسی طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی کا ترجمہ ہے اس کو ۱۰۴۹ھ میں اس نے مکمل کیا تھا۔

آج ہم اس کی تیسری مثنوی کا تعارف کراتے ہیں، جو غالباً ان دونوں سے قبل یعنی ۱۰۳۵ھ کے پہلے لکھی گئی تھی، اس مثنوی کا نام مثنوی پر درج نہیں ہے اس کو ہم "چندا اور لورک" سے موسوم کرتے ہیں، اس کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں ایک نسخہ پر کسی نے پنسل سے "میناوتی" بھی لکھا ہے۔ بہر حال اس کو میناوتی یا "چندا اور لورک" سے موسوم کرنا صحیح ہے اس مثنوی میں تقریباً ایک ہزار شعر ہیں، پہلے حمد و نعت ہے اس کے بعد منقبت خلفائے راشدین ہے، اس سلسلہ میں وہ سیدنا عبد القادر جیلانی کی مدح کرتا ہے اس کے بعد قصہ شروع ہو جاتا ہے، اس مثنوی میں بادشاہ کی مدح نہیں ہے۔
اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس کو شاہی تقرب حاصل نہیں ہوا تھا، ۱۰۳۵ھ میں جو مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال مرتب ہوئی ہے، اس میں وہ اس امر کی آرزو کرتا ہے کہ اگر اس کا کلام بادشاہ کو پسند آجائے تو اس کی مصیبت زدہ حالت بدل جائے گی، اس وقت وہ دربار کا ملازم ضرور تھا، لیکن جیسا کہ اس کا بیان ہے وہ معمولی ملازم تھا۔

مثنوی چندا لورک میں اپنے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ہے، اور نہ بادشاہ کی مدح ہے، معلوم ہوتا ہے یہ غواصی کی پہلی تصنیف ہو گی، اس کو بھی اس نے فارسی قصہ سے دکھنی میں منظوم کیا ہے، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے آغاز (حمد و نعت)

کہوں حمد میں پاک رحمان کا ‏ ‏ ‏ کہ او حمد زیور ہے ایمان کا

ثنا حمد اوس کوں سزاوار ہے — کہ دو جگ کون پیدا کرنہار ہے
او خالق ہے سب خلق کا خاص و عام — او مالک ہے سب ملک کا جیوں تمام

.. ..

دیگر حق کی توحید بعد از کلام — محمد پو بھیج درود و سلام
الہی رکھے تون بندیاں کی شرم — نبی کوں دیا ہیچ کیتا کرم
محمدؐ نبی سرورِ اولیاء — نبیاں مرسلاں پر شفاعت کیا

منقبتِ اصحابؓ اور مدح حضرت جیلانیؒ

محمدؐ کے بعد از صفا چار یار — نبی روح یعنی عناصر ہیں چار
ایمان ہے ابوبکرؓ ایمان کا — خلیفہ نبی بعد، اسلام کا
عمرؓ کی عدل کا رہا ہے نشان — خجل جن آن گے عدل نوشیرواں
منور مکمل ہے عثمانؓ ذات — حیا کے اتے گوہراں جس کے ہات
سو شیراں میں ہیں شیر حضرت علیؓ — اونو کی شجاعت کی ہے کھلبلی

.. ..

محی الدین معشوق جس کا ہے ناؤں — ولی جس قدم کا، لیتے کر کے چھاؤں
کہ بارا ایماما ترے راج ہیں — اونو سب ای سر تا سر تاج ہیں
پہار پیر (اماماں؟) چودا سکنے ہیں سو دیک — دو ہی خانوادے سو ہیں دل ہیں یک

اصل مثنوی فارسی میں تھی، غواصی نے اس کا دکھنی میں ترجمہ کیا۔

رسالہ اتھا فارسی یو اول — کیا نظم دکھنی شین سے بدل

اس مثنوی میں ایک قصہ نظم کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے ایک بادشاہ تھا اس کی ایک بیٹی تھی چندا نام، بہت حسین و جمیل تھی۔ وہ ایک شخص "سورک" نامی پر جو "گوال" (گوالا) تھا عاشق ہوگئی اسے اپنے محل میں بلوا بھیجا

گر وہ نہیں آیا، اس کے بعد دونوں میں نامہ و پیام ہونے لگا، بالآخر شہزادی چندا لورک کے ساتھ کسی دوسرے شہر کو چلی گئی، شہزادی کے باپ کو اس کی خبر ہوئی اور اس نے تلاش کے لئے ایک پیرزن کو مقرر کیا، اس کی ایک مینا تھی، "مینا ستونتی" کی طرح اس میں بھی مینا اپنی گفتگو سے یہ واضح کرتی ہے کہ اولاد کے سلسلہ میں والدین کے چار فرض ہیں:-

(۱) شریف اور نیک عورت کا دودھ پلانا۔ (۲) نیک صحبت میں رکھنا، (۳) اچھی باتوں کی تعلیم دینا (۴) ادب سکھانا، اگر ان پر خیال نہ رکھا جائے تو اولاد بگڑ جاتی ہے، مینا کی زبانی عورتوں کے مکر کی کہانیاں بھی بیان کی گئی ہیں، اس کا پیرزن کو چندا اور لورک کو پتہ چل جاتا ہے، بادشاہ ان کا قصور معاف کر دیتا ہے اور ان کی واپسی پر تخت و تاج ان کے حوالہ کر دیتا ہے اس کا "چندا اور لورک" سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مثنوی میں ان ہی دونوں کا ہیرو اور ہیروان کی حیثیت سے ذکر ہے یہاں کچھ نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے

کہ چندا و لورک نے مل کر تمام   دستونت کے جا کر پکڑے قدام

بزبان پو قصہ سب کہے کھول کر   کہ لورک و چندا سنے سر بسر

نفس قصہ کا کچھ انتخاب ملاحظہ ہو

یہ تھی ایک حکایت عجب خوب تر   رسالہ میرا خوب شہد و شکر
کہ یک شہر کا ایک اتھا بادشاہ   جہانگیر عالم میں تھا شہنشاہ
بڑا مہربان عدل در شہریار   نیکو نام در اس کا سوبالا کنور
وزیران کتے خوب حسن کمال   ملکان ہزاران سوں تھے محل محال
او سین کے ولایت بھوت شہر تھے   سبھیں خلق و اعیان کی دنیادار تھے
اتھی اوس کی بیٹی بھی صاحب جمال   اتھا نام اس کا سو چندا اکمال
تھا اوس بادشاہی میں گوال ایک   اسم اوس کا لورک اتھا نام نیک
گورو، اتک یک دن او آتا رہتا   شہر کی گلی میں سوں جاتا رہتا

شہنشا کی بیٹی جھجکے اوپر　　کھڑی تھی سو دیکھی اوسے سر بہ سر
کہی من میں کیا خوب سندر ہے جان　　گورو ہانکتا کیا ہوا پیغمان
کھڑی ہو، اشارت سوکٹی نیک ذات　　کیتی ہوں تجے سرفرازی کی بات

سینی بات دوتی کہی اے بھنی　　نچل روپ کی تو اسے پدمنی
توں نادان بالی میرے بات کی　　کیا معنا بیٹی شوق ہو بات کی
ٹھکی ہو کہ یوں دل کوں لگتا عجب　　بنی دھیٹ ہو بات کی کیا سبب
تری عمر پندرہ برس دین کی　　کہاں کی تجے دین کم سین کی
جوانی تیری ایک کر باری بار　　تڑپ تا مرا جیو نت بے قرار
جوانی سدا جھاڑ کا بہار ہے　　مدن مد بھریا سانپ کا زہار ہے
نہیں تو غرض کیا تجے بولنا　　ستم گھور پر گوہران رولنا
سوا سیتی نہ کوال تجہ لال کون　　و تقنبورا، اکہان تج سروران کون (؟)
سنا روپ تیرا بُرا ٹانک لک　　ہوا ہے او افسوس کے لاک لک
چھپا جا کو دھنکر میں تیرا اجال　　کہ جوں چاند پر چھپا اجلا ابھال
کیتی بھیلس میلا اپکا زبان　　جو چھٹیں کیا چاند کوں چھٹو ل کیران
سہاوے نہ گوال تجہ لال کون　　کہ تاریاں منی دبک اوتار توں

سنیں ہوں کہے (کہ) ایک شہر کا شہر یار　　میلایا او درویش کی ایک نار
ہمیشہ منگی بھیک او در بدر　　چڑایا اوسے پادشاہی صدر
ولے بھیک کی اوسکوں عادت اچھی　　لے کر آئی ٹکڑیاں یو ٹکڑے اچھی

.. ..

ادیاران سو شیطان کا مال ہے — شرم کون پورا جیو کوں کال ہے
بندیا بہشت شداد دنیاں میں — بیحد مال خرچا چلیا دیکھنے میں (؟)
ٹیا پاؤں دلہز میں وہ نابکار — لیا جیؤ اوس کا سو پروردیگار
اوقارون اوس واسطے غرق ہے — جو ہا مال کوں غیب کا چرخ ہے

سنیں ہوں سپاہی اتھا ایک نگر — اتھیں عورتاں دو اوسی سر بہ سر
رہتی تھی بڑی نار مہاڑی منیں — تلے تھی ننھیں پیار سوں رکتی منیں
اور یک دن سپاہی شہر نے گیا — اوجالا ڈوبیا ہور اندھارا ابھیا
ادی رات چوری کی جوں وقت پر — بیٹھا چور ایک اس سپاہی کے گھر
سٹریاں پر دھریا پاؤں چڑھتے بدل — بیجان پائی ریاں سب واں ہوں مل
سنیں تھی جو اونار مہاری سندر — اوٹھی ہڑ بڑائی سنچل دیک کر
کہی مرد جاتا ہے سوکن کے پاس — پکڑ پاؤں جا اوس کی محکم سراس
پڑے گا جو آواز زیور کان میں — پریا سو چلی دور سریلے کنیں میں (؟)

اختتام کے اشعار جس میں شاعر نے اپنا تخلص بھی استعمال کیا ہے :-

سدا فتح نصرت سوں تو راج کر — یو چندا مبارک ہے تجکوں مگر
کہ یو مال ہوا ملک کی آس کر — لے کر گئے ہیں چندا کوں تم سر بھر
مبارک ہے تم کو ملک مال یو — مبارک مجھے پیر کا دلق یو
میرے پیر بخش کر کرو تم کرم — مبارک اچھو تم کون لاکھاں حرم
کہاں سیکی تون کرے گی ، سوکر — دلی منجہ پو رکھنا کرم کی نظر

.. ..

قدم پیر کے لگ کو داصل ہوئی | اوسٹ ونت تاریاں میں فاضل ہوئی
دنیاں میں اچھو اوس کی یا ایمان | کہ جنت میں پاوے گی عالی مکان
کیا نظم قصے کا نایاب کھول | جیسے خوب لگتا تو لیتا ہے مول
غواصی پو کرنا کرم کی نظر | دعا حق سوں منگتا میرے حق اوپر
بڑے فہم داراں میں ہوں کم فہام | کیا ہوں یو نادانگی سوں تمام
کرم کی نظر رکھ کم و بیش سوں | کرو پرورش اوس دل و جان سوں
بنانے کا مجھ میں نہ تھا کچ دماغ | دعا بزرگاں کی کیا تازا باغ
شتابی سوں لکھے کوں اور ہوس | پڑن ہار کوں پھڑکو آوے اوس

ہزاروں درود و ہزاراں سلام
بحق محمد علیہ السلام

صرف کتب خانہ آصفیہ میں اس مثنوی کے ۲ نسخے موجود ہیں، ورنہ کسی ملک کے کسی کتب خانہ میں اس اس مثنوی کا کوئی نسخہ نہیں ہے، اس لئے یہ مثنوی نایاب ہے، غواصی اور اس کی تصانیف پر اب تک جن جن اصحاب نے روشنی ڈالی ہے اونھوں نے اس مثنوی کا تذکرہ نہیں کیا ہے آج میں پہلی مرتبہ اس مثنوی کو پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کے نمبر یہ ہیں

(۱) نمبر مثنوی (۵۲۴) (۲) نمبر داخلہ ۲۸۵۲۷ / ۱۴۱

(۲) دیوان غواصی[1] اردو مخطوطات میں دوسرا نایاب مخطوط دیوان غواصی کا ہے، یہ ایک ضخیم دیوان یا کلیات ہے، اس میں قصیدے، غزلیں، مثنویاں رباعیاں وغیرہ سب کچھ ہیں متعدد غزلیں سلطان محمد قلی کی غزلوں پر لکھی گئی ہیں بعض غزلیں خواجہ حافظ کی غزلوں کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں، بعض مسلسل غزلیں بھی ہیں، دکن کے قدیم شعرا میں جو ۱۰۰۰ھ کے قبل گذرے ہیں سوا سلطان قلی کے کسی اور کا دیوان اس قدر ضخیم نہیں ہے، غزل گوئی میں وہ اپنے دوسرے ہمعصر

---

[1] نمبر دواوین ۱۰۳

شعرا وجہی، نصرتی وغیرہ سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ کتب خانہ آصفیہ کا یہ نسخہ بھی ناقص اور نامکمل ہے ابتدا کے چند اوراق اور آخر کے کئی صفحے نہیں ہیں، علاوہ ازیں کئی صفحے کرم خوردہ ہونے سے چورا ہو گئے ہیں۔

غواصی کا یہ دیوان یا کلیات (۴۷۵) صفحے پر مشتمل ہے فی صفحہ (۱۳) سطریں ہیں، اس دیوان میں چودہ قصیدے ہیں جو حمد و نعت، منقبت اور بادشاہ کی مدح پر مشتمل ہیں۔ قصیدے طویل نہیں ہیں سب سے بڑا قصیدہ (۳۴) شعر کا ہے۔ قصیدے میں وہی امور پائے جاتے ہیں جو زمانہ مابعد کے اردو قصیدوں کی جان ہیں۔ یہ دیوان اوّل و آخر سے ناقص ہے، ابتدائی اشعار یہ ہیں:۔

...عطر سوں پرورده کریو تازے پھول — ازل کے دیس عنایت کیا ہے منج ستار

.........کدھیں نہ باسی ہوئے — کہ جو تلک ہے جہاں تو تلک ہے مہکنہار

.........رنگ بہری ہیں دلے — خزاں ہے ہر برس دے یار اتو کوں نئیں ہے قرار

نعت کے قصیدہ کا جو پہلا شعر موجود ہے وہ یہ ہے

یہی حبیب خدا کا رسول ہے برحق — یہی طبیب نبی ہے شفیع روز شمار

حضرت علیؓ کی منقبت کے قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو

جو خالق افلاک ہے کرتار علےٰ کا — آکار کیا جگ میں اظہار علی کا

سلطان عبداللہ کی مدح میں کئی قصیدے ہیں ایک قصیدہ تو بہت سنگلاخ زمین میں ہے یہاں دو قصیدوں کے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

ہر صباح باد صبا کا ہات میں جاروب لے — جھاڑ مالی ہو سدا جھاڑیں ترا دربار گل

شادتیری یاد سوں جیکوئی اس دنیا میں آج — ہے گھر اس کا گل انگن گل ہور در و دیوار گل

خسرواں میں آج کے تون ہے پنم کا چاند گر — تج پہ تازیاں کی اچھالیں گنبد دوار گل

دیکھ کر اقبال ترے رستم دستان کے — تج دندیاں پر آج باندی ہیں کمر تروار گل

شکر خدا جو ذوق پہ ہے ورق ٹھار بہار آج — یعنی ہوا ہے ہر طرف ہور ابر گوہر بار آج

نادر بہارستان کا زرگر ہزاروں صنع سوں — کیتا جڑت گلزار کی جہاراں کو خوش منگار آج

کسوت ہیری کر وہر تری شبنم کی موتیاں میں ہو غرق — دیتی ہے جلوا ہر گھڑی جیوں گنبد دوار آج

صحرا ہور دریا نور کا موجاں پہ موجاں مار کر — بخشے چندر ہور سور کوں سکہ ہو رصفار آپار آج

عالم معطر ہوے کر کیوں رات دن مہکائے نا — کھولیا یوں ہر پھول تے صد ناؤ تا تار آج

عارف ہو تج اخلاص کا دل کی زمیں میں پرلی — جو جہاڑ تج مقصود کا دو جگ میں بادی بار آج

گلزار تیری عشق کا کملائے کی نا ہو کدھی — انکھیاں تے اپنی جیوں بدل برسا اکھو کی دھار آج

.. ..

بار الاماں کا محب بچلا اگر تو ہوئے تو — ثابت رکھ اپنی صدق ہور ایمان ٹھار ٹھار آج

سلطان عبداللہ جو شیر خدا کا شیر ہے — مشہور اس کی داب کا دو جگ ......

غواصی نے ہر ردیف میں غزل لکھی ہے، ان کی تعداد بڑی ہے اس کی غزلوں میں وہ سب کچھ ہے جو زمانہ مابعد میں غزل کے امتیازی نشان ہیں، تغزل بھی ہے، اور تصوف بھی، شاہد و ساقی بھی ہے، گل اور گلزار بھی، شراب بھی ہے کباب بھی، رقیب بھی ہے اور قاصد بھی، معشوق سے راز بھی ہے اور نیاز بھی، اس کے حسن کی تعریف بھی ہے اور گلہ بھی سراپا بھی ہے اور کردار بھی، غزلوں کا کچھ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

سجن کے عشق تے اے جیو بس نہیں کرتا — دیوانگی کوں اپنے سر اپس نہیں کرتا

جہاں جو عشق بساتا ہے شہر ہور بازار — ڈروں تے کشت وہاں کوئی عسس نہیں کرتا

فراق سوں دل اٹھا شور کر اگر نہیں تو — فغاں ہلائے بغیر کوئی جرس نہیں کرتا

پلا مدمست اے ساقی منج عادت ہے پینے کا ہو سرخوش دو ریک دے ہر شے کر دنگا رنگ سینے کا
مرا جیو ہووے اس جیو کی جیوں کوں بسروں کیوں کدیں بسرون تو مر جاؤوں پنا دوں ذوق جینے کا

عشق کی آگ میں جل کر راک ہونا عشق بازی میں چاک چاک ہونا
خاک ہونا تو سچ ہے آخر کو خاک نا ہوے لگ نپج خاک ہونا
اس سجن کی وصال کی خاطر آرزو دل میں لاک لاک ہونا
ہے غواصی یو عاشقانہ غزل یو غزل ستی درد ناک ہونا

گفتم کہ اے پری توں ہے فتنۂ زمانا گفتا کہ راست گفتی اے گن بھری سجانا
گفتم کہ در جہاں یا لیلی ہو آئی ہے توں گفتا کہ من چوں مجنوں پائی توں تج دیوانا
گفتم کہ خال و زلفت کیا ہے سو یوں منجکوں گفتا کہ زلف دام است ہور خال ہے سو دانا

قادر جو اپنی بے بدل قدرت دکھانے کے بدل پیدا کیا ہر شی کوں عالم بسانے کے بدل
کیا آدمی کیا فرشتا کیا دیو کیا جن، کیا پری ظاہر کیا سب کوں بندے اپنے کہانے کے بدل
نیکی بدی سچ جھوٹ ہور صلح ہور جھگڑا ہور قہر سرجیا دنیا ہور دین کا دھند اچلانے کے بدل

شراب نقل پیالا یو سب تو حاضر ہے چتر سجاں مراد و شراب خوار کہاں
سکیاں تو منجکو کہتیاں ہیں قرار پکڑ و کر ولے پیا کوں دکھی نین منجے قرار کہاں

جو میں بلبل ہو تیرے عشق کا گلزار پکڑیا ہوں ہوا خواہاں میں تیری خوش ہوا کا شعار پکڑیا ہوں
معطر اس دل کی روح کیوں نا ہوویں کہ منج بھیتر کہ تیری باس کا لے گل عجب مہکار پکڑیا ہوں

تج آنگے سرا جاسکتا نہیں ہوں آج اس خاطر — کہ کروں پہ تری اپکار کالی بہار پکڑا یا ہوں
جہاں میں جنت الماوٰی کی راحت تجے زیادہ تر — تری دیوار کے سائیں کوں اے دلدار پکڑیا ہوں

دین داری کا شرف اے یار اگر منگتا ہے تو — مصطفی کی پیروی کرتوں کہ ہوگا کامیاب
مرتضیٰ کا مار دم واثم اس کی آل کا — جو دنیا ہور دین کا ہووے تجے روزی صواب
گر توں عارف ہے تو اس درویش کی جیتی منی — فکر کر ایسا چ جو نا سینگ جلے تا کباب

آخر الذکر تین شعر دیوان کے خاتمہ کے ہیں، اسی پر دیوان ختم ہوتا ہے، جیسا کہ لکھا گیا ہے یہ ناقص اوّل ناقص آخر ہے۔ بایں ہمہ ایک یہی نسخہ ہے اس لئے نایاب ہے۔

(۳) دیوان سلطان | نمبر (۳۰۷۴) دیوان، صفحہ (۲۰۸) سطر بر متن ۱۷، ۱۲۱ حاشیہ ۲۰ شعر، سلطان، قطب شاہی دور کا شاعر تھا، اس کے حالات کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح اس کی کوئی مثنوی دستیاب نہیں ہوئی ہے تاریخوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد کا (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) تخلص ظل آلہ تھا مگر کبھی کبھی اپنے لئے سلطان بھی تخلص استعمال کرتا ہے، اس لئے ممکن ہے یہ سلطان ہی کا دیوان ہو لیکن تیقّن کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتّہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دیوان ایسے شاعر کا ہے جو قطب شاہی دور سے تعلق رکھتا ہے، ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ یہ ایک صوفی شاعر تھا اور میران شاہ معروف سے اس کو بیعت اور خلافت حاصل تھی۔

دیوان میں صرف غزلیں ہیں اور ردیف دار ہیں، الف سے لے کر ی تک ہر ایک حرف کی ردیف موجود ہے،

سلطان کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے آغاز یہ ہے

اوس پاک عشق باز کوں جب نہ اثر ہوا — تب نور ذات جوش ہوا زنگنج بر ہوا
تس نور ذات تمام رکھیں احمد صفات — سو وصف کی زبان ستے لگا اجہر ہوا
تب احمدی صفات سوں مشغول ہو رہیں — اوس مشغولی سبب بنی آدم بسر ہوا

تج حسن کا جدہاں تے نین میں مہر ہوا　　　مرار سے دل سوتج تدہاں تیج اگسر ہوا
ہور تج نظر کی تیر کئے چھید سینہ سب　　　شکرانہ ہزار سو گہر کون جنجر ہوا
چاہ زنخ میں پڑکہ جیا غوطہ کیا اچھا　　　بارے نکل کہ اوستے بزلف ادھر ہوا
اے تن سو تج تمن کوں سدا تنگتکی میں تھا　　　بے سد کیا سو پر نبی بہتر جیسر ہوا
دل اے تن نگر میں ہو سلطان عقل تھا　　　اب تج اے دل ربا او مبارک نگر ہوا

تس بدن کی فرش میں تیرے تیئں مہمان کر　　　نعمت دیدار رکھیا تج گھونگٹ کا کر شاط

ذوق سینے شوق دہر توں کریا ساں بے حساب　　　کئی ہزار راں ناتوں پایا یکی خصلت بدیع

ایمان لینا جانا نرپہ جوتے ہیں نت قرباں ہم　　　بریاں کر دل کو کئے محبوب کون مہمان ہم
خم خانہ شکرانہ کرمی جہان خوش بیان ہیں　　　ہور ساقی دوراں ہو کر کہتے ہیں مے کا دان ہم

پیا کے ہجر سوں میری نین یکتل نسوئی ہیں　　　مناؤں میں جتا تو بھی نپٹ غم گین ہوتی ہیں

تج حسن کا یو جب تے دیکھا ہوں باغ تازہ　　　تب تے تن میں میری بسیا فراق تازہ

تج نین کی پتلی مجھے مطلق کو لیا ران دیسے　　　عشاق کی یٹ پار ہو فضا کی اغیار ان دیسے

خوش وقت ہے می نوش نکر مغز کون بر ہم　　　در میکدہ ہوست کی دنیا ہے جائے

دیوان کے خاتمہ میں ایک غزل بطور قصیدہ درج ہے۔ یعنی دیوان کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے۔

مخمس ات گنج سلطان بار ہیں آپ محیط	یک ہو جگ ہیں آپ کو آیا یا محمد سیدی
اے او سلطان نے ادیر قادی وجودی محمدی	گنج گوہر کرنے ظاہر اسم پکڑیا جوہری

دیوان کے خاتمہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"تمت تمام شد کتاب دیوان شاہ سلطان ثانی، از اصل کتاب مرشد مالک ہادی آگاہ عنایات افزائے بر خاک پایان قبلہ دو جہان حضرت شیخ شاہ محمد مشہور قادری اولاد حضرت شیخ فرید شکر گنج رحمتہ اللہ بموجب حکم جہاں مطاع بھائی صاحب قبلہ روے منکر رائے صاحب بخط ایغام مکتوبن فقیر وحقیر خاکپائے غلامان غلام حضرت پیر دستگیر محبوب ربانی بندہ شام لعل ولد رائے انس رام در بلدہ حیدر آباد روز پنجشنبہ بتاریخ بست دنہم شعبان ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء بوقت دو گھڑی روز ماندہ تمام شد"

اس عبارت سے اس امر کی بھی صراحت ہوتی ہے، کہ آج سے ایک صدی پیشتر دکن کے ہندو کس طرح تصوف کا مذاق رکھتے تھے اور حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی سے کس درجہ عقیدت تھی، اور اردو کلام سے کتنا شغف تھا۔

دیوان سلطان کا ایک اور نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے، یورپ میں اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے، اور نہ کسی دوسرے کتب خانہ میں اس دیوان کا پتہ چلا ہے۔ یہ دیوان شائع نہیں ہوا ہے، سلطان کے کلام پر تفصیلی وضاحت اور ریسرچ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) دیوان حسینی: یہ ایک نامکمل مختصر دیوان ہے (نمبر دواوین ۱۶۸۷) مصنف کا نام شاہ حسین تھا وہ امین الدین اعلی بیجاپوری کا مرید تھا، تصوف ان کا مسلک تھا، شاعری میں بھی تصوف کا رنگ ہے۔ دیوان میں صرف غزلیں ہیں۔ ۱۱۰۰ھ کے پہلے یہ دیوان مرتب ہوا ہے، اس کے مخطوطے بھی نایاب ہیں۔

دیوان میں ردیف وار غزلیں ہیں، ان کی تعداد (۲۸) ہے، یہ ردیف الف، ب، ج، د، ر، س، م، ن اور "ی" پر مشتمل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے صرف "ہ" اور "ی" کی ردیف کی غزلیں اس میں نہیں دیں، حسینی کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ہوا تھا شوق مجکوں طبع تیری آزمانے کا　　نہیں ثانی ترا جگ منے توں قادر ہے زمانے کا
جہاں کے عاقل و دانا ہیں عاجز تجہ فراست سوں　　کسے طاقت صنم تحسیں میں تیرے بار پانے کا
تیرے ناز و ادا کے وضع بانکے دیکھ کوں ظاہر　　ہوا ہے عشق عالم کون بجھے یک دم بجھانے کا
نہ بوجیا تھا نئے یو طرح شوخی کے سجن ہرگز　　کہاں سیکھے ہو بارے تم یو بیخود مے پلانے کا
جسے مجکوں بندہ صادق علی نے فضل سوں اپنے　　حسینی کون دیا ہے علم مخفی کے خزانے کا

سجن سا دل ربا نہیں ہے جہان میں　　نیاب ہے عصر میں دلدار غم خوار
تبسم سوں کریا اعجاز عیسیٰ　　کیا بے جان کوں زندہ پل میں یک بار
الے اے خوبرو خوبی سوں اپنی　　حسینی کوں دکھا مکھڑا نون یک بار
حسینی حشر کا کچھ خوف مت کر
امین الدین ہے تیرا مددگار

تمھارے دید کا لذت ہمارے آنسووں پوچھو　　ہور اپنے حسن کی خوبی بچشم ناز سوں پوچھو
ادہر پردا ادھر بیٹھے بدل چوسے جو تم موہن　　دھڑی مسی کی کیوں نکمٹی لب ممتاز سوں پوچھو
سینے سے کھینچ کوں سینہ لگائے شوق سوں پیارے　　او راحت ہور خوشی جی کی کچھ اس جانباز سوں پوچھو
مزہ کچھ جو کہ لینا تھا یو سب تجہ سے چکے دلبر　　یہی باقی کیا رہیا سوں وہ دل ہمراز سوں پوچھو
حسینی منتظر بیٹھا ہے کب سوں چاند سوں مکھ کا
اگر ہو دل منے پیارے تو پھر کیوں راز سوں پوچھو

---

(۵) گلدستہ: یہ بھی بیجاپور کے شاعر صنعتی کی مثنوی ہے، اس کا صرف ایک نسخہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے پاس ہے، یہ دوسرا نسخہ ہے جس کا پتہ چلا ہے صنعتی کے حالات اور مثنوی گلدستہ کی صراحت ندوی صاحب

تفصیل کے ساتھ رسالہ سب رس میں لکھ چکے ہیں، اس لئے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہے، کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ کے آغاز اور اختتام کے شعر پیش ہیں، ۱۰۵۵ھ میں یہ مثنوی تصنیف ہوئی ہے۔ آغاز

کہوں حمد اول میں رازق جہاں | کہ خالق ہے کل شی کا او بے گماں
کہتا ہوں اول حمد میں اس قادر سبحان کا | جن دو حرف میں سرجہاں بسیار کل میدان کا
گلدستہ خاص و عام کر قصے کا اس خوش نام رکھ | تحفہ اپے اپر آپ تو نہا جگ میں دھریا عرفان کا

تخلص کے چند شعر

اپنا صنعتی کون ہے طاقت کہاں | تیرا وصف کہنے فصاحت کہاں

اپنا صنعتی کرتوں حصہ شروع | ویسے پیر کی بل سوں ہو کر رجوع

اختتام

کیا سعدیت کا یو قصہ تمام | بحق محمد علیہ السلام
ختم کر قلم رک یہاں سوں تمام | علیہ الصلواۃ وعلیہ السلام

یہ نسخہ ۱۱۴۲ھ میں لکھا گیا ہے (نمبر مثنوی ۵۰۳)

(۲) مثنوی بہرام و گل اندام | (نمبر مثنوی شامات ۲۰۲)

یہ قطب شاہی دور کے شاعر طبعی کی مثنوی ہے جو ۱۰۸۱ھ میں لکھی گئی ہے طبعی سلطان عبد اللہ قطب شاہ اور ابو الحسن تانا شاہ کے زمانہ میں موجود تھا، تانا شاہ کے دربار میں اس کی رسائی تھی، اس دور کے مشہور صوفی بزرگ شاہ راجو حسینی کا مرید تھا، طبعی کی یہ مثنوی اس کے قادر الکلامی کی شاہد ہے، اردو شہ پارے، اور یورپ میں دکھنی مخطوطات میں اس مثنوی کا تذکرہ کر دیا گیا ہے، یورپ میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا یہاں

اب تک کسی نسخہ کا پتہ نہیں چلا تھا اب ایک نسخہ کا پتہ چلا ہے جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے،
مثنوی کے آغاز اور اختتام کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

آغاز

الٰہی تھمیں ہور کرتار توں ۔۔۔ نرنجن تھمیں ہور نرنکہار توں
تہیں آسماں ہور تہیں دہرتری ۔۔۔ تہیں قطب زہرہ تہیں مشتری
تہیں چاند تارے تہیں نور ہے ۔۔۔ تہیں رات دن ہور تہیں سور ہے

تخلص کے چند شعر

الٰہی یو طبعی تیرا داس ہے ۔۔۔ دے ایمان اسکوں ترا آس ہے

کہ تیری شفاعت کے دہرتا امید ۔۔۔ قیامت میں طبعی کوں رکھ روشن فید(؟)

تیری مدح میں کچھ نہ دہرتا ہے کام ۔۔۔ یو طبعی ہے بن دام تیرا غلام

خاتمہ

کیا ہوں میں چالیس دن میں کتاب ۔۔۔ ہوت فکر کر رات دن بے حساب
کیا میں یو بیتاں نوا کر جو سیس ۔۔۔ ہزار اور ہے تین سو پر بتیس
اتھ سال تاریخ کا خوب نیک ۔۔۔ سنے یک ہزار اور ہشتاد و یک
یو نامہ پڑیں گے تو بہر خدا ۔۔۔ پڑو فاتحہ نام لے کر میرا
یو نامے کوں طبعی کیا ہے تمام
بحق محمد علیہ السلام

(۷) معراج نامہ | (مجاہد ۱۷۳)

دکن کے شعرا نے معراج رسول کریم صلعم کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، ان کی اکثر عشقیہ مثنویوں میں معراج کے متعلق ضرور ایک عنوان ہوتا تھا، اس کے علاوہ انھوں نے مستقل مثنویاں بھی معراج ناموں کے نام سے لکھی ہیں، زیر بحث معراج نامہ گولکنڈہ کے ایک شاعر "بلاقی" کا لکھا ہوا ہے۔

بلاقی کے متعلق دکن کے بعض دیگر شعرا کی طرح تفصیلی معلومات کی اطلاع نہیں ہے، انہیں یہ معلوم ہے کہ اس کا نام سید بلاقی اور تخلص بلاقی تھا، بادشاہ کے دربار میں اسے بار حاصل نہیں تھا، تصوف سے لگاؤ تھا، کوئی عشقیہ مثنوی نہیں لکھی بلکہ معراج نامہ کو اپنا کارنامہ بنایا لیکن یہ معراج نامہ بھی ایک داستان بن گیا ہے کیونکہ اس میں معراج کے واقعہ کے سلسلہ میں ایک دلچسپ افسانہ قلمبند کر دیا ہے اس کا بیان ہے کہ معراج کے واقعہ کو سن کر ایک یہودی نے انکار کیا خدا نے اس کو معراج کی حقیقت سمجھانا چاہی چنانچہ جب اس یہودی نے دریا پر جاکر نہاتے وقت غوطہ لگایا تو اپنے آپ کو ایک حسین و جمیل خوبصورت عورت کی شکل میں پایا، ایک مزدور زبردستی اس کو پکڑ کر اپنے گھر لے گیا اور وہ کئی سال تک ایک عورت کی شکل میں اس مرد کے پاس رہا اور اس کے بطن سے سات لڑکے پیدا ہوئے، اس کے بعد ایک مرتبہ پھر دریا میں غسل کرتے وقت غوطہ لگایا اور جب باہر آیا تو بدستور اپنے کو مرد کی شکل میں پایا اور گھر آیا گھر پہونچا تو دیکھتا کیا ہے کہ اس کی بیوی جو مچھلی دھونے بیٹھی تھی اسی طرح بیٹھی ہے اور کسی قدر دیر ہو جانے سے اس کے انتظار میں پریشان ہے، اس نے لوگوں سے اپنے واقعات بیان کئے سب لوگوں نے اس کو بیوقوف بنایا۔ آخر کار وہ خاموش ہو گیا اور رسول مقبول صلعم کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا ہے۔ اس معراج نامہ کا ذکر اسپرنگر نے بھی کیا ہے، جامعہ عثمانیہ اور ادارہ ادبیات میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود ہے، نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں بھی یہ موجود تھا اسی طرح حیدرآباد میں دو تین نسخے پائے جاتے ہیں، یورپ میں بھی اس کا ایک نسخہ تھا نمونہ کلام حسب ذیل ہے

اول نام اللہ سو بولوں احد　　ثنا ہور صفت میں کروں بے عدد
ثنا ہور صفت اس سزاوار ہے　　کہ تہار قدرت کا کرتار ہے
کیا چاند سورج ستارے فلک　　زمیں آسماں جن و حور و ملک

اس کے دوسرے نسخوں میں اشعار میں کچھ ردوبدل ہے چنانچہ جامعہ عثمانیہ کے نسخہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

اول نام اللہ سو بولوں احد ثنا و صفت اس کی ہے بے عدد
ثنا اس اوپر نت سزاوار ہے کرنہار قدرت میں کرتار ہے

ادارۂ ادبیات اردو کے نسخہ کا آغاز جن اشعار سے ہوا ہے وہ ابتدائی نہیں ہیں بلکہ وہ ناقص الاول ہے خاتمہ کے اشعار میں بھی فرق ہے چنانچہ کتب خانہ آصفیہ کے زیربحث نسخہ کا اختتام اشعار ذیل پر ہوا ہے۔

نہ ظالم کریں اس اپر کچھ ستم زبرکت محمد نبی الختم
جو سید بلاقی نبی کا غلام قصہ یو کہیا ہے لطف سوں تمام

جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں آخری شعر یہ ہے

جو سید بلاقی نبی کا غلام قصہ یو کیاں میں لطف سوں تمام

ادارہ ادبیات کے نسخہ میں آخری شعر یہ ہے

جو سید بلاقی نبی کا غلام قصہ یو کہیا تجہ لطف سوں تمام

پیرس میں جو نسخہ ہم نے اس۔ معراج نامہ کا دیکھا تھا اس کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوا ہے

اول نام اللہ جو بولوں ابد ثنا اور صفت اس کی کرو بے عدد
ثنا اوس اوپر نت سزاوار ہے کرنہار قدرت میں کرتار ہے
کیا چاند سورج ستارے فلک زمیں آسماں حور جن و ملک

بلاقی نے اس معراج نامہ کو کسی فارسی معراج نامہ سے دکھنی میں ترجمہ کیا ہے چنانچہ اس کی صراحت بھی کردی ہے۔

(۸) اسرار عشق | سوانح عمری ۲۵۰)

یہ مثنوی میاں عبدالمومن مومن کی تصنیف ہے جو سنہ ۱۰۹۲ھ میں قلمبند ہوئی ہے، اس میں سید محمد جونپوری بانی مذہب مہدوی کے حالات، مناقب اور کرامات درج ہیں یہ ضخیم مثنوی ہے۔ آغاز اور خاتمہ کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

کہا احمد اس معشوق کا آج کہا جی عاشقاں کی یہ انول کاج
سنو.... چھپ یک تازہ ترشان نظربازی کی دلیل آیا ہر نظر آن

خاتمہ

تاریخ ختمش خرد مژدہ داد کہ گنجینۂ پاک اسرار عشق (باد؟)

---

(۹) معراج نامہ | نمبر (سیر ۴۴۰)

یہ معراج نامہ ایک دوسرے دکھنی شاعر مختار کا ہے، اس کا بیجاپور سے تعلق تھا بلاقی کی طرح اس کا بھی شاہی دربار سے تعلق نہیں تھا، سنہ ۱۰۹۴ھ میں اس نے اس معراج نامہ کو قلم بند کیا ہے۔ آغا حیدر حسن کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔
کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ کا آغاز اور اختتام جن اشعار سے ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں

کہوں حمد اول اوس راج کا نبی کوں دیا تاج معراج کا
خلایق پہ ساری کیا ہے ظہور ولے سب تے اول نبی کا ظہور
احد ہے ولے او عدد کا نہیں عدد کا احد اوس کے حد کا نہیں

اختتام کے اشعار

یو معراج نامہ ہوا ہے تمام سلام علی روح خیر الانام
سنہ تھا یو ہجرت کا اس دن قرار تھے گزرے نود چار پر ایک ہزار

مختار نے اپنے معراج نامہ میں جنت دوزخ کی سیر، آسمانوں کی سیر وغیرہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے سید بلاقی

اور مختار کے معراج ناموں میں بہت کچھ اختلاف ہے، ہاشمی کا معراج نامہ تقریباً (۸۵۰) شعر پر مشتمل ہے اور مختار کے معراج نامے میں (۷۵۰) سے زیادہ اشعار ہیں، ان دونوں کی تصنیف میں بارہ سال کا فرق ہے یعنی مختار نے ہاشمی کے معراج نامہ کے بارہ سال بعد اپنا معراج نامہ لکھا ہے۔

(۱۰) نجات نامہ | (نمبر فقہ حنفی ۲۹۲)

یہ مثنوی محمد امین ایاغی کی تصنیف ہے، ایاغی بیجاپور کا شاعر ہے جو علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ (۱۰۶۷ھ، ۱۰۸۳ھ) میں موجود تھا، ایاغی کی یہ مثنوی ۱۰۶۷ھ اور ۱۰۸۳ھ کے درمیان لکھی گئی ہے، مثنوی میں پہلے حمد اور نعت ہے اس کے بعد روز قیامت کی حقیقت، حکایت ناموس کے بعد اپنے بادشاہ کی تعریف کرتا ہے اس میں وہ بتاتا ہے کہ اس کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی ہے۔ اس کے بعد روز محشر اور دوزخ کا بیان ہے آغاز ان اشعار سے ہوا ہے۔

اول کچھ نہ تھا اور نہ نکھار تھا　　دونوں جگ کا پیدا کرن ہار تھا
توں قدرت نے پیدا کیا ایک رتن　　کہ جس سے لیا روپ یو برہمن

اس مثنوی کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں بھی موجود ہے۔

(۱۱) رسالہ کفایت الاسلام یا شریعت نامہ | (نمبر فقہ حنفی ۲۹۲)

یہ مثنوی بیجاپور کے شاعر شاہ ملک کی تصنیف ہے جو ۱۰۷۷ھ میں لکھی گئی ہے اس مثنوی کا ایک نسخہ جو شریعت نامہ سے موسوم کیا گیا ہے یورپ میں موجود ہے کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں ہے آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوا ہے۔

الٰہی دے توفیق انسان کو　　جو بندگی کریں تیری دل و جاں سوں
تو پیدا کیا محض بندگی کتیں　　سو او چھوڑ کر پکڑے ہیں گندگی کتیں

تاریخ تصنیف کا شعر

سن ایک ہزار و ستر پو سات　　کہا تھا اوسی سال میں یو کتاب
۱۰۷۷ھ

---

(۱۲) رسالہ فقہ ہندوی | (نمبر فقہ حنفی ۸۹)

یہ مثنوی "عیدو" کی لکھی ہوئی ہے جس کے متعلق ڈاکٹر زور کا خیال ہے وہ گجرات کا باشندہ تھا، اس کا نام یا تخلص امین بھی تھا(؟) چنانچہ اس کی صراحت حسب ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

کتنے مسلے دین کے عیدو کہے امین — فقہ ہندوی زبان پر بوجھو کرو یقین

یہ مثنوی جو مسائل فقہ حنفی پر مشتمل ہے ۱۰۷۵ھ میں لکھی گئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور ادارہ ادبیات اردو میں اس کے نسخے موجود ہیں، آغاز اور سنہ تصنیف کا شعر درج ہے۔

حمد ثنا سب رب کون خالق کل جہاں — لائق حمد و ثنا کے اور نکوئی جان
علم شریعت نا کے بھیجا پاک رسول — جو کچھ بھیجا رب نے سب کیا قبول
یارب اپنے کرم سوں بیحد بھیج درود — نبی محمد مصطفیٰ تسوں معہ خشنود

سنہ ہزار چہتر پنج رمضاں تمام — اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا انظام
۱۰۷۵ھ

---

(۱۳) احکام الصلوٰۃ | (فقہ حنفی ۴۲۰)

مولانا عبداللہ کی تصنیف ہے جو فقہ حنفی پر مشتمل ہے، اس کا ذکر ہم نے دکن میں اردو میں کیا ہے یہ ۱۰۳۲ھ کی تصنیف ہے، یہ بڑی نایاب کتاب ہے جو نثر میں لکھی گئی ہے، اس کے پہلے کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں چلا تھا اب کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ ملا ہے۔

آغاز

"اول کلمہ طیب پہلا کلمہ بولتا ہوں میں پاکی کا تبکی پاکی، ایمان کی پاکی، کفر تے، شرک تے،
لا الہ الا اللہ نہیں کوئی معبود برحق الا اللہ مگر اللہ تعالیٰ"

(۱۴) کنز المومنین | نثر (فقہ حنفی ۸۱۸)

یہ عابد شاہ کی تصنیف ہے جو ۱۰۸۰ھ کے قبل تصنیف ہوئی ہے، عابد شاہ گولکنڈہ کا شاعر تھا، شاہ راجو حسینی

سے بیعت تھی، کنز المومنین نثر میں ہے، سب رس اور احکام الصلوٰۃ کے بعد یہ تیسری کتاب جو نثر میں گولکنڈہ میں لکھی گئی ہے یہ فقہ کی کتاب ہے، مصنف نے (۱۵۲) کتابوں سے مدد لے کر اسے لکھا ہے۔ یہ فقہی مسائل متعلق عبادات معاملات اور اصول فقہ پر مشتمل ہے، اصل احادیث کے ساتھ ان کا ترجمہ دکھنی میں کیا گیا ہے۔ آغاز کی عبارت نمونہ کے لئے پیش ہے۔

"الحمد للہ رب العالمین یعنی سراناہو رتعریف کرنا سزاوار ہے اللہ تعالیٰ کوں کہ پیدا کیا ہے تمام خلقت کوں بعدہ اے عزیز اس کتاب کا نام کنز المومنین رکھا ہوں اس کا معنا مومن کا خزانہ ہے۔ ہور اس کتاب بنانے والے کا نام فقیر الحقیر تراب الاقدام عابد شاہ حسینی ہور میرے پیر کا نام حضرت یوسف روحانی عرف شاہ راجو حسنی الحسینی قدس اللہ سرۃ العزیز بعد اے عزیز اس کتاب کو دکھنی ہے کر کر لکھا نکو سمجھ۔"

(۱۵) "قصص الانبیاء" یہ ایک نایاب مثنوی ہے، اس کا مصنف بھی ایک جدید دریافت کردہ شاعر ہے یہ بیجاپور کے عادل شاہی دور کی تصنیف ہے اور اس کا مصنف "قدرتی" ہے "دکنیات پر کام کرنے والے ڈاکٹر زور، حکیم شمس اللہ قادری، مولانا عبدالحق، پروفیسر سروری کسی نے "قدرتی" کے متعلق کوئی معلومات یا اس کے تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، آج ہم پہلی مرتبہ قدرتی کو متعارف کراتے ہیں۔

"قدرتی کا نام ہم کو معلوم نہیں ممکن ہے عبدالقادر، عبدالقدیر یا قدرت اللہ ہو، بیجاپور کے دوسرے اپنے ہمعصر شعرا، رستمی، نصرتی، کی طرح اس نے قدرتی اپنا تخلص قرار دیا تھا، دوسرے شعرا کی طرح اس نے نہ کوئی عشقیہ مثنوی لکھی اور نہ قصیدے بلکہ انبیاء کے حالات میں یہ ضخیم مثنوی قلمبند کی ہے، یہ اگرچہ ناقص الآخر ہے مگر جو اشعار موجود ہیں وہ بھی دس ہزار سے زیادہ ہیں۔ دکھنی مثنویوں میں جن کا آج تک پتہ چلا ہے رستمی کے خاور نامہ کے بعد جس کے چوبیس ہزار شعر ہیں، قدرتی کی مثنوی ہی زیادہ ضخیم ہے۔ اس میں عنوانات کے تحت انبیاء کا تذکرہ ہے۔

عنوانات کی تعداد تیس سے زیادہ ہے، جن میں معلوم شدہ جملہ انبیاء آگئے ہیں چنانچہ اس کے عنوان یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) حمد (۲) عناصر اربعہ (۳) آسمان و ملائک (۴) تحت الثریٰ (۵) فرش ہائے اربعہ (۶) دوزخ کو پیدا کرنا (۷) لگائے (۸) پہاڑوں کی پیدائش (۹) جن اور پریوں کی پیدائش (۱۰) ابلیس کا مقام (۱۱) حضرت آدمؑ کی پیدائش (۱۲) آدمؑ اور حوا کا جنت سے نکالا جانا (۱۳) ہابیل اور قابیل (۱۴) وفات آدم (۱۵) شیث اور ادریس

(۱۶) نوح (۱۷) ھود (۱۸) صالح (۱۹) ابراھیم (۲۰) اسحاق (۲۱) یوسف (۲۲) ایوب (۲۳) موسیٰ اور فرعون (۲۴) یوشع (۲۵) الیاس (۲۶) شعیب (۲۷) اشموئل (۲۸) شداد (۲۹) داؤد (۳۰) سلیمان (۳۱) ذکریا ۔ (۳۲) یحیٰی (۳۳) سکندر (۳۴) لقمان، (۳۵) اصحاب کہف (۳۶) عیسیٰ (۳۷) جرجیس (۳۸) اصحاب فیل (۳۹) سید المرسلین۔

ہر عنوان کو "قصہ" کا لقب دیا گیا ہے، آنحضرت صلعم کے حالات میں حبش کی ہجرت تک کا حال آگیا ہے ۔اس کے بعد کا حال نہیں ہے، ممکن ہے اور کئی ہزار یا کئی سو شعر ہوں کیونکہ یہ ناقص الآخر ہے۔

مثنوی کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوا ہے۔

کہہ الحمد اللہ و پروردگار		کیا جگ اپس نور تے آشکار
سراؤں اول میں جو سبحان کون		جسکوئی جیو دیا ہے سو سلطان کون
خلیفہ ہے اس کا نبی مصطفیٰ		کیا جس کہتی و اللیل سور و الضحیٰ

مصنف کے تخلص کے چند شعر یہ ہیں

سچین قدرتی ذاتی پھرتا ہے توں ؛		یو تو اسی دریا میانے ترتا ہے توں

کھیا قدرتی قصہ دکھنی تمام		ابراھیم نبی پو درود و سلام

کھیا قدرتی خوب تازہ کلام		کہ بر صدق یوسف علیہ السلام

کھیا قدرتی قصہ ایوب کا		سنے کوئی بندہ جو محبوب کا

چونکہ مثنوی نایاب تھی اور ان ہی اوراق میں اس کا تعارف اہل علم سے کیا جارہا ہے اس لئے مزید نمونہ کلام

پیش کیا جاتا ہے

ایوب علیہ السلام کے قصہ کے چند شعر یہ ہیں

قصہ یو جو کہتا ہوں ایوب کا　　اتھا نسل اولاد یعقوب کا
اتھی ماں ان کی یہود انسل　　یمن شاہ کی وہ اتھی در اصل
بنیا نیچ صابر و ایوب تھے　　نظر پاک صورت منی خوب تھے
اتھے وو تونگر بہت مال دار　　بھوکیاں کوں کھانا کھلاتے بچار
جو کپڑے نہ تھے پہین تے تن اُپر　　پتلکیا تمین کپڑے پنادے اگر
بلاتے وانکی اسی دہات تھے　　جو کرتے اپے خیر خیرات تھے
سکتے ہیں جو اس دہات سجان او　　مسلط کیا ان پر شیطان یو

یوسف اور زلیخا کے قصہ کے چند شعر

قبولی زلیخا جو خدمت کیتیں　　اسی پرورش خوب کرتی ہوں ہیں
او دل جان قبولی محبت بدل　　و خوش حال ہوی یوں جو کھلتا کنول
زلیخا رکھے اسکوں سبال تے　　و جیوکر کو اس کون گے پال نے
جو یوسف اول سو اتھا بال کا　　و نوخیز سترا اتھا سال کا
علد اسکا جیکچ علم بوجیا اتھا　　جیکچ سال کا جاب سوجیا اتھا
اسی واسطہ جم زلیخا کا دل　　اپچے جو بی خوشحال جیوں پھولکھلر
اسی عشق دن بدن مزید ا ہوا　　د سودا عشق کا سو پیدا ہوا

آنحضرت صلعم کے حالات کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نہیں مسخرائی یو ہے جان تون　　قبولی ہوں میں اپنی ایمان سون

سو جتنے تمارے اچھیں گے جو خویش — بلا کر جمع کر توں سارے قریش
سو میرا چچا ورقہ نوفل کتیں — بلالیا سے توں میری منزل کتیں
محمد کوں یاں تم بلالیائے کر — کرد خورسنداری میر آئے کر
نہیں مرد منج کوں محمد بغیر — اسی باج منگتی نہیں کار خیر
ابوطالب سنے ہے خدیجہ ستے بات — سو خوش حال ہوکر اپے دعا تد بات
بلا بھیج سارے اکابر کتیں — صفا دید سارے قریشی جو دیں
بلائے ورقہ نوفل کتیں ایک بار — جو آئے ہے سب مل خدیجہ کے ٹہار
پلائے ورقہ نوفل کتیں تب شراب — و بعضیاں پو سارا جو چھٹکے گلاب
..... ورقہ نوفل یزان ست سو — خدیجہ نیران دست پر دست سو
..... کہے ورقہ نوفل کے سات — سفارش کی ہے محمد کی بات
کیا فایدہ بھوت میرا تمام — کفایت کیا مال جا سار شام

فرعون کے ڈوبنے کا حال

دو فرعون ڈبنے لگیا ایک بار — کہیا تب جو موسیٰ کون یوں کر پکار
نکو توں، ڈبا بیج مسلمان ہیں — جو ہوتا ہوں لیاتا ہوں ایمان میں
اسی سات جبرئیل آئے دھان — مچلکہ کھیا سو دیکھائے وہاں
و تو یہ کیا تو ہوا کچ نہ فرق — ہوا سب و لشکر ستے آپ غرق
و جبرئیل آئے میکائیل سات — جو لے کے ہزاروں فرشتے سنگات
سو کافر کے لشکر کتیں گھیر مار — ڈبائے ندی میں سبی ایک بار
و موسیٰ جو دیکھتے علیہ السلام — ہوا غرق فرعون لشکر تمام
کہے اپنے لوگاں ستے دیکھار — چلو جا بن کا فر ڈبیا ہے ہو خوار

بخوف طوالت اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے،

اس زمانہ (یعنی سنہ ۱۰۰۰ھ اور سنہ ۱۱۰۰ھ کے درمیان) کی کئی اور مثنویاں مثلاً طوطی نامہ غواصی، گلشن عشق نصرتی، پھول بن ابن نشاطی، قصہ ابوشحمہ اولیا، چندر بدن و مہیار مقیمی، یوسف زلیخا ہاشمی وغیرہ بھی موجود ہیں۔ ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، کیونکہ ان میں اکثر شائع ہو چکی اور جو شائع نہیں بھی ہوئی ہیں، ان پر مفصل مضامین لکھے جا چکے ہیں ان کے علاوہ تصوف میں بھی کئی ایک کتابیں ہیں جو نظم و نثر میں ہیں ان کو بھی آیندہ پیش کیا جائے گا، اس کے بعد سنہ ۱۱۰۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک کے مخطوطات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

منشی امیر اللہ تسلیم

(کرنل مرزا بسم اللہ بیگ صاحب بی، اے)

تمہید

جب میں گورنمنٹ کالج اجمیر میں پڑھتا تھا اُس وقت اکثر شاعروں میں اُستاد تسلیم کے شاگردوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی زبانی جو واقعات اُستاد مرحوم کے متعلق سنے اور جو خیال میں نے اُن کی شاعری اور بلند شخصیت کے متعلق قائم کیا تھا اُن کی تائید ان کے متعلقہ تذکروں سے نہ ہوئی۔ خم خانۂ جاوید، گل رعنا یا دوسرے تذکروں میں جو ذکر تسلیم کا ہے۔ نیز جو انتخاب کلام ہوا ہے وہ مجھے پسند نہ آیا۔ اُس وقت میں نے کوشش کی تھی کہ جو واقعات و حالات میں نے سنے ہیں ان کو قلمبند کر دوں۔ اب جبکہ لکھنؤ میں اورینٹل کانفرنس کا اجلاس ہونے لگا تو میں نے مناسب سمجھا کہ بعض ایسے حالات جو منظرِ عام پر نہ آئے ہوں بیان کرکے اور اپنے زاویۂ نظر سے انتخاب کلام کرکے تحفتہً اہل لکھنؤ کی خدمت میں پیش کر دوں۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ایک بات اور عرض کر دوں کہ جہاں سوانح حیات کا ذکر ہے اُس سے مقصود تفصیلی واقعات زندگی بتلانا نہیں ہے بلکہ ان کی شعر گوئی کے پس منظر کو پیش کرنا ہے۔

منشی امیر اللہ تسلیم

(۱) بچپن کا نام احمد حسین۔ منشی امیر اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ وطن نواح فیض آباد۔ پیدائش ۱۸۲۰ء۔ اُن کے والد عبد الصمد صاحب پلٹن میں تیس روپئے پر ملازم تھے۔ والد کی ملازمت کے اس تعلق سے منشی صاحب کی ابتدائی زندگی لکھنؤ ہی میں گذری۔ فارسی و عربی کی کتابیں والد اور بڑے بھائی عبد اللطیف سے پڑھیں۔ خطاطی میں بھی کمال پیدا کیا۔ والد کے بڑھاپے میں اُن کی جگہ پلٹن میں ملازم ہو گئے۔

(۲) تسلیم نے طبیعت موزوں پائی تھی۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ۱۳ سال کی عمر سے غزل لکھنی شروع کی مگر کسی

اُستاد سے اصلاح نہ لی۔ جب مرزا اصغر علی خاں تسلیم دہلوی جو حکیم مومن خاں کے ممتاز شاگردوں میں تھے لکھنؤ آئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ مرزا صاحب نے منشی صاحب کی طبیعت کا اندازہ کر کے اُن سے کہا کہ تم بھی طبع آزمائی کیا کرو۔ اس اجازت کے ملنے کے بعد تسلیم ان سے غزلوں کی اصلاح لینے لگے۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ موزونیت کا یہ عالم تھا کہ اِدھر مصرع طرح سنا۔ اُدھر راستہ چلتے چلتے دس بیس شعر کہہ ڈالے مزاج میں بہ تقاضائے سن قدرے لاپروائی بھی تھی۔ دو ہفتہ بعد مشاعرہ میں پہونچے خیال آیا کہ کچھ روز پہلے ہم نے بھی غزل کہی تھی۔ پرچہ تلاش کر کے جیب سے نکالا۔ اور باری آنے پر پڑھنا شروع کر دیا۔ کبھی استاد سے اصلاح لی کبھی نہ لی۔ ایک مرتبہ ایسا ہی اتفاق ہوا کہ غزل کہی تھی مگر اصلاح لینے کی نوبت نہ آئی تھی۔ دوستوں کے ساتھ مشاعرہ میں پہونچ گئے باری آنے پر پڑھنا شروع کر دیا۔ مشاعرے اور وہ بھی اس زمانے کے جن میں ناسخ، آتش جیسے اُستاد اور اُن کے شاگرد سب ہی رونق محفل ہوتے تھے کچھ معمولی نہ تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہل کمال میں تو ہمیشہ سے نوک جھوک رہی چلی آئی ہے۔ اپنے شاگرد کو اس طرح بے اصلاح لئے غزل پڑھتے دیکھ کر تسلیم حیران ہوئے مگر خاموش تھے۔ غزل پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہونچے سہ

پئیں خاک سے صحبت غیر میں　　　نہ شیشہ نہ ساغر نہ پیمانہ اپنا

تو ناسخ نے تعریف کی اور مکرر پڑھنے کی فرمائش کی۔ اب تو تسلیم چونکتا ہوئے سوچا کہ شعر تو اس قابل نہیں کہ ناسخ جیسا استاد اس طرح داد دے۔ معلوم ہوا کہ پہلے مصرع میں دو حرف کم پڑتے ہیں۔ ارباب سخن جانتے ہیں کہ فعولن فعولن فعولن فعولن میں ایک بحر فعولن بھی ہوتی ہے جس کا فرق آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ تاوقتیکہ تقطیع نہ کی جائے یہی وقت حضرت تسلیم کو پیش آئی۔ واقعی شاعر کے لئے مشاعرہ بھی بڑے امتحان کی جگہ ہے۔ رعب محفل سے بڑے بڑے لوگوں کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ امانت جیسا اُستاد ایک دفعہ برسر مشاعرہ پڑھ گیا کہ ع

لبوں پر جان شیریں ہے اب اے فرہاد کیا کیجئے

تقطیع میں ایک الف دبتا تھا یار لوگوں نے مضحکہ اڑایا کہ ابے فرہاد کیا کیجئے تو اس قدر شرمندہ ہوئے کہ پھر مشاعرہ میں غزل پڑھنے کی قسم کھالی تسلیم کو دیکھئے ذرا پریشان نہ ہوئے۔ اب کی بار جو شعر پڑھا تو درست تھا سہ

پئیں خاک سے صحبت غیر میں ہم　　　نہ شیشہ نہ ساغر نہ پیمانہ اپنا

لوگوں کو حیرت ہوئی بعض سمجھے کہ پہلی مرتبہ بھول گئے تھے۔ بعض سمجھے کہ عمداً ایسی حرکت کی کہ پہلی بار لفظ کو چھوڑ کر پڑھا

بعضوں نے کہا کہ طبیعت نے عین وقت پر موزونیت دکھائی۔ غرض بات رہ گئی تسلیم بھی کساتھے۔ مشاعرہ کے بعد کہنے لگے کہ تسلیم پہلی مرتبہ جب تو نے شعر پڑھا تو اس قدر غصہ آیا تھا کہ پھر کبھی تیری صورت نہ دیکھوں۔ لیکن جب دوبارہ شعر سنایا تو جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر منھ چوم لوں۔

(۳) واجد علی شاہ نے مسٹر سلیمن ریذیڈنٹ کی شکایت کی بناء پر منشی صاحب کی پلٹن توڑ دی تو بیکار ہوگئے۔ تین سال کی بے سود کوشش کے بعد ایک منظوم عرضی بادشاہ کی خدمت میں گذرانی جو مقبول ہوئی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر نظم ہی میں حکم لکھوایا۔ حکم یہ تھا ؎

بشنوائے خوشنویس واسے خوش گو　　، دو فن میسکنی و ، دو نحو

اسم تو مندرج بہ دفتر شد　　بست و دہ روپیہ مقرر شد

اس تیس روپیے پر واجد علی شاہ کے زمانے تک اچھی گذری۔ اُسی زمانے کی غزل کا ایک مدحیہ شعر ہے کہ ؎

منبر ہر شاخ پر پڑھتی ہے بیٹھی عندلیب　　خطبہ ہائے مدحت واجد علی شاہ جہاں

غدر کے بعد جب لکھنؤ کی حالت بگڑی تو پھر ملازمت گئی اور پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے۔ یہ غزل اُسی زمانے کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تسلیم کو لکھنؤ سے کس قدر محبت تھی۔ اور اس کا چھوڑنا کس قدر شاق تھا۔ فرماتے ہیں ؎

اوج پر ہے بے نشاں ہو کر بھی شان لکھنؤ　　لامکاں کو داغ دیتے ہیں مکان لکھنؤ

واعظِ رنگین بیاں۔ اُن کو نہ دکھلا سبز باغ　　کیا کریں گے لے کے جنت ساکنان لکھنؤ

جیتے جی کیونکر مری ان کی جدائی ہو سکے　　لکھنؤ ہے روح میری۔ میں ہوں جان لکھنؤ

سنتے سنتے خلد کی تعریف جی گھبرا گیا　　اب تو اے واعظ سُنا کچھ داستان لکھنؤ

یہ لطافت ہو کلام غیر کو کیونکر نصیب　　رشک موج آب کوثر ہے زبان لکھنؤ

دونوں عالم سے الگ ہر رنگ میں پاتا ہوں میں　　کیا زمین لکھنؤ۔ کیا آسمان لکھنؤ

گردش ہی گردش ہے اے تسلیم اپنے بخت کی　　اور ہیں دو چار دن ہم میہمان لکھنؤ

(۴) اس مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصائب کی تاب نہ لاکر حضرت تسلیم نے باہر جانے کی ٹھان لی تھی۔ غرض اُس کے بعد ہی رامپور چلے گئے۔ اور کلب علی خاں کے دربار میں بھی تیس روپیے پر ملازم ہوئے۔ اور ان کی زندگی تک آسائش

سے بسر کی۔ مگر اُن کے انتقال کے بعد تسلیم کو پنشن دیدی گئی تو پھر پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ اُسی زمانے کی غزل ہے جو انتہائی رنج کے وقت لکھی گئی مگر شاعری کی علوئے فطرت کا اندازہ لگائیے کہ سوائے مقطع کے اور کہیں اُس رنج کا اظہار نہیں بلکہ چوچلا ہے ؎

دل مرا تھا۔ گر گیا۔ گم ہو گیا۔ جاتا رہا
غم تمھیں کاہے کا ہے جاتا رہا جاتا رہا

آج آنکھیں تک نہیں ملتی ہیں کل بیٹھے تھے پاس
دو ہی دن میں اس قدر پاس وفا جاتا رہا

اس دلِ گم گشتہ کو اُس کی گلی سے عمر بھر
بیشتر میں ڈھونڈ لایا۔ بارہا جاتا رہا

اُٹھ گئے کلب علی خاں کیا کریں فکر سخن
اب تو اے تسلیم وہ سارا مزا جاتا رہا

ایک دوسری غزل کے دو شعر ہیں ؎

انصاف کرو مجھ سے المناک ازل کو
بہلائے بھلا صحبت احباب کہاں تک

کیا بیٹھے ہو تسلیم چلو ملک عدم کو
وابستگیٔ عالم اسباب کہاں تک

(۵) نواب حامد علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد تسلیم کو دوبارہ بحال کیا۔ تیس روپئے تنخواہ اور دس کا اضافہ ایسے چالیس روپئے ملنے لگے۔ جشن دربار کے موقعہ پر حضرت تسلیم نے ایک قصیدہ پڑھا جو سخت زمین میں ہے۔ ردیف گریبان آشیں دامن اور قافیہ رسے اور فتحہ ماقبل۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بہار آئی پتے گھر گھر گریباں آشیں دامن
تبرک بن گئے پھٹ کر گریباں آشیں دامن

وہ خلعت آج میں لوں گا شہ حامد علی خاں سے
سراسر جس کے ہوں پُر زر گریباں آشیں دامن

قصیدوں میں حضرت تسلیم کا رنگ خاص ہے مضمون کی بلندی اور بلاغت کو الفاظ کی رنگینی اور فصاحت کے ساتھ ایسا نمایاں کرتے ہیں کہ اکثر موقعوں پر غزل کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ بعض اوقات قاآنی کی سی روانی معلوم ہوتی ہے۔

(۶) اصناف سخن میں جو قدرت مثنویوں میں حضرت تسلیم کو حاصل تھی وہ اُن کے معاصرین میں سے کسی کو بھی نہ ملی۔ مثنوی نالۂ تسلیم۔ دل و جان۔ صبح خنداں مشہور ہیں۔

(۷) غزل گوئی میں رنگینی۔ شوخی۔ متانت۔ کمال درجے تک پہونچی ہیں قوت تخیلہ اور قوت ممیزہ دونوں اعلیٰ درجہ کی عطا ہوئی ہیں مضمون کو اس سادگی اور صفائی سے قلبند کرتے ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غدر میں ایک دیوان

شائع ہونے کے بعد تین دیوان چھوڑے۔ (۱) نظم ارجمند۔ (۲) نظم دل افروز۔ (۳) دفتر خیال۔ ان تینوں میں نظم ارجمند کی غزلیں اپنی خصوصیتوں۔ اور گوناں گوں صفتوں کے اعتبار سے اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ ہے۔ اُن کے کلام کا عام جوہر پختگیٔ کلام۔ رنگینی الفاظ۔ دلپذیری مضامین چلتی ہوئی بحریں اور چوچلا پن ہے۔ ان اوصاف کی وضاحت میں ذیل کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

نالہ کچا ہے۔ دل ہے خفا شوق ہے اُداس — تم کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
تم کا تھا ان کو آنکھ سے کیوں دل پھڑک گیا — لو نشہ تو کسی نے پیا کوئی چھک گیا

گیسو کی محبت میں سنبھلا ہی نہیں جاتا — اُس پیچ سے کیا نکلوں نکلا ہی نہیں جاتا
دریائے محبت میں ڈوبا ہوں کچھ ایسا میں — ہر چند اُبھرتا ہوں ابھرا ہی نہیں جاتا

چاہتا ہوں جنس نامقبول میں شامل نہ ہو — پھیر دو مجھ کو مرا دل گر کسی قابل نہ ہو
ہے دعا تسلیم اتنی عالم اعلام سے — اپنا دیوان آشنائے دیدۂ جاہل نہ ہو

معاملہ بندی۔ سلاست زبان۔ محاورات کی روانی جو امیر و داغ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہیں وہی خوبیاں یہاں بھی موجود ہیں۔

قوت کشمکش غم جو دکھائی ہوتی — آہ نے عرش کی زنجیر ہلائی ہوتی
کیا مجھے حسرت انگشت حنائی ہوتی — پاؤں پڑتا بھی تو وہ ہاتھ نہ آئی ہوتی
ساقی اک دن تو مے سرخ پلائی ہوتی — آگ سی آگ لگی دل کی بجھائی ہوتی
مار ڈالا لب اعجاز نما نے ورنہ — آج منھ کی ملک الموت نے کھائی ہوتی

کیا کہہ کے عندلیب چمن سے نکل گئی — کیا سُن لیا گلوں نے کہ رنگت بدل گئی

ایسا کہاں رفیق کہ دیتا قلق میں ساتھ
اک جان تھی تو وقت پہ وہ بھی نکل گئی

اے جان غم فراق کے صدمے نہ پوچھئے
وہ حال تھا کہ موت بھی بالیں سے ٹل گئی

گھبرائی تھی فراق میں۔ لیکن ہزار شکر
باتیں وہ دل نے کیں کہ طبیعت بہل گئی

غیر سے ملئے۔ مجھے ناکام رہنے دیجئے
آپ اپنے نامہ و پیغام رہنے دیجئے

ہم نہیں کہنے کے اے تسلیم پیغام وصال
یہ تمنا۔ یہ خیال خام رہنے دیجئے

وہ آتے ہیں۔ آئی ہوئی ٹل جائے تو اچھا
فقرہ ملک الموت سے چل جائے تو اچھا

غرض چلتے ہوئے ردیف وقافیوں میں جس بے باکی اور روانی سے تسلیم نے کہا وہ چوٹی کے شعراء سے کسی طرح کم نہیں۔ چند اور مثالیں سن لیجئے ؎

ہاں بیٹھے ہیں در پہ صفت نقش قدم ہم
دعویٰ ہے تو اغیار اٹھا کیوں نہیں دیتے

اک وہ ہیں جنھیں لینے وہ آئے نہیں جاتے
اک ہم ہیں کہ چھوٹوں بھی بلائے نہیں جاتے

یہ حسن خداداد نہیں ہے کسے محبوب
تم کس کی نگاہوں میں سمائے نہیں جاتے

محفل میں تری صورت تصویر نہالی
جب بیٹھ گئے ہم کے اٹھائے نہیں جاتے

یاد سفر ملک عدم دل سے لگی ہے
ہر دم مجھے لو گور کی منزل سے لگی ہے

مٹ جائے کہیں زندگی و مرگ کا جھگڑا
اے تیغ جفا اب تو یہی دل سے لگی ہے

کیا کہتے ہو کیا بھول گیا میں دم رخصت
اک یاد تمھاری سو مرے دل سے لگی ہے

اللہ ری وحشت کہ پس مرگ بھی تسلیم
جنت میں طبیعت مری مشکل سے لگی ہے

دشمن وفا نصیب ہیں میں ہوں جفا نصیب		اُن کا جدا نصیب ہے میرا جدا نصیب
اغیار تو عدو ہیں جو کہتے ہیں سب بجا		تم دوست ہو کے کہتے ہو مجھ کو بلا نصیب
کس سے مثال دوں صنم بے مثال کو		کس کو ہے یہ کرشمہ و شوخی ادا نصیب
جب دیکھتا ہوں ملتے ہوئے ان کو غیر سے		سوئے فلک میں دیکھ کے کہتا ہوں یا نصیب

اسی ردیف و قافیہ میں امیر کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔ خوب کہا ہے ؎

ساقی نے دے کے جام کف رعشہ دار میں		مجھ سے کہا کہ لے مگر آ گئے ترا نصیب

(۸) مولانا محمد حسین آزاد جن شعراء کو پانچویں دور کے شاعر کہتے ہیں یعنی ناسخ، آتش، وزیر، رند، مومن، ذوق غالب ان سب ہی کو حضرت تسلیم نے دیکھا تھا چونکہ ۹۱ سال کی طویل عمر پائی تھی اس لئے کئی دور اُن کی آنکھوں کے روبرو گذر گئے۔ ناسخ و آتش کو طالب علمی میں دیکھا تھا۔ ذوق و غالب کو جوانی میں۔ امیر و داغ کو کہولت میں۔ اور ان کے بعد اُن کے شاگردوں کو بھی کلام پڑھتے سُنا۔ اکثر اوقات رامپور کے مشاعروں میں امیر و داغ سے ایک ہی طرح کی غزلوں میں مٹھ بھیڑ رہی۔ کلام کسی طرح اُن سے کم بھی نہ رہا۔ امیر کی رنگینی کلام مسلّمہ ہے تو تسلیم کی جدت و شوخی بھی قابلِ داد ہے۔ اس طرح کے مشاعرے میں کہ کیونکر ہو گیا، دفرہو گیا معشوق کی خفگی کا منظر امیر و تسلیم دونوں نے اپنے مطلعوں میں کھینچا ہے۔ امیر فرماتے ہیں کہ ؎

آفتیں آئیں خفا جب وہ ستمگر ہو گیا		پھر کے چکر۔ مڑ کے نشتر۔ کھچ کے خنجر ہو گیا

تسلیم کا مطلع ہے ؎

بن پڑی بے پردہ نظارہ میسر ہو گیا		ایک بات ایسی کہی جامہ سے باہر ہو گیا

حضرت امیر اس مشاعرہ میں بازو میں بیٹھے تھے جب حضرت تسلیم نے یہ مطلع پڑھا تو ہنسکر چپکے سے تسلیم کے کان میں کہا کہ بڑی بلی کہدیا ہو گا۔

غالب کا وہ شعر تو یاد ہو گا کہ ؎

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو		اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا

تسلیم اسی ردیف و قافیہ میں فرماتے ہیں کہ ؎

سنتے سنتے وہ حال دل بولے یہ تو قصہ ہوا گلا نہ ہوا

غالب ایک دوسری غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

تسلیم جواب میں فرماتے ہیں کہ ؎

دیگا رزاق ازل تسلیم جو قسمت میں ہے مثل غالب کیوں کہیں گھر میں رہیں کھائیں گے کیا

پیری میں بھی حضرت تسلیم کی رنگینی طبع ویسی باقی تھی فرماتے ہیں کہ ؎

پیر ہوں پر ہے جواں ذوق غزلخوانی ہنوز لطف دیتی ہے مجھے میری سخن دانی ہنوز

تسلیم گو ہیں پیر مگر دل جوان ہے مرتے ہیں جامہ زیبوں کے اب بھی نکھار پر

آغاز جوانی کی ادا اور ہی کچھ ہے اب تو وہ صنم نام خدا اور ہی کچھ ہے

اس غزل کے ایک شعر میں حضرت تسلیم نے اپنے مسلک وحدت الشہود کو ظاہر فرمایا ہے کہتے ہیں

ہر ایک سمجھتا ہے مظاہر کو ہمہ اوست کس کس سے کہوں میں کہ خدا اور ہی کچھ ہے

اے چارہ گر درد نہو مفت میں بدنام بیمار محبت کی دوا اور ہی کچھ ہے

تم کہتے ہو تسلیم ابھی تک ہیں سلامت ہم نے گلی کوچہ میں سنا اور ہی کچھ ہے

ایک مشاعرہ میں جس کا قافیہ وردیف پڑی ہے لڑی ہے اتفاق سے امیر۔ داغ اور تسلیم تینوں نے پڑی کا قافیہ مطلع میں باندھا ہے۔ سب مطلعے ملاحظہ ہوں امیر کہتے ہیں ؎

جب آنکھ اُس شاہ خوباں پر پڑی ہے نگہ تقدیر بن بن کر لڑی ہے

داغ ؎

نظر کہتے میں اُس بُت پر پڑی ہے کہاں جاکر مری قسمت لڑی ہے

تسلیم ؎

نگاہ لطف ساقی جو پڑی ہے وہی مے ہے مگر کتنی کڑی ہے

(۹) پختگی کلام تسلیم کا خاص جوہر۔ صائب کے بعد آپ کو مشکل سے ایسا شاعر ملے گا جو مسلم الثبوت ہیں

تسلیم سے بہتر ہو۔ صائب کے وہ شعر تو آپ کو یاد ہوں گے جو مسلم الثبوتی میں بے نظیر ہیں ؎

زتعظیم و تواضع ہائے خصم ایمن مشو صائب
کہ خم کردن صیاد آفت ہاست مرغاں را

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست
پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

تسلیم کی مسلم الثبوتی ملاحظہ ہو ؎

سنگ دل پیار کیا کرتے ہیں خونخواروں کو
سان سینے سے لگا لیتی ہے تلواروں کو

آپ مٹ جاتے ہیں اوروں کیلئے صاحب درد
آبلے دیتے ہیں سینہ میں جگہ خاروں کو

کیا ہو او عدۂ دوزخ ہے اگر اے واعظ
کیا وہ دھکی بھی نہ دیں اپنے گنہگاروں کو

دوسری غزل ملاحظہ ہو ؎

سر سبز باغ دہر میں اہل رقم نہیں
دیکھی ہری بھری کبھی شاخ قلم نہیں

مانند خامہ قابل رفتار ہم نہیں
جب تک نہ دستگیر ہو اٹھتے قدم نہیں

گھر میں عدو کے دیکھ لئے نقش پا ترے
حدِ ستم سے ایک بھی باہر قدم نہیں

مسلم الثبوتی کی دو ایک مثالیں اور سن لیجئے ؎

زمانے سے نرالا ہے عروس فلک کا جوبن
جواں ہوتی ہے اے تسلیم جب یہ پیر ہوتی ہے

ایک غزل کے چار شعر سُناتا ہوں۔ مسلم الثبوتی آخری دو شعروں میں ہے۔ پہلے دو ردیف و قافیہ کی رو میں آنے عرض کرتا ہوں ؎

نہیں معلوم کیا گزری گل و بلبل کو سکتے ہیں
نہ سن سکتے ہیں کانوں سے نہ منھ سے بول سکتے ہیں

انھیں بھولی نہیں بے باکیاں دست تمنا[ع] کی
کہ میری خاک پر آتے ہوئے اب تک جھجکتے ہیں

ہوائے عشق کامل ہے تو سوز حسن پیدا کر
ثمر خورشید کی گرمی سے شاخ تر میں پکتے ہیں

دم پیری نہیں تسلیم اپنی یہ غزل خوانی
بنے ہیں بے حیا بلبل خزاں میں بھی چہکتے ہیں

(۱۰) ظریفانہ انداز کی دو ایک مثالیں بھی سُن لیجئے۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔ اُسی کے

ع تمنا کو دست کا استعارہ دیکر عجیب رنگینی پیدا کر دی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔ خدا شرمائے ان ہاتھوں کو رکھتے ہیں کشاکش میں۔ یہاں دست تمنا کو بیباک بنا کر خیال کو شعری وسعت دے دی ہے۔

پیش نظر تسلیم فرماتے ہیں ؎

ایک دن عالم رویا میں یہ دیکھا میں نے قرص خورشید بخشاں مری جاگیر میں ہے
سر پہ ہے تاج مرے پیر میں کفش زریں سر سے معروف زمانہ مری توقیر میں ہے
اُس کی تعبیر جو پوچھی تو یہ نکلا تسلیم
ٹوٹا جوتا۔ پھٹی ٹوپی تری تقدیر میں ہے

مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے خواب وہی دیکھ سکتا ہے جس کی ہمت بلند اور خیالات اونچے ہوں۔

ایک شخص نے رامپور میں تسلیم سے کہا جبکہ وہ شاگردوں میں تشریف فرما تھے کہ ایک مصرع ہے جس پر گرہ لگانے سے دوسرے شاعر عاجز ہیں۔ آپ لگا دیجئے مگر شرط یہ ہے کہ جتنے (چ) پہلے مصرع میں ہیں اُتنے ہی دوسرے مصرع میں بھی ہوں مصرع یہ ہو ع

چار دنوں سے چوک میں چرچا چوری کا چوچند ہوا

اس مصرع لگانے پر یاد آیا کہ بعض اوقات مزاحیہ طور پر ایسے مصرع دیے جاتے ہیں کہ اُن پر مصرع لگانا مشکل ہو جاتا ہے مہاراج کشن پرشاد کے زمانے میں ایک مصرع دیا گیا تھا جو سب سے اچھا مصرع لگائے گا وہ ایک اشرفی انعام پائے گا مصرع یہ تھا ع کبھی بولے چھن۔ کبھی بولے چھن۔ کبھی بولے چھن تیرے گھونگرو

حیدر آباد کے سب ہی شعرا نے طبع آزمائی کی تھی مگر جو صاحب انعام و داد لے گئے وہ حضرت توفیق تھے جن کا یہ مصرع تھا ع گئی گذرے سن۔ ترا کم تھا سن کہ لئے تھے سُن ترے گھونگرو

ارباب سخن فہم کے لئے یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اُس شخص نے حضرت تسلیم سے اپنے مصرع پر مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ اُستاد نے پہلے تو یہ کہا کہ مجھے ایسے واہیات مصرعوں پر طبع آزمائی کی فرصت نہیں مگر سائل نے کہا کہ اُستاد اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ اس مصرع پر مصرع لگانے سے اُستاد بھی عاجز رہ گئے۔ شہر میں تو یوں ہی مشہور ہوگا۔ تو اُستاد اس کی شوخی پر مسکرا کر فرمانے لگے پڑھو کیا مصرع ہے۔ اُس نے دُہرایا کہ ع چار دنوں سے چوک میں چرچا چوری کا چوچند ہوا۔ میرے دوست حبیب النبی صاحب جو حضرت تسلیم کے شاگرد تھے اُن کا بیان ہے کہ اُستاد نے برجستہ کہا ع

چھ چھ چوکی چوک میں بیٹھی چور نہ چنچل بند ہوا

(۱) اخیر زمانے میں داغ نے حیدر آباد سے لکھا تھا کہ تسلیم دکن آجائیں اور تسلیم کی تعریف ان الفاظ میں کی تھی کہ

چمن ہند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں تو طوطی تسلیم کے سوا کوئی چہکتا نظر نہیں آتا۔ اب تو کوئی نہیں رہا جو میرے سخن کی داد دے۔ غرض ان الفاظ میں تعریف کر کے دکن آنے کی ترغیب دی تھی اور امید دلائی تھی کہ معقول تنخواہ بھی ہو جائے گی مگر تسلیم کی طبیعت غیور تھی۔ اپنے ہم فن کا احسان لینا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ بڑھاپے کا عذر کر دیا۔ حضرت امیر کا انتقال ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا (حضرت امیر کا انتقال ۱۹۰۰ء میں ہوا) اور حضرت امیر کو دکن آئے بہت تھوڑا عرصہ گذرا تھا وہ واقعہ بھی ذہن میں تازہ تھا اپنے خط کے اخیر میں تسلیم نے یہ شعر لکھا کہ ؎

مرے دل سے تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے　　　مگر مرگ امیر بے وطن کچھ اور کہتی ہے

اس شعر والی غزل کا مطلع بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ؎

حیا کچھ اور کہتی ہے پھبن کچھ اور کہتی ہے　　　تری ہر ہر ادا اے جان من کچھ اور کہتی ہے

تسلیم کا انتقال ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ ۹۱ برس کی عمر پائی۔ اس سے پہلے ۱۹۰۵ء میں داغ انتقال فرما چکے تھے۔

(۱۲) حضرت تسلیم کی زندگی ایک شمع ہدایت ہے۔ ایک درس عبرت ہے۔ حضرت تسلیم ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر تیس روپیے زیادہ نہ کما سکے۔ مگر ان کی ہمت اور نظر اونچی تھی اولو العزمی سے کام لیا۔ نہ مصائب کی پروا کی نہ غریبی سے گھبرائے۔ اُن کا اپنا احساس اس شعر سے ظاہر ہے ؎

دل شگفتہ رکھتے ہیں ہر حال میں رنگیں مزاج　　　مانع خندہ نہ گل کو چاک دامانی ہوئی

نہ امیر سے سوال کیا۔ نہ غریب کو دھتکارا۔ بڑے منکسر المزاج اور بڑے خوش اخلاق تھے۔ اچھی سی اچھی صحبتوں میں شریک رہے۔ امراء۔ اہل علم۔ اہل کمال سب کی نظروں میں اونچے رہے اپنا وقار قائم رکھا اور با ہمہ اور بے ہمہ رہ کر گذار دی۔ اگر Plain living and high thinking کی مثال لینا ہے تو حضرت تسلیم کو دیکھو۔ اُن کی زندگی سکھلاتی ہے کہ بلا ذرائع۔ بلا مال و دولت بھی انسان اپنی زندگی کو کیونکر بہتر بنا سکتا ہے جس طبقے میں حضرت تسلیم پیدا ہوئے۔ اُس میں لاکھوں آئے اور چلے گئے جن کو نہ کوئی جانتا ہے۔ نہ پہچانتا ہے۔ مگر تسلیم کا نام جب تک اردو شاعری ہے جب تک ذوق سخن ہے۔ روز روشن کی طرح مشہور رہے گا۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام او۔ آج بھی انکے شاگرد موجود ہیں۔ آج بھی عزت سے نام لینے والے احباب موجود ہیں۔ آج بھی انکی تعریف ہوتی ہے حضرت غالب نے سچ کہا کہ ؎

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　　آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

حالی بہ حیثیت مُصلح

(مس منزہ بانو کاؤس جی ایم، اے، بی ٹی)

جدید اُردو شاعری کے مجدد اور اصلاحی شاعری کے موجد، سعدیٔ ہند شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کا نامِ نامی دنیائے علم و ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مولانا حالی ایک باکمال شاعر، اور ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے سچے رہنما اور بڑے دلسوز مصلح ہیں۔ اُن کے کلام کا وہ جُز جو انھوں نے بہ حیثیت ایک مصلح کے سپردِ قلم کیا قابلِ صد تحسین و آفرین ہے اور یہی ان کی علمی و ادبی زندگی کا نہایت درخشاں پہلو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے شعر و سخن کے میدان میں جس وقت قدم رکھا ہے تو یہ وہ دَور تھا کہ علم و ادب کی عام حالت رو بہ انحطاط تھی، شاعری گل و بلبل کے افسانوں سے بھری پڑی تھی ابتداً مولانا کا دَورِ شباب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، لیکن اُن کی دُور رس اور حقیقت بیں نگاہوں نے انھیں بہت جلد شاعری کے اس سراب سے بچا لیا اور رفتہ رفتہ وہ تمام پردے جو شاعری اور ادب کے مابین حائل تھے، اُٹھتے نظر آئے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مولانا نے اپنی کاوشِ فکر کا رُخ ہی بدل دیا اور ایک نئی فکر، نئے اندازِ بیان اور نئے اسلوب سے اپنی قوم کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار کرنے میں اپنی زندگی وقف کر دی اس کے مُردہ جسم میں روحِ نو کی تخلیق کی اور اسے عمل کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔ مولانا نے جہاں اپنی قوم کا اخلاقی پہلو سنوارا وہاں اپنی غیر معمولی سعی، بے لاگ محنت، کاوش اور پرخلوص جذبہ سے شاعری کو پستِ حالی و ضلالت سے نکال کر اوجِ کمال پر پہنچا دیا اور اسے اخلاقی، ناصحانہ، ادبی، فلسفیانہ اور فطرت کے عین مطابق بنا ڈالا۔ یہ انھیں کی سعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اُردو زبان میں ہر قسم کا پاکیزہ لٹریچر پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اکبر و اقبال جیسے باوقار شعراء بھی انھیں کے مصلحانہ خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔

اب ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کی اصلاحی شاعری کا محرک کیا تھا جس کی وجہ سے اُن کی شاعری میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انقلاب کی تہ میں ۱۸۵۷ء کا وہ خونیں واقعہ کارفرما تھا جس نے مولانا کو انتہائی متاثر کیا اور انھیں اپنی قوم کی معاشرتی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی پستی کا گہرا احساس ہو گیا اور انھوں نے اصلاح و ترمیم کا بیڑا اُٹھا لیا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا کی شاعری کو اصلاحی رنگ میں ڈھالنے کا سہرا سرسید

کے سر ہے۔ سرسید نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوم کی پستی و تنزل کو محسوس کیا اور اپنی ساری توانائیاں اسی کی اصلاح و تعمیر میں صرف کر ڈالیں لیکن اپنی بے غرض محنت اور پرخلوص جذبہ کے اظہار کیلئے انھیں ایک شیریں گفتار اور نغمہ سنج شاعر کی سخت ضرورت محسوس ہوئی جو اپنی دھیمی دھیمی اور سُریلی آواز سے اپنی قوم کے سوئے ہوئے جذبات اُبھارے اور اس کے بے حس قلب میں اپنی ملی قوم کی محبت کے جذبے کو بیدار کرے۔ ایسے وقت سرسید کی آنکھیں ایک ایسے ہی شخص کی تلاش میں سرگرداں تھیں کہ حُسنِ اتفاق سے مولانا حالیؔ سے دوچار ہوگئیں اور اُن کی ذات میں سرسید نے وہ سب کچھ پایا جس کے وہ متلاشی تھے۔ مولانا حالیؔ نے سرسید کو اپنا رہنما اور علمی سرپرست بنا لیا اور جو اصلاحی شان مولانا کے ابعد کے علمی کارناموں میں نظر آتی ہے وہ سرسید ہی کا فیضان ہے۔

مولانا اپنی قوم کے حقیقی بہی خواہ اور مخلص ہمدرد ہیں۔ اُن کے قول و فعل میں یکسانیت ہے اور چونکہ اُن کی ہر بات دل سے نکلتی ہے اس لئے دل میں فوراً اپنا مقام حاصل کر لیتی ہے مولانا نے جب دیکھا کہ زمانہ کا رنگ ہی بدلا ہوا ہے تو ساری مروجہ شاعری اُن کو ایک "ناپاک دفتر" نظر آنے لگی اور شاعروں کا مقام ان کی نگاہوں میں "قلی اور نفر" سے بھی پست نظر آنے لگا چنانچہ ارشاد ہے ؎

قلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے مگر ان کو کس مد میں کوئی کھپائے

مولانا فطری شاعر اور انسانی جذبات کے نبض شناس ہیں۔ ایک طرف پاکیزہ شاعری کی روح اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے اور دوسری طرف اپنی قوم کی اصلاح و تعمیر کا خیال رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اصلاح و تعمیر کی سجدہ گاہ پر اس شاعری کی قربانی ایک اہم مسئلہ تھا خود مولانا "مسدس" کے دیباچہ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "یہ ایک ایسے ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے بخاراتِ اندرونی جن کے رُکنے سے دم گھٹا جاتا تھا دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈھتے تھے" حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان لاکھ اپنے فطری رجحانات کا رُخ پھیرنے کی کوشش کرے لیکن ایک نہ ایک وقت اُن کا ظہور ہوئے بغیر نہیں رہتا یہی حال مولانا کا تھا انھوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ اس رنگ سے کنارہ کشی کریں لیکن جس رخنہ کی تلاش تھی اس کو مسدس نے مہیا کر دیا۔ مسدس اصلاحی نظم سہی لیکن شعریت سے خالی نہیں۔ یہ نظم مولانا کا سب سے اعلیٰ و عظیم اصلاحی و ادبی کارنامہ ہے۔ گو مولانا نے مرد میدان بن کر لوگوں کے اجسام پر قابو حاصل نہیں کیا لیکن اُن کے مسدس نے لوگوں کو متاثر کیا، اُن کی خوابیدہ صلاحیتوں کو چونکایا اور ان کے دماغ و اذہان میں ایک

انقلاب عظیم برپا کر دیا تھا انھوں نے فلاح و صلاح کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے ایسا پیرایہ اختیار کیا جس کی بنیاد اولیا اور بزرگانِ سلف کی پاکیزہ زندگی پر رکھی ہوئی تھی، اس کی یاد کو عوام کے دلوں میں تازہ کر کے انھیں غیرت دلائی، ان کے جذبات ابھارے درد الہامانہ انداز میں اپنی قوم سے مخاطب ہو کر ان کو بتایا کہ جس قوم کی گذشتہ تاریخ اس قدر شاندار ہو اس کا حال کیونکر اس قدر دل شکن ہو سکتا ہے، اب مولانا کی اس غیر فانی نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور بقول سرسید "اس سچے حال پر حال لائیے"۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی   عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی   اک آواز میں سوتی بستی جگادی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے   کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

اس کے بعد بانیٔ اسلام کا پیغام کس خوبی سے پیش کیا ہے:۔

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق   زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان طاعت کے لائق   اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ   جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اس کے بعد رسول اللہ نے جو اُمت اپنی یادگار چھوڑی اُس کا حال بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کے نوجوانوں کو اس طرح توجہ دلائی ہے:۔

ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے   فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اس طرح اسلام کی اخوت، مساوات، عدل و انصاف، سرفروشی، جانبازی، حق پرستی، اور خدمت خلق کو عیاں کرتے ہوئے "ہر کمالے را زوالے" کے فطری اصول کے مطابق ان کی پستی کا بھی ان کو احساس دلایا ہے۔

یہ گدلا ہوا جبکہ چشمہ صفا کا   گیا چھوٹ سررشتہ دین ہدیٰ کا
رہا سر پر باقی نہ سایہ ہما کا   تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا
کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک   جو بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

بعدۂ اپنی قوم کو اس کی انتہائی زبوں حالی کا نقشہ پیش کر کے اور دلوں کو بے حد و اندازہ متاثر کر کے، یاس میں امید کی جھلک نمایاں کرتے ہیں اور یہی ایک سچے اور ہمدرد مصلح کا فرض اولین ہے۔ فرماتے ہیں

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو   جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو

ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو فسردہ دلوں کے دِل آخر بڑھا تو
ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

آخر میں اپنے کلام کی مصلحانہ کوشش و مقصد کا اظہار بارگاہ ایزدی میں دعا کی صورت میں اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

اک ابر اُس پہ بھیج اپنی رحمت کا یارب غبار اس سے جو دھو دے ذلّت کا یارب
انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے ذرا اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے
کہیں گاہ بازئی دوراں دکھا دے جو ہونا ہے کل آج اُن کو سجھا دے
چھتیں پاٹ لیں تاکہ باران سے پہلے سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شعراء اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کر شاعری کے میدان میں قدم رکھتے ہیں اُن کی شاعری بڑی حد تک بے اثر اور بے جان ہوتی ہے لیکن مولانا کے اصلاحی کلام میں بھی شاعری کی اصلی روح جھلکتی ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر مسدّس مولانا کا نتیجۂ فکر نہ ہوتا تو اس قدر با اثر اور تاثیر سے لبریز نہ ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ خیال و زبان ایک دوسرے کا دامن پکڑے ایک بحرِ ذخار فکر میں رواں دواں ہیں۔ روانی، تسلسل، سادگی، جوش، صداقت درد، سوز غرض ہر جذبہ کی چاشنی اس میں موجود ہے۔ اگر کسی کو اسلام کی روح کو سمجھنا ہے تو مسدّس کا مطالعہ کرے اور اپنی چشم پُرنم اور دل دردمند سے مد و جزر اسلام اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے!!

جب ہم مولانا کی رباعیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بھی ہمیں اصلاحی رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نہ کہیں زبردستی کی پرواز خیال ہے نہ لایعنی تشبیہات و استعارات ہیں، بات وہی جانی بوجھی ہے، سیدھی سادی ہے، جگ بیتی ہے لیکن مولانا کے سحر البیان قلم نے اسے آپ بیتی کی بات بنا کر پیش کیا ہے، رباعیاں کیا ہیں ایک عالمگیر حقیقت ہے جو دل میں فوراً اپنا مقام حاصل کر لیتی ہیں۔ ارشاد ہے

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنّم دنیا وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو

پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا　　ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

زاہد کہتا تھا جان ہے دین پر قربان　　پر آیا جب امتحان کی زد پر ایمان
کی عرض کسی نے کہئے اب کیا ہے صلاح　　فرمایا کہ بھائی جان جی ہے تو جہان

اس کے علاوہ مولانا کی لاتعداد نظمیں ہیں۔ جن سے ایک دردمند دل کی صدا آتی ہے۔ کوئی مشکل ایسی نہیں جو انھوں نے عیاں نہ کی ہو اور اس کا حل نہ بتایا ہو۔ کہیں وہ حب وطن کے جذبہ کو ابھارتے ہیں کہیں اپنی قوم کی پست حالی پر چار چار آنسو بہاتے ہیں کہیں زوال و انحطاط کے اسباب بیان کرتے ہیں، کہیں ان سے بچنے کی ترکیبیں بتاتے ہیں، کہیں علم و عمل کی اہمیت کو عیاں کرتے ہیں اور کہیں مذہب کا صحیح مفہوم و مقصد واضح کرتے ہیں۔ الغرض یہ وہ بیش بہا ذخیرے ہیں جن میں، اگر نظر بصیرت از در ہے تو زندگی کے سنورنے کے آثار نمایاں ہیں۔ مولانا ایک دردمند دل کے مالک تھے اُن کی نگاہیں ہر ایک کے درد کو دیکھتی اور محسوس کرتی تھیں۔

مولانا کے زمانے میں اسلامی سلطنتیں زوال پذیر ہو گئی تھیں اور ہر حکمراں غفلت کا شکار بنا ہوا تھا۔ اسلامی اصول و ضوابط ذہنوں سے فراموش ہو چکے تھے جس کی وجہ سے عوام کے اخلاق ضعف پذیر ہو رہے تھے اور ایک غیر ملکی حکومت اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا رہی تھی اس نفسا نفسی کے زمانے میں مسلمانوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو انھیں اس جمود کے قعر سے نکالے اور راہ راست پر ڈالے۔ یہ کار خیر مولانا نے ایک زبردست ایثار و خلوص کے ساتھ انجام دیا یعنی جو قدیم ذوق شاعری ازل سے لے کر آئے تھے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اپنے ادبی کارناموں کو نئے سانچے میں ڈھال کر اپنی قوم کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور اُن کی کمزوریوں سے جو ناجائز فائدے اٹھائے جا رہے تھے اس کا اظہار اس طرح کیا کہ

نہیں خالی مزے سے حبشیوں کی لوٹ بھی لیکن　　حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تونے گلشن میں　　یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گل چیں یا ہے قزاقی

مولانا نے اپنی اصلاحی شاعری سے صرف اپنی قوم ہی کو بیدار نہیں کیا بلکہ علم و ادب کی بھی زبردست اور قابل فخر خدمت کی۔ جس ہمدردی اور خلوص کے ساتھ مولانا نے قدیم شاعری کو محدودیت کے دائرہ سے نکالنے کی کوشش

کی وہ قابل صد تحسین و آفرین ہے اُن کی معرکۃ الآرا تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" خود اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا ادب و شاعری میں وسعتیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کتاب میں نفس شاعری سے انھوں نے ایسی مدلل بحث کی ہے کہ اس تصنیف کو مولانا کا ایک زبردست اصلاحی کارنامہ تصور کرنا بیجا نہ ہوگا اپنی غیرفانی نظم مسدس میں اپنے زمانہ کے بگڑے ہوئے مذاق کو پیش نظر رکھ کر کہتے ہیں

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے — جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اپنے ملک و قوم کی متنزلزل حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا حالی ایک بڑی حد تک انگریزی اقتدار کے حامی تھے لیکن انھیں ہرگز یہ بات ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ تھی کہ ہندوستانی محکوم مطلق بن کر رہ جائیں انھیں ہندوستان کا مستقبل اگرچہ تیرہ و تاریک نظر آتا تھا اور اس کی زبوں حالی سے متاثر ہو رہے تھے لیکن جو پاکیزہ و بلند مطمح نظر ان کا تھا اس میں اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی خواہش کے سوا اور کسی بات کی آمیزش نہ تھی۔ اس بات کا بین ثبوت ہمیں اس کالے اور گورے کی صحت کے طبی امتحان والے قطعہ میں ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض — اور یہ لکھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مُکّے سے مرے — کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے، تم کو مل نہیں سکتی سند — کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بہ ظاہر جاندار
ایک کالا گر کہ گورے سے فوراً مر نہ جائے — آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

یا توں باتوں میں ظرافت کے ساتھ پتے کی بات بتلا دی ہے کہ مسلمانوں میں اب بھی اس قدر طاقت باقی ہے کہ اگر ہوش سنبھالیں تو ملک سنبھل سکتا ہے۔

"تدبیر قیام سلطنت" والا قطعہ پڑھئے تو واضح ہوتا ہے کہ مولانا کی دوربین نگاہیں ہندوستان کی سیاسی بے بسی سے بے خبر نہ تھیں اور ان کا دل اپنی قوم کی زبوں حالی سے ناآشنا نہ تھا۔ اُن کے جذبۂ قومیت میں ایک ندرت یہ تھی کہ حریف

سے نفرت کرنے کی بجائے وہ اپنوں سے محبت کرتے تھے اور رنج و تعب سے مایوس ہونے کی جگہ سنجیدگی و متانت سے سعئ پیہم کا عزم کرتے تھے۔ ان کا اصلاحی کلام خیالی تخلیق اور شاندار منصوبوں کا مظہر نہیں ہے بلکہ پیش پا افتادہ کمزوریوں کے ازالہ کا ایک زبردست آلہ ہے۔

الغرض مولانا نے جو خدمت نہ صرف اپنی قوم بلکہ انسانیت کی اپنے قلم سے کی وہ فراموش نہیں کی جا سکتی اُن کی دُور رس نگاہیں اور درد آشنا دل ہر انسانی جذبہ کا جائزہ لیتا تھا۔ اصلاح و ترمیم ان کی زندگی کا ایک جزو لاینفک تھا۔ اسی کو مدنظر رکھکر انھوں نے ایک نئی طرز کی داغ بیل ڈالی جو آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوئی۔ مولانا قدیم تہذیب لیکن جدید رجحانات میں اپنی مثال آپ ہیں۔ زمانہ شاید ہی ایسا جیّد عالم ایسا عدیم المثال شاعر، ایسا ہمدرد مصلح پیدا کر سکے یوں تو دنیا واعظین و ناصحین سے خالی رہی ہے نہ رہے گی۔ ہر دَور میں اور ہر زمانہ کی ہر کروٹ میں بڑے بڑے صاحب علم و فضل، بڑے بڑے باکمال، خوش سیرت و خوش خصال لوگ نمود و شہود کے منصہ پر جلوہ فرما رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ ان میں حالیؔ نہ ہوگا۔ اب اُن کی تعریف میں اُن ہی کا ایک شعر ملاحظہ ہو

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

مُلّا عبد الصّمد
(اُستادِ غالب)

(جناب مالک رام صاحب ایم اے)

یوں معلوم ہوتا ہے، کہ غالب کی زندگی میں بھی بعض لوگوں نے ملا عبد الصمد کی ہستی سے متعلق شک و شبہ کا اظہار کیا تھا، لیکن بعد میں اگر سب نہیں، تو ان میں سے اکثر غالباً مطمئن ہو گئے تھے۔ اب ایک صدی بعد پچھلے دنوں جناب قاضی عبد الودود صاحب نے ایک مضمون[1] میں دوبارہ اس مسئلے کو اٹھایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ واقع میں عبد الصمد کوئی شخص نہیں تھا اور وہ غالب کا زائیدۂ فکر ہے۔ اس کے لئے انھوں نے جو دلائل دئے ہیں، ان میں سے مندرجہ ذیل زیادہ اہم اور قابلِ غور ہیں۔

(۱) غالب نے قاطع برہان کی تصنیف کے زمانے تک (۱۸۶۲ء) کبھی عبد الصمد کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ اس سے پہلے کتنے ایسے مواقع پیدا ہوئے، جب وہ ان کا نام پیش کر سکتے تھے، مثلاً جب کلکتے میں قتیل کے حوالے سے ان پر اعتراض ہوا ہے، تو وہ عبد الصمد سے اپنی فیض یابی کی طرف اشارہ کر سکتے تھے، یا جب انھوں نے مولوی سراج الدین احمد کی فرمایش پر قاضی محمد صادق اختر کے تذکرے آفتاب عالم تاب کے لئے اپنا ترجمہ لکھا ہے، تو وہ اس میں بھی عبد الصمد سے اپنی تعلیم کا حال لکھ سکتے تھے۔ لیکن دونوں موقعوں پر انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

(۲) کسی تذکرہ نگار نے بھی، ان کی تعلیم کے سلسلے میں عبد الصمد کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ ان میں سے بعض غالب کے معاصر ہیں۔ نہ دنیا کا کوئی اور شخص غالب کے سوائے عبد الصمد سے ذاتی واقفیت کا مدعی ہے۔

(۳) مولانا حالی لکھتے ہیں۔

> "کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدا فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں، اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے۔"
> (یادگار غالب ص۱۴)

(۴) حکیم غلام رضا خاں نے پروفیسر عبد الغفور شہباز کو ایک خط میں لکھا ہے:

> "صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا، نہ اردو۔ یہ جو مرزا صاحب عبد الصمد کو اپنا استاد لکھتے ہیں، اس شخص کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہ تھا۔" (زندگانی بےنظیر ص۲۰۱)

جناب قاضی صاحب موصوف نے بعض اور ضمنی دلائل بھی پیش کئے ہیں، جن کی طرف حسبِ ضرورت اپنی جگہ

[1] "غالب کا ایک فرضی استاد ــ عبد الصمد" از قاضی عبد الودود (علی گڑھ میگزین ـ غالب نمبر ۱۹۴۹ء)

پر اشارہ کیا جائے گا، لیکن یہ چار دلیلیں بنیادی کہی جا سکتی ہیں۔ ان کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عبد الصمد محض غالب کے تخیل کی پیداوار ہے۔ میرے نزدیک ان میں سے کوئی ایک دلیل بھی قطعی طور پر ان کے اس دعوے کی مؤید نہیں ہو سکتی (ہم ان پر الگ الگ غور کرتے ہیں۔)

(۱) کلکتے کے مشاعرے میں غالب کے دو شعروں پر اعتراض ہوئے تھے۔ پہلا تھا ؎

جزوے از عالَم، و از ہمہ عالَم بیشم — ہمچو موئے، کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اس شعر پر اعتراض یہ تھا کہ مصرع اولیٰ میں بیش کی جگہ، تفصیلِ بعض بیشتر ہونا چاہئے تھا۔ نیز یہ کہ بہ اجتہادِ قتیل ہمہ عالَم کی ترکیب غلط ہے، کیونکہ عالَم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ جو کثرت پر دلالت کرتا ہے، صحیح نہیں۔

دوسرا شعر تھا ؎

شورِ اشکے، بہ فشارِ بنِ مژگاں دارم — طعنہ، بر بے سر و سامانیٔ طوفان، زدہ

اس پر کہا گیا تھا، کہ مصرع ثانی میں زدہ کا استعمال غلط طریقے پر ہوا ہے۔

شعر و شاعری کی دنیا میں ایسے اعتراض کوئی انوکھی چیز نہیں۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہر صاحب نظر ان سے واقف ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کسی شخص پر اعتراض ہوا کرتا ہے، تو وہ ایسے موقع پر کیا کرتا ہے؟ یا اس کے حامی کیا کیا کرتے ہیں؟ بلا استثنا وہ سند میں ایسے شعرا و ادبا کا کلام پیش کرتے ہیں، جو معترض کا بھی مستند علیہ ہو اور اس طرح یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، کہ جب معترض کا اپنا مستند علیہ استاد، محلِ اعتراض لفظ یا ترکیب کو استعمال کر چکا اور اس طرح اس کے صحیح ہونے کی شہادت دے چکا ہے، تو اب وہ اس کے استعمال پر کیسے انگلی رکھ سکتا ہے۔ اس موقع پر بھی یہی ہوا تھا۔

غالب نے اور ان کے دوستوں نے ہمہ کا مفرد لفظوں کے ساتھ ربط درست ثابت کرنے کے لئے حافظ اور سعدی کے کلام سے سندیں پیش کیں۔ زدہ کے استعمال سے متعلق خود غالب نے مثنوی بادِ مخالف میں بیدل کے کلام سے سند دی ہے۔ یقیناً اعتراض اٹھانے کا صحیح طریقہ یہی تھا، کہ فریقین کے جو مسلمہ استاد تھے، ان کے کلام سے استناد کیا جاتا۔ بھلا اس جگہ اپنے استادوں کے نام گنوانے کا کیا موقع تھا! اعتراض یہ تھا کہ تم نے یہ لفظ غلط لکھا ہے۔ ضرورت اسے درست ثابت کرنے کی تھی، نہ یہ کہ میرا استاد ملا عبد الصمد تھا، جسے ان کے مخالف جانتے تک نہیں تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے، تو اس پر سوال از آسماں و جواب از ریسماں کی مثل صادق آتی۔

رہا، ان کا مثنوی بادِ مخالف میں بعض اساتذۂ فارسی: حزیں، اسیر، طالب، عرفی وغیرہ کے نام لینا، تو یہ قتیل کی تحقیر کے لئے ہے، کہ ان اہلِ زبان حضرات کے مقابلے میں قتیل، کی کیا ہستی ہے، کہ میں انھیں چھوڑ کے اس کی پیروی کرنے لگوں۔ اس مقام کے اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ نام گنانے سے ان کا مدعا کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

دینکہ، در پیش گاہِ بزمِ سخن	بہ زباں ہا، فتادہ! ست ز من
کہ فلاں با قتیل نیکو نیست	ہمیں خوانِ نعمتِ او نیست
زلّہ بردارِ کس، چرا باشم	من ہمائم، ہمیں چرا باشم
فیضے از صحبتِ قتیلم نیست	رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
نہ ہوا خواہے، نہ دشمنے	در میان است، پائے ہم فنے
حاش للہ، کہ بد نمی گویم	واں ہم، از پیشِ خود، نمی گویم

مگر آناں، کہ پارسی دانند ہم بریں عہد و رائے و پیمان اند

کز اہلِ زباں، نبود قتیل ہرگز از اصفہاں، نبود قتیل

لاجرم، اعتماد را نہ سزد گفتہ اش، استناد را نہ سزد

کیں زباں، خاصِ اہلِ ایران است مشکلِ ما، و سہلِ ایران است

سخن است آشکار و پنہاں نیست دہلی و لکھنؤ، ز ایراں نیست

دوستاں را، اگر زبیں گلہ است کہ خرامت، خلافِ قافلہ است

می رویم، از پئے قتیل، ہمہ ساختہ مرو را، دلیل ہمہ

تو ازیں حلقہ، چوں بدر زدۂ گام بر جادۂ دگر، زدۂ

اے تماشائیانِ غرّہ نگاہ! ہاں، بگوئید حَسبۃً للہ

کہ چساں، از حزیں بہ پیچم سر آں بجادو دمے، بدہر سمر

دل دہم گر، اسیرِ بیگ گردم زاں نوآئیں صفیرِ بیگ گردم

دامن از کف، کنم چگونہ رہا طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح و روانِ معنی را آں ظہوری، جہانِ معنی را

× × × × × ×

کشتۂ گفتگوئے اینانم مست لائے و ہوئے اینانم

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را چہ شناسد، قتیل و واقف را

اقتباس ذرا طویل ہو گیا، لیکن اس سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے، کہ یہاں وہ اپنے معلّمین کا ذکر نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں، کہ قتیل کے حوالے سے اعتراض لغو بات ہے، کیونکہ بہرحال اس کا درجہ غیر ملکی زبان دان سے زیادہ کا نہیں اور ہم سند کے موقع پر اسے حزیں، طالب، عرفی اور دوسرے اساتذۂ اہلِ زبان کے مقابلے میں پیش نہیں کر سکتے۔ مجھ پر جو اعتراض کیا گیا ہے، جب اس کے لئے اہلِ زبان کے کلام سے نظیر مل گئی، تو اب وہ قتیل، اور اس کے ساتھ کے دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کے اجتہاد کے مطابق لاکھ غلط ہوا کرے، اس کی کون پروا کرتا ہے۔ میں مقلد ہوں اہلِ زبان کا؛ نہ کہ ہندوستانی فارسی نویسوں کا۔ من ہمانم، ملس چرا باشم۔ میرے کلام کی صحت کا معیار وہ اصول ہیں، جو اہلِ زبان نے وضع کئے ہیں۔ اگر وہ قتیل اور واقف کے اصولوں پر صحیح نہیں اترتا، تو مجھے اس سے سروکار نہیں ؎

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را چہ شناسد قتیل و واقف را

خدارا غور فرمائیے کہ یہاں مُلّا عبدالصّمد کا ذکر کرنے کا کیا تُک تھا۔

اور اگر ان کے مُلّا عبدالصّمد کا نام نہ لینے سے لازماً یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس شخص کا وجود خارج میں نہیں تھا، تو انھوں نے مولوی محمد معظم کا نام بھی تو نہیں لیا۔ کیا ہم ان کی ہستی سے بھی انکار کر دیں؟

دوسری مثال یہ پیش کی گئی ہے، کہ جب مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر انھوں نے آفتاب عالم تاب کے لئے اپنے حالات لکھ بھیجے ہیں، تو یہاں بھی ملا عبدالصمد کا ذکر نہیں کیا۔ سب سے پہلے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے یہاں بھی مولوی محمد معظم کا نام نہیں

لکھا۔ حالانکہ ہمیں دوسرے ذرائع سے یقینی طور پر علم ہے، کہ انھوں نے مولوی صاحب موصوف کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ شعر و شاعری کی دنیا میں، تعلیم اور درس و اصلاح سے مراد، ہمیشہ فنِ شاعری کی تعلیم اور کلام پر اصلاح ہوا کرتی ہے، نہ کہ عام مدرسے اور مکتب کی تعلیم۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ شیفتہ، مومن، کے شاگرد تھے یا حالی، غالب کے شاگرد تھے، تو کیا اس سے ہمارا یہ مدعا ہوتا ہے کہ ان اصحاب نے مومن اور غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لی تھی یا یہ مراد ہوتی ہے کہ انھوں نے فقہ و حدیث اور عربی و فارسی، مومن اور غالب سے حاصل کیں؟ جب ہم کہتے ہیں کہ غالب نے مولوی محمد معظم اور ملا عبد الصمد سے تعلیم حاصل کی، تو ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ انھوں نے ان دونوں صاحبوں سے فارسی زبان پڑھی۔ رہی شعر و سخن کی بات، تو یہ دوسرا میدان ہے۔ اس سے نہ ان دونوں استادوں کا کوئی تعلق تھا، اور نہ میرزا نے ان سے اصلاح لی تھی۔ اس میں وہ واقعی تلمیذ الرحمٰن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آفتابِ عالم تاب کے لئے اپنے حالات لکھتے وقت انھوں نے نہ مولوی محمد معظم کا ذکر کیا، نہ ملا عبد الصمد کا، اور صاف لکھ دیا:

"در سخن، از پرورش یافتگانِ مبداءِ فیاضم، و سوادِ معنی را لفظ را گو ہر خویش روشن کردہ ام ساز ہیچ آفریدہ منت آموزگاریم بگردن، و بار منتِ رہنمایم بر دوش، نیست"

وہ اپنی مفصل سوانح عمری نہیں لکھ رہے تھے۔ بلکہ ایک شعرا کے تذکرے کے لئے مختصر حالات مہیا کر رہے تھے۔ پرانے تذکرہ نگاروں کا کیا دستور تھا، یہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ چاہتے تھے کہ صاحبِ ترجمہ نے اپنا کلام کیسے دکھایا، اور کس سے اصلاح لی۔ غالب نے لکھ دیا، کہ اس بارے میں (در سخن) کسی کا بارِ احسان میرے کندھوں پر نہیں اور میں نے مبداءِ فیاض کے سوائے کسی سے استفادہ نہیں کیا۔ انھوں نے اس میں کوئی غلط بیانی یا مبالغہ نہیں کیا۔ یہ امرِ واقع ہے۔

لیکن جب انھوں نے قاطع برہان تالیف کی، تو اب موضوعِ کلام بدل گیا تھا۔ اب شعر و سخن اور عروض کی تعلیم یا شعروں پر اصلاح لینے کا سوال نہیں تھا، بلکہ یہاں گفتگو، زبان اور الفاظ کی تحقیق اور معانی و بیان سے متعلق تھی یہی وجہ تھی، کہ جب قاطع برہان میں انھوں نے بعض ایسی باتیں لکھیں جو ان کے خیال میں نئی تھیں، تو انھوں نے لکھ دیا کہ یہ مجھے اپنے استاد ملا عبد الصمد سے معلوم ہوئی تھیں۔ یہ بالکل دوسری بحث ہے، کہ جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ واقع میں درست تھا یا نادرست۔ وہ اصل میں کوئی نیا نکتہ تھا بھی یا نہیں۔ ہم یہاں اس سے متعلق کچھ نہیں لکھنا چاہتے، کیونکہ یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ بہرحال وہ ان کے نزدیک نیا بھی تھا اور درست بھی، اور انھوں نے اسے اپنے استاد ملا عبد الصمد سے سنا تھا۔ اگر آج ہماری تحقیق سے یہ ثابت ہو جائے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا، وہ غلط تھا، تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکالیں گے کہ استاد اور شاگرد دونوں غلطی پر تھے۔ یا اگر وہ بات پہلے کسی اور مصنف کے ہاں موجود ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی دریافت کا سہرا غالب کے سر نہیں، اور ان سے پہلے مصنف یہ بات لکھ گیا ہے اگرچہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ غالب نے اسے پہلے مصنف کے ہاں نہ دیکھا ہو اور خود اپنے طور پر اسی نتیجے پر پہنچے ہوں۔ آخر دنیا میں توارد بھی تو کوئی چیز ہے۔ بلکہ میں تو اس سے بھی آگے جانے کو تیار ہوں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انھوں نے یہ نکتہ پہلے مصنف کے ہاں واقع میں دیکھا ہو اور اس کے باوجود اسے "ایجادِ بندہ" کہہ کے پیش کر دیا ہو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے، کہ ایک کثیر المطالعہ شخص کسی بات کو کہیں دیکھتا ہے اور بھول جاتا ہے لیکن ایک زمانے کے بعد اگر اسے کسی ضرورت سے، اسی موضوع پر غور و فکر کرنے کا اتفاق ہو، تو عین ممکن ہے کہ وہ اسی بات کو جو اس کا پیش رو لکھ چکا ہے (اور جسے وہ بھول گیا ہے کہ اس نے کہیں دیکھی تھی، لیکن جو بہر حال اس کے تحت الشعور میں موجود ہے) اپنی تحقیق اور اپنے دماغ کی اپج کہہ کر پیش کر دے۔ شاید ایک قانون کا ماہر تو اس شخص کو مجرم قرار دے

لیکن نفسیات کا عالم اسے بے قصور ٹھیرائے گا۔

بہرحال اگر انھوں نے قاطع برہان میں، مُلّا عبدالصمد کے حوالے سے، بعض ایسی باتیں لکھی ہیں، جو غلط ہیں، یا جنھیں ان سے پہلے کا کوئی اور مصنف بھی لکھ چکا ہے، تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استاد نے شاگرد کو جو کچھ بتایا وہ غلط تھا، اور شاگرد کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ بات غلط ہے، ورنہ وہ کیوں اسے بھری دنیا میں شائع کر دیتا اور اپنی اور اپنے استاد کی رسوائی کا سامان مہیا کرتا۔ لیکن اس سے آپ یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ سرے سے استاد کا وجود ہی نہیں تھا، اور شاگرد نے یہ بات اپنے دماغ سے گڑھ لی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے، کہ انھوں نے قاطع برہان میں مُلّا عبدالصمد کا نام اس لئے لکھا تھا، کہ اس طرح مخالفوں کا منھ بند کر سکیں۔ یہ اعتراض کرتے وقت یہ خود بخود فرض کر لیا گیا ہے کہ میرزا یہ پہلے سے جانتے تھے کہ لوگ قاطع برہان کی مخالفت کریں گے، حالانکہ اس مفروضہ کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ غالب نے سوچ سمجھ کر ایک لمبی اسکیم تیار کی تھی یعنی پہلے برہان قاطع پر اعتراض لکھے پھر انھیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا، پھر چونکہ وہ جانتے تھے کہ دنیا اس کی مخالفت کرے گی، اس لئے انھوں نے اپنے دماغ سے ایک شخص ملا عبدالصمد پیدا کیا اور تمام اعتراض اس کے نام لکھ دئے، تاکہ لوگ اس طرح مرعوب ہو کر ان کی بجائے ملا عبدالصمد کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ کیا غالب کی شخصیت اور زندگی سے متعلق جو کچھ ہمیں معلوم ہے، اس میں کوئی ایسی بات ہے، جس میں ان کے سازشی کردار کی طرف اشارہ ہو، یا جس سے پایا جائے کہ وہ پہلے سے اتنی لمبی سازش سوچنے اور اسے معرض عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا۔ جس شخص نے ۶۵ برس تک آپ کے درمیان کسی سازش کے بغیر، شریفانہ زندگی بسر کی ہے۔ آپ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ اب جب وہ موت کے کنارے تک پہنچ گیا ہے، وہ یوں یکایک بدل جائے گا۔ کسی مضمون یا تحریر کو کسی دوسرے کے نام سے چھاپ دینا بالکل الگ بات ہے۔ یہ ان کے پیشے سے متعلق ہے۔ وہ کسی خاص شخص کو اس درجے کا نہیں خیال کرتے کہ اس کے منھ آئیں اور خود اس سے مخاطب ہوں۔ اس لئے چند صفحے لکھ کے اپنے کسی شاگرد یا دوست کے نام سے چھاپ دیتے ہیں۔ لیکن یہ فرض کر لینا کہ انھوں نے کسی خاص اسکیم کے تحت ایک افترا کیا، بہت بڑی جسارت اور دعویٰ ہے۔ اور اسے درست ثابت کرنے کے لئے اس سے بہت زیادہ محکم دلائل کی ضرورت ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے بھی ملا عبدالصمد کا ذکر نہیں کیا۔ تو اول تو یہ کوئی دلیل ہی نہیں۔ اگر کوئی مصنف، اپنے موضوع سے متعلق پوری تحقیق نہیں کرتا، یا باوجود کوشش اسے پوری معلومات حاصل نہیں ہوتیں اور اس لئے اس کی تحریر ادھوری اور تشنہ رہ جاتی ہے، تو جو چیزیں اس کے حیطۂ بیان سے باہر رہ گئی ہیں، وہ ناپید نہیں ہو جاتیں۔

لیکن اصلی بات وہی ہے جس کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، کہ اس دور میں کوئی ان تفصیلات میں جاتا ہی نہیں تھا سوائے خوب چند ذکا اور قطب الدین باطن کے، کسی نے مولوی محمد معظم کا بھی ذکر نہیں کیا۔ باطن آگرہ کے رہنے والے تھے اور وہیں انھوں نے غالب کے مولوی محمد معظم کے مکتب میں تعلیم پانے کا حال سنا ہوگا۔ اس لئے انھوں نے ان کا نام لکھ دیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے لب و لہجے سے یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے ان کا مقصد مولوی محمد معظم سے زیادہ غالب کو نظیر کا شاگرد ثابت کرنا ہے۔ ذکا کو بھی مولوی محمد معظم کا حال شاید آگرے ہی سے معلوم ہوا تھا۔ ان دو مصنفوں کے علاوہ اور کسی نے مولوی محمد معظم کا بھی ذکر نہیں کیا۔ بفرض محال یہ دونوں تذکرے ناپید ہو جاتے اور ہمیں ان تک دسترس نہ ہوتی، تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ غالب نے مولوی محمد معظم سے بھی تعلیم نہیں حاصل کی تھی یا مولوی

محمد معظم کا خارج میں وجود نہیں تھا عدم ذکر یا عدم علم، عدم شے پر دلالت نہیں کرتا۔ یہ غلط منطق ہوگی۔ مثلاً شیفتہ کا تذکرہ گلشن بیخار لے لیجئے۔ نہایت مستند تذکرہ ہے اور مصنف خود آخری دور کے کتنے شاعروں کا معاصر دوست اور ہمجلیس ہے۔ لیکن کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) آزردہ۔ مفتی صدر الدین خاں۔ ان کے روز کے ملنے والے ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ان کے شرف صحبت سے لذت اندوز نہ ہوتا ہوں۔ ان کے علم و فضل اور زہد و ورع کی تعریف میں ڈیڑھ صفحہ لکھا ہے۔ لیکن نہ خاندان کا حال، نہ تعلیم کا۔ نہ والد کا نام، نہ استادوں کا۔

(۲) ذوق۔ شیخ ابراہیم۔ ان کے حالات میں نصف صفحہ لکھا ہے۔ والد کا نام ندارد۔ تعلیم سے متعلق خاموش۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے کلام پر اصلاح لینے کا بھی ذکر نہیں۔

(۳) مسرور۔ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں خلف الصدق نواب ابو القاسم خاں شاگرد محمد جان بیگ ساقی (مزید حالات ندارد)

(۴) شہیدی۔ تخلص، کرامت علی نام، باشندہ لکھنؤ۔ (اس سے زیادہ حالات اور تعلیم کا ذکر نہیں)

(۵) ظفر۔ مرشد زادۂ آفاق، مرزا ابو ظفر بہادر، ولی عہد سلطانِ زماں حضرت محمد اکبر شاہ۔ شیخ ابراہیم ذوق از مائدہ نعمتش زلہ ربا و وظیفہ خوار است (اس کے علاوہ تعلیم کا ذکر نہیں)

(۶) غالب۔ اسد اللہ خاں المشتہر بمرزا نوشہ، از خاندانِ فخیم است و از رؤسائے قدیم (نہ والد کا نام، نہ تعلیم کا حال)

(۷) ممنون۔ نظام الدین نام، ہمین پور قمر الدین منت است (تعلیم وغیرہ کا ذکر نہیں)

(۸) مومن۔ دو صفحے کے حالات میں تعلیم کا تو کیا ذکر، والد تک کا نام نہیں۔

(۹) نصیر۔ شاہ نصیر الدین۔ خاندان کے حالات، والد کا نام، تعلیم اور اصلاح سے متعلق مطلق کچھ نہیں۔

(۱۰) اور تو اور خود اپنے حالات میں بھی مومن سے شاگردی کا تو لکھا ہے باقی ندارد۔

میں نے قصداً صرف ان شاعروں کے حالات سے اعتنا کیا ہے، جن سے شیفتہ کے ذاتی تعلقات تھے اور جن سے انھیں اکثر ملنے جلنے کا اتفاق رہتا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ حالات کس قدر مختصر اور غیر مکمل ہیں۔ اس صورت میں پرانے تذکرہ نگاروں سے شکایت بے جا ہے۔ وہ بھی کیا کرتے، اس زمانے کا رواج ہی تھا۔ اب اگر ان حضرات کے ملا عبد الصمد کا نام نہ لکھنے سے ہم یہ نتیجہ نکالنے لگیں کہ اس شخص کا وجود خارج میں نہیں تھا، تو ماننا پڑے گا کہ ہمارے کتنے شاعر حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کی طرح بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

لیکن حقیقت وہی ہے، جو میں بار بار اوپر لکھ چکا ہوں، کہ تذکروں میں صرف اس استاد کا ذکر کیا جاتا تھا جس سے صاحبِ ترجمہ اپنے کلام پر اصلاح لیتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کسی مصنف نے غالب کے استاد کا نام نہیں لکھا، کیونکہ سب جانتے تھے، کہ انھوں نے کسی کو اپنا کلام دکھایا ہی نہیں۔

رہا یہ کہ غالب کے سوائے دنیا کا کوئی اور شخص ملا عبد الصمد کو نہیں جانتا، تو اس میں نہ غالب کا قصور ہے، نہ ملا عبد الصمد کا۔ وہ کوئی فاتح نہیں تھے۔ ولی اور نبی نہیں تھے، کہ تاریخوں میں ان کا نام آتا۔ ایک سیلانی آدمی چلتا پھرتا آیا۔ سیر سپاٹا کر کے واپس چلا گیا۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اس کے حالات اور نسب نامے کی کھوج لگاتا۔ کتنے سیاح ہندوستان میں آئے جنھوں نے یہاں سے واپس جا کے اپنے سفرنامے لکھے، لیکن ہندوستان کے کسی مصنف یا تذکرہ نگار نے ان

کا ذکر نہیں کیا۔ ان کا ہندوستان میں آنا اور یہاں کے مختلف شہروں میں گھومنا پھرنا، ہمیں ان کے سفرناموں سے معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ سفرنامے نہ ہوتے، تو کیا ہم ان سیاحوں کے وجود سے انکار کر دیتے!

(۳) بے شک مولانا حالی فرماتے ہیں، کہ کبھی کبھی میرزا کی زبان سے یہ سنا گیا ہے، کہ چونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے، اس لئے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ بھی کہتے ہیں:

"عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی۔"

یہ ایک معاصر کا بیان ہے اور معاصر بھی ثقہ اور محتاط اور صائب رائے۔ جب تک حالی نے اور ذرائع سے اپنے بیان کی درستی کے لئے کافی ثبوت فراہم نہیں کر لیا ہوگا، وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ غالب نے جو کچھ کہا، وہ اپنی جگہ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نام کے ایک شخص سے انھوں نے فارسی ضرور پڑھی تھی۔

جو لوگ میرزا کی افتادِ طبع سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں، کہ انھیں خلافِ واقعہ باتیں بنانے میں اور لطیفے چھانٹنے میں لطف آتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی زندگی کا ایک اور واقعہ لے لیجئے۔ لوگوں نے بہادر شاہ کے دربار میں ان کے شیعی ہونے کا چرچا کیا۔ ظفر نے اس سے متعلق ان سے پوچھا۔ حالانکہ یہ امر واقع تھا اور سب اسے جانتے تھے، لیکن انھوں نے جھٹ سے چند رباعیاں لکھ کے اس سے تحاشی کی۔ افسوس، کہ یہ سارا کلام محفوظ نہیں رہا۔ صرف ایک رباعی، حالی نے یادگار غالب میں نقل کی ہے ؎

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری کہتے ہیں وہ مجھے رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

لیکن سب لوگ جانتے تھے کہ وہ شیعی اور اثنا عشری ہیں بات ہنسی میں اڑ گئی۔ اسی طرح اگر انھوں نے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں یہ چھینٹا اڑایا کہ اجی کون شاگرد، اور کہاں کا استاد۔ وہ لوگ مجھے بے استاد ہونے کا طعنہ دیتے تھے، میں نے ان کے لئے ایک استاد پیدا کر لیا، تو جاننے والے اسے بھی ان کے دوسرے لطیفوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ہوں گے۔ اس سے ان کی راست گفتاری پر کوئی حرف نہیں آتا، بلکہ یہ بھی ان کی معمولی فقرہ بازی کا ایک نمونہ ہے۔

(۴) حکیم غلام رضا خاں صاحب نے جو کچھ پروفیسر شہباز مرحوم کو لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی جناب قاضی صاحب کی طرح، میرزا کے ایک مذاق کو سنجیدگی پر محمول کر لیا ہے۔ بلکہ حکیم صاحب کے بیان میں کسی حد تک تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ غالب نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا، کہ میں نے اپنا فارسی کلام، ملا عبد الصمد کو دکھایا تھا۔ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ میں نے کم عمری میں دو برس تک ان سے فارسی پڑھی تھی۔ اب کلام دکھانے اور فارسی پڑھنے میں بہت فرق ہے۔ حکیم غلام رضا خاں کے مندرجہ صدر بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے، گویا وہ اس بات کی تردید کر رہے ہیں کہ غالب نے ملا عبد الصمد کو اپنا کلام دکھایا تھا۔

کہاوت ہے، جو پیا کو بھائے سو سہاگن۔ اس کی ایک مثال جناب قاضی صاحب موصوف نے پیش کی ہے فرماتے ہیں:

"حکیم غلام رضا خاں نے خود غالب کی زبان سے عبد الصمد کا فرضی نام ہونا سنا ہو گا حکیم غلام رضا خاں کا بیان نہ ہوتا،

جب کبھی عبد الصمد کے وجود خارجی کا قائل ہونا بہت مشکل تھا، اس کی موجودگی میں اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا"

کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس لئے کہ یہ ان کے مفروضے کے مطابق ہے۔

اگرچہ قاضی صاحب نے "سنا ہوگا" کہہ کے آپ ہی اپنی دلیل کمزور کردی ہے، لیکن ہمیں اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جہاں تک غالب کے عبد الصمد کو فرضی نام کہنے کا تعلق ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مولانا حالی نے بھی یہی لکھا ہے۔ وہ بھی تو یہی فرماتے ہیں کہ "کبھی کبھی غالب کی زبان سے سنا گیا ہے"۔ اس لئے اس قول کی اہمیت اتنا کہہ دینے سے تو نہیں بڑھ جاتی کہ "حکیم غلام رضا خاں نے خود غالب کی زبان سے عبد الصمد کا فرضی نام سنا ہوگا"۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا حالی نے بھی یہ بات کسی مجلس میں خود غالب کی زبان سے سنی ہو، یا کسی اور معتبر سامع (مثلاً حکیم غلام رضا خاں ہی) نے ان تک یہ بات پہنچائی ہو۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم حکیم صاحب کے بیان کو حالی پر ترجیح دیں۔ اصلی اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غالب کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی حالی فرماتے ہیں کہ

"عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد شخص تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی"۔

اب جب تک جناب قاضی صاحب یہ نہ بتائیں کہ ان کے پاس غالب کے ایک ثقہ معاصر کے بیان کو جھٹلانے کے لئے کیا بُرہانِ قاطع ہے، ہم کیسے ان کی مان لے سکتے ہیں۔

یہاں تک تو میں نے ان دلایل پر جرح کی ہے، جو جناب قاضی صاحب نے ملا عبد الصمد کو فرضی وجود ثابت کرنے کے لئے پیش کی ہیں۔ یہ منفیانہ پہلو ہے یعنی میری نظر میں ان کی کوئی دلیل بھی مُسکت نہیں اور ان سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ملا عبد الصمد کوئی آدمی نہیں تھا۔ اب میں ایک ایسی دلیل دینا چاہتا ہوں، جو میرے نزدیک مثبت حکم رکھتی ہے اور جس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبد الصمد واقعی ایک تاریخی شخصیت ہے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا، فقرہ لکھا تھا: "اے عزیز، چہ کسی، کہ باایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می رسی"۔"

اس پر جناب قاضی صاحب موصوف نے یہ تبصرہ فرمایا ہے۔

"انھوں نے (یعنی مولانا حالی نے) اس پر غور نہیں کیا کہ شیفتہ (خط کی) خود دیکھنے کا دعویٰ نہیں کرتے اور شاید اس پر توجہ کی گلشن بیخار میں شیفتہ نے عبد الصمد کا ذکر نہیں کیا"۔

گلشن بیخار میں عبد الصمد کا ذکر نہ ہونے سے متعلق تو میں لکھ ہی چکا ہوں کہ میرزا نے عبد الصمد سے اپنے کلام پر اصلاح نہیں لی تھی کہ وہ ان کا ذکر کرتے۔ اور اگر اس پر اصرار ہی کیا جائے، تو انھوں نے مولوی محمد معظم کا ذکر بھی نہیں کیا۔

لیکن حیرت، ان کے اس فقرے پر ہوتی ہے:۔ "شیفتہ خود دیکھنے کا دعویٰ نہیں کرتے"۔ کیا دعوے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ مولانا حالی کی اس تحریر سے مندرجہ ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

(۱) مولانا حالی سے یہ روایت خود نواب شیفتہ مرحوم نے بیان کی تھی۔

(۲) نواب شیفتہ مرحوم فرماتے ہیں کہ ملا عبد الصمد کے ایک خط میں یہ فقرہ لکھا تھا، جو اس امر کی دلیل ہے، کہ یہ خط انھوں نے دیکھا تھا۔

(۳) نواب شیفتہ کا اس خط کے ایک فقرے کو پورے کا پورا، اصلی لفظوں میں روایت کر دینا، دوسرا ثبوت ہے اس بات کا کہ انھوں نے یہ خط خود دیکھا تھا۔

(۴) خط کا وجود، اس کے لکھنے والے کے وجود پر دال ہے اور ثبوت ہے، ملا عبدالصمد کے تاریخی شخصیت ہونے کا۔

اور سچ پوچھئے تو میری نظر میں تو خود یہ فقرہ بھی ملا عبدالصمد کے وجود کی دلیل ہے۔ اسے ملا ہی کی طرح کا کوئی بے ہمہ و باہمہ شخص لکھ سکتا ہے اور کم از کم میرے نزدیک وہ کچھ اسی قسم کے انسان تھے۔ واللہ اعلم

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مولانا حالی دونوں ثقہ اور معتبر راوی ہیں۔ ہم وہم بھی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی نے غلط بیانی کی ہوگی یا واقعہ کے بیان میں "زیب داستان" کے لئے کسی طرح کے حذف و اضافہ سے کام لیا ہوگا۔ اگر ہم ایسی صریح اور بیّن شہادت پر بھی اعتبار نہیں کر سکتے، تو تاریخ اور مذہب کی کسی روایت کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اگر در خانہ کس است، اشارہ بس است۔ مختصراً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جب چاہیں، لفظوں کو توڑ مروڑ کے روز روشن کی سی شہادت کا بھی انکار کر دے سکتے ہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

تبصرے

یادگارِ فرحت | مرتب ڈاکٹر غلام یزدانی ـ سائز ۶½×۹½ صفحات ۱۷۴ قیمت مجلد ۔ غیر مجلد ۔ ملنے کا پتہ :- فرحت میموریل کمپنی حیدر آباد (دکن)

اُردو کے مزاح نگاروں میں مرحوم فرحت اللہ بیگ ایک خاص امتیاز اور درجہ کے مالک ہی نہیں بلکہ بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے ان مزاح نگاروں کے زمرے میں یگانہ و منفرد ہیں، بے شک ان کی انشاپردازی کا آغاز مزاح نگاری سے ہوا اور اس میدان میں وہ اپنے معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے لیکن ان کا زور قلم محض مزاحیہ مضامین ہی پر صرف نہیں بلکہ اس سے ان میں تحقیق و تدقیق کا شوق بھی پیدا ہوا اور انھوں نے مختلف موضوعوں پر پوری پوری داد تحقیق بھی دی، مرحوم نرے محقق ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے اپنی تحقیقات کے اظہار کے لئے ایک ایسی زبان پسند کی جس میں ادبی دلآویزی و دلکشی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، فرحت اللہ کی علمی اور ادبی تحقیق کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین زور کہتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کے بعد شبلی، سید سلیمان اور رشید احمد صدیقی میں سے کوئی بھی فرحت اللہ کے درجے کا انشاپرداز پیدا نہیں ہوا، مرحوم کی وفات کے بعد ضرورت تھی کہ ان کی یادگار میں ایسا کوئی مجموعہ شائع کیا جاتا جس میں مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مرحوم کے رفیق قدیم ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب نے میرزا کے چند احباب و اعزّہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مرحوم کی شخصیت اور علمی فتوحات پر اپنے تاثرات ظاہر کریں، اس مجموعہ یادگار فرحت، کے اکثر مقالات مفید اور علمی اعتبار سے بلند ہیں، خود یزدانی صاحب کا حصّہ بڑا قابل قدر ہے، انھوں نے محض حق دوستی ہی ادا نہیں کیا بلکہ اُردو ادب کے ایک بلند پایہ انشاپرداز اور محقق کے کارناموں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے، اگر اسے گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو ہم یہ کہنے کی جرأت کریں کہ بعض مقامات پر تکرار بھلی معلوم نہیں ہوتی اور دوسرے کہیں کہیں ذرا زبردستی سے کام لیا گیا، بحیثیت مجموعی 'یادگار فرحت'

ایک قابل قدر مجموعہ ہے۔ (م۔ا۔ڈ)

سیرت مولانا کرامت علی جونپوری | مصنف مولانا عبدالباطن جونپوری، تقطیع ۳۰×۲۰، صفحات ۱۵۱
قیمت فی جلد ایک روپیہ، ملنے کا پتہ :- بیت الامن ملا ٹولہ جونپور،

یہ مولانا کرامت علی جونپوری کی سیرت ہے، مولانا سید احمد شہیدؒ کے مشہور خلفا میں سے ہیں۔ آپ ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، مقام ولادت جونپور تھا، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولوی ابراہیم سے حاصل کی پھر مختلف علمائے وقت سے شرف تلمذ حاصل کر کے معقولات اور منقولات میں کمال حاصل کیا، اٹھارہ سال کی عمر میں رائے بریلی گئے اور سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی ان کا دل شوقِ جہاد سے بھرپور تھا مگر اپنے پیر و مرشد کے کہنے پر انھوں نے میدانِ جنگ کے بجائے میدانِ عمل کا راستہ لیا۔ اور تقریباً پچاس سال تک اپنی مسیحا نفسی سے آسام و بنگال کے گوشے گوشے میں اسلامی روح پھونکتے رہے، یہاں تک کہ ۱۲۹۰ھ میں رنگپور میں انتقال کیا، آپ کا مزار رنگپور ہی میں ہے۔ اور زیارت گہ خلائق بنا ہوا ہے

"سیرت سید احمد شہید" میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کے تمام خلفاء کا مفصل تذکرہ کیا ہے، مگر مولانا کرامت علی جونپوری کے حالات بہت مختصر دئے ہیں، ضرورت تھی کہ اس مجاہد دینی کی سیرت کو کوئی تفصیل کے ساتھ مرتب کرتا، مولانا عبدالباطن صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنے دادا کی ایک مفصل سیرت مرتب کر کے اس کمی کو پورا کر دیا ہے، ان کے اقرار کے مطابق یہ ایسی حالت میں لکھی گئی ہے کہ جس کیلئے اُن کے پاس کوئی معتبر مواد فراہم نہ تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ واقعات میں اور ان واقعات کو منسوب کرنے کے سلسلہ میں کچھ غلطیاں ہوں چنانچہ جونپور کی اصلاح سے متعلق بہت سے وہ واقعات جن کو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مولانا سخاوت علی جونپوری کی طرف منسوب کیا ہے، اس سیرت میں مولانا کرامت علی جونپوری کی طرف منسوب کر دئے گئے ہیں، علاوہ ازیں مضامین کی ترتیب پرانے طرز کی ہے، اور بعض مضامین کو غیر ضروری حد تک دہرایا گیا ہے مگر ان سب خامیوں کے باوجود کتاب اس قدر دلچسپ ضرور ہے کہ اس کے پڑھنے سے ہمارے دل میں مولانا کرامت علی کی عزت و عظمت بیدار ہو جاتی ہے۔ امید ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں بزرگوں کی کچھ بھی عزت ہے اس کتاب کو ایک بار ضرور پڑھنے کی کوشش کرے گا۔

سیرت مولانا عبد الاوّل جونپوری | فرزند مولانا ابو البشر صاحب جونپوری تقطیع ۳۰×۲۰، صفحات ۲۰۰

قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ :۔ بیت الامن، ملا ٹولہ، جون پور،

یہ مولانا عبدالاول کی سیرت ہے، مولانا کرامت علی جونپوری کے فرزند تھے، ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ مقام ولادت سندیپ مشرقی پاکستان تھا، سات آٹھ سال کی عمر میں والدین کا انتقال ہوگیا اور یہ اپنے بہنوئی مولانا مصلح الدین کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے، مختلف بزرگوں سے تعلیم حاصل کی اور کچھ دنوں مکہ کی مشہور درسگاہ مدرسۂ صولتیہ میں پڑھتے رہے، بہنوئی کے انتقال کے بعد یہ واپس جونپور چلے آئے اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چل کر بنگال و آسام کے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، آخر وقت تک تبلیغ وارشاد اور تصنیف و تالیف میں لگے رہے، ۱۳۲۹ھ میں کلکتہ میں انتقال کیا، یہ صاحب قلم تھے، عربی، فارسی اور اردو میں تقریباً سو سو کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

اس سیرت میں مولانا ابوالبشر صاحب نے مولانا عبدالاول کے جن واقعات کو تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی ہے وہ ایک معمولی عالم کے واقعات ہیں اُن سے دل میں کوئی قابلِ احترام اثر نہیں پیدا ہوتا، اس کے برخلاف مولانا عبدالباطن نے ضمیمہ میں جن واقعات کو قلمبند کیا ہے وہ گنتی کے ہونے کے باوجود ہمارے دل میں ان کی عزت پیدا کرتے ہیں۔ ضمیمہ میں مولانا نے اپنے والد ماجد کے بعض تصنیفات کا بھی تعارف کرایا ہے، اگر ساتھ ہی ساتھ ان پر ایک تنقیدی نظر بھی ڈال دیتے تو بہت اچھا ہوتا، بہرحال بزرگوں کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کیلئے قابل قدر تحفہ ہے۔ (ح-ن)

نگارخانہ | مترجم - میراجی۔ شائع کردہ - مکتبہ جدید لاہور

قیمت :۔ ایک روپیہ آٹھ آنے ۔ ضخامت ۱۰۰ صفحے

ترجمہ ہے سنسکرت شاعر داموردگپت کی نظم "کٹنی متم" کا جس میں ایک جہاں دیدہ بیسوا کی زبان سے اس کے پیشہ کے اسرار و رموز بیان کروائے گئے ہیں۔ مشاق وکرالا جس کا قافلۂ عمر تیزی سے بڑھاپے کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ نوخیز مالتی کو اپنے فن کے اونچ نیچ اور جملہ گر کھول کر بتاتی ہے۔ کتاب کے پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سنسکرت شاعر نے بہت قریب سے طوائفوں کی زندگیوں اور ان کی گفتار و رفتار کو دیکھا ہے۔ کتاب کے شروع میں سعادت حسن منٹو کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے۔ دیباچہ میں میراجی کے اپنی جنس و جنس زدگی کے جس اعتراف کا ذکر ہے اس کی روشنی میں کتاب کے موضوع سے میراجی کی طبعی مناسبت کے بارے میں بہت کم شک کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ میراجی نے ترجمہ کا فرض نہایت ایمانداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ترجمہ کی زبان ہندوستانی کی بہترین

مثال ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ (ا۔م)

مضمون نگاری (جلد اوّل) مصنف:۔ علامہ اخلاق دہلوی۔ شائع کردہ:۔ انجمن ترقی اردو ہند

قیمت:۔ تین روپیہ ضخامت ۲۰۷ صفحے

مضمون نگاری اصنافِ ادب میں سے ایک اہم صنف ہے۔ اور ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے۔ مضمون نگاری بھی اسی حزم و احتیاط، غور و فکر، ترتیب و سلیقہ اور دیدہ ریزی کی متقاضی ہوتی ہے جس کی ادب کی دیگر اہم اصناف ہوتی ذراسی بے احتیاطی یا سہل انگاری ایک اچھے اچھے مضمون کے مقصد کو بالکل ہی فنا کر دیتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں مضمون نگاری سے لسانی، معنوی ترتیبی، فکری اور فنّی زاویہ ہائے نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔ البتّہ بحث میں ذرا اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کی کمی بعض مفید کتابوں کی سفارش سے پوری کی گئی ہے۔ آخر میں کچھ تمثیلی مضامین دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب مبتدیوں اور خاص کر طالب علموں کیلئے بڑی مفید ثابت ہوگی۔ مصنف نے طالب علموں کی ضروریات اور مشکلات کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ہم طالب علموں اور مبتدیوں کو اس کتاب کے مطالعہ کی دعوت دینے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔

(ا۔م)

شذرات

(صفحہ ۴ کا بقیہ)

اور یہ عزت و سعادت صرف اسی کالج کو حاصل ہے کہ وہ اردو کی توسیع و تعمیم کے مختلف کاموں کے ساتھ اس خدمت کو بھی انجام دیتا رہتا ہے۔

اسی مہینہ میں انجمن ترقی اردو بمبئی کی دعوت پر دکنیات کے ماہر مولوی سید نصیر الدین ہاشمی نے تین مقالے پڑھے ان کے موضوع یہ تھے:۔

۱۔ اردو کی ترقی میں دکنی سلاطین کا حصہ

۲۔ دکن کے ہندو شعراء

۳۔ دکنی کلچر

ضمیمہ

مقالہ نما

مرتب ——— محمد ابراہیم صاحب ڈار

شریک مرتب ۔ عالی جعفری ، عصمت جاوید ، احمد ملک

مذہبیات

۱۔ حید رزماں صدیقی ، دعوت نبوی کے اصول و مقاصد۔ (معارف مئی ۱۹۵۱ء ۲۲۵ ـ ۲۴۳)

انبیا کی دعوت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبلیغ، درس و تعلیم اور تربیت تینوں کام ساتھ ساتھ تکمیل پاتے ہیں اس لئے پیغمبر اسلام کی سیرت کا مطالعہ زندگی کے ہر شعبہ میں کرنا چاہیئے، پیغمبر خدا کا حقیقی کارنامہ یہ ہے کہ آپ کے تزکیۂ نفوس اور تعلیم و تربیت نے عربوں کو نگاہ حق شناس اور دل خود آگاہ عطا کیا، دعوت نبوی کا طبعی اقتضا مصالحت و امن پسندی تھا، اس دعوت کی ایک اصل یہ ہے کہ مصالحت کے تمام معقول وسائل و ذرائع استعمال کرنے سے پہلے قوت و طاقت کا استعمال ہرگز نہ کیا جائے۔

۲۔ محمد غوث، شنتو مذہب کی کتابیں، (برہان مئی ۱۹۵۱ء ۳۰۷ ـ ۳۱۲)

جاپان کے قدیم مذہب کا نام شنتو ہے جس کے معنی دیوتاؤں کے طریقہ کے ہیں، اس مذہب کی مشہور کتابیں یہ ہیں :-
'کوجی کی' 'نی ہون گی' اور 'نی سوئی گو'

۳۔ مناظر احسن گیلانی ، تورات کے دس احکام، اور قرآن کے دس احکام (برہان مئی ۱۹۵۱ء ۲۰۵ ـ ۲۹۸)

اپنی قومی ذہنیت اور مزاج کی وجہ سے یہود میں قنوط و یاس کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ ہلکی سے ہلکی مصیبت کی برداشت کی صلاحیت ان میں باقی نہ رہی تھی، ان کا خواہ مخواہ یہ سمجھ لینا کہ اب 'ملعونیت' اور 'مغضوبیت' سے ہم نکل نہیں سکتے قطعاً غلط ہے،

۴۔ مناظر احسن گیلانی ، تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام (برہان جون ۱۹۵۱ء ۳۵۰ ـ ۳۶۲)

دین کی حقیقی روح سے اسرائیل کی اولاد محروم ہو چکی تھی اور ایک کھوکھلے قالب کی شکل میں دین اُن میں باقی رہ گیا تھا، میرا خیال ہے کہ برکت کے متعلق جن خوش فہمیوں میں یہود مبتلا تھے ان ہی کو قرآن اپنے اس اعلان سے صاف کرنا چاہتا ہے کہ زندگی کے موجودہ عبوری دور کی کسی کامیابی کو اپنی دینی زندگی کی صحت کی دلیل ٹھہرا لینا مذہبی اقوام کا شدید دماغی مغالطہ ہے۔

۵۔ مناظر احسن گیلانی ، تدوین حدیث محاضرۂ چہارم (۱۶) (برہان مئی ۱۹۵۱ء ۲۶۱ ـ ۲۷۲)

حدیث میں فتنے کی ابتدا جن لوگوں کی راہ سے ہوئی یہ وہی تھے جن کے لئے حضرت عثمانؓ کی نرم حکومت نے بیباکانہ جسارتوں کے ارتکاب کے مواقع فراہم کر دئے تھے حضرت علیؓ کا جمع کردہ حدیثوں کا صحیفہ ان کی تلوار کی نیام میں رکھا ہوا تھا، ان کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اتنی شدت اور کڑی نگرانی ضروری نہ تھی جیسی کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نزدیک تھی۔

۶۔ مناظر احسن گیلانی ، تدوین حدیث محاضرۂ چہارم (۱۷)

(برہان جون ۱۹۵۱ء ۳۲۵ – ۳۳۶)

بعض روایتوں پر اعتماد کرنے کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت علیؓ کی حدیثوں کے تین چار مجموعے لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے، کچھ بھی ہو اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علیؓ تقلیل فی الروایۃ کے اصول پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے،

۷۔ میر ولی الدین، معتزلہ (۵) (برہان مئی ۱۹۵۱ء — ۲۷۳ – ۲۸۴)

حدوث عالم اور یہ کہ خدا فاعل مختار ہے کے حق میں دلائل پیش کئے ہیں اور معتزلہ کی شاخ جبائیہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے،

۸۔ میر ولی الدین (ڈاکٹر)، معتزلہ (۶) (برہان جون ۱۹۵۱ء ۳۳۷ – ۳۴۹)

امامت انکار رؤیت باری، عرفان حق واجب عقلی ہے، منزلۃ بین المنزلتین کے سلسلہ میں جبائی کے خیالات پر تنقید کی گئی ہے معتزلہ کے دوسرے گروہوں کے خیالات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

تاریخ و سیاست

۹۔ ادارہ۔ امریکہ کا ڈالر اور روس کی جنگی تیاریاں (نگار جون ۱۹۵۱ء ص ۲۵ – ۲۶)

امریکہ اور روس کے موجودہ کشیدہ تعلقات کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خود امریکہ نے روس کی جنگی تیاریوں میں اس کی مدد کی ہے تو کسی کو یقین نہ آئے گا لیکن واقعہ یہی ہے، اعداد و شمار کی مدد سے بتایا گیا ہے کہ مارشل پلان، اُدھار پٹہ اور دیگر مراعات کے تحت کس حد تک روس کو امریکہ سے فائدہ پہنچا ہے۔

۱۰۔ ادارہ۔ تاریخ یونان کا ایک پوشیدہ ورق (سکندر اعظم کی تخت نشینی کی خونیں داستان)، نگار مئی ۱۹۵۱ء ص ۲۲ – ۲۴۔

مسیح سے چار سو سال قبل کے عہد آموز کے جنسی اختلاط، شہنشاہ فلپس اور رقاصہ المپیاس کے رومان، سکندر کی ولادت فلپس اور المپیاس کی نا چاقی اور سکندر کی تخت نشینی کی دلچسپ داستان بیان کی گئی ہے۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۱۱۔ برکاتی۔ منظور الحسن: اسد لکھنوی اور ٹونک (آجکل ۱۵ جون ۲۴ – ۲۶)

اسد لکھنوی کے حالات زندگی اور ریاست ٹونک سے ان کے تعلق، کے ساتھ ساتھ نمونۂ کلام اور تلامذہ کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

۱۱۔ بشیر محمد خاں برہانپوری، حضرت شاہ برہان الدین رازی (معارف مئی ۱۹۵۱ء ۳۷۸ — ۳۹۰)

حضرت برہان الدین راز الٰہی کے مختصر حالات زندگی اور اورنگ زیب اور دوسرے امراء سے ان کے تعلقات بیان کئے گئے ہیں۔

۱۲۔ بشیر محمد خاں برہانپوری، حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی (۲) (معارف جون ۱۹۵۱ء ۴۶۴ – ۴۷۴)

راز الٰہی کی عبادت و ریاضت، تصانیف، اقوال و ملفوظات اور شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے۔

۱۳۔ خورشید احمد فاروق، مختار ابو عبید ثقفی (۲) (برہان مئی ۱۹۵۱ء ۲۹۵ — ۳۰۷)

مختار نے اٹھارہ ماہ حکومت کی جو یا ساڑھے تین سال اس میں شک نہیں کہ یہ عہد عربی تاریخ میں ایک نہایت انوکھا عہد ہے اور مختار کی شخصیت بحیثیت ایک حکمران، ایک ڈپلومیٹ اور ایک فرد کے پہلی صدی ہجری کے عرب حکمرانوں سے ممتاز ہے،

۱۴۔ خورشید احمد فاروق، مختار بن ابی عبید الثقفی (۳) (برہان جون ۱۹۵۱ء ۳۶۳ – ۳۷۱)

مختار نے اپنی کامیابی کے لئے اس گروہ کو پسند کیا جو اہل بیت کا معتقد تھا، اس کی پالیسی اور مذہبی بہروپ کے بارے میں مسعودی اور بلاذری سے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔

۱۵۔ شرما سنیہ دیو: مہادیوی ورما (آجکل ۱۵ جون ۱۹۵۱ء)

مہادیوی ورما عہد حاضر کے ہندی شعرا میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ وہ فن مصوری سے بھی واقف ہیں لیکن انھیں

موقلم سے زیادہ قلم پر دسترس ہے، گیت نویسی ان کا خاص میدان ہے، مضمون میں ان کے چند گیت مع ترجمہ پیش کئے گئے ہیں اور ان کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۶۔ صدیقی۔ اولاد احمد: برٹرنڈ رسل (آجکل، ۱۵ مئی ۱۹۷۰ء، ص ۲۹)

۱۹۵۰ء کا ادبیات کا نوبل پرائز پانے والے مفکر برٹرنڈ رسل کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں اور ان کی ادبی اور فلسفیانہ صلاحیتیں کو سراہا گیا ہے ان کے انداز فکر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں معاشی نقطۂ نظر سے چڑ ہے اور وہ ہر مسئلہ کو نفسیاتی مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ وہ اشتراکیت اور سرمایہ داری میں کوئی فرق نہیں پاتے لیکن موخر الذکر کو اول الذکر پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ فرد کا احترام کرتی ہے اور اس کے برعکس اشتراکیت اسے سماج کا تابع بناتی ہے۔

۱۷۔ ناصر علی خاں: جین پال سارتر (آجکل، ۱۵ مئی، ۱۹۶۴ء) فلسفۂ وجودیت کے بانی اور موجودہ دور کے سب سے بڑے فرانسیسی مفکر اور ادیب جین پال سارتر کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں اور ان کے افسانوں کی فنی خوبیوں اور ان کے فلسفۂ وجودیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تنقید، ادب و لسانیات

۱۸۔ ابومحفوظ الکریم معصومی، قصیدۃ العرس (معارف مئی ۱۹۶۹، ۳۹۱ – ۳۹۷)

خالد بن صفوان کی یادگار ایک بے ربط سا قصیدہ العرس ہے، پروفیسر عبدالعزیز میمنی نے اسے الطرائف الادبیہ میں شائع کیا، رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کی مدد سے مقالہ نگار نے تصحیح کی کوشش کی ہے۔

۱۹۔ احتشام حسین۔ زبان اور رسم خط کا تعلق (بحث کے لئے) نگار، جون ۱۹۶۵ء، ص ۳۵ – ۳۹)

زبان کی قومی، بین الاقوامی اور تہذیبی اہمیت علمی حیثیت سے مسلم ہے۔ پہلے زبان اور رسم خط کی ابتدا و ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ زبان اور رسم خط میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اس مسئلہ کو بحث کی غرض سے چھیڑا ہے اگر بحث و مباحثہ کے بعد یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ زبان و رسم خط دو الگ الگ چیزیں ہیں تو پھر یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ اردو کے لئے دیوناگری، لاطینی اور فارسی رسم خط میں سے کونسا رسم خط اختیار کیا جائے۔ آخر میں نگار کے ادارہ کی طرف سے مختصراً اس مقالہ پر اظہار خیال اور ارباب علم کے لئے دعوت غور و فکر ہے۔

۲۰۔ ادارہ۔ ادبیات ملایا پر فارسی کا اثر (نگار، مئی ۱۹۶۵ء ص ۸، ۳۸)

اسلام تیرھویں صدی عیسوی میں براہ ہندوستان ملایا پہونچا اور اس کے ساتھ ادبیات فارسی سے بھی وہاں کے لوگ آشنا ہوئے۔ ملایا آنے والے ایرانیوں، ملایا میں فارسی کتابوں کے تراجم اور ملایا کی شاعری پر فارسی زبان کے اثر کا ذکر چند سطروں میں کیا گیا ہے۔

۲۱۔ اسلام حسین: سریلے بول (آجکل ۱۵ مئی ۱۷ – ۲۲)

مضمون میں عظمت اللہ خاں کی شاعری کا بالتفصیل ذکر ہے عظمت اللہ خاں پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں ہندی اور اردو کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں پہلی بار ہندوستانی عورت کو ایک مستقل موضوع بنا کر اس کے دکھ درد کی اسی کی زبانی ترجمانی کی۔ انھوں نے مرثیے اور مثنوی سے ہٹ کر واقعہ نگاری کی ایک نئی راہ نکالی، گھریلو زندگی کی منظر کشی میں وہ منفرد ہیں، خشک موضوعات کو اپنانے کے باوجود انھوں نے موزوں انتخاب الفاظ، مناسب بحروں اور شیریں طرز بیاں کی مدد سے حسن شعریت کو قائم رکھا اور یہ ان کا بڑا فنی کمال ہے۔

۲۲۔ انصاری: محمد رضا: ہفتہ وار "طلسم" لکھنؤ، ایک صدی پرانا اخبار (آجکل ۱۵ جون، ۴۲ – ۴۳)

یہ اخبار ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء کی شورش سے دو دن قبل بند ہو گیا۔ دستیاب شدہ شماروں کی روشنی میں اس اخبار کے مندرجہ ذیل پہلو

کو اجاگر کیا گیا ہے، محل اشاعت الگ و مدیر اور تاریخی موقف۔

۲۳۔ جعفر بارھوی: اردو میں علمی اور فنی اصطلاحات (معاشیات ۱۵، جون ۱۹۴۹ء ۳۱۹ - ۳۲۵)

یورپ کی ترقی وہاں کی مختلف زبانوں کی وسعت کی رہین منت ہے۔ پاکستان میں چونکہ اردو سرکاری زبان بننے والی ہے اس لئے اسے بھی وسیع کرنا چاہیئے۔ مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھنی چاہئیں اور اصطلاحات گڑھنی چاہئیں۔ ویسے اردو میں بہت اصطلاحات پہلے سے بھی موجود ہیں۔ البتہ نئی اصطلاحوں کے لئے دقت نظر اور قابلیت سے کام لینا چاہیئے۔ مثال کے لئے مضمون نگار نے اپنی کتاب "حساب تجارت کے اصول" میں سے اردو کے اصطلاحی ترجمے دئے ہیں۔

۲۴۔ جہاں بانو: کلام اکبر پر ایک طائرانہ نظر (سب رس ۱۵، جون ۴۲ - ۴۸)

اسکولوں وغیرہ میں چونکہ ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت اکبر کا انتخاب پڑھایا جاتا ہے، اس لئے طلبا اکبر سے خلاف اور بدظن ہو جاتے ہیں، جسکی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے ہاں عشق و حسن، سلوک و معرفت، اخلاق، پند و نصائح سبھی کچھ ہے طنز و مزاح اس کی سب سے نمایاں اور خاص چیز ہے۔

۲۵۔ شکیل الرحمن شکیل۔ اردو ادب فساد میں (نگار جون ۱۹۵۰ء ص ۵ - ۱۲)

ابتدا میں ادب اور زندگی کے باہمی تعلق، مارکس کے فلسفہ، پیدائش دولت کے ذرائع اور سماج کی طبقاتی ترتیب سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح اردو کے ترقی پسند ادیبوں نے دوسری جنگ عظیم، قحط بنگال، آزادی و مابعد آزادی اور فساد سے متعلق ادبی تخلیقات کیں۔

۲۶۔ اعجاز حسین اعظمی: مختصر افسانہ (آج کل ۱۵ مئی ۴۸ - ۵۰)

مختصر افسانہ کی مختلف تعریفیں پیش کرنے اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بعد اردو مختصر افسانہ کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے اور موجودہ دور کی افسانہ نگاری کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔

۲۷۔ صدیقی، کمال احمد: اردو ناول کا ارتقا (آجکل ۱۵

جون ۴۴ - ۴۹)

موجودہ ناولوں کے مختلف کرداروں میں پائی جانے والی یک رنگی پر اظہار تاسف کرنے کے بعد، ناول میں کردار کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور ان خاص خاص کرداروں پر اظہار خیال کیا گیا ہے جو اردو کے قابل ذکر ناول نویسوں نے اردو ادب کو دئے ہیں۔ جن کرداروں سے قدرے تفصیل سے بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں:۔

(اصغری، اکبری، نصوح، ابن الوقت۔ نذیر احمد)، آزاد اور خوجی (پنڈت رتن ناتھ سرشار)، اور امراؤ جان ادا (ہادی رسوا)

۲۸۔ عبد السلام ندوی، فلسفۃ البلاغت (معارف، جون ۱۹۵۱ء ۴۲۶ — ۴۵۰)

شام کے ایک عیسائی کالج کے عربی پروفیسر جبر ضومط نے فلسفۃ البلاغت کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جس کے مطالب کا خلاصہ یہاں دیا گیا ہے، اس میں بلاغت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۹۔ عرش ملسیانی: راؤنڈ ٹیبل ادبی مباحثہ (آجکل ۱۵ مئی ۲۴ - ۲۷)

راؤنڈ ٹیبل ادبی مباحثہ کی روداد جو ۱۷ فروری ۱۹۵۱ء کو دہلی کالج ہال میں بزم ادب کے زیر اہتمام منعقد ہوا، جس میں اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ نئے ہندوستان کی تاریخ میں اردو کے ادیبوں کا کیا حصہ رہا۔ اس مباحثہ کی صدارت خواجہ غلام السیدین نے کی، اور اس میں مندرجۂ ذیل حضرات نے حصہ لیا۔ آل احمد سرور، احتشام حسین۔ ڈاکٹر عبد العلیم، جگن ناتھ آزاد، امین لکھنوی، مس سیدہ ثریا سلطانہ، خورشید الاسلام، نور علی سردار جعفری۔

۳۰۔ عرش ملسیانی: نظریاتی مشاعرہ (آج کل ۱۵ مئی ۴۷ - ۴۸)

۱۸ فروری ۱۹۵۱ء کو دہلی کالج بزم ادب کی جانب سے ایک نظریاتی مشاعرہ زیر صدارت جوش ملیح آبادی ہوا جس میں ہر شاعر نے پہلے اپنا نظریہ فن پیش کیا اور اس کے بعد اپنی نمائندہ نظم یا غزل پڑھی۔ شرکاء مشاعرہ کے نام یہ ہیں۔ جوش، تلوک چند

مرحوم، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری، امن لکھنوی تاباں، خلیل الرحمٰن اعظمی، آل احمد سرور اور احتشام حسین وغیرہ اس مضمون میں عرش ملسیانی نے اپنے نظریہ شاعری پر روشنی ڈالنے کے بعد اپنی ناشائع شدہ نظم بعنوان "جہل کی رات" بھی پیش کی ہے۔

۳۱۔ عزیز حسن۔ سرقہ، توارد، استفادہ (مسلسل) (نگار مئی ۱۹۵۰ء، ص ۱۴-۲۱)

مختلف شعرا کے اشعار پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ واردات اور تخیلی شاعری میں بہت تھوڑا اور بہت ہی نازک فرق ہوتا ہے۔ تخیلی شاعری ہی توارد کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں اگر کوئی شاعر اپنے پیش روؤں کے خیالات اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے تو اس کو سرقہ نہ سمجھنا چاہیے۔ یا ترجمہ سمجھنا چاہیے یا استفادہ ہر زبان کے شعرا اور مصنفین اپنے پیش روؤں سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں اور کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف بھی کرتے رہے ہیں۔ متقدمین سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہی متاخرین بعض نازک اور عمدہ مضامین پیدا کرسکے۔ اگر متقدمین سے استفادہ کرنا سرقہ سمجھ کر ترک کردیا جائے تو ان تمام فوائد سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

۳۲۔ عشرت حسن انور، اقبال اور برگسان (معارف مئی، ۱۹۴۶ء، ص ۳۶۰-۳۷۷)

اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کس حد تک برگسان کے ہم نوا ہیں اور کس مقام پر پہنچکر وہ برگسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

۳۳۔ عطاء الرحمٰن کاکوی، آتش اور شاد۔ (نگار مئی ۱۹۵۰ء ص ۵-۱۳)

بسلسلۂ ماسبق آتش اور شاد کی ہم طرحی غزلوں اور متحد التخیل مضامین کا موازنہ پیش کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے شاد کو آتش پر فوقیت حاصل ہے۔ اور غالب کے بعد شاد جیسا زبردست غزل گو پیدا نہیں ہوا۔ آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ شاد اور آتش کے کلام کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ دونوں حافظ شیراز سے بہت قریب ہیں اور دونوں کے یہاں تغزل کا متغزلانہ رنگ نمایاں ہے لیکن آتش کے یہاں یہ رنگ زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ آخر میں شاد کے "خمریات" سے بحث کی گئی ہے۔

۳۴۔ عطاء الرحمٰن۔ میر و راسخ کا تقابلی مطالعہ۔ (نگار مئی ۱۹۴۶ء، ص ۲۸-۳۵)

مختلف مضامین پر میر و راسخ کے ہم معنی اشعار پیش کرکے دونوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔

۳۵۔ عندلیب شادانی۔ لکھنوی شاعری کی چند خصوصیتیں (نگار جون ۱۹۴۶ء، ص ۲۷-۳۸)

لکھنوی شاعری سے مصنف کی مراد ناسخ و آتش اور ان کے پیروؤں اور شاگردوں کی شاعری ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں جو چیزیں خاص طور پر مابہ الامتیاز ہیں ان میں سے ایک محبوب کی جنس کا تفاوت بھی ہے۔ اس خصوصیت اور اُس زمانہ کی عشقیہ شاعری پر ہلکی سی روشنی ڈالنے کے بعد لکھنوی شاعری کی خصوصیات سے مع امثال بحث کی گئی ہے۔

۳۶۔ عشرت حسن انور (ڈاکٹر) اقبال و نیٹشے (معارف جون ۱۹۴۶ء، ص ۴۵۱-۴۶۰)

اقبال کو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ برگسان کا "زور زندگی" خود ایک اور مصدر سے مشتق ہے جس کو انھوں نے "زور خودی" سے تعبیر کیا، اس نقطہ پر پہنچ کر اقبال نیٹشے کے خیالات سے اثر پذیر ہو کر اپنے فلسفۂ خودی کی تعمیر میں مصروف ہوجاتے ہیں، نیٹشے کا نظریۂ خودی جو شوپن ہار کے خیالات کا ردِ عمل ہے بیان کیا گیا ہے۔

۳۷۔ غلام مصطفیٰ خاں (ڈاکٹر)، اردو املا کی تاریخ۔ (معارف جون ۱۹۴۶ء، ص ۴۰۵-۴۳۵)

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس زمانہ میں کونسے حروف کس طرح سے لکھے جاتے تھے، ان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں چنانچہ اس کے لئے معلومات نہ صرف مطبوعہ کتابوں سے بلکہ نادر مخطوطات سے بھی حاصل کی گئی ہیں اور

کوشش کی گئی ہے کہ صحیح صحیح چیزیں نظر کے سامنے آجائیں تاکہ ہمارے محققین کچھ اسلاف کے اختیار کردہ اصول سے اور کچھ اپنے اجتہاد سے املا کے صحیح قاعدے منضبط کر سکیں۔

۳۸۔ محمد لبشیر الحق بیدل دسنوی، حضرت شیخ سیف الدین باخرزی اور ان کی رباعیات (معارف مئی ۱۹۵۱ء ۳۴۴۔۳۶۲)

ساتویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ سیف الدین باخرزی کی فارسی رباعیات کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں موجود ہے جن کو صلاح الدین خدا بخش نے ایک جرمن رسالہ میں شائع کیا تھا یہاں باخرزی کی رباعیات درج کی گئی ہیں بعد ان پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے، باخرزی کے حالات زندگی کا ایک مرقع بھی دیا ہے۔

۳۹۔ محمد عزیز حسن۔ سرقہ توارد، استفادہ (مسلسل نگار جون ۱۹۵۱ء ص ۱۳ ۔ ۲۴)

جذباتی شاعری کی حالت تخئیلی شاعری کے برعکس ہے۔ جذباتی شاعری شاعر کی ذاتی چیز ہے۔ اس لئے اس سے استفادہ جائز نہیں ہے۔ جو کچھ واردات سے متعلق ہے اس میں ترجمہ یا استفادہ سرقہ ہے۔ لیکن کسی شعر یا مصرع پر سرقہ کا اطلاق کرنے سے پہلے اسے آمد اور آورد کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے اور یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اس کی تخلیق میں شاعر کی دماغی کاوش کا کتنا حصہ ہے۔ اسی طرح اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ کہیں شاعر کے قلم سے غیر شعوری طور پر یہ مصرع یا شعر نہ ٹپکا ہو۔ حال ماضی کی پیداوار ہوتا ہے اور شاعر اپنے ماحول کا عکاس۔ لہذا شاعر کے خیالات کا اپنے پیشروؤں کے خیالات سے ٹکرانا بعض وقت ناگزیر سا ہو جاتا ہے۔

۴۰۔ ملسیانی۔ جوش، اردو نظم میں فارسیت (آج کل ۱۵ جون ۱۹۔ ۲۳)

"فارسیت" سے مقالہ نگار کی مراد اردو میں مقبول و مروج فارسی الفاظ و مرکبات نہیں بلکہ وہ فارسی الفاظ و مرکبات ہیں جو عوام تو عوام خواص بھی نہیں بولتے لیکن جو صرف ضرورت شعری کی آڑ میں اشعار میں استعمال ہوتے آئے ہیں مقالۂ ہذا میں قادر الکلام شعرا کے ایسے اشعار پیش کئے گئے ہیں جن میں مذکورۂ بالا مضمون میں فارسیت ہے اور اس قسم کے الفاظ و مرکبات کو واجب الترک قرار دیا ہے۔

۴۱۔ مہیش پرشاد: تصانیف مرزا غالب کی ابتدائی اشاعتیں (سب رس ۵۱ جون ۳۔۹)

گل رعنا، سیر باغ دودر، میخانۂ آرزو، اردو اور فارسی کے صاحب کمال ادیب اور شاعر غالب کی غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ دیوان غالب اردو، کلیات نظم فارسی، پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، قاطع برہان، مثنوی گہر بار، نامۂ غالب، تیغ تیز، سبد چین، عود ہندی، اردوئے معلی، دیوان غالب اردو (حمیدیہ) مکاتیب غالب، متفرقات غالب، نادرات غالب، آثار غالب کے نفس مضمون کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مختلف اشاعتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ نکات غالب فاتحات غالب اور دعای صباح البتہ نہیں پر اسی قسم کا نوٹ ہے۔ البتہ ان کے طبع اول کے نسخے مضمون نگار کی نظر سے اپریل ۱۹۵۰ء تک نہیں گزرے تھے۔

۴۲۔ نظامی خلیق احمد: خواجہ احمد فاروقی (آجکل ۵۱ مئی ۴۔۸)

مقالہ نگار خواجہ احمد فاروقی کو زمانہ طالب علمی سے جانتے ہیں اور ان کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ مقالہ ہذا میں ان کی تصنیفات کے ساتھ ساتھ ان کے ان علمی اور تنقیدی مضامین کا بھی قدرے تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جو رسالۂ اردو، نگار، نقوش، جامعہ، ہمایوں، برہان اور نئی روشنی میں نکل چکے ہیں اور جا بجا اقتباسات پیش کر کے انکی تنقیدی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی تنقید کا مخصوص پہلو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ حسینی یا جمالیاتی نہیں بلکہ اس میں قدم قدم پر تاریخ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اسلئے کہ خواجہ صاحب تاریخ کا بڑا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔

۴۳۔ نواب علی: سروش عسکری، ایک غزل گو کی حیثیت سے (آج کل ۵۱ جون ۵۔۱۰)

سروش عسکری کی غزلوں کے محاسن گنائے گئے ہیں۔ ان کی

غزلوں کے اکثر اشعار "ادب برائے حیات" کی نمایندگی کرتے ہیں اور ان کی بالغ نظری اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہیں جن میں تاملِ اظہار، ادرما و رائیت جیسی خوبیاں ملتی ہیں۔ انکا انداز کلاسیکی اور ان کے اکثر اشعار سادہ و پرکار ہیں۔

آرٹ (علوم و فنون)

۴۴ - سید محبوب رضوی: دیوبند کی چند تاریخی مسجدیں (برہان جون ۱۹۵۱ء ۳۶۲-۳۷۸)

دیوبند کی چند تاریخی مسجدوں کا مفصل تذکرہ ہے۔

معاشرتی حالات

۴۵ - محمد شریف الدین: حیدرآباد میں صنعتی تعلیم (سب رس ۱۵ مئی ۲۵-۳۰) حیدرآباد کی صنعتی تعلیم اور اس کی ترقی و وسعت پر تاریخ وار تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ تعلیم ۱۸۷۷ء میں شروع ہوتی ہے چھوٹی موٹی دیسی صنعتوں سے شروع ہو کر اب یہ تعلیم ٹیکسٹائل، ایئر فورس میکانکس وغیرہ کو محیط ہے۔ وزیر تعلیم اور وزیر محنت اس پر خاص توجہ کر رہے ہیں۔ حکومت کے علاوہ چند خانگی ادارے بھی ہیں جو صنعت و حرفت کی تعلیم دیتے ہیں۔

۴۶ - ادارہ: پاکستان کی پہلی مردم شماری (معاشیات ۱۵ مئی ۲۶۸-۲۷۱)

پاکستان میں فروری ۱۹۵۰ء میں پہلی مردم شماری ہوئی تھی جسکی علاقائی تفصیل عارضی اعداد کے ساتھ دی گئی ہے۔ سب سے زیادہ اضافہ مشرقی پاکستان کی آبادی میں ہوا۔ مخصوص حالات کی وجہ سے کشمیر میں مردم شماری نہیں ہو سکی۔

۴۷ - ادارہ: جمہوریہ ہند کی پہلی مردم شماری (معاشیات ۱۵ مئی ۲۷۲-۲۷۳)

فروری ۱۹۵۱ء میں جمہوریہ ہند میں پہلی مردم شماری ہوئی جس کی علاقائی تفصیل عارضی اعداد کے ساتھ دی گئی ہے۔

اقتصادیات

۴۸ - آمنہ قدوس زبیری: پاکستان میں تحریک امداد باہمی کو فروغ دینا بہت ضروری ہے۔ بلا قرضہ کے مقابلے میں انجمن ہائے امداد باہمی قرضہ بہت مفید ہے۔ اس کا اعتراف شاہی کمیشن اور مجلس جمعیت اقوام نے بھی کیا ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی بینک کاری کی تجدید و توسیع میں تحریک امداد باہمی نے زبردست حصہ لیا ہے۔

۴۹ - انور سعید انواری: کشمکش (معاشیات ۱۵ مئی ۲۵۱-۲۶۰)

کوریا کی لڑائی کا محدود رہ جانا مشکل ہے اس لئے کہ دنیا کی تقریباً نصف قومیں برسر پیکار ہیں اور یہ جنگ دراصل نظریاتی جنگ ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داریت کے حامی روس اور امریکہ کی سرکردگی میں لڑ رہے ہیں۔ وہ وقت قریب ہے جب اس جنگ کی لپیٹ میں پوری دنیا آجائے گی۔ چنانچہ موقع کے لحاظ سے مضمون نگار نے اشتراکیت کے ضمنی ذکر کے ساتھ سرمایہ داری کے مالہ و ماعلیہ پر ایک تبصرہ کیا ہے۔

۵۰ - ادارہ: ۵۲-۱۹۵۱ء کے چند موازنے (معاشیات ۱۵ مئی ۲۸۶-۲۸۷)

سرسری تبصروں کے ساتھ پنجاب، سندھ، بہاولپور اور کراچی کارپوریشن کے موازنے پیش کئے گئے ہیں۔

۵۱ - ادارہ: شاہی ترجیحات کا خاتمہ (معاشیات ۱۵ مئی ۲۸۰-۲۸۵)

۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے اپنی تجارت کو برقرار رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے غیر منقسم ہندوستان سے ایک تجارتی معاہدہ (معاہدۂ اٹاوہ) کیا تھا جسکی وجہ سے برطانیہ کو فائدہ اور ہندوستان کو نقصان پہنچا۔ اس کے خلاف غیر سرکاری حلقوں نے بڑا احتجاج کیا لیکن قانونی مشین کے ذریعہ اس معاہدہ کی شاہی ترجیحات باقی رہیں اور ہندوستان میں تو اب بھی ہیں۔ البتہ تقسیم کے بعد پاکستان کو چونکہ اس سے بڑا نقصان پہونچ رہا تھا اس لئے اس کی تنسیخ کی کوشش کی گئی، حتیٰ کہ اپریل ۱۹۵۱ء میں اس معاہدہ کو ایک نئے مفید معاہدہ سے بدل دیا گیا۔

۵۲ - حامدہ سلطان: ایران کا تیل (معاشیات ۱۵ جون ۳۱۲-۳۱۸)

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ایران مغربی طاقتوں کا آماجگاہ بن گیا۔ برطانوی اثرات کے مقابلہ میں روسی اثرات زیادہ رہے۔ نہر سوئز کی وجہ سے اس کی بھی اہمیت بڑھی۔ تیل

اس کی خاص "دولت" ہے۔ امریکہ، روس اور رومانیہ کے بعد تیل سلسلہ میں اسی کا نمبر ہے۔ ۱۹۰۱ء میں مظفر الدین قاچاری نے ایک آسٹریلوی کو ۵ لاکھ پر تیل کا ٹھیکہ دیا۔ جس نے ۱۹۰۹ء میں نئی نئی قائم شدہ اینگلو ایرانی آئیل کمپنی کو دیدیئے۔ ۱۹۱۴ء میں برطانوی حکومت نے اس کے کافی حصے خرید لئے۔ معاوضہ میں ایران کو ایک محدود رقم ملتی رہی۔ لیکن ایرانیوں نے ہمیشہ اس "لوٹ" کو محسوس کیا اور تیل کے معاہدوں کو ختم کرنے کے در پے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۰ء میں تیل کو قومی قرار دیدیا۔ تاہم تمام معاملات ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں۔

۵۳ - شوکمار : آبادی اور خوراک (آجکل ۱۵ مئی ۵۳-۵۴ء)

مضمون میں ۲۰ تک مختلف ممالک میں قحط سے مرنے والوں کے اعداد و شمار پیش کرنے کے ساتھ ساتھ خوراک کی اہمیت بتائی گئی ہے اور اس سلسلہ میں بھارت اور چین کی زبوں حالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو آج بھی اناج کے لئے امریکہ اور روس کے دست نگر ہیں۔ مضمون کے آخر میں اُمید ظاہر کی گئی ہے کہ بھارت میں غذائی صورت حال بہت جلد بہتر ہو جائے گی۔

۵۴ - عباس خلیلی : پاکستان میں جہاز رانی اور جہاز سازی (معاشیات ۱۵ مئی ۲۴۴-۲۵۰)

ساحلی ملک، نیز دو حصوں کی فاصلگی کی وجہ سے پاکستان کی حکومت نے اپنے قیام کے دن ہی سے جہاز رانی اور جہاز سازی کی طرف متوجہ اور انہیں فروغ دینے میں کوشاں ہے۔ اس سلسلہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے طالب علم باہر بھیجے گئے چالن کی نئی بندرگاہ بنائی گئی، مقامی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی بھی جاری ہے۔ ماہی گیری کا چونکہ اس سے خاص تعلق ہے اور وہ بھی ایک اہم حرفت ہے، اس لئے جہاز رانی اور جہاز سازی پر مزید توجہ صرف کی جا رہی ہے۔

۵۵ - قاسم محمود : معاشیات کے جدید نظریے (معاشیات ۱۵ جون ۲۹۴-۳۰۷)

معاشیات کی اب تک کوئی واضح تعریف نہیں کی گئی ہے، اسلئے مضمون نگار نے فشر، کینز، سلگمن، ڈیون پورٹ، مارشل، کلے اور رچرڈ کی پیش کردہ تعریفوں سے سیر حاصل بحث کی اور ڈیون پورٹ سے اتفاق کیا ہے کہ معاشیات قیمت کی سائنس ہے۔

۵۶ - ہدایت اللہ : مشرقی پاکستان کی زرعی حالت (معاشیات ۱۵ جون ۳۰۸-۳۱۱)

مشرقی پاکستان کی زمین کی زرخیزی دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی کی وجہ سے ہے۔ تاہم یہ دریا نقصان بھی پہنچاتے رہتے ہیں۔ اس کا رقبہ ۵۳۶۰۰ مربع میل ہے جن کا ۱۲ فیصدی ناقابل کاشت، ۱۲ فیصدی پر کھیتی نہیں ہوئی، ۹ فیصدی جنگل ہے باقی ۶۳ فیصدی پر زراعت ہوتی ہے لیکن اس کا ۸ فیصدی کبھی ناموافق موسم یا اور دوسری وجہوں سے خراب ہو جاتا ہے بغیر مشین کے خود کفیل ہونا دشوار ہے۔ تاہم اس امر میں کوشش سے کمی کو گھٹایا جا سکتا ہے۔ دھان، جوٹ، گنا، کپاس، چائے تمباکو اور چھالیہ یہاں کی خاص پیداواریں ہیں۔ یہاں کی کمی مغربی پاکستان سے ہو جاتی ہے۔

نفسیات

۵۷ - جلیل احمد - ایم۔ اے : قوت متخیلہ اور روحانی تصورات (نگار مئی ۱۹۵۱ء ص ۲۵-۲۷)

قوت متخیلہ کے نتائج ہیں تقریباً ہر انسان میں ملتے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ قوتِ متخیلہ کے مختلف تجربات اور ان پر کئے ہوئے تجربے اعتراضات سے بحث کی گئی ہے۔ آخر میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ شاعرانہ خیالات عوام کی ذہنی سطح سے بلند ہوتے ہیں اور مخصوص وجدان کا نتیجہ ہونے پر جس کا اس مادی دُنیا سے کوئی علاقہ نہیں اور بتایا گیا ہے کہ ہماری ذہنی کیفیت اسباب و علل کی اسی طرح پابند ہے جسطرح مادی اشیا ہوتی ہے اس لئے ان کو روحانی حیثیت دینا غلطی ہے۔

تعلیمات

۵۸ - روی بال ریڈی : گاندھی جی اور بنیادی تعلیم (سب رس ۱۵ جون ۲۰-۲۴)

دسمبر ۱۹۴۹ء میں ہمایوں کبیر نے ایک معلوماتی مضمون اونا نیٹلنڈ ایشیا میں لکھا تھا۔ جس کا ترجمہ اس وقت پیش کیا گیا ہے۔ اس میں

موجودہ تعلیم کے نقائص، بنیادی تعلیم کی خصوصیات وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے گاندھی جی کے خیالات اور نظریات پیش کئے ہیں۔

۵۹ - یاد ماضی: ہماری علمی جدوجہد کے متعلق (سب رس - ۵۱ جون ۷-۸)

اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں کم چھپا کرتی تھیں اسی لئے کوشش بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہوتیں۔ کسی کتب خانہ نے انہیں جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ادارۂ ادبیات اردو کو اس دور میں اس کی سعی کرنی چاہیئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے مشہور مستشرق ڈاکٹر لائٹنر نے ملازمت سے سبکدوش ہو کر حیدرآباد میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ایک "مرکز ادارۃ فی دارالشرفا برالمشرقین ترویج العلوم المشرقیہ" قائم کیا، جہاں سے "الحقائق" ایک رسالہ نکلا۔ ڈاکٹر لائٹنر کے انتقال کے بعد ان کے ورثا اس ادارہ پر قابض ہوگئے تھے۔ مگر خواجہ کمال الدین اور سید امیر علی کی کوششوں کے بعد اسے ان سے لے لیا گیا اور اب وہ مسلمانوں کے تبلیغی مشن کا انگلینڈ میں مرکز بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر، سید علی بلگرامی، خلیل آفندی اور محمد عبدالجبار خان الحقائق کے مدیر تھے۔ (باقی)

تبصرہ و کتابیات

۶۰ - ادارہ: آج سے قبل کا ہندوستان از ڈاکٹر سید محمود۔ (برہان مئی ۱۹۵۵ء، ۳۱۷-۳۱۹)

اس کتاب میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے عہد پر از اول تا آخر ایک بڑا اچھا پر از معلومات اور مبنی بر حقائق تبصرہ ہے، حقائق اور واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف ان غلط افسانوں کی پر زور تردید بھی کرتے گئے ہیں جو مسلمان بادشاہوں سے یا بعض اسلامی تعلیمات سے منسوب ہو کر عام طور پر مشہور ہوگئے ہیں۔

۶۱ - اسلام کا تمدنی و سیاسی نظام: از نکہت شاہجہانپوری (معارف جون ۱۹۵۵ء، ۴۷۰-۴۷۰)

مصنف نے ایک آیت کی تفسیر کے ضمن میں اسلام کے سیاسی و تمدنی نظام کو پیش کیا ہے، اطناب سے کام لیتے ہوئے انہوں نے ان مسائل پر جو سو سوا سو صفحوں میں آسکتے تھے۔ اپنے زور بیان سے چار سو صفحے صرف کر دیئے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنی آیت کی تشریح کے متعلق مصنف کے دماغ میں جس قدر خیالات اور مسائل بھرے ہوئے تھے انہوں نے کاغذ کے صفحات پر بکھیر دیا ہے، کتاب کا انداز تحریر خیبادہ اور موثر ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق میں مقبول ہوگی۔

۶۲ - ادارہ، ایم اسلم اور ان کا ادب۔ مرتبہ بدر السلام ذوغی (معارف جون ۱۹۵۵ء ۴۷۸-۴۷۹)

مرتب نے ایم اسلم کے حالات، عادات، سیرت و کردار ادبی و اصلاحی خدمات اور فنی خصوصیات پر مقالات کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، ناشر و مرتب مستحق ستائش ہیں کہ انھوں نے ایک صاحب فن کی قدردانی کا حق ادا کیا ہے، کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

۶۲ - ادارہ - پاکستانی عورت دوراہے پر۔ از مین حسن اصلاحی (معارف مئی ۱۹۵۵ء ۳۹۸-۳۹۹)

کتاب میں سات باب ہیں جن میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر داد تحقیق دی گئی ہے، مصنف کے قلم میں کہیں تلخی و تیزی آگئی ہے مگر ان کا مقصد اور نقطۂ نظر بالکل صحیح اور کتاب اپنے موضوع پر بہت مفید ہے۔

۶۳ - ادارہ، ذکر غالب از مالک رام (معارف مئی ۱۹۵۵ء ۳۹۹-۴۰۰)

مصنف نے اپنی کتاب ذکر غالب پر نظر ثانی کر کے نئے اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے، غالب پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے یہ کتاب امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

۶۴ - ادارہ، ذکر غالب از مالک رام ایم۔ اے دوسرا ایڈیشن (برہان جون ۱۹۵۵ء ۳۸۶)

یہ کتاب صرف غالب پر نہیں بلکہ اردو ادب میں بڑا قیمتی اضافہ ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کر کے فاضل مصنف کے ذوق تحقیق اور حسن انشا کی داد دیں گے۔

۶۵ - ادارہ، علیگڈھ میگزین غالب نمبر (برہان جون ۱۹۵۵ء ۳۸۲-۳۸۳)

یہ نمبر "خاصہ کی چیز" ہے، ارباب تحقیق و نظر نے اپنی کاوشوں کو زیادہ تر میرزا کے ذاتی و خاندانی حالات و سوانح تک محدود رکھا ہے لیکن ان کے کلام بالخصوص فارسی شاعری کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے، بہرحال مجموعی اعتبار سے یہ نمبر بہت زیادہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔

۶۶۔ ادارہ، فرہنگ غالب از امتیاز علی عرشی (ہماری جون ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۸۶)

غالب محض فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق ہی نہ رکھتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس زبان کے اور اس کے لغت کے مجتہد درجہ کے بھی تھے، مولانا عرشی کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ انھوں نے غالب کے تمام سرمایۂ نظم و نثر کو کھنگال کر ایسے تمام عربی، فارسی، اردو، ہندی اور ترکی لغات کا مجموعہ تیار کیا ہے۔

۶۷۔ ادارہ، کرنول کے تاجدار۔ از جی۔ ایم خان (معارف مئی ۱۹۵۱ء صفحہ ۴۰۰)

تیموری حکومت کے زوال کے زمانے میں دکن میں جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئی تھیں ان میں ایک ریاست کرنول (مدراس) بھی تھی، اس کتاب میں سرکاری دستاویزوں اور انگریز حکام کی تحریروں سے ریاست کرنول کے مظلومانہ خاتمہ اور خاندان کرنول کے ساتھ انگریزوں کی بدسلوکی کے حالات تحریر کئے گئے ہیں۔

۶۸۔ ادارہ۔ گاندھی جی اور شاہ خاں کے دیس میں۔ از شری پیارے لال، مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین (رہبر مئی ۱۹۵۱ء ۔ ۳۱۹ ۔ ۳۲۰)

اس میں گاندھی جی کے دورۂ سرحد کا مفصل حال لکھا ہے، ڈاکٹر عابد حسین ترجمہ کے لئے مشہور ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انھوں نے بڑی عجلت سے کیا ہے اور اس میں وہ روانی اور شگفتگی پیدا نہیں ہو سکی جو لائق مترجم کے ترجمہ کی خصوصیت ہے۔

۶۹۔ رفیعہ سلطانہ: ذکر غالب (سب رس ۱۵ جون ۴۹ء)

مالک رام نے غالب کی تصانیف اور خطوط غالب سے مدد لے کر غالب کی سوانح ترتیب دی، اور خاندان و شجرہ پر تحقیق کی ہے تاہم کتاب خشک نہیں ہو پائی۔ ادبی لطافت پائی جاتی ہے۔ آخر میں غالب کی تصانیف، لباس، عادات، اطوار اور گھریلو زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ پوری کتاب میں اعتدال سے کام لیا ہے۔ جس کے لئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

۷۰۔ رفیعہ سلطانہ: سماجیات (سب رس ۱۵ جون ۴۸ء)

جعفر حسن کی "ابتدائی عمرانیات" کے بعد علم سماجیات پر یہ دوسری کتاب ہے۔ زبان آسان اور عام فہم ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں خامیاں ہیں۔ امید کہ طبع ثانی میں دور کر دی جائیں گی۔ کتاب کی سب سے بڑی کمی انگریزی حوالوں کے ترجموں کی ہے۔ چھپائی اوسط اور کاغذ معمولی ہے۔ ان کے پیش نظر اس کی قیمت للعہ زیادہ ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی کتاب قابل قدر اور طالب علموں کے لئے مفید ہے۔

۷۱۔ رفیعہ سلطانہ: شعر و نغمہ (سب رس ۱۵ جون ۱۹۴۴ء)

یہ یعقوب عثمانی کا مجموعۂ کلام ہے ان کا وطن یوں تو لکھنؤ ہے مگر اب اورنگ آباد کے کہنہ مشق شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ خیال و بیان دونوں ہی ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں ترنم بھی ان کی خاص صفت ہے یہ غم دوراں کے شکوہ سنج نہیں۔ اس لئے ان کے ہاں ابدیت پائی جاتی ہے۔

۷۲۔ رفیعہ سلطانہ: لکیریں (سب رس ۱۵ جون ۴۸ء)

تارش پرتاب گڑھی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں ستارے شرارے، شعلے اور شگوفے عنوان قائم کر کے ستارے اور شرارے کے تحت غزلیں اور شعلے اور شگوفے کے تحت رباعیاں درج کی ہیں۔ غزلوں میں سوز و گداز اور فکر نمایاں ہے۔ داخلیت کی وجہ سے انفرادیت پیدا ہے۔ رباعیوں میں جوش کا رنگ ہے۔ اور غزلوں کا "روانی غم" فراق سے لیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ فراق کی زمین میں غزلیں بھی ملتی ہیں۔ ابتدا میں نیاز، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر اعجاز، جگن ناتھ آزاد، اعجاز صدیقی، ماہر القادری اور شفیق جونپوری کی رائیں اشارے کے عنوان کے تحت درج ہیں۔ ایک روپے میں یہ بہت زیادہ

قیمتی کتاب ہے۔

۷۳۔ ظفر حسین: ہم آپ (آجکل، ۱۵ مئی ۵۵-۵۶)

ہم آپ، جس کے مصنف عبدالماجد دریابادی ہیں پاپولر سائیکولوجی یعنی روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی نفسیات پر ایک عام فہم کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے موضوع کے جزئیات مسائل پر نہایت سہل اور دلنشین انداز میں بحث کی ہے۔

۷۴۔ فرید الوحیدی: آثار ابوالکلام آزاد (آجکل، ۱۵ مئی ۲۴-۲۵)

قاضی عبدالغفار کی تصنیف آثار ابوالکلام آزاد پر تبصرہ۔ یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کی فطری اور نفسیاتی کیفیات سے بحث کرتی ہے جس میں مصنف نے اپنے مطالعہ کی بنیاد مولانا کی شخصیت کو نہیں بلکہ ان کی تصانیف اور تحریروں کو بنایا ہے یہ کتاب اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے اس کی وجہ ایک تو سیرت نگاری کا یہ نیا طرز ہے اور دوسرے قاضی صاحب کا شاندار اسلوب بیان اور مخصوص زبان ہے کتاب کے آخری حصہ میں مولانا کے طنز و مزاح اور ان کے اسلوب نگارش پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے جو تبصرہ نگار کی نظر میں کتاب کے موضوع کو دیکھتے ہوئے خارج از بحث ہے۔

۷۵۔ ملسیانی، عرش: اسلام کے معاشی نظریے (آجکل، ۱۵ جون ۵۵-۵۶)

اس کے مصنف ڈاکٹر محمد یوسف الدین، استاد مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ ہیں۔ اسلامی نظام معیشت پر یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جو مصنف کی دس سالہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اردو کی ہر لائبریری میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔

۷۶۔ ملسیانی، عرش: اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں (آجکل ۱۵ مئی ۵۶)

ڈاکٹر مسز اینی بسنٹ کے ایک لکچر کا ترجمہ از ضیاءالدین احمد برنی

۷۷۔ ملسیانی، عرش: اصلاح الاصلاح (آجکل، ۱۵ جون ۵۵)

سیماب اکبرآبادی، اصلاحات اساتذہ پر گاہ گاہ شاعر آگرہ میں لکھتے رہے، ابر صاحب گنوری نے انھیں اصلاحات پر سیماب صاحب کے اعتراضات کا جواب مسلسل مضامین کی

صورت میں رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور میں شائع کیا کتاب ہذا انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب طالبان فن کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے مضامین میں لہجہ کہیں کہیں حد سے زیادہ تلخ ہے۔

۷۸۔ ملسیانی، عرش: راسخ (آجکل، ۱۵ جولائی ۵۶)

شاد عظیم آبادی کے شاگرد حمید عظیم آبادی نے راسخ عظیم آبادی پر ایک مبسوط مقالہ انتخاب کلام راسخ کے ساتھ شامل کر کے شائع کیا ہے یہ سعی مشکور ہر لحاظ سے قابل داد ہے۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر اختر اورینوی کا "حرف آغاز" درج ہے جو کتاب کا برمحل اور مختصر تعارف ہے۔

۷۹۔ ملسیانی، عرش: پرانے خدا (آجکل ۱۵ جون ۵۵)

کرشن چندر کے دس افسانوں کا مجموعہ، ان افسانوں میں کرشن چندر کی تخلیقی قوتیں اجاگر ہیں وہ طنز کے ذریعہ شائستگی میں مطلب کی بات کہہ جاتے ہیں نفس مضمون اور بیان کے اظہار میں انھوں نے بے تعصبی سے کام لیا ہے۔

۸۰۔ ملسیانی، عرش: ذکر غالب (آجکل، ۱۵ مئی ۵۶)

مالک رام کی لکھی ہوئی یہ قابل قدر کتاب غالبیات میں ایک گرانقدر اضافہ ہے یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو نظر ثانی کے بعد اضافے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ یہ غالب کے سوانح حیات، کلام اور کلام کا پس منظر، تصنیفات وغیرہ کے باب میں پرازمعلومات کتاب ہے۔ جگہ جگہ حواشی اور حوالہ جات سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب میں ایسی بہت سی معلومات بھی ہیں جو خود مصنف کی تحقیق کا نتیجہ ہیں

۸۱۔ ملسیانی، عرش: سفینہ و ساحل (آجکل، ۱۵ مئی ۵۶)

نوح ناروی کے شاگرد وارثی بچھرایونی کے کلام کا یہ مجموعہ ان کی صفائی خیال اور سلاست کا آئینہ دار ہے۔

۸۲۔ ملسیانی، عرش: کیوپڈ و سائیکی (آجکل، ۱۵ مئی ۵۶)

کتاب کا ترجمہ ضیاءالدین احمد برنی نے کیا ہے۔ کیوپڈ اور سائیکی کے پلاٹ سے متعلق آٹھ سہ رنگی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔

۸۳۔ ملسیانی، عرش: لطائف ناصر الدین (آجکل ۱۵ مئی ۵۶ء)

آقا محمد رمضانی کی کتاب کا یہ ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی نے کیا ہے۔ کتاب دلچسپ ہے۔

۸۴۔ ملسیانی، عرش، گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں (آجکل ۱۵ جون ۵۵ء)

کتاب کے مصنف مہاتما جی کے پرائیوٹ سکریٹری شری پیارے لال ہیں ڈاکٹر سید عابد حسین نے اسے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب پٹھانوں کی گاندھی جی اور ان کے اصول سے عقیدتمندی کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے اردو کا جامہ پہنا کر اردو ادب میں ایک بہت اچھی کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

۸۵۔ ملسیانی، عرش: ہمارا راج (آجکل ۱۵ جون ۵۶ء)

اس کے مصنف مدن موہن گیت ہیں۔ اس میں آسان زبان میں ہمارے ملک کے نئے دستور کی موٹی موٹی باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب میں کچھ تصویریں اور ایک نقشہ بھی شامل ہے بچوں کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے اور یہ کتاب یقیناً ایک بڑی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرے گی۔

۸۶۔ تازش پرتابگڑھی: الطاف کی انقلابی شاعری (سب رس ۱۵ جون ۹-۱۳)

الطاف صحیح اور سچا انقلابی شاعر ہے۔ اسے شاعر شباب سمجھنے والے غلطی کرتے ہیں۔ اس کے ہاں روایتی نہیں بلکہ حقیقی انقلابی شاعری ملتی ہے۔ چنانچہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اردو کے نقاد اس کی طرف سے عموماً بے توجہی برتتے رہے ہیں جس کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ وہ مارکس کے خیالات اور ادھر ادھر سے مانگے تانگے کی چیزوں کا مرہون منت نہیں زیر نظر مضمون میں الطاف کے ایک مجموعہ "داغ بیل" کے ایک باب کی انقلابی نظموں پر تبصرہ کیا ہے۔

۸۷۔ نصیر الدین ہاشمی: مقالہ وجدی (مصنف پنچھی باچھا) پر ایک تنقیدی نظر (سب رس ۱۵ مئی ۹-۱۲)

اردو ایم۔اے کی ڈگری کے لئے محمد بن عمر نے وجدی پر ایک پر مغز اور سیر حاصل تبصرہ لکھا ہے۔ زیر نظر مضمون میں محمد بن عمر کے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے ان کے مقالہ کی خوبیوں کو الگ الگ کرکے بتاتے ہوئے بتایا ہے کہ "تمہیدی پس منظر" میں احمد نگر کی نظام شاہی حکومت کا بھی ذکر ضروری تھا۔ اسی طرح وجدی کے ہم عصر شعرا میں ولی اور سراج کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ اس قابل قدر مقالہ کی اشاعت سے دکھنی ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔

وفیات

۸۸۔ جوش ملیح آبادی: ایک اور صاحب کمال اٹھ گیا (آجکل ۱۵ جون ۵۶ء)

آرزو لکھنوی کی مفارقت نے دل میں ایک تازہ گھاؤ ڈال دیا آپ الفاظ کی تحقیق، لغات کی پرکھ، فن شعر کے نکات، اصوات کا زیر و بم اور عروض کی دقیقہ سنجیوں میں ایک زبردست مجتہد تھے اور فن اور زبان کے مسائل میں ترقی پسندانہ خیالات کے حامل تھے۔ ان کی موت سے محفل ادب کی ایک اور شمع بجھ گئی۔

پرنٹر پبلشر محمد فضل اللہ فاروقی ندوی نے انصار فائن آرٹ لیتھو پریس سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے چھپوا کر دفتر نوائے ادب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ ہارنبی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا

JANUARY — MARCH

THE

NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY JOURNAL

OF

The Anjuman-e-Islam Urdu Research Institute

PUBLISHED EVERY

JANUARY & APRIL
JULY & OCTOBER

Publishing Agents:

WRITERS' EMPORIUM LTD.
POST BOX 1411 — BOMBAY 1.

Annual Subscription
Inland & Pakistan:
Rs. 3/-

Price each Copy
Re 1/-

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے
اغراض و مقاصد

۱۔ پی، ایچ، ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا
۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔
۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا۔
۴۔ ریسرچ کا کام کرنیوالے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا۔
۵۔ ایک جامع کتب خانہ قائم کرنا۔
۶۔ مختلف کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنا۔
۷۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء۔
۸۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور انھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۱۔ یہ خالص علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔
۲۔ اس میں اُردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔
۳۔ اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہو۔ انھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
۴۔ اُردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ برسر عام لایا جائے گا۔
۵۔ رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

In order to avoid wayside pilferage kindly send **TWO** copies of your publication addressed to

1 The Secretary
A I URDU RESEARCH INSTITUTE
92, Hornby Road, Bombay 1

2 The Secretary
THE WRITERS' EMPORIUM LTD
Post Box 1411, Bombay 1.

This will ensure the receipt of your publication for suitable incorporation of the articles into the NAWA-e-ADAB

Thank you.

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

چندہ سالانہ تین روپیہ
ششماہی دو روپیہ
فی پرچہ ایک روپیہ

چندہ سالانہ تین روپیہ
ششماہی دو روپیہ
فی پرچہ ایک روپیہ

جلد (۳)	اپریل سنہ ۱۹۵۲ء	نمبر (۲)

فہرست مضامین

شذرات

اپریل کے اوائل میں یونیورسٹی کے امتحانات کے سلسلہ میں متعدد ارباب علم و فضل بمبئی تشریف لائے تھے ان میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ڈاکٹر زبیر صدیقی صدر شعبۂ عربی کلکتہ یونیورسٹی ڈاکٹر سید محمد حسین نینار صدر شعبہ عربی فارسی اردو مدراس یونیورسٹی، پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی جناب آغا سید حیدر حسین صاحب ناگپور یونیورسٹی وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان بزرگوں میں سے بعض نے انسٹی ٹیوٹ کا معائنہ اور مفید مشوروں سے ہم کو سرفراز فرمایا۔ بعض نے قلمی و عملی معاونت کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ ہم ان مشوروں کی روشنی میں اپنے علمی تحقیقاتی کام کو مکمل تر اور وسیع تر بنانے کی کوشش کریں گے، لیکن ہماری راہ میں سب سے بڑی مشکل ہماری مالی حالت ہے۔ "نواے ادب" دو برسوں کی مسلسل کوششوں کے باوجود اب تک اس قابل بھی نہیں ہوا ہے کہ اپنے اخراجات ہی خود برداشت کرلے، یہ شکایت صرف ہمارے ادارے ہی کو نہیں ہے بلکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں کی مرکزی انجمن ترقی اردو کو بھی اس کا رونا ہے کیا ہم کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں ؟۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے کہ بعض مخلص ہستیاں ایسی بھی ہیں جو کہتی کچھ نہیں لیکن کرتی سب کچھ ہیں انھیں ادب ہستیوں میں غالبیات کے ماہر جناب مالک رام صاحب ہیں، حال ہی میں وہ مصر سے جب ہندوستان تشریف لائے تو انھوں نے ہمارے ادارے کو بھی سرفراز فرمایا۔ ان کو دیکھ کر اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سچا محب علم و تحقیق کس طرح ہر جگہ ہر حال اور ہر مجمع میں صرف ایک ہی مقصد کے لئے جیتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلا عملی کرم تو یہ فرمایا کہ 'نواے ادب' کے لئے اپنے مضامین عنایت ہی نہیں فرمائے بلکہ اس سلسلہ کو باقی رکھنے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ ذکر غالب کے بعد ان کی ایک اور تصنیف —— عورت اور اسلامی تعلیم ہے، یہ کتاب دراصل ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نامہ نگار میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی کتابی صورت نے اس کی افادیت اور زندگی دونوں کو بڑھا دیا ہے۔ اس پر ایک مختصر تبصرہ جولائی کے شمارے میں شائع ہوگا۔

اسی قسم کے لوگوں میں اردو کے مشہور نقاد و ادیب پروفیسر عندلیب شادانی ہیں، وہ مشرق میں بیٹھ کر سارے ملک کو منور کر رہے ہیں، اب اسی مشرق سے انھوں نے خاور (ڈھاکا) نامہ رسالہ نکالا ہے اس کے پہلے ہی نمبر کے مطلع پر جو ثوابت و سیارے ضیا پاشی کرتے نظر آ رہے ہیں ان کی روشنی میں ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی روشنی عنقریب ساری اردو دنیا کو مطلع انوار بنا دے گی !

مشرق سے ہم کو علم و ادب کی یہ روشنی ہی نہیں ملی ہے بلکہ تہذیب کی کرنوں نے بھی اس کو دلکش و رنگین بنانا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ خاور کے ساتھ ہی ساتھ صوبہ بہار سے ایک علمی و ادبی رسالہ تہذیب کے ساتھ نکلنا شروع ہوا ہے اس کے اڈیٹر اُردو اور ہندی کے افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی ہیں۔ سہیل صاحب نے چھوٹا ناگپور میں اُردو زبان و تعلیم کی اشاعت و ترقی میں جو خاموش خدمات انجام دی ہیں ان کا حال ان لوگوں کو جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں اچھی طرح معلوم ہے ابھی چند مہینوں پہلے تک وہ پٹنہ سے ایک روزنامہ بڑی کامیابی کے ساتھ نکالا کرتے تھے لیکن ان کا اصلی میدان ادب ہے اور ہم خوش ہیں کہ وہ پھر اپنی حقیقی دنیا میں آگئے ہیں پہلے ہی شمارے میں ان کو جن مضمون نگاروں کا تعاون حاصل ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر بہار نے اپنی روایتی بے اعتنائی نہیں برتی تو یہ رسالہ ادب کی اچھی خدمت کر سکے گا۔

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی مسرت بخش ہے کہ پٹنہ کا علمی و ادبی رسالہ معاصر کچھ عرصہ سے ملک کے بلند پایہ محقق و نقاد جناب قاضی عبدالودود صاحب کی ادارت میں آگیا ہے، اس وقت تک اس کے دو نمبر نکل چکے ہیں امید کہ قاضی صاحب اس کو دوبارہ مرنے نہ دیں گے۔

یوں تو اکبر الہ آبادی اور ان کے کلام پر عرصہ سے تھوڑا بہت لکھا جا رہا ہے، لیکن حصول آزادی کے بعد جب ہم نے اپنا جائزہ لیا کہ ہم کیا ہیں تو شاید ہم کو شدت کے ساتھ اس چیز کا احساس ہوا ہے کہ ہم جو تھے وہ نہیں رہے اور جو ہیں وہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہماری اس تبدیلی، اس کے مُضر اثرات اور اس سے بچنے کے لئے اگرچہ بہتوں نے بہتیرے طریقوں سے لکھا لیکن جس مفکر و مصلح نے سب سے زیادہ صاف اور سب سے زیادہ دلنشین انداز میں تقریباً نصف صدی تک ہم کو یہ بتایا وہ اکبر تھا چنانچہ برسوں کے بعد لوگوں نے اس کی طرف پھر توجہ کی ہے، ہندوستان میں ان کا گاندھی نامہ شائع ہو چکا ہے اور عورت نامہ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ علی گڈھ سے میگزین کا خاص اکبر نمبر شائع ہوا ہے پاکستان نے اس سے آگے ایک اور قدم بڑھایا ہے اور وہاں بزم اکبر کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی ہے اس کے مہتمم جناب اختر انصاری صاحب جو اپنی شاعری کی وجہ سے اس برِ عظیم میں محتاج تعارف نہیں، اس بزم نے اس وقت تک کلیات اکبر ہی کی پہلی دو جلدیں نہیں چھاپی ہیں بلکہ اکبر مرحوم کے صاحبزادے عشرت حسین کی لکھی ہوئی حیات اکبر بھی شائع کی ہے، اس کے علاوہ یہ بتانے کے لئے کہ موجودہ عہد کے نوجوان ادیب و نقاد اکبر کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ جناب انصاری نے "اکبر اس دور میں" کے نام سے ایک مجموعہ مضامین شائع کیا ہے اور اس کے ساتھ شعرا کی نذر عقیدت کو لسان العصر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ امید کہ اکبر سے یہ دلچسپی برابر بڑھتی رہے گی۔

سائلؔ دہلوی

(جناب مالک رام صاحب ایم اے)

نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ مرحوم کا اس سال ساتواں دیسا ہے۔ وہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو شنبہ کے دن اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ چونکہ سال ولادت ۱۸۶۷ء تھا، اس طرح عمر عزیز ۷۸ برس ہوئی۔ اللہ کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے، مرحوم مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ بہت دن سے خیال کر رہا تھا کہ اپنے تاثرات قلم بند کر دوں، لیکن ہائے مکروہات ؎

فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے　　تجھ کو بھی ہم دکھائیں، کہ مجنوں نے کیا کیا

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین برس تک روزگار کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ لیکن اسے میری نالائقی سمجھئے یا بدقسمتی، کہ کسی جگہ قدم نہ جم سکے۔ ان ایام میں یہاں دلّی میں میرے ایک مہربان تھے، جنھیں اس بات کی بہت فکر تھی کہ کسی جگہ میرے لئے مستقل ٹھکانا ہو جائے۔ انھوں ۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں مجھے لکھا، کہ اگر تم یہاں آجاؤ، تو شاید ریڈیو کے محکمے میں تمھارا انتظام ہو جائے گا۔ چنانچہ اس بلاوے پر میں یہاں آگیا۔ یہ دلّی میں میری پہلی آمد تھی۔ میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے رجحانات کے باعث، مجھے اس عروس البلاد سے جو دلچسپی ہو سکتی تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہو گی۔

اس زمانے میں یہاں میرے ایک ہم وطن عزیز دوست رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے۔ ساتھ کے پڑھے ہوئے، یوں سمجھیے، دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول میں مدرس تھے میں انھیں کے ہاں اترا۔ دو تین دن کے بعد وہ ایک صبح مجھ سے کہنے لگے، تمھیں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے کسی دن فرصت ملے تو لال کنویں میں ایک بوڑھے نواب صاحب رہتے ہیں، سراج الدین خاں نام ہے۔ ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا، کون نواب سراج الدین احمد خاں، وہی تو نہیں جو سائلؔ تخلص کرتے ہیں کہا، ہاں، وہی۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ اگلے دن اتوار تھا۔ میں نے ناشتے کے بعد لال کنویں کی راہ لی ؎

بوقتِ صبح چو مردم بکار و بار روند　　بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

میرے ان دوست کو سائلؔ صاحب کے مکان کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کہیں لال کنویں کے محلے میں رہتے ہیں۔ البتہ مجھے معلوم تھا کہ ان کا لوہارو خاندان سے تعلق ہے۔ اس لئے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی چنانچہ میں پوچھتا پوچھتا قاسم جان کی گلی میں جا پہنچا جہاں اس خاندان کے مکانات ہیں۔ یہاں میں نے ایک آدمی سے

پوچھا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں میں اس وقت نواب ضمیر الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا (خلف نواب علاء الدین احمد خاں علائی) کے مکان کے سامنے تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمایئے۔ میں نے مُڑ کے دیکھا، تو میرے سامنے جناب ضمیر مرزا کا ملازم کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے دُہرایا۔ اُس نے کہا، جناب، وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا مکان لال دروازے میں ہے مجھے شبہ ہوا کہ شاید اسے نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ جی ہاں، میں سمجھ گیا۔ وہی نا، جو شاعر ہیں اور جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں۔ آیئے میں آپ کو پہنچائے آتا ہوں، چنانچہ ہم دونو گلی قاسم جان سے نکل کے لال کنوئیں میں آ گئے۔ لال دروازہ کچھ دور تو تھا نہیں۔ یہی چند قدم کا فاصلہ ہے اس کے اندر تھوڑی دُور چل کے وہ سیدھے ہاتھ پر ایک اونچی کرسی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لیجئے حضور یہ ہے نواب صاحب کا مکان۔ اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔" اور مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری یقیناً ملازم کے لئے تھی۔ اسی طرف کے کونے میں اوپر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک دروازہ تھا، جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ پیش طاق پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" اسے دیکھ کر مجھے معاً "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" والا لطیفہ یاد آ گیا۔

الٹے ہاتھ کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا، جس میں داخل ہونے کے لئے دو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی، تو دیکھا کہ یہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدّن کا امتزاج ہو رہا ہے یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا۔ اس کے اوپر نصف کمرے کے لگ بھگ سپید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین اگال دان اور سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں ـــ اور جہاں چاندنی نہیں تھی، وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں یہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ کمرے میں داخل ہوئے۔

تقریباً ستر برس کا سن، کوئی چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم، سیدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، المبوترا کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوک دار ناک، کلے کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی، تبدّن سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید ڈاڑھی، جو یک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے، شرعی لبیں،

آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں، سر پر ہلکی سی پلے کی ٹوپی جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج پٹی گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتا، کندھے پر رومال، نیچے لٹھے کا آڑا پاجامہ، پاؤں میں خورد نوک کا جوتا۔ دائیں ہاتھ میں لکڑی اور بائیں میں سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا۔

یہ تھے، نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب بن نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر (والیٔ فیروز پور جھرکہ و لوہارو) بن نواب مرزا عارف جان بیگ بخارائی۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے ؎

سائل کو تم نہ چشم حقارت سے دیکھنا نواب پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے

میں اٹھ کے آداب بجا لایا۔ بہت لطف سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پہلے مجھے بٹھایا، پھر خود دوسری کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ نام پوچھا، مقام پوچھا، تعلیم اور روزگار کا حال پوچھا۔ چونکہ خود شاعر تھے، خیال کیا ہوگا کہ یہ جو ملنے آیا ہے، تو ضرور شعر بھی کہتا ہوگا۔ پوچھنے پر میں نے عرض کی کہ عمر بھر شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا، تو پہلے کچھ تعجب کا اظہار کیا۔ پھر فرمایا لیکن اس میں بھی شبہ نہیں، کہ یہ ہے بیکاری کا مشغلہ۔

ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے، یہ گلی کے رخ پر تھا اور یہاں کی تینوں کھڑکیاں کھلی تھیں۔ نیچے گلی میں ایک ٹھٹھیرا برتنوں کی مرمت کر رہا تھا۔ قدرتاً شور ہونا ہی چاہیئے۔ اس متواتر بے ہنگم آواز سے میں بہت پریشان تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات ہمیں ایک دوسرے کی بات سننے میں بھی تکلف ہوتا تھا۔ لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سائل صاحب بھی اس کھٹا کھٹ سے بہت منغص ہوئے۔ گھبرا کے آواز دی۔ ارے کوئی ہے۔ دروازے پر سے ملازم نے جواب دیا۔ حضور حاضر ہوں۔ میاں۔ جاؤ، اس نیک بخت سے کہو کہ یہ شور بند کرے اور اگر وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، تو اس سے کہہ دو، کہ یہ محلہ چھوڑ کے کہیں اور چلا جائے۔ یہ کیا مصیبت نازل ہوگئی ہے۔ ملازم نے جا کے سمجھا دیا ہوگا۔ بہرحال آواز آنا بند ہوگئی اور اس کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا۔ جب طبیعت چاہے، چلے آؤ۔ میں دوپہر تک بالعموم مکان ہی پر رہتا ہوں۔ سرِ شام کبھی کبھی گھومنے نکلتا ہوں۔

یہ تھی جناب سائل صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

اتفاق سے میری ریڈیو میں بھی نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں جو حضرات اس محکمے کے کرتا دھرتا تھے، میں انھیں خوش نہ کر سکا۔ چنانچہ مہینہ بھر یہاں رہ کے واپس لاہور چلا گیا۔

اگلے برس مجھے پھر ان ہی مہربان کے ذریعے ایک اور دفتر میں جگہ مل گئی۔ میں شملے گیا اور عارضی طور پر ملازم ہو گیا۔ مشاہرہ قلیل تھا، لیکن کام بھی کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ حکومت کے دفاتر کے ساتھ یہ لوگ بھی گرمیوں میں شملے اور سردیوں میں دلی جاتے آتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب ستمبر میں دفتر دلی آئے تو میں بھی یہاں پہنچ گیا۔

یہاں آنے کے بعد میں پہلی فرصت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے دونوں جاڑوں میں متواتر ان کے ہاں آتا جاتا رہا دراصل یہی وہ زمانہ ہے، جب مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

اب تفصیل میں کیا جاؤں کہ کیسے کیسے ہمارے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ حکم ہوا کہ جب تک دلی میں رہو، یوں جب جی چاہے یا ضرورت ہو، آسکتے ہو، لیکن اتوار کے دن، کہ تمھیں دفتر سے چھٹی ہوتی ہے۔ لازماً صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کیا کرو۔ میں نے اقرار کر لیا۔ جو لوگ دلی کی سردیوں کو جانتے ہیں، انھیں خوب معلوم ہے کہ مجھے اس وعدے کے ایفا میں کیا کیا مشکل پیش آتی ہوگی لیکن مجھے خوشی ہے کہ آندھی ہو کہ طوفان، بارش ہو کہ کڑکڑاتی سردی، میں تعمیل حکم میں ان دونوں جاڑوں میں بلاناغہ ہر اتوار کو حاضر ہوتا رہا اور اس دن عام طور پر دوپہر تک ان کے ساتھ رہتا۔

کھانے پینے میں مزاج بہت نفاست پسند تھا حتی الوسع اس بات کی کوشش کرتے، کہ سالن، ترکاری ہاتھ سے نہ کھائیں۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ چکناہٹ یا سالن کی زردی انگلیوں پر رہ جائے۔ اس لئے بے دریغ چمچے اور کانٹے استعمال کرتے تھے۔ انھیں دہی کا پنیر بہت پسند تھا۔ یعنی دہی، پتلے ململ کے ٹکڑے میں ڈال کے لٹکا یا جاتا تھا۔ جب تمام پانی رس کے ٹپک جاتا، تو بقیہ پنیر، دو تھڑوں یا کسی اور بھاری اور سخت چیز کے درمیان رکھ کے ہموار کر لیتے۔ پھر جیسے چاہتے، اس کے تکونے، لمبوترے، چوکور ٹکڑے کاٹ لیتے۔ ناشتے میں یہ پنیر بالعموم ہوتا تھا اور وہ اسے ہمیشہ کانٹے سے کھاتے تھے۔

کھانے میں مچھلی بہت پسند تھی، لیکن کانٹے سے ڈرتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی میں فرق آگیا تھا۔ چھوٹا کانٹا دکھائی نہیں دیتا تھا، اس لئے عام طور پر بیگم صاحبہ ان کے لئے علیحدہ پہلے سے کانٹا نکال کے دسترخوان پر رکھ دیا کرتی تھیں خوراک بہت کم تھی۔

ایک دن ناشتے پر فرمایا، خوب پیٹ بھر کر کھالو، ممکن ہے، کہ دوپہر کا کھانا نہ ملے، آج ہمیں سیر کے لئے باہر جانا ہے۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب وہ مجھ سے کچھ کرنے کو کہتے، تو میں کوئی حجت نہیں کرتا تھا۔ وہ میری عادتوں سے خوب واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ کون سی چیز مجھے پسند ہوگی اور کون سی ناپسند۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں کہیں گے، جو میرے خلافِ طبع ہو۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ میں نے نہیں پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ صرف اتنا کہہ دیا، بہت اچھا۔ انھوں نے کسی دوست سے گاڑی مانگ رکھی تھی۔ ملازم کو حکم ہوا۔ گاڑی لے آؤ۔ ہم نیچے اترے اور نئی دہلی کے راستے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر پہنچ گئے۔

نواب سائل مرحوم کے خاندان کو بزرگانِ دین سے بہت عقیدت رہی ہے بلکہ خود ان کے اپنے اجداد میں بھی اولیا اللہ کی کمی نہیں۔ قریبی زمانے میں بھی ان کے پردادا نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں، جتنے شاعری میں معروف ہیں، تصوف اور اہل باطن کے حلقوں میں اس سے کم مشہور نہیں۔ وہ حضرت مولانا فخرالدینؒ

کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خود نواب احمد بخش خاں اگرچہ شروع میں کچھ باغی سے رہے، لیکن اخیر میں اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعہ انھوں نے بھی مولانا فخر الدینؒ کی بیعت کر لی تھی۔ یہ اسی ارادت اور خوش عقیدگی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام حضرت خواجہ ضیا الدین اجمیریؒ کے نام کی رعایت سے غلام ضیاء الدین رکھا، جو آسمانِ علم و ادب پر ضیاء الدّین احمد خاں نیّر رخشاں بن کے چمکا۔ سائل صاحب بھی حضرت مولانا شاہ دلدار علی صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ یہ بزرگوار شاعر بھی تھے۔ مذاق تخلص تھا اور اس فن میں ذوقؔ کے شاگرد تھے۔

میرا سلطان جی میں یہ پہلا پھیرا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار مقدس پر حاضری دی۔ یہاں فاتحہ پڑھ کے ہم باہر صحن میں پڑی ہوئی لکڑی کی چوکیوں پر آکے بیٹھ گئے۔ چند مجاور بھی ہمارے پاس آن بیٹھے وہ نواب صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ بھی یک ایک سے اس کے گھربار کا حال پوچھتے رہے۔ ایک مجاور اندر مزار پر سے سبز کپڑے کی دو دھجیاں لے آیا۔ ایک ایک ہماری ٹوپیوں کے اوپر لپیٹ دی گئی۔ سائل صاحب نے اس سے کچھ سلوک کیا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے۔ بزرگان دین کے مزاروں پر اکثر آتے رہنا چاہیئے۔ اس سے برکت حاصل ہوتی ہے اور دل میں انابت الی اللہ پیدا ہوتی ہے۔ افسوس! ان مقامات پر اکثر مجاور ایسے ہیں، جنھوں نے محض دوکانداری بنا رکھی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں، جن کے دل صاحب مزار کے انوار سے منوّر ہیں۔ اور اگر تم واقعی یہاں کی برکات حاصل کرنا چاہو، تو لازم ہے کہ انھیں واسطہ بناؤ،

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ ان سے کٹھ حجتی کر بیٹھوں۔ لیکن موقع بے ڈھب تھا۔ ہمارے ارد گرد بہت لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے طرح دے جانے اور خموشی ہی میں عافیت دیکھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے پوری نہیں، تو نیم رضا تو ضرور ہی سمجھے ہوں گے۔

مبادا، اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو جائے، اس لئے میں ایک اور واقعہ بھی لکھ دیتا ہوں جس سے ان کے مذہب اور اصحابِ مذہب سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

میں اس زمانے میں قرول باغ میں رہتا تھا۔ ان دنوں جامعہ ملیہ کے صدر دفاتر بھی یہیں تھے۔ "مسجد کے زیر سایہ خرابات" کا تمنا پورا کرنے کو میں نے یہاں کے اکابر کے پڑوس میں مکان لے رکھا تھا۔ اور ان اصحاب کے ہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ ایک شام میں مکتبۂ جامعہ کے مہتمم، برادرم حامد علی خاں صاحب سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو رہا ہے۔ بیشتر مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے ایک بہت بڑے عالم اور مصنّف بھی موجود تھے۔ میں نے انھیں ذاتی طور پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ان کی دو ایک جوانی کی تصویریں دیکھی تھیں میں نے انھیں پہلی نظر میں پہچان لیا، کہ جس کی وہ جوانی تھی آج اس کا بڑھاپا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تقریب انھیں کے اعزاز میں ہوئی ہے اور یہ لوگ ابھی ابھی شام کا کھانا کھا کے بیٹھے ہیں۔ میرے قریب جو صاحب تشریف فرما تھے، ان سے معلوم ہوا کہ مشارٌ الیہ بزرگوار ایک مقدمے کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے ہیں۔ قصّہ سنیئے۔

موصوف، ایک ادارے کے مدیر اعلیٰ اور بہت بڑے عالم دین ہونے کے علاوہ، ایک مشہور علمی و ادبی مجلے کے ایڈیٹر بھی تھے۔ کچھ مدت پہلے دلّی کے ایک من چلے اور جوشیلے نوجوان نے ان کی ایک مایۂ ناز کتاب پر مخالفانہ تنقید لکھ کے ایک مختصر رسالے کی صورت میں شائع کی تھی۔ اس میں وہ ان کی غلطیاں دکھا کے ان کی علمی حیثیت معرضِ بحث میں لے آئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مقامات پر وہ جوانی کی ترنگ میں جادۂ اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے، لیکن اگر معاملہ یہیں تک رہتا، تو کوئی بات نہیں تھی۔ غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ پھر تحقیق و تصنیف کا میدان تو بہت وسیع ہے، خصوصاً جہاں تعلق استنباط اور استنتاج سے ہو، وہاں تو اختلاف کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اگر ہمارے ممدوح، معاملے کو اسی نظر سے دیکھتے، تو کوئی قباحت نہیں تھی۔ لیکن خدا معلوم، انھیں کیسے شبہ ہوا، کہ اس رسالے کی تصنیف میں ان کے ایک مخالف عالمِ دین کا ہاتھ ہے، جو یہیں دلّی میں رہتے تھے۔ بقول امام شمس الدین ذہبی، دو صاحبِ علم شخصیتوں کے لئے ہم عصری بہت بڑا ابتلا ہے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کی صحیح قدر و قیمت شناخت نہیں کر سکتے، بلکہ بسا اوقات رشک و حسد کے باعث، ان میں چشمک بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ یہ دونوں صاحب ہمارے چوٹی کے عالموں اور مصنفوں میں سے تھے، لیکن نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے اشد مخالف۔ چنانچہ جب یہ رسالہ، موصوف کے پاس تبصرے کی غرض سے پہنچا، تو انھوں نے اپنے مجلہ میں اس پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھ دیا، کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں کون معشوق ہے اور کس نے یہ کتاب لکھی ہے اور کیوں چھپوائی ہے۔ یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ رسالے کے مصنف کا نام جعلی ہے۔

جونہی یہ پرچہ دلّی میں پہنچا، جس میں یہ تنقید چھپی تھی، اس نوجوان مصنف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، عدالت میں ہتک عزت اور ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا، کہ فلاں مجلّہ کے ایڈیٹر نے میری تصنیفی قابلیت پر حملہ کر کے میری ہتک کی ہے۔ نیز یہ شبہ کر کے کہ میں نے کتاب کسی اور سے لکھوا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہے، میری شہرت اور عزت پر حملہ کیا ہے۔ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا، ہرجانہ غالباً دس ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا۔

جو حضرات قانون سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں معاملہ کس قدر سنگین تھا۔ قرائن ایسے تھے کہ جرم ثابت ہو جائے گا اور موصوف کو سزا ہو جائے گی اور ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس لئے قدرتی طور پر سب لوگ تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ اگلے دن اسی مقدمے کی پیشی تھی اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے۔

اتفاق کی بات، کہ میں اس نوجوان مصنف سے چند دن پہلے نواب سائل صاحب کے مکان پر ملا تھا اور ان کا یہ رسالہ بھی دیکھ چکا تھا۔ نواب صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے ان کی تعریف کی اور ان کے والدِ مرحوم سے اپنے قدیم دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ نوجوان بھی، ان سے اسی طرح مودبانہ ملے تھے، جیسے ایک خورد اپنے بزرگ سے ملتا ہے۔ میں نے جب اس مقدمے کی روداد سنی، تو معاً میرے ذہن میں یہ خیال گذرا کہ اگر نواب صاحب کوشش کریں، تو شاید ان کی وساطت سے کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔ چونکہ مقدمے کی پیشی اگلے دن تھی اور وقت تنگ تھا، اس لئے میں نے فیصلہ کیا

کہ ابھی جاکے ان سے ملنا چاہیئے تاکہ اگلی کسی عدالت کے وقت سے پہلے اس نوجوان سے بات چیت کی جاسکے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار وہاں دو ایک دوستوں سے کیا، تو انھوں نے بھی میری تجویز پر صاد کیا اور زور دیا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ غرض کہ میں باہر نکلا اور بائیسکل پر سوار ہو کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب سائل صاحب کے یہاں پہنچا ہوں تو ساڑھے دس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جونہی انھیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی۔ فوراً نیچے اتر آئے اور چھوٹتے ہی پوچھا، کیوں خیر تو ہے۔ میں نے کہا۔ نہیں تو کوئی ایسی بات نہیں۔ کہنے لگے۔ اب میں یہ تو ماننے سے رہا اس سردی کے وقت، اتنی رات گئے، قرول باغ سے تمھارا آنا بے سبب تو ہو نہیں سکتا۔ القصہ میں نے بے آرامی کی معافی چاہتے ہوئے سارا قصہ بیان کیا۔ تو انھوں نے جو کچھ جواب میں کہا، وہ آبِ زر سے لکھ رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا بیٹا، تم بہت بھولے ہو، تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ انھیں اپنے علم کا غرور ہے۔ انھیں اپنی نمازوں کا غرور ہے۔ اپنے روزوں کا غرور ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے علم اور عبادت کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سجدے کریں اور ان کے ہاتھ چومیں۔ ان کی ہر بات پر آمنّا اور صدقنا کہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو لڑکا اپنے سگے باپ کی اندھا دھند ماننے کو تیار نہیں اور کہہ دیتا ہے، ابّا جان، یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ بھلا یہ قل اعوذی ملّا کیسے توقع رکھتے ہیں کہ دنیا ان کی ہر ایک بات بے چون و چرا تسلیم کرے گی۔ تم اس نوجوان سے مل چکے ہو۔ وہ گھر کا اچھا کھاتا پیتا ہے۔ اس کے باوا میرے اچھے دوست تھے۔ یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے اور وہ اس کے لئے اچھی خاصی پونجی چھوڑ مرے ہیں۔ اس کی عربی اور مذہبی علوم کی باقاعدہ تعلیم ہوئی ہے اور وہ بودا نہیں ۔ مجھے اس مقدمے کا علم نہیں تھا۔ لیکن اگر انھوں نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہے، تو اسے بجا طور پر رنج ہونا ہی چاہیئے۔ اور اگر انھوں نے اس دوسرے عالم کی مخالفت کے جوش میں کوئی ایسی بات لکھ دی ہے جس پر قانونی گرفت ہو سکتی ہے، تو انھیں اس کا خمیازہ بھگتنا چاہیئے۔ جو آگ کھائے گا، انگارے ہگے گا، اگر کوئی اور مجھے اس معاملے میں دخل دینے کو کہتا، تو کبھی نہیں مانتا۔ لیکن تمھاری خاطر سے میں اپنی سی کوشش کر دوں گا، آگے جو خدا چاہے کل علی الصباح دفتر جانے سے پہلے، جاتا ہیں تھا رہے ساتھ خود اس کے پاس چلوں گا۔

میں نے یہ لمبی داستان صرف اس لئے بیان کی ہے کہ اس سے سائل صاحب کے علمائے دین سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خود کوئی بہت بڑے عالم نہیں تھے۔ اپنے جدِ بزرگوار کے بعد انھوں نے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھیں عربی علوم یا مذہب سے کچھ ایسی بڑی وابستگی تھی کہ انھیں ان مولویوں کا مدِ مقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ بہت خوش عقیدہ تھے اور سب علما اور اصحابِ فضل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں وہ حقیقی بزرگی اور علم کے قدر شناس اور پرستار تھے، وہیں بناوٹ اور ملمع کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے نام کی شوکت اور شہرت انھیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

دیکھئے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ ہم حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی زیارت سے مشرف ہو کر باہر نکلے اور پھرتے پھراتے جناب خواجہ حسن نظامی مدظلہ کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی ملت تھی۔ مجھے ٹھیک سا یاد نہیں، لیکن غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ میری کنیت ابوالمعظم، جناب خواجہ صاحب کی رکھی ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب مدظلہ مکان پر تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے جناب حسین نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہاں تھوڑی دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی اور چائے پانی سے کچھ تواضع بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف فاسفورس کے تیل اور سویا بین کا بہت اشتہار دے رہے تھے۔ جانے کیسے، ان چیزوں کا ذکر چل پڑا۔ خواجہ حسین نظامی صاحب نے ان دونوں کا ایک ایک نمونہ ہمیں پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلئے آپ کے دادا جان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم گھومتے گھماتے چونسٹھ کھمبا کے پاس اس احاطے میں پہنچ گئے، جہاں غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں فاتحہ کے بعد مختلف قبروں کی نشان دہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے علی بخش خاں رنجور کی قبر ہے۔ معروف کی پائنتی ان کے ایک مرید محمد حیات خاں ولد احمد یار خاں (رام پوری؟) ہیں اور ان کے برابر میں ان ہی کے صاحبزادے خان بہادر محمد نظام الدین خاں ہیں۔

دلی کی ایک ایک اینٹ کے نیچے ایک داستان اور ایک تاریخ دفن ہے۔ ہم یہ اینٹیں الٹتے پلٹتے، باتیں کرتے اور مختلف بزرگوں اور بادشاہوں کی آرام گاہوں سے درس عبرت لیتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اب جو چلے، تو ڈیڑھ ایک بجے کے لگ بھگ قطب میں صفدر جنگ کے مقبرے پر آ کے دم لیا۔ یہاں کے انتظام دیکھ کر میں کچھ متعجب سا ہوا۔ شالی برآمدے میں دریاں بچھ چکی تھیں۔ ایک طرف چولہا گرم ہو رہا تھا۔ ایک ملازم چائے کا سامان، ایک چھوٹے سے تخت پر قرینے سے لگا رہا تھا۔ جب ہم داخل ہوئے، تو نواب صاحب نے ملازم سے پوچھا، کہو میاں، بھائی کے آنے میں کتنی دیر ہے۔ حضور، وہ اب آنے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ حکم ہو تو چائے تیار کروں۔ نہیں میاں، ہم بھائی کے آنے سے پہلے کیسے پی لیں، یہ تو ٹھیک نہیں۔ حضرت، اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ وہ آئیں گے تو دوسرا دور ہو جائے گا۔ بس چٹکی میں تیار کئے دیتا ہوں۔ پانی تو آگ پر رکھا ہی تھا، اس نے پل مارتے میں چائے کی دو پیالیاں بنا کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ نواب صاحب کا تو مجھے معلوم نہیں، لیکن میں اس دو تین گھنٹے کی گھمنڈ رگردی سے واقعی بھوک سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہم ابھی چائے ختم بھی نہیں کر پائے تھے، کہ ایک گاڑی صحن میں آ کے رکی اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ ۵۵--۶۰ برس کا سن، سانولا رنگ، لانبا قد، اکہرا جسم، کھچڑی ڈاڑھی، تھوڑی پر زیادہ گالوں پر کم، بدن پر بندگلے کا شیروانی نما لمبا گرم کوٹ اور نیچے گرم پاجامہ۔ سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی۔ وہ آئے اور آداب عرض کر کے، نواب صاحب کے برابر میں بیٹھ گئے جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا بھائی، میں تم سے اس عزیز کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ پھر میرے متعلق چند کلمے کہہ کے مجھ سے فرمایا۔ آپ خان بہادر حکیم محمد علی خاں صاحب ہیں۔ میرے بچپن کے لنگوٹیے،

بھائی نہیں، مگر بھائی سے عزیز تر۔
جن اصحاب نے ذوق کا تذکرہ پڑھا ہے، ممکن نہیں کہ وہ حافظ غلام رسول ویراں کا نام نہ جانتے ہوں۔ ویراں، ذوق کے شاگرد تھے۔ شاگرد ہی نہیں، بلکہ عاشق تھے، کیا مجال جو کوئی ان کی موجودگی میں استاد کے خلاف کوئی بات کہہ جائے۔ زبان ہی تک نہیں، لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ قدرت بڑی منصف مزاج ہے۔ اگر کہیں ایک طرف کمی رہ جاتی ہے، تو اس کی کسر کہیں اور سے پوری کر دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ویراں نابینا تھے، مگر بلا کے ذہین۔ اور حافظے کا تو کیا کہنا۔ قرآن حفظ تھا ہزاروں شعر نوک زباں تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انھوں نے تڑسے سند میں کسی استاد کا شعر پڑھا۔ جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔
ذوق ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کر سکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے انوتے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل اور مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا، کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ بپا ہو گیا۔ خلیفہ محمد اسمٰعیل بھی جنت سدھارے۔ بھرے گھر میں جھاڑو پھر گئی اور اس کے ساتھ ہی ذوق کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ جو بچا کھچا تھا، اسے مولانا آزاد لے کر نکل بھاگے۔ ذوق کے شاگردوں کو قدرتی طور پر فکر ہوئی، کہ اگر کلام جلد شائع نہ ہوا، تو کل کو کوئی استاد کا نام لینے والا بھی نہیں ملے گا۔ ظہیر اور انور دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کیا اور حافظ ویراں کے پاس پہونچے، کہ یہ استاد کے سب سے زیادہ حاضر باش شاگرد تھے اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ ان ہی کو یاد تھا چنانچہ یہ بولتے گئے اور ظہیر اور انور لکھتے گئے اور اس طرح ان تینوں صاحبوں کی کوشش سے ۱۸۶۰ء میں دیوان ذوق کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا آزاد نے بہت کچھ کتر بیونت کر کے، بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے ایک اور دیوان شائع کیا، جو اب متداول ہے۔
حافظ ویراں استاد کی زندگی بھر قلعۂ معلی میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد محلہ کشن گنج (دہلی) میں رہنے لگے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں فوت ہوئے۔ "خاکِ سدۂ خواجہ" تاریخ وفات ہے، جو انھوں نے خود ہی اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ بیرونی احاطے کے صدر دروازے سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؎

"فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جانا" ان سے کہہ دو، جو ہیں اس رہ سے گذرنے والے

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی چھوڑی۔ یہ حکیم امجد علی خاں صاحب اسی صاحبزادی کی یادگار تھے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب موصوف، ویراں کے نواسے ہیں، تو مجھے ایک پرانا مسئلہ یاد آ گیا۔
میرے دلی آنے سے کچھ دن پہلے لاہور کے ایک نوجوان ادیب نے ذوق کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے اور الم غلم باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا، کہ ذوق مذہباً شیعی تھے۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں تھی۔ اس پر میں نے اس کی تغلیط میں ایک مختصر تحریر نگار میں شائع کی تھی۔ میں نے استدلال خود ذوق کے کلام سے کیا تھا۔ ظاہر

ہے کہ یہ کچھ ایسا قابلِ اطمینان ذریعۂ تحقیق نہیں۔ اب یہ سن کر کہ حکیم صاحب، ایک ایسے شخص کے عزیز ہیں جو ذوقؔ کا دن رات کا مصاحب تھا، میں نے ان سے پوچھا، کہ کیا آپ سے کبھی اپنے نانا جان سے ذوقؔ کے معتقدات سے متعلق بھی کوئی بات چیت ہوئی تھی۔ فرمایا۔ پہلے تو میں ان کی وفات کے وقت بہت چھوٹا تھا، اس لئے مجھے ایسی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اگر ہوتی، تو بھی میرا سر پھرا تھا کہ میں ان سے کوئی بحث، ذوقؔ سے متعلق کرتا۔ اگر انھیں کہیں ہلکا سا شبہ بھی ہو جاتا، کہ میرے سوال سے استاد کی تنقیص یا اعتراض کا پہلو نکلتا ہے، تو وہ میری کھوپڑی نہ اُدھیڑ ڈالتے۔ لیکن اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ذوقؔ شیعی نہیں تھے، بلکہ اہل سنت و الجماعت میں سے تھے۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا معمول ہے کہ اکتوبر سے لے کر مارچ تک، جاڑوں کے چھ مہینے، ہر اتوار دوپہر کو یہاں صفدر جنگ کے مقبرے پر آجاتے ہیں۔ سردی ہو۔ پانی برسے۔ آندھی ہو یا طوفان آئے، ان کے اس معمول میں فرق نہیں آسکتا۔ اگر آپ کسی اتوار کو حکیم صاحب کو یہاں موجود نہ پائیں، تو سمجھ لیجیے کہ یا تو وہ دلّی میں نہیں یا اتنے بیمار ہیں کہ بستر پر سے ہلنے کی تاب نہیں۔ دلّی میں ہوتے ہوئے اور صحت کی حالت میں، ناممکن ہے، کہ وہ یہاں نہ آئیں۔

کوئی گھنٹے بھر میں دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو خضر میرزا مرحوم تھے، دوسرے ظہیرؔ دہلوی کے نواسے سید اشتیاق حسین شوقؔ۔ خضر میرزا، میرزا زین العابدین خاں عارفؔ کے بھتیجے اور جناب سائلؔ صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے، بلکہ رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ ایک نواب اسد بخش خاں کے پڑپوتے تھے اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے نواسے کے بیٹے گویا چار پیڑھی اوپر دونوں کا جدّ اعلیٰ ایک تھا۔ خضر میرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے نوکری سے پنشن پانے کے بعد، اب یہیں مہرولی میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے اور سارا وقت عبادت میں گذارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود، جسم نہایت چاق و چوبند، طبیعت حد درجہ حاضر اور حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ انھوں نے اس دن ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے آنسو نکل آئے۔ آپ یہ سُن کر تعجب کریں گے کہ باوجود اس پیرانہ سالی اور تدین کے انھیں غیر ثقہ بلکہ عریاں لطیفے تک کہنے میں باک نہیں تھا۔ ڈر کے ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں، جو نسبتاً کم عریاں ہے۔

ایک مولوی صاحب تھے۔ نماز کا وقت آیا، تو مسجد میں تشریف لائے۔ پہلے مسواک کی، پھر لوٹا ہاتھ میں لے کے جائے ادب میں گئے اور واپس آکے وضو کرنے لگے۔ ابھی وضو ختم نہیں کر پائے تھے کہ ان کی ہوا خارج ہو گئی اور وہ بھی آواز سے۔ اس پر جو صاحب ان کے قریب حوض پر بیٹھے ـــــ وضو کر رہے تھے، بولے کہ یہ بآوازِ بلند احتجاج کر رہی ہے کہ آپ نے منہ میں تو مسواک کی، لیکن مجھ غریب کو پوچھا تک نہیں۔ (میں نے بعض لفظ حذف کر دئے ہیں اور بعض بدل ڈالے ہیں)

معلوم ہوا کہ جوانی کے عالم میں شعر بھی کہتے اور خضرؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

خضر یہ بھی خدا کی قدرت ہے
بت ہیں راستہ بتاتے ہیں

اس کے ساتھ انھوں نے مومن کا یہ شعر پڑھا تھا ؎

کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

سید اشتیاق حسین کا نام اس لئے یاد رہ گیا کہ اُس دن انھوں نے مختلف شاعروں کے پڑھنے کی ایسی ہو بہو نقل اتاری تھی کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں دورِ حاضر کے اکثر مشہور شاعروں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میں نے ان کا کلام ان کی زبان سے سُنا ہے۔ اس لئے میں نے ان سے فرمائش کر کے بعض شاعروں کی نقل اتارنے کو کہا اور وہ ہر مرتبہ امتحان میں پورے اترے۔ سائل صاحب اپنا کلام بہت ترنم سے پڑھتے تھے چنانچہ مشہور ہے کہ داغ کے آخری زمانے میں، جب یہ حیدر آباد میں مقیم تھے۔ مشاعروں میں اکثر حضور نظام اور استاد داغ کی غزلیں یہ پڑھا کرتے تھے۔ آج کل تو مشاعروں کا حال تباہ ہو گیا ہے۔ جو شاعر گلے بازی سے قاصر ہے، لوگ اُسے سننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن سائل صاحب کے پڑھنے اور ہمارے موجودہ شاعروں کے پڑھنے میں بہت فرق تھا۔ وہ گاتے نہیں تھے (رجھانے کا تو کیا ذکر) اس کے باوجود ان کے پڑھنے میں ایک خاص لذت اور دل کشی تھی، جو بس سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس، یہ انداز انھیں پر ختم ہو گیا۔ جب شوق صاحب، بیشتر شاعروں کی نقل اتار چکے، تو میں نے ان سے کہا، کہ اچھا اب سائل صاحب کی نقل فرمایئے۔ کہنے لگے، یہاں میری ترکی تمام ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے صرف ایک مصرع تک ان کی نقل اتاری ہے اور اس پر بھی مجھے کچھ ایسا اطمینان نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے وہ مصرع دہرایا۔ اگرچہ انیس بیس کا فرق تھا، تا ہم بڑی حد تک وہ سائل صاحب کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ سائل صاحب نے سن کے صرف اتنا کہا۔ تم بڑے شریر ہو۔

اس کے بعد کتنی مرتبہ مجھے ان ہفتہ داری جلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور ہر بار میں ان اصحاب کی مہربانی اور خلوص، محبت اور وضع سے نیا اثر لے کر واپس آیا۔ ہماری آخری دَور کی تہذیب میں وضع کو بہت دخل تھا۔ اس کی گرفت ملکی قانون اور مذہبی شریعت سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ کیا مجال، جو آپ ان بزرگوں کو اس ڈگر سے ادھر اُدھر ہٹا سکیں جو انھوں نے پہلے دن اپنے لئے پسند کر لی تھی۔ حکیم صاحب کی وضع داری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

ان کے ہاں رمضان کے مہینے میں ہر جمعہ کو افطاری کی تقریب ہوتی تھی۔ اس میں وہ اپنے خاص احباب کو تو مدعو کرتے ہی تھے، لیکن اس کے علاوہ بھی صلائے عام تھی۔ اس دن جس کا جی چاہے، ان کے ہاں پہنچ جائے اور روزہ افطار کرے۔ ہر ایک کی مناسب آؤ بھگت ہوتی۔ کھانے کو مٹھائی اور پینے کو موسم کے مطابق چائے، شربت وغیرہ سے تواضع کی جاتی۔ میں نے صرف ایک جمعہ کو حاضری دی تھی۔ بلا مبالغہ سو سوا سو آدمی سے کم نہیں ہو گا۔ افطاری کے بعد بے تکلف احباب ٹھہر جاتے۔ کچھ دیر تفریح رہتی۔ شعر و شاعری ہوتی۔

حکیم صاحب موصوف نے ۱۹۳۷ء میں نواسیر کے مرض سے وفات پائی۔ ان کے بعد وہ صفدر جنگ کے ہفتہ دار کی اجتماع بھی ختم ہو گئے۔

وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

سائل صاحب کی پہلی بیوی نواب ممتاز حسین خاں والی پٹودی کی ہمشیرہ تھیں۔ لیکن میاں بیوی میں نبھ نہ سکی اور علیحدگی ہو گئی۔ اس بیوی سے ان کے ایک بیٹا ہوا تھا، جو صغر سنی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام معظم مرزا تھا۔ یہی لڑکا ان کی کنیت ابو المعظم کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا نکاح استاد داغ کی منھ بولی بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا، جو ان کے چھوٹے بھائی میرزا امتیاز الدین احمد خاں کی بیوہ تھیں۔ داغ کی اپنی صلبی اولاد صرف ایک بیٹا احمد تھا، جو انھیں کم عمری میں داغ دے گیا۔ انھوں نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

احمد کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہوں تباہ   آنکھوں کا نور تھا، مرے دل کا سرور تھا

اس کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کو گود لے لیا، جو دور سے ان کی عزیز ہوتی تھیں۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیوں ضمیر مرزا مرحوم کے ملازم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہی نواب سراج الدین احمد خاں، جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ نیز میں نے جو شروع میں ذکر کیا ہے کہ ڈیوڑھی کے اندر صدر دالان کے دروازے کے اوپر ایک تختی پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" تو اس کا کیا مطلب تھا۔

جناب بیگم صاحبہ، عمر میں سائل صاحب سے کوئی بیس برس چھوٹی تھیں۔ یعنی جب سائل صاحب سے ان کا نکاح ہوا ہے تو یہ کوئی ۱۸-۱۹ برس کی تھیں اور وہ ۳۸-۳۹ برس کے۔ ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے یہ کہ وہ استاد زادی تھیں، نواب صاحب بہت حد تک ان سے دبتے تھے اور یہ ان سے نرم گرم بات کر لیتی تھیں۔ مثلاً ۱۹۳۷ء کے جاڑوں میں سائل صاحب حیدر آباد گئے۔ وہاں انھیں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا، جس سے ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ بہت معذور ہو گئے اور بیساکھیوں کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بے شک اس عمر میں ایسی سخت چوٹ مشکل ہی سے بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے، لیکن اگر مناسب علاج ہوتا اور نواب صاحب احتیاط کرتے، تو ممکن تھا کہ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے۔ لیکن ان کے مزاج میں شروع سے چھیلا پن اور سہل انگاری تھی۔ انھوں نے نہ صرف خود اس طرف مناسب توجہ نہیں کی، بلکہ اس معاملے میں وہ کسی اور کی بھی نہیں سنتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بعض اوقات بیگم صاحبہ بہت خفا ہوتی ——— اور زچ ہو کے کہا کرتی تھیں یہ تو مرض کو پال رہے ہیں۔ بھلا جب تک اس کا مناسب علاج نہیں ہوگا، یہ کیسے تندرست ہو جائیں گے۔

سائل صاحب اپنے استاد کا بہت ادب کرتے تھے۔ دن میں کسی نہ کسی سلسلے میں دسیوں مرتبہ ان کا

ذکر آجاتا۔ داغ صاحب کی یہ بات اور داغ صاحب کی وہ بات۔ اپنے استاد بھائیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ جناب احسن مارہروی مرحوم، جناب نوح ناروی، جناب بیخود دہلوی، ان حضرات سے میں سائل صاحب ہی کے ہاں ملا ہوں۔

استاد داغ کے خاندان کی کتنی باتیں مجھے سائل صاحب سے معلوم ہوئی تھیں۔ جن میں سے بعض گفتنی ہیں، بعض ناگفتنی۔

ایک دن ان سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ آپ کے خاندان نے انھیں نواب شمس الدین احمد خاں کا بیٹا تسلیم نہیں کیا۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ یاد نہیں ہمارے قریب کون سی کتاب رکھی تھی۔ اس میں داغ کی تصویر بھی تھی۔ اسے کھول کے یہ تصویر مجھے دکھاتے ہوئے بولے۔ تم نے ہمارے خاندان کے کتنے آدمیوں کو دیکھا ہے اور ہمارے بزرگوں میں سے بعض کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ اب یہ تصویر دیکھو اور خود فیصلہ کر لو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ اور لوہارو خاندان کے افراد میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ وہی وضع قطع وہی نقشہ وہی خدوخال۔ اور اگر قیافہ کوئی چیز ہے تو اسے مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس خاندان میں سے نہیں تھے۔

میں نے جب اس رائے کا اظہار کیا تو فرمایا، بلاشبہ جو کچھ تم نے کہا، بالکل سچ ہے۔ بس ایک فرق تھا۔ ہمارے گھرانے میں سب کا رنگ بہت گورا چٹا رہا ہے۔ داغ صاحب اس کے برعکس اچھی خاصی سانولی رنگت کے تھے۔ لیکن تم پڑھے لکھے آدمی ہو جانتے ہو کہ یہ بات ایسی نہیں کہ محض اس وجہ سے ہم انھیں اپنے خاندان سے خارج کر دیں۔ مجھے تو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ غیر ہیں بلکہ میں تو انھیں چچا جان کہا کرتا تھا۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی ہوئی ہے، تو لوہارو خاندان والوں نے داغ کو اس لئے ان کا بیٹا تسلیم نہیں کیا کہ کہیں انگریز انھیں ریاست کا وارث نہ قرار دے دیں۔ سارا خاندان شمس الدین احمد خاں کے خلاف تھا اور ننھیال کی طرف سے بھی داغ کی پشت پر کوئی تھا نہیں۔ اس لئے وہ لوگ آسانی سے اس میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن بعد میں جب نواب امین الدین احمد خاں گدی پر بیٹھ گئے اور اب کا اندیشہ نہیں رہا تھا، تو آہستہ آہستہ ان کی مخالفت میں کمی آگئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ داغ کے پہلے دیوان کی جو منظوم تقریظ نیر رخشاں نے لکھی تھی، اس میں بھی وہ انھیں اپنا عزیز یا بھتیجا تسلیم کرتے ہیں۔

ایک اور بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا۔

داغ کی شاعری کو دیکھ کے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص شراب ضرور پیتا ہو گا۔ ایک مرتبہ مولانا نیاز

بیخود (عظیم آبادی/دہلوی) نے داغ کے غالباً اس شعر پر

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور　　کیا چیز حرام ہو گئی ہے

لکھا تھا کہ جس شخص نے کبھی پی نہ ہو، وہ ایسا شعر لکھ ہی نہیں سکتا۔ میں نے ایک دن سائل صاحب سے اس سلسلے میں پوچھا۔ انھوں نے نہایت وثوق سے فرمایا، داغ صاحب نے کبھی شراب نہیں پی اور لوگوں کا یہ بالکل غلط خیال ہے کہ وہ پیتے تھے۔

مجھے سائل تخلص ہمیشہ کھٹکتا تھا۔ شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں کہ میں نے کہا: قبلہ آپ کے جد امجد ضیاء الدین نیر، رخشاں و الد شہاب ثاقب، آپ کا تخلص سراج منیر کی رعایت سے تجویز ہونا چاہیے تھا، یہ سائل کیا ہوا۔ فرمایا۔ بیٹا تم نے کیا بات یاد دلادی میری شاعری کا آغاز تھا۔ ان دنوں میں نواب غلام حسن خاں محو سے اصلاح لیتا اور سراج تخلص کرتا تھا۔ لیکن چچا ابا، نواب احمد سعید خاں کو یہ تخلص پسند نہیں تھا۔ لیکن کوئی اور موزوں تخلص بھی ان کے خیال میں نہیں آتا تھا۔ ایک دن وہ نواب غلام حسن خاں کے گھر پر تشریف فرما تھے۔ میں بھی خدمت میں حاضر تھا کہ پھر میرے تخلص کی بات چھڑ گئی۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شریف صورت شخص دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ کسی نے پوچھا، کون ہے۔ اس نے جواب میں صرف اتنا کہا، سائل ہوں۔ خیر اسے تو کچھ دے دلا کے رخصت کیا۔ لیکن اس کے ٹلنے کی دیر تھی کہ محو صاحب کہنے لگے، لو بھائی، تمھاری مشکل حل ہو گئی۔ اس صاحبزادے کا تخلص سائل رکھ دو۔ چچا ابا کو بھی یہ پسند آگیا چنانچہ اس دن سے ہم سراج سے سائل ہو گئے۔

خدا نے ان کے اس تخلص میں برکت دی اور یہ ایسا مشہور ہوا، کہ آپ سائل دہلوی کہیں تو ذہن کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتا۔ خود انھیں بھی اس کا خوب احساس تھا۔

گرمیوں میں جب حکومت ہند کے دفتر شملے جایا کرتے تھے تو یار لوگ یہاں کی سردی کو شعر و سخن کی گرم بازاری سے کم کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ہر سال یہاں اچھے خاصے بڑے پیمانہ پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا جس میں شرکت کے لئے ہندوستان کے مختلف حصوں سے مشاہیر کو دعوت دی جاتی تھی۔ سائل صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ ہال سے نکل رہے تھے، تو کسی نو مشق نے پوچھا کہ دلی میں آپ کا پتا کیا ہے، جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جا سکے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے ہوئے چمک کے بولے۔ میاں صاحبزادے! خط پر صرف "سائل دہلی" لکھ دینا، مجھے مل جائے گا۔ اسی طرح کا جواب ایک موقع پر غالب نے نواب علاؤ الدین احمد خاں کو دیا تھا کہ بے شک صرف میرا نام اور دہلی لکھ دیا کرو، خط مجھ تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار اور مروت کا مادہ تھا۔ کوئی ان کے پاس چلا جائے، انھیں ملنے اور اس کی فرمائش پورا کرنے سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ وہ اندر سے بیاض منگواتے، اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے شکریہ، بس کیجئے یا کوئی اور ذکر نہ چھڑ جائے، سائل صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا، تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاؤدیوں سے واسطہ پڑ جاتا، جو نظم اور نثر کا فرق تک نہیں جانتے تھے۔ اب جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ لیکن نواب صاحب بڑے اطمینان سے اسی طرح ان سے

کبھی پیش آتے۔ میں بہت جز بز ہوتا۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے شکایت بھی کی کہ آخر آپ کیوں ایسے کور ذوقوں کو ٹال نہیں دیتے۔ ہمیشہ یہی جواب ملا۔ بیٹا، انکار کرنے کی جرأت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ تم نے نہیں سنا دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے کہ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اردو کے معلی کا لطف لینا ہو تو سائل کا کلام دیکھئے۔ باوجود داغ کا شاگرد ہونے کے، انھوں نے استاد کی حیدر آبادی شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ یہ چیز داغ سے مخصوص تھی اور انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔ آمیر مینائی نے اس میدان میں مقابلے کے لئے کیا کچھ کوشش نہیں کی، لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ آمیر کے شاگردوں میں سے ریاض خیر آبادی، حفیظ جونپوری اور جلیل مانکپوری نے اس رنگ کو نباہنے کی کوشش کی اور بہ فرق مراتب اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خود داغ کے شاگردوں میں بعض بہت کامیاب ہوئے۔ احسن مارہروی۔ نوح ناروی۔ بیخود دہلوی اساتذۂ فن ہیں۔ مضطر خیر آبادی کی غزل میں استاد کا رنگ چوکھا ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ داغ اپنے رنگ کا واحد مالک ہے۔ سائل نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔ انھوں نے اپنے لئے نئی راہ نکالی۔ زبان تو دلی کی ہونا ہی چاہیئے تھی۔ انھوں نے اس میں خالص عاشقانہ خیالات معاملہ اور محاکات کے علاوہ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کی اور بہت حد تک اس میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے شگفتہ اور پر لطف شعر نکالے ہیں کہ کچھ انھیں سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم ان کا سرمایہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی نور علیٰ نور ہے جس میں بنیادی طور پر اگرچہ نور الدین جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نور جہاں بیگم کی حیات معاشقہ کا بیان ہے، لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسایل آ گئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی، ورنہ خاصے کی چیز ہو . . . . اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوگا۔

زمانے کا مذاق بدل گیا۔ ان کے سارے دیوان تو کون چھپوائے گا اور کون پڑھے گا۔ لیکن، گر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک مجلد میں شائع کر دے، تو یہ زبان کی واقعی خدمت ہوگی۔ اور مثنوی تو ضرور ہی چھپ جانا چاہیئے، اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔ بقول نظیری نیشاپوری ؎

ہزار نقش دریں کارگاہ درکار است   مگیر خوردہ نظیری، ہمہ نکو بستند

دہلی سوسائٹی

(سجن لال صاحب ــــ مترجم، احمد ملک)

اٹھارویں صدی عیسوی کے چھٹے عشرہ اور ساتویں عشرہ کے اوائل میں شمالی ہند میں متعدد انجمنیں موجود تھیں۔ ان میں سے چند کے نام ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ انجمن اسلامیہ لاہور، انجمن تہذیب لکھنؤ، انجمن تہذیب گونڈہ، علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی، انجمن مطالب مفیدیہ، محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ[۱] انجمن پنجاب۔ سروسے پرشاد منڈل (الہ آباد) پنجاب ریفارم ایسوسی ایشن۔ ہندو نیشنل امپرومنٹ سوسائٹی (بنارس)۔ بنارس انسٹی ٹیوٹ۔ اسلامیہ سوسائٹی (امرتسر) انجمن اتحاد دہلی۔ اور دہلی سوسائٹی۔ میں ان میں سے مؤخر الذکر کو اپنے مقالہ کے موضوع کے لئے منتخب کرتا ہوں۔

اُردو صحافت پر تحقیقات کے دوران میں اس سوسائٹی اور اس کے کارناموں سے متعلق بڑے مفید اور قابل قدر حوالے ہماری نظر سے گذرے نامور فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی اپنے بیش بہا مقالوں اور خطبوں میں سوسائٹی کے کارناموں کا جابجا ذکر کرتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی حیاتِ جاوید میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور پروفیسر رام بابو سکسینہ اپنی "تاریخ ادب اُردو" میں سوسائٹی کو ان الفاظ میں متعارف کرتے ہیں ــ "۱۸۶۴ء میں دہلی میں ایک اور سوسائٹی قائم ہوئی۔ رائے بہادر پیارے لال آشوب اس کے لائق معتمد تھے۔ اس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام متعدد تقریریں ہوئیں۔ اور اس طرح اُردو کے چراغ کو جو اگرچہ ٹمٹما رہا تھا بجھنے نہیں دیا گیا۔"[۲] البتہ یہاں ۱۸۶۴ء کی جگہ ۱۸۶۵ء ہونا چاہیئے تھا کیونکہ جیسا کہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا اس انجمن کے افتتاح کا صحیح سنہ یہی ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے سوسائٹی سے متعلق عالمانہ مقالہ نے جو (سوسائٹی کے جریدہ کی) صرف چار اشاعتوں سے

---

[۱] اس اہم سوسائٹی کی بنیاد لفٹنٹ گورنر بنگال کی مجلسِ قانون ساز کے ایک ممبر مولوی عبداللطیف خاں نے اپریل ۱۸۶۳ء میں رکھی تھی۔ اس کے جلسے مہینے میں ایک بار مولوی عبداللطیف خاں کی قیام گاہ ۱۶ واقع نمبر ۱۶ تال تلا لین پر ہوا کرتی تھی۔ ادب، سائنس اور عمرانیات پر تقریروں، خطبوں اور مباحثوں کے ذریعہ مسلمانوں سے اُونچے اور تعلیم یافتہ طبقہ تک مفید معلومات پہنچانا اس انجمن کا مقصد تھا۔ یہ تقریریں، خطبے اور مقالے اردو، فارسی یا عربی میں ہوا کرتے تھے اور انجمن کے ماہانہ جلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔ بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم گرے سوسائٹی کے مربّی تھے۔ مجلسِ منتظمہ مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی۔

۱۔ قاری عبدالباری صدر ــ ۲۔ مولوی عباس علی خاں نائب صدر ــــ ۳۔ مولوی عبداللطیف خاں سکریٹری

اراکین:۔ (۱) محمد رحیم الدین (۲) شیخ عیسیٰ بن قرطاس (۳) مرزا احمد بیگ (۴) مولوی قاسم علی (۵) مولوی محمد عبدالرؤف (۶) مولوی عبدالحکیم (۷) سید مرتضیٰ سہسہانی (۸) ڈاکٹر میر اشرف علی (۹) مولوی سید علی احمد (۱۰) منشی سید لطافت حسین۔

[۲] ہسٹری آف اُردو لٹریچر از رام بابو سکسینہ ص ۲۹۸۔

متعلق ہے اور جس کی ایک نقل موصوف نے ازراہِ عنایت مجھے مرحمت فرمائی ہے سوسائٹی کے سنِ قیام سے متعلق اختلافات کا تصفیہ کر دیا ہے اور میرے لئے سوسائٹی پر ایک مفصل مضمون لکھنے میں آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔ میں باستثنا ئے چند سوسائٹی کے گرانقدر مجلہ کی تمام گمشدہ اشاعتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں ان میں وہ اشاعت بھی شامل ہے جس سے صدیقی صاحب نے استفادہ کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ دریافت اس موضوع کے بارے میں اہل تحقیق کے علم میں اضافہ کا باعث ثابت ہوگی۔ اگرچہ ابھی کچھ اشاعتیں نایاب ہیں لیکن اس سے سوسائٹی کی خدمات اور اس کے جریدہ کی قدر و قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اب میں سوسائٹی کے قیام سے لے کر ۱۸۶۲ء کے اختتام تک سوسائٹی کی تاریخ اور اس کے کارناموں کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ارباب تدقیق سے میری گذارش ہے کہ جریدہ کی یہ نایاب رائے اگر ان تک پہنچے تو اس مقالہ کی کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش فرمائیں۔

۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کی ایک سہانی صبح کو کمشنر دہلی کرنل ہیملٹن نے اپنی کوٹھی پر ایک ابتدائی جلسہ منعقد کیا جس میں حکام کے علاوہ عائدین شہر اور یورپین باشندوں نے شرکت کی۔ اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کمشنر صاحب نے اس تقریب کی شانِ نزول پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب اور لکھنؤ کی سوسائٹیوں کی مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں بھی انھیں بنیادوں پر ایک سوسائٹی کی داغ بیل ڈالنی چاہیئے جہاں ہم ایک ساتھ بیٹھ کر دلچسپ موضوعوں پر تبادلہ خیال کر سکیں یا مقالے پڑھ سکیں اور اس طرح علم کی شمع کو درخشاں رکھیں۔ مغلیہ تہذیب کے اس مرکز (دہلی) کو علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ——— کے شہروں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے یہ پہلے ہی چپکے ان شعبوں میں اس پر گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ سوسائٹی کے مقاصد حسب ذیل بتائے گئے۔

بحث و مباحثہ اور مقالوں کے ذریعہ ادبیات تاریخ، آثارِ قدیمہ، علم سکہ، ادبِ لطیف کی توسیع و ترقی، انہیں ترقی دلانا اور لوگوں میں ان کے لئے ذوق و شوق پیدا کرنا۔

جلسہ نے اس تجویز کو منظور کیا اور طے پایا کہ سوسائٹی کا ایک کتب خانہ اور ایک دارالمطالعہ ہو اور ان کے لئے ایک عمارت کا انتظام کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ سوسائٹی کو عطا کئے ہوئے یا سوسائٹی کے جلسوں میں پڑھے ہوئے مقالوں کو جلسوں کی روئداد کے ساتھ سوسائٹی کے جریدہ میں شائع کیا جائے۔ اور سوسائٹی کے مہینے میں ایک یا دو جلسے ہوا کریں۔

تمام تجاویز کی منظوری کے بعد ابتدائی جلسہ نے یہ طے کیا کہ یکم اگست کو ایک عام جلسہ بلایا جائے تاکہ ان تجاویز کو قبولِ عام کی سند حاصل ہو اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں آسانی ہو۔ اس طرح سوسائٹی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

یکم اگست ۱۸۶۵ء کے عام جلسہ میں جو دہلی کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ تھا سوسائٹی کا نام "دہلی سوسائٹی برائے ترقی علوم و فنون" منظور ہوا۔ اور مندرجۂ ذیل اصحاب سوسائٹی کے عہدیدار منتخب ہوئے۔

۱۔ سرپرست۔ کرنل میٹلف۔ کمشنر دہلی

۲۔ صدر۔ (الف) کپتان مک موہن۔ نائب کمشنر دہلی

(ب) مرزا الٰہی بخش

۳۔ نائب صدر۔ لالہ صاحب سنگھ صاحب

۴۔ معتمد اعزازی۔ ڈبلیو گولڈ سٹریم۔ جج سمال کاز کورٹ

۵۔ معتمد۔ پیارے لال

مندرجۂ ذیل حضرات مجلس منتظمہ کے اراکین منتخب ہوئے۔

(۱) ڈاکٹر مینچی (۲) پادری سمتھ (۳) فٹز پیاٹرکس اسسٹنٹ کمشنر دہلی (۴) لفٹنٹ ہارکورٹ، اسسٹنٹ کمشنر دہلی بعد میں انھیں کپتان بنایا گیا اور ۱۸۶۶ء میں انھوں نے "اے نیو گائڈ ٹو دہلی" تصنیف کی۔ (۵) نواب ضیاءالدین خاں (۶) پادری وہیٹلے (۷) دہلی کالج کے پرنسپل (۸) رائے بنسی لال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر دہلی (۹) نواب شہاب الدین احمد خاں (۱۰) ولایت حسین نائب میونسپل کمشنر دہلی (۱۱) لالہ مہیش داس آنریری مجسٹریٹ دہلی (۱۲) لالہ رام کشن۔ چنامل آنریری مجسٹریٹ دہلی کے صاحبزادے (۱۳) شیخ محبوب بخش آنریری مجسٹریٹ دہلی (۱۴) پنڈت بشیشور ناتھ (۱۵) منشی جیون لال آنریری مجسٹریٹ دہلی (۱۶) مولوی ضیاءالدین معاون پروفیسر دہلی کالج (۱۷) مولوی جعفر علی (۱۸) حکیم محمد خاں (۱۹) بابو بنک کے گوپال سہائے (۲۰) لالہ وزیر سنگھ (۲۱) نواب نجف خاں تحصیلدار ضلع دہلی۔

یہ بھی طے ہوا کہ سوسائٹی کی رکنیت کا چندہ مقرر کیا جائے جو آٹھ آنے ماہانہ سے زائد نہو۔ آخر میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ حکومت سے دہلی میوزیم کے دو کمروں کے لئے درخواست کی جائے جن میں سے ایک کمیٹی کے لئے مخصوص ہو اور دوسرا کتب خانہ و دارالمطالعہ کے لئے۔ جناب صدر کے شکریہ کے ساتھ جلسہ برخاست ہوا۔[۱]

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی سوسائٹی ایک باقاعدہ انجمن کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پورے شد و مد کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔

سوسائٹی کی دوسری میٹنگ دس روز بعد ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کو ہوئی جس میں مرزا غالبؔ کا نام ممبران کی فہرست میں شامل کیا گیا۔

چند حضرات نے مقالے پڑھے۔ سب سے پہلے سوسائٹی کے نائب صدر لالہ صاحب سنگھ نے اپنا

---

[۱] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ دہلی سوسائٹی غالب نمبر علیگڈھ میگزین ص ۵۲-۵۵

نوٹ :- تیسری میٹنگ میں جو ۷ نومبر کو منعقد ہوئی اور پانچ ممبروں کا اضافہ ہوا۔ ممبروں کی مجموعی تعداد ۹۳ کو پہنچ گئی تھی جن میں سے ۱۷ یوروپین تھے اور باقی ہندوستانی۔ فہرست میں غالبؔ کا نام تیسواں، ذکاءاللہ کا ساٹھواں اور سید احمد خاں کا پیاسٹھواں تھا۔ (علیگڈھ میگزین۔ غالب نمبر ص ۵۵-۶۰)

مقالہ بعنوان "طریقۂ مہاجنی ہندوستان میں" پڑھا۔ اس مقالہ پر جو مباحثہ ہوا اس میں کرنل ہیملٹن اور پادری سمتھ نے حصّہ لیا۔ اس کے بعد جیون لال نے مطالعۂ تواریخ کے فوائد سے متعلق اپنا مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد کرنل ہیملٹن نے مرزا غالب سے فرمائش کی کہ اگر سوسائٹی کے لئے کوئی مقالہ سپردِ قلم کیا ہو تو پڑھیں۔ مرزا صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ مرزا صاحب چونکہ معمّر اور ضعیف تھے اس لئے انھوں نے جنابِ صدر سے بیٹھ کر مقالہ پڑھنے کی اجازت چاہی۔ ان کا مقالہ بے حد پسند کیا گیا

سوسائٹی کا دستور ــــ سوسائٹی کے عہدیدار ایک مربّی، دو صدر، ایک نائب صدر، ایک معتمد اور ایک معتمدِ اعزازی پر مشتمل تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ایک نائب معتمد کا اضافہ کیا گیا۔ اراکین کی تعداد ۱۴۰ تھی۔[۵۱]

ہر وہ شخص جس کو سوسائٹی کا کوئی ممبر ذاتی طور پر جانتا ہو، ایسے ممبر کی سفارش اور ایک اور ممبر کی تائید پر سوسائٹی کا ممبر بن سکتا تھا۔ سوسائٹی جب اس سفارش کو منظور کر لیتی تھی (جیسا کہ وہ عام طور سے کیا کرتی تھی) تو ایسا شخص سوسائٹی کا باقاعدہ ممبر متصوّر ہونے لگتا تھا۔ یہ منظوری بے حد ضروری سمجھی جاتی تھی کیونکہ ایک بار سوسائٹی کے ایک ممبر نے ذاتی تعلقات کی بناء پر ایک صاحب کی سفارش کی اور ایک ممبر نے اس کی تائید کی اور ان کو ممبر بنایا گیا جنابِ صدر نے اس نامزدگی کو غیر آئینی قرار دیا۔

ہر ممبر کے لئے سوسائٹی کا چندہ واجب الادا تھا۔ جو ممبر چندہ دینے میں ناغہ کرتے تھے ان کے نام رجسٹر سے خارج کر دیئے جاتے تھے۔ ایسے ممبروں کو دوبارہ رکن بننے کا حق تھا لیکن اس کے لئے سوسائٹی کی جملہ شرائط کی پابندی ضروری تھی۔

ابتدائی ایام میں اراکین سوسائٹی کا رسالہ خریدا کرتے تھے مگر ۱۸۶۷ء سے ان کو یہ بلا معاوضہ ملنے لگا۔

اجلاس :ــــ سوسائٹی کے جلسے دو قسم کے ہوا کرتے تھے۔ ایک عام اور دوسرا خاص۔ خاص جلسے مہینے بھر میں دو یا تین بار انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان کا انعقاد صدر یا مربّی کی قیام گاہ پر ان کی سہولت کو مدّنظر رکھتے ہوئے منگل کی صبح یا شام میں ہوا کرتا تھا۔

عام جلسے منگل کی شام میں ہوا کرتے تھے۔ یہ کبھی مہینے میں ایک یا دو بار اور کبھی اس سے زائد بار ہوتے تھے۔ جلسے صدر یا مربّی کی علالت یا عدم شرکت کی بنا پر ملتوی بھی ہوا کرتے تھے۔[۵۲] لیکن ۱۸۶۷ء سے یہ طے ہوا کہ صدر کی عدم شرکت کی بناء پر جلسوں کو ملتوی یا برخاست نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ممبر حاضر ہوں (جو جلسہ کے انعقاد کے لئے کم سے کم ضروری تعداد تھی) تو ان میں سے کوئی صدارت کے فرائض انجام دے اور جلسہ کی کارروائی چلائے۔ یہ طریقہ کار ۱۸۶۷ء کے اختتام تک جاری رہا۔[۵۳]

---

[۵۱] دہلی سوسائٹی۔ ۲۸ جون ۱۸۶۷ء ص ۱۵۔ کچھ عرصہ کے بعد شمالی مغربی صوبہ کے گورنر صاحب سوسائٹی کے مربّی اعلیٰ بن گئے۔

[۵۲] دہلی سوسائٹی۔ ۵ نومبر ۱۸۶۷ء۔

[۵۳] دہلی سوسائٹی۔ ۲۶ نومبر ۱۸۶۷ء ص ۵ تا ۸

مقالہ نگار کی غیر موجودگی میں سکریٹری یا کوئی ممبر مقالہ پڑھ کر سنانے کا حق رکھتا تھا۔ یہ طریقہ بھی سال (۱۸۶۷ء) کے اخیر تک کار فرما رہا۔ عام طور سے سکریٹری مقالے پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔

جلسہ کی کارروائی حسب ذیل نہج پر انجام پاتی تھی۔

(۱) سابق جلسہ کی روئداد (۲) اس کی منظوری (۳) مقالوں کی خواندگی (۴) مقالوں پر بحث (۵) سکریٹری کی جانب سے پیش شدہ دیگر امور مثلاً سوسائٹی کے اعلان نئے حکومت کی طرف سے موصول شدہ گفتیاں جن پر سوسائٹی کی رائے طلب کی گئی ہو وغیرہ۔ حاضرین کے نام اور ان کے القاب (Designations) بھی لکھ لئے جاتے تھے بحث شدہ مقالے سوسائٹی کے جریدہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔

مجلس منتظمہ عطیات اور کتابیں قبول کرنے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتی تھی۔ عطیات اور کتابوں کی وصولیابی کا سوسائٹی کے جریدہ میں معطیان کے شکریہ کے ساتھ اعلان ہوا کرتا تھا۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے جوں جوں زمانہ گذرتا گیا سوسائٹی کے حالات بہتر ہوتے گئے اور علمی حلقوں میں اس کی وقعت اور اثر بڑھتا گیا۔ بعض اوقات نامور ہستیاں بھی سوسائٹی کو خطاب کیا کرتی تھیں۔

سوسائٹی کے اہم جلسے:۔۔۔ سوسائٹی کے ساتھ یہ ایک روایت بن گئی تھی کہ جب بھی حکومت کی کوئی مقتدر شخصیت دہلی تشریف لاتی تھی سوسائٹی اس کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا کرتی تھی۔ سوسائٹی نے ایسے متعدد سپاسنامے پیش کئے ان مواقع پر سوسائٹی کی مختصر تاریخ بیان کی جاتی تھی اور اس کی کارروائیوں اور عہدے داروں کی خدمات پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ہم اب سوسائٹی کے اس پہلو کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

۲۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے مربی کرنل ہیملٹن نے اراکین کو مطلع فرمایا کہ لفٹنٹ گورنر کے دہلی تشریف لانے کی توقع کی جا رہی ہے۔ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور کیپٹن ہگنس، لالہ سنگھ صاحب (نائب صدر) ولایت حسین خاں، مولوی ضیاء الدین، مسٹر سمتھ، اور پیارے لال (معتمد اعزازی) پر مشتمل ایک وفد مقرر کیا جائے جو ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرے[1]

جب لفٹنٹ گورنر سر ڈونلڈ مکلاڈ کی تشریف آوری پر دہلی میں ایک دربار عام کا اہتمام ہوا تو سوسائٹی کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا[2] سوسائٹی کے سکریٹری نے سپاسنامہ پڑھ کر سنایا جس میں سوسائٹی کی تاریخ، اس کے کارناموں کا تذکرہ اور مربی کی توصیف و تعریف تھی۔ جس وقت یہ سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا سوسائٹی کے رجسٹر میں ۱۴۴ ممبروں کے نام موجود تھے جن میں سے ۹۶ ہندوستانی تھے اور باقی یوروپین۔

اس سپاس نامے میں ان عطیات کا ذکر ہے جو سوسائٹی کے ممبروں کی جانب سے مقالوں کی شکل میں موصول

---

[1] دہلی سوسائٹی۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء ص ۱۴

[2] " " " " ص ۲۷۔۔۔۳۰

ہوئے تھے۔ مقالہ نگاروں کے نام یہ ہیں۔ منشی حکم چند، پنڈت بشیشور ناتھ، نواب علاؤالدین احمد خاں، پیارے لال، مولوی الفت حسین، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب شمس الدین احمد خاں، لالہ لچھمی نرائن، منشی جیون لال۔
سوسائٹی کے سکریٹری نے لفٹنٹ گورنر سے گذارش کی کہ وہ سوسائٹی کے مربی اعلیٰ بننا قبول فرماکر ان کی عزت افزائی فرمائیں اور ان کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کریں۔
لفٹنٹ گورنر صاحب نے سوسائٹی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ جب سے انھوں نے سوسائٹی کو چندہ دینا شروع کیا تھا اسی وقت سے وہ سوسائٹی کی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ حتی المقدور سوسائٹی کی اعانت فرماتے رہیں گے۔ بعد میں انھوں نے معتمد سوسائٹی کی استدعا کو شرف قبولیت بخشا۔
سپاس نامہ کی ایک مطبوعہ نقل ان کی خدمت میں ارسال کی گئی جس کو انھوں نے قبول فرمایا اور سوسائٹی کی کارروائیوں کو سراہا۔
جب کرنل ہیملٹن نے جو ابتدا سے ہی سوسائٹی کے مربی تھے اور جنھوں نے سوسائٹی کے وقار کو بڑھانے میں مساعی جمیلہ سے کام لیا تھا جنوری ۱۸۶۷ء میں اپنا استعفا پیش کیا تو سوسائٹی کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک الوداعی سپاسنامہ پیش کیا گیا اور بہترین بالشان الفاظ میں انھیں خراج تحسین ادا کیا گیا[۵]۔ اس میں سے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔
"آپ کے عہد حکومت میں اس شہر نے وہ رونق پائی ہے کہ ہماری زبان نہیں جو آپ کا شکریہ ادا کریں.....
آپ کی اُس محبت نے جو آپ کو ہمارے لئے ملک کی زبان اور علوم سے از بس ہے آپ کو اس شہر میں ایک انجمن علمی قائم کرنے پر آمادہ کیا، شکر کہ یہ درخت آپ کا لگایا ہوا کچھ کچھ پھل لانے لگا۔ اور یقین ہے کہ اور بھی عمدہ پھل لائے۔"
کرنل ہیملٹن نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:۔
"جو کچھ کوشش مجھ سے سوسائٹی کے واسطے ظہور میں آئی۔ ان کو آپ بہت کچھ سمجھتے ہیں، اس تھوڑے عرصہ میں جب سے سوسائٹی مقرر ہوئی، اس شہر کے صاحبانِ عالیشان اور ہندوستانیوں میں ربط و ضبط بڑھانے میں اُس نے بہت مدد کی ہے، بہت سے مضامین دلچسپ پر آزادانہ طور سے بحث ہوئی اور ایسی تدابیر اختیار کی گئی ہیں جن سے تعصب اور غلطی رفع ہو، اور ترقی عوام ظہور میں آئے، مجھے بھروسا ہے کہ اس شہر اور اس کے گرد و نواح کے تمام ذی اختیار اور معزز اشخاص سوسائٹی کی مدد کئے جائیں گے، مجھے شکر گذار ہونا چاہیئے ان صاحبوں کا جنھوں نے مضامین دلچسپ اور مفید سوسائٹی میں پڑھ کر ہم کو ممنون کیا، اور نیز ان صاحبوں کا جو سوسائٹی کی ترقی میں ساعی ہیں، خصوصاً مسٹر کولڈ سٹریم صاحب بہادر اور ماسٹر پیارے لال صاحب کا جو تمہارے سکریٹری ہیں، میری توجہ دلی ہمیشہ سوسائٹی کی طرف رہے گی اور جو مدد مجھ سے ہو سکے گی پہنچانے میں رغبت دی جائے گی، مجھے اُمید ہے کہ آپ ایک عمدہ کتب خانہ تیار کرنے اور علمی انجمنوں سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوں گے، پس اب میں اس کو ختم کرتا ہوں، اور آپ کی کامیابی اور خیریت کا خواہاں ہوں۔"

---

[۵] دہلی سوسائٹی ۲۳ اکتوبر ۱۸۶۶ء ص ۳۰-۳۲

اس نوعیت کا دوسرا موقعہ اس وقت پیدا ہوا جب سوسائٹی کو اپنے سرگرم سکریٹری پیارے لال کو جنھوں نے بحیثیت معتمد ۱۸۶۵ء سے لے کر ۹ دسمبر ۱۸۶۸ء تک سوسائٹی کی اہم خدمات انجام دی تھیں الوداع کہنا پڑا پنجاب کے مہتمم (حلقۂ ادب) نامزد ہونے پر انکو مستعفی ہونا پڑا تھا۔[۵۱]

اگر پیارے لال سوسائٹی کے مقبول ترین سکریٹری تھے تو حیرت کا مقام نہیں۔ ہم آگے چل کر ان کے بارے میں کچھ کہیں گے ان کی خدمت میں جو سپاس نامہ پیش کیا گیا اس پر مندرجہ ذیل ممبران کے دستخط ثبت تھے۔

کار سٹیفن۔ سی۔ آر۔ گک۔ مرزا الٰہی بخش۔ اے۔ ڈیمیلٹ۔ مرزا محمد سلیمان شاہ۔ مرزا شہاب الدین احمد خاں۔ رائے چینا مل۔ رائے مہیش داس۔ رائے جیون لال۔ رائے بنسی لال۔ لالہ رام کشن۔ لالہ اغوری پرشاد۔ لالہ سنگرام۔ لالہ وزیر سنگھ لالہ سریرام۔ خان بہادر محبوب بخش۔ محمد حسین۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب (جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ فرمایا "فقیر اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم واندوہ ہوا ہے میرا جی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں")۔ سی۔ اے۔ کرک پیاٹرک۔ بابو الیفو ننغو گپ۔ حکیم غلام رضا خاں۔ بابو ہزاری مین سنگھ۔ لالہ رامی مل۔ لالہ جگن ناتھ۔ لالہ شوجی رام۔ منشی کیلال کشن۔ وزیر سنگھ۔ پنڈت گوپال سہائی۔ نواب محمد نجف خاں لالہ نارائن داس۔ غلام حیدر خاں۔ پنڈت بشیشور ناتھ۔ لالہ پارس داس۔ رائے گنگا رام۔ پنڈت کشن لال۔ لالہ شیام لال لالہ دیال سنگھ۔ پرتھو دیال۔ شوقی رام۔ نصیر الدین۔ لالہ گوبے دیال۔ بھگتا ور سنگھ۔ لالہ اجودھیا پرشاد۔ لالہ جانکی داس لالہ بلدیو سنگھ۔ چندو لال۔ تارا ناتھ۔ سید کیفیت علی۔ مرزا غیاث الدین۔ حکیم محمد حسام الدین۔ منشی حکم چند اور رو برٹ مورس۔

اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر وہ اپنے دوستوں اور سوسائٹی کے ممبروں کی اعانت فرماتے تھے۔ اسی طرح اپنے رشحات قلم سوسائٹی کو تفویض فرما کر یا اہم موضوعات پر (جو گاہ بہ گاہ سوسائٹی کے سامنے پیش ہوتے رہتے تھے جیسے پنجاب یونیورسٹی اسکیم یا برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی تجاویز) پر رائے زنی کر کے وہ سوسائٹی کی کارروائیوں میں شرکت فرماتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سکریٹری کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد بھی وہ سوسائٹی کے معاملات سے ویسی ہی گہری دلچسپی لیتے رہے اور کبھی کبھی اس کے جلسوں میں شریک ہو کر مقالے پڑھتے رہے۔

جب ڈیوک آف ایڈنبرگ ہندوستان وارد ہوئے تو سوسائٹی نے ایک سپاس نامہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اسی طرح پرنس آف ویلز کے رو بہ صحت ہونے پر سوسائٹی نے ایک تہنیتی پیغام ملکہ معظمہ کی خدمت میں ارسال کیا۔ دونوں موقعوں پر جوابات موصول ہوئے جن کو سوسائٹی کے جریدے میں شائع کیا گیا۔

۲۴ جنوری ۱۸۷۲ء کو لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے سوسائٹی کے جلسہ میں شرکت فرما کر سوسائٹی کو اعزاز بخشا۔ اس موقعہ پر کیری کرانٹ نے صدارت کے فرائض انجام دئے تھے۔[۵۲]

---

[۵۱] دہلی سوسائٹی ۲۴ اکتوبر ۱۸۶۸ء ص ۳۰۔۳۲

[۵۲] دہلی سوسائٹی۔ اشاعت ۱ جلد ۲ ۲۴ جنوری ۱۸۷۲ء ص ۱ تا ۶۔

اس جلسہ میں نہ صرف سوسائٹی کے تقریباً سب ممبروں نے شرکت کی بلکہ دہلی کے معزز شہری بھی شریک جلسہ ہوئے۔ لفٹننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کردہ سپاس نامہ میں حسب معمول سوسائٹی کی تاریخ اور اس کے کارناموں کا تذکرہ تھا۔ نیز آنجہانی کرنل ہیلٹن، میجر بک سواہن، آنجہانی سر ڈونلڈ میکلوڈ، آنجہانی کرنل بک نیل وغیرہم کو جن کا عہدے داروں اور ہمدردوں کی حیثیت سے سوسائٹی سے قریبی تعلق رہا تھا خراج تحسین ادا کیا گیا تھا۔

لفٹننٹ گورنر صاحب نہایت انہماک کے ساتھ جلسہ کی کارروائی ملاحظہ فرماتے رہے۔ سوسائٹی کے سابق سکریٹری پیارے لال نے بارہ صفحات پر مشتمل اپنا مقالہ بعنوان "دو آریائی بہنیں" پڑھ کر سنایا۔ لفٹننٹ گورنر صاحب سوسائٹی کی شاندار کارکردگی اور مباحثوں کی جن کو وہ نہایت ضروری سمجھتے تھے روح سے بےحد متاثر ہوئے۔ انھوں نے سوسائٹی کو مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ سوسائٹی اپنی مفید سرگرمی کو جاری رکھے گی۔[1]

۱۸۷۵ء میں سوسائٹی نے پرنس آف ویلز کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ اسی طرح ۲۶ اپریل ۱۸۷۶ء کے جلسہ میں جو کرنل ڈبلیو۔ جی۔ ڈیویز کی صدارت میں منعقد ہوا تھا سوسائٹی نے لارڈ لٹن کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرنا طے کیا۔ جلسہ میں اس پر کافی بحث ہوئی کہ ایک سپاس نامہ پیش کیا جائے یا دو۔ ایک لارڈ لٹن کی خدمت میں اور دوسرا ملکہ معظمہ کی خدمت میں جب یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو وہ "ملکۂ ہند" کا خطاب اختیار کریں گی۔ لیکن طویل مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ صرف ایک سپاس نامہ پیش کیا جائے اور وہ بھی گورنر جنرل کی خدمت میں۔[2]

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ چند باذوق حضرات کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ جو سوسائٹی کا بنیادی مقصد تھا، سوسائٹی صوبہ کی مقتدر ہستیوں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے کا بھی فخر حاصل کرتی رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کن ٹھوس بنیادوں پر سوسائٹی نے اپنی ناموری کا محل تعمیر کیا تھا۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ حکومت کس طرح تعلیمی، نصابی اور دیگر اہم امور پر سوسائٹی سے مشورے کیا کرتی تھی۔ سوسائٹی کی سفارشات حکومت کے نزدیک وقیع ہوا کرتی تھیں اور اس کی رائے کو بنظر استحسان دیکھا جاتا تھا۔

دوسری انجمنیں بھی سوسائٹی کی رائے طلب کیا کرتی تھیں۔ جیسے بنگال سوشل سائنس ایسوسی ایشن، یوروپین کمیٹی برائے قیام پنجاب یونیورسٹی، علیگڈھ سوسائٹی وغیرہ۔ اسی طرح پنجاب کے ناظم تعلیم عامہ میجر فلر یا کپتان ہالرائڈ یا انجمن لاہور کے صدر ڈاکٹر لیٹنر بھی سوسائٹی سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔

سوسائٹی نے مشرقی کتابوں اور مخطوطوں کی ایک فہرست مرتب کرنے میں حکومت کے ساتھ اشتراک کیا۔ طہران کی مطبوعہ مشرقی کتابوں کی فہرست اور سید احمد خاں کی رپورٹ پر بھی جو شمالی مغربی صوبے کے مسلمانوں کی تعلیم

---

[1] دہلی سوسائٹی۔ اشاعت نمبر ا جلد نمبر ۲، ۲۴ جنوری ۱۸۷۳ء ص ۱۸ — ۲۰

[2] دہلی سوسائٹی۔ ۶ اگست ۱۸۷۶ء۔ دربار کے دلچسپ واقعات کے لئے ہم ناظرین سے مرادؤل ٹیوڈر کریگ فرنس کی سفارش کریں گے۔

کے لئے سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی سوسائٹی کی رائے طلب کی گئی تھی۔

یہاں پر جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سوسائٹی نے خاص فنڈ فراہم کر لیا تھا جس کا ایک حصہ انگریزی کتابوں کے تراجم کی اشاعت کے لئے مخصوص تھا۔ سوسائٹی کے سرگرم نائب سکریٹری لچھمن داس نے ولسن کی "رگ وید" کو اور سوسائٹی کے ایک رکن ایسری سنگھ نے "The History of America" کو اردو کا جامہ پہنایا۔ سوسائٹی کتابوں پر تبصرے اور مسودوں پر نظر ثانی کر کے حکومت سے ان کی اشاعت کی سفارش بھی کیا کرتی تھی۔ ایسی کتابوں میں مولانا الطاف حسین کا "قصۂ منصفہ" ایسری سنگھ کا "قصیدۂ ملکہ وکٹوریہ" (نظم) اور مرزا غیاث الدین کی "تاریخ خاندانِ تیموریہ" (نظم) مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

(باقی آئندہ)

دکن میں اردو کے ہندو شعرا[1]

(جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی)

دکن میں دکھنی، اردو یا ہندوستانی کے ابتدائی نمونے جو تحریری صورت میں دستیاب ہوتے ہیں وہ تقریباً ۱۴۲۵ء سے ہیں جبکہ دکن میں بہمنی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ تقریباً دو سو سال تک بہمنی خاندان حکومت کرتا رہا۔ اور اس کے بعد دو سو سال تک عادل شاہی ——— قطب شاہی۔ نظام شاہی وغیرہ حکومتیں کرّ و فر شان و شوکت سے حکومت کی نوبت بجاتی رہیں۔ پھر شمال کی مغلیہ حکومت میں دکن بھی شامل ہوگیا اور تقریباً ۴۰ سال کے بعد آصفیہ حکومت قائم ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مرہٹوں۔ حیدر علی و ٹیپو سلطان اس کے بعد انگریزوں نے دکن کے بیچ حصہ پر قبضہ کر لیا۔ بہرحال تقریباً ساڑھے پانچ سو سال سے اردو زبان دکن کے وسیع حصہ میں رائج رہی اور استعمال کی جاتی رہی۔

جن حکومتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب کی سب علم و ادب کی سرپرست اور اہل علم و فن کی قدر دان شعرا اور ادیبوں کی مربی و محسن رہی ہیں اس کی وجہ سے ان کے زمانہ میں علم و فن شعر و سخن اور ادب کو بڑی ترقی ہوئی صدہا کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں سے ایک بڑا حصہ آج تک موجود ہے۔ ان کے زمانہ کا تمدن اور تہذیب۔ رسم و رواج اور کلچر کے آثار آج تک باقی ہیں اور اپنی پرشان و شکوہ ماضی کی داستان سناتے ہیں۔

ان حکومتوں کے بانیوں نے اگرچہ باہر سے آکر اپنے زور بازو سے حکومت قائم کی اور اپنے خاندان کے لئے وسیع حکومت کی بنا ڈالی تھی مگر ان کی اولاد دکھنی دودھ سے پرورش پاکر پروان چڑھی تھی ان کی رگوں میں دکھنی خون کا دور دورہ تھا ان کے دربار میں اگر باہر سے آئے ہوئے امرا اور رؤسا۔ اصحاب علم و فضل۔ شعرا اور ادیب پیش پیش رہا کرتے تو وہیں دکن کے دکھنی امراء اور رؤسا اور اصحاب فکر و دانش کا بھی جمگھٹا ہوتا تھا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو مشاہیر اور مشیران سلطنت ہوتے تھے۔

ابوالقاسم فرشتہ۔ رفیع الدین شیرازی۔ خواجہ علاء الدین محمد شیرازی۔ ملک عبدالرشید۔ خواجہ سعد اللہ۔ میر محمد مومن استرآبادی۔ قاضی محمد سمنانی۔ مبرک معین الدین سبزواری۔ مرزا محمد امین سیستانی علامہ ابن خاتون وغیرہ جیسے ارباب علم و فضل نے تاریخ ادب حکمت و فلسفہ۔ ریاضی و ہندسہ کا جو چراغ جلایا اس کی روشنی اب تک زائل نہیں ہوئی ہے — نور الدین ظہوری ملا ملک قمی۔ حکیم آتش۔ مرزا محمد تقی۔ ملا شکیبی وغیرہ جیسے شعراء نے شعر و سخن کا جو بازار گرم کیا تھا اس کی گرمی اب تک سرد نہیں ہوئی ہے۔

تاریخ میں جہاں ان غیر ملکی ارباب فکر و دانش اصحاب علم و فضل کے نام ان کے علمی کارناموں کے باعث زندگی جاوید

[1] انجمن ترقی اردو بمبئی کے زیر اہتمام یہ مقالہ ۸ / جنوری ۱۹۵۲ء کو پڑھا گیا۔

حاصل کئے ہیں وہیں تلنگی زبان کے شعراء اور ادیبوں مثلاً ملاریڈی۔ گنگادھر۔ پنا گنٹی کے کارناموں کو سنہرے حروف میں پیش کرتی ہے۔

ان حکمرانوں کے زمانے میں اگر عربی اور فارسی کی قدر دانی ہوئی تو وہیں دکن کی مشترک زبان دکھنی اور تلنگانہ کی ملکی زبان تلنگی اور مہاراشٹرا کی ملکی زبان مراٹھی کی بھی سرپرستی ہوتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ قطب شاہی عہد کو تلنگی ادب کا سنہرا دور قرار دینا چاہئے۔ کیونکہ قطب شاہوں کے پہلے اور پھر ان کے بعد تلنگی کو ایسی شاہانہ سرپرستی نصیب نہیں ہوئی اس خاندان کے اکثر بادشاہ نہ صرف تلنگی سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ اس زبان میں شعر موزوں کرنے کی قابلیت بھی رکھتے تھے۔ تاریخوں سے اس امر کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ابراہیم قطب شاہ اور سلطان محمد قلی قطب شاہ نے تلنگی کے دیوان مرتب کر دئے تھے۔

اسی طرح بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کے مراٹھی سے واقف رہنے کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے۔

مراٹھی اور تلنگی کے ساتھ ساتھ دوسری مشترک زبان دکھنی کو ان کے زمانہ میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ وہ صرف بول چال کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ اب نظم و نثر کے بلند پایہ شہ کار اسی زبان میں مرتب ہوتے تھے۔ علماء۔ فضلاء۔ صوفیا اور اصحاب طریقت شعراء اور ادیب اس زبان میں اپنی دماغی پیداوار کو قلمبند کرتے تھے۔ اشرف۔ فیروز۔ محمود۔ وجہی۔ احمد۔ غواصی۔ ابن نشاطی عبدل۔ نصرتی۔ مرزا۔ سیوک۔ رستمی وغیرہ نے جو ادب پارے لکھے تھے وہ آج تک ان کے زور قلم اور پرواز تخیل ندرت خیال کی داستان سناتے ہیں۔ دکھنی ادب کا بول بالا ان سے بالاتر ہو گیا زبان کی سلاست اسلوب کی روانی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس کی وضاحت طوالت کا موجب ہوگی بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی عہد کے شعراء اور ادیبوں میں سے جن کے کارناموں سے ہم واقف ہیں صرف چند ہی ایسے خوش نصیب ہیں جن کے ناموں کی ہمیں اطلاع ہے ورنہ کئی ایسے بلند پایہ شعراء ہیں جن کے ناموں کی آج تک وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ بہمنی دور کے دو سو سال اور قطب شاہی عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں کے تقریباً دو سو سال کے عرصہ میں جن شعراء نے سربلندی حاصل کی تھی ان میں کتنے ہندو اصحاب تھے۔ صرف رام راو وہ خوش نصیب ہے جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے واقعات شہادت امام حسینؓ پر ایک کتاب قلمبند کی تھی مگر افسوس ہے کہ وہ بھی آج ناپید ہے اور "سیوک" پر جس کا جنگ نامہ موجود ہے ہندو ہونے کا گمان ہے۔

ہم نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" میں اردو زبان کی ترقی کے سات دور قرار دئے ہیں اس کے بموجب ابتدائی دو ادوار میں صرف رام راو ہی کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ کسی دوسرے ہندو شاعر کی ہمیں اطلاع نہیں ہے۔

تیسرا دور ۱۱۰۰ھ ہجری یا ۱۶۸۶ء سے شروع ہوتا ہے اس دور میں ہم لالہ جسونت رائے منشی تخلص کو شاعر اور ادیب کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں۔

منشی اورنگ زیب عالمگیر کے جنوبی ہند فتح کرنے کے بعد یہاں کے گورنر سعادت اللہ خاں مقرر ہوئے۔ ان کے دربار میں لالہ جسونت رائے ایک معزز عہدہ رکھتے تھے ان کے ماتحت جو سررشتہ تھا اس میں کئی ارباب قلم کام کرتے تھے چنانچہ

محمد امین اسرائیلی جو ایک بلند پایہ فارسی کا انشاء پرداز تسلیم کیا گیا ہے وہ لالہ جسونت رائے کا ہی ہاتحت تھا۔

لالہ جسونت رائے عرفی۔ فارسی کا ادیب شاعر اور انشاء پرداز تھا۔ اس نے سعادت اللہ خاں کے حالات میں ایک فارسی ضخیم مثنوی سعید نامہ قلبند کی ہے۔ جسونت رائے کو فارسی کے ساتھ اردو سے بھی دلچسپی تھی۔ منشی اپنا تخلص قرار دیا تھا۔ ایک مثنوی "گل کدۂ عشق" کے نام سے فارسی میں اور ایک دوسری مثنوی جو اردو میں لکھی گئی تھی "گلدستۂ عشق" سے موسوم تھی افسوس ہے یہ دونوں اب ناپید ہیں۔ منشی کے کلام سے دو غزلیں اور گلدستۂ عشق کا وہ حصہ دستیاب ہوا ہے جو سعادت اللہ خاں کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ یہاں بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہتا ہوں اتا وصف ممدوح کی	کہ ہے تس منے خاصیت نوح کی
جو ٹک اوس کی بخشش کا برسے ابہال	کرے دھرت کون بحر و کاں کی مثال
نہیں کوئی شجاعت منے اوس کا جوٹ	کریا فتح پل میں گھران ملک د کوٹ

غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

چاند شرماتے کیا گل کو تیرے رو کے اگل	خون ہوا نافہ کا دل نگہت گیسو کے اگل
کیا ہے جنت جو کتے کیا ہے فردوس بریں	کیا جو شمشاد کتے قامت جو کے اگل
کیا ہے لالاں کی جوانی کیا ہے وہ موتیاں کی جھلک	کیا وہ شبنم جو کتے گل کا نیری جو کے اگل

نیں وہ مکھ جو پڑیا زلف کے بالاں سے نکل	گل پڑیا باغ منی سنبل و ریحاں تے نکل
خال ہے مکھ کا تیرے یا ہے یو گل لالہ کا تل	یا گیا داغ میرے دل کا ہے آہاں تے نکل
منشی یو شعر ہیں یا ہیں اچھے سحر کے پد	یا کہ موتیاں نے پری چشمہ حیواں تے نکل

یہ منشی کا کلام ہے جو آج سے دو سو چالیس سال پہلے موزوں فرمایا گیا تھا۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ان میں جدت خیال بھی تھی اور تخیل کی بلند پروازی بھی۔ ان کے زمانہ کے لحاظ سے وہ کلام صاف اور سادہ ہے۔

دکن کا چوتھا دور ۱۱۳۶ھ سے شروع ہو کر ۱۲۲۰ھ پر ختم ہوتا ہے یہ زمانہ وہ ہے جب آصفیہ حکومت قائم ہو گئی تھی اس دور کے پندرہ سولہ شعراء اور ان کے کلام سے ہم واقف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔ لالہ موہن لال عتاب تخلص لالہ لچھمی نراین شفیق۔ لالہ جے کشن داس بے جان۔ لالہ نہال کرن داغ۔ سرو نجی رائے للہ۔ لال چند رنگین۔ بالاجی ترمک ذرہ۔ رائے گلاب چند ہمدم۔ نرسا ثابت۔ انندرام مخلص۔ بہادر سنگھ بہادر۔ تولہ رام تولہ۔ چرناس وغیرہ ان سب کا تذکرہ طوالت کا موجب ہوگا ہم صرف شفیق۔ ہمدم اور ذرہ کا تعارف کراتے ہیں۔

(۱) شفیق تخلص لالہ لچھمی نارائن نام تھا۔ ان کے باپ لالہ منسارام عربی اور فارسی کے زبردست عالم آصف جاہ اول کی سرکار سے متوسل تھے کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ شفیق ۱۱۵۷ھ میں تولد ہوئے مولانا شیخ عبدالقادر سے درس لیا پھر مولانا سید غلام علی آزاد بلگرامی سے اپنی تعلیم کی تکمیل فرمائی۔ شعرگوئی میں آزاد کے ہی شاگرد تھے شفیق کا انتقال ۱۲۱۵ھ میں ہوا ان کی کئی فارسی کتابیں مشہور ہیں چنانچہ گل رعنا شعراء فارسی کا تذکرہ اور چمنستان شعراء اردو گو شعراء کا تذکرہ ہے اس کے علاوہ کئی فارسی تاریخیں قلمبند فرمائی ہیں۔

شفیق فارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا غزلیات اور مثنویاں اس کی یادگار ہیں۔ قصیدے بھی لکھے ہیں۔ مرثیہ بھی موزوں فرمایا ہے۔ شفیق کا پہلے صاحب تخلص تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

تشنہ لب ہوں شراب کی سوگند　　　جل گیا جی کباب کی سوگند
ہر گھڑی تو قسم نہ کھا جھوٹی　　　تجھکو دل کی کتاب کی سوگند
دل صاحب ہے کہاں پریشان آج　　　زلف کے پیچ و تاب کی سوگند

ایں کنج چمن میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے　　　خدا جانے کہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ　　　نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

آنکھوں کے متعلق اس نے بیسیوں شعر لکھے ہیں جس میں نئی نئی تشبیہیں دی ہیں تصویر جاناں اس کی قابل قدر مثنوی ہے۔

(۲) بالاجی ترک نام اور ذرہ تخلص تھا۔ ۱۱۵۰ھ سے ۱۲۰۰ھ تک اس کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ شفیق کی طرح ذرہ بھی صاحب علم و فضل تھا۔ آصف جاہ اول کے دار الانشاء میں مامور تھا جس سے اس کی فارسی قابلیت کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ ذرہ کا کلیات خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ غزلوں کے علاوہ دو مثنویاں بھی اس کی یادگار ہیں۔ ایک کو مظہر نامہ سے موسوم کیا ہے اور دوسری مثنوی لطیف سے نام زد کی گئی تھی۔ اب دونوں ناپید ہیں۔ ذرہ کو رسا سے تلمذ تھا۔ ذرہ کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

نہ بولی شمع اتنا ہائے پروانے کے ماتم پر　　　کہ تھا یہ ہمدم اپنا یار اپنا جاں نثار اپنا

بے وفاؤں سے وفا کرتے ہیں ہم　　　حق محبت کا ادا کرتے ہیں ہم

ایسے خوبوں کو دل نہ دے زنہار　　　تیرا دنیا میں کیا خدا ہی نہیں

پیر ادمی نے یوں کہا ذرہ　　　جب تلک ہے جہاں میں تو خوش باش

ذرہ بھی اپنے رنگ میں خورشید طبع ہے　　　مضموں کا اس کے رنگ پڑا ہے سماکے ساتھ

---

(۳) ہمدم تخلص رائے گلاب چند نام تھا۔ شمس الامراء امیر پائیگاہ کی سرکار سے متوسل تھا۔ احسن اللہ خاں بیان دہلوی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۱۱ھ میں اس نے کلیات مرتب کیا ہے جو ۱۲۸۰ھ میں اُن کے فرزند نے اس کو طبع کرکے شائع کیا ہے۔ ہمدم غزل، قصیدہ، مثنوی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتا تھا ضخیم کلیات سے اس کے پرگو اور قادر الکلام شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

نگہ شوخ کام کرتی ہے　　　کار عاشق تمام کرتی ہے

دل سوختہ ہیں اس کے تبسم کے جو کوئی　　　نزدیک ان کے کچھ نہیں توقیر برق کی

بہ ظاہر جاگتا تو ہوں نظر پر کچھ نہیں آتا　　　برنگ دیدۂ تصویر ہوں میں خواب حسرت میں

وصل کی شب وہ کچھ آتے ہی بگڑ جاتے ہیں　　　لب بھی یہاں ملنے نہیں پاتے کہ لڑ جاتے ہیں

چشموں میں تیرے جس کو مے خانہ نظر آیا　　　وہ مے سے محبت کا مستانہ نظر آیا

دکن میں اردو کے ارتقاء کا پانچواں دور ۱۲۲۰ھ سے ۱۳۰۰ھ تک قرار دیا گیا ہے اس دور میں شمالی ہند یعنی دہلی اور لکھنؤ وغیرہ سے بیسیوں شعراء حیدرآباد آگئے تھے اور اہل علم کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ اس لئے حیدرآباد کی قدیم دکھنی شاعری پر بڑا اثر پڑا یعنی اب دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی شاعری کا رنگ نظر آنے لگا۔ کسی نے شعراء دہلی کا طرز اختیار کیا تو کسی نے اہل لکھنؤ کے طرز کو اپنایا۔

اس دور کے تقریباً چالیس پچاس ہندو شعراء سے ہم واقف ہیں ان کا تذکرہ اس موقع پر دشوار ہے اس لئے اس دور کے تین مشاہیر شعراء کا تعارف کرایا جاتا ہے جو شاداں۔ ربط۔ مکھن لال مکھن ہیں۔

(۱) مہاراجہ چندو لال شاداں ۱۱۸۹ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۶۱ھ میں اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ کروڑ گیری کی نظامت سے ترقی کرتا ہوا پیشکاری کی جلیل القدر خدمت پر فائز ہوا اور عرصہ دراز تک دیوان کے اہم فرائض انجام دے

مہاراجہ کے سیاسی کارناموں کو ہم نظر انداز کرتے ہیں ان کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ ہر وقت ان کے گرد و پیش شعراء کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ان کو بیش قرار تنخواہ دی جاتی تھی۔ احسن اللہ خاں بیان۔ نصیر۔ حفیظ۔ مشتاق۔ شہید وغیرہ کئی شعرا شمالی ہند سے آئے ہوئے دربار کی زینت تھے۔ مہاراجہ کو شعر و سخن سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ وہ خود بھی اپنے زمانہ کا شاعر تھا۔ فارسی اور اردو کلام موجود ہے۔ مہاراجہ کا کلام سنجیدہ شگفتہ پسندیدہ مضامین کا گنجینہ ہے۔ کلام میں رنگینی ہے انداز بیان میں جدت ہے۔ تخیل کی بلند پروازی ہے ان سے ان کے قادر الکلام ہونے کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔

شاداں کو تصوف سے گہری دلچسپی تھی اس لئے کلام کا بڑا حصہ تصوف کے مسائل اور اسرار کا بیش بہا گنجینہ ہے۔

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا ۔۔۔ کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

ہمیں کیا کام ہے دونوں جہاں سے ۔۔۔ ترا ملنا ہمارا مدعا ہے

جامہ یار کو کیا جامہ گل سمجھا ہے ۔۔۔ خار کی طرح سے دامن دلدار نہ کھینچ

تو ہی غفار ہے مجرم ہوں تیرا ۔۔۔ عطا کیوں کر نہ ہو آخر بشر ہوں

اب شکل دکھا حجاب مت کر ۔۔۔ سو جان سے تیرے نثار ہیں ہم

بوسے لینے ہی سے پژمردہ ہوئے جاتے ہیں ۔۔۔ رشک گل اتنی بھی نازک بدنی خوب نہیں

کیا کہئے رات کیسی کٹی اس کے پیار میں ۔۔۔ کس کس مزے کے لطف تھے بوس و کنار میں

۲۔ بالا پرشاد نام اور ربط تخلص تھا۔ پیدائش لکھنؤ میں ہوئی مگر پرورش حیدرآباد میں ہوئی۔ راجہ خوش حال چند کا داماد تھا۔ اس کے بعد جاگیرات کا مالک تھا۔ شاعری سے بڑا شغف تھا اس وقت کی محفلوں میں اس کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔ ایک طرف قوالی کی مجلس میں غنائیہ غزل مقبول تھی تو دوسری طرف محفل عیش و طرب میں عشقیہ کلام طرب و انبساط کا موجب ہوتا تھا۔

تصویر اگر شمع رسالت کی لکھوں میں ۔۔۔ خامے سے مکمل جلوہ شق القمر آوے

تاب و تواں و صبر گئے دل کے ساتھ ساتھ ۔۔۔ عقل گئی ہے صاحب عقل کے ساتھ ساتھ

سر سے کفن لپیٹے ہوئے پھر رہے ہیں ربط ۔۔۔ مرنے کے اشتیاق میں قاتل کے ساتھ ساتھ

یوں تو یوں ہی مجھ منکر ہیں میرے قتل سے آپ　　　سرخی پنجہ نازک کو حنا کہتے ہیں
وہ جو خنجر مرے مژگاں کی طرح ہے پرخوں　　　یہ جو دامن پہ ہیں چھینٹے اسے کیا کہتے ہیں

۳۔ لکھن۔ لکھن لال نام۔ راےبہ خطاب اور لکھن تخلص تھا۔ مہاراجہ چندو لال کی جانب سے حضوری میں عرض بیگی کی خدمت پر مامور تھا۔ تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ رباعیات عمر خیام سے بڑی دلچسپی تھی۔

اسی دلچسپی کے لحاظ سے اس نے عمر خیام کی رباعیات کا اردو رباعی میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو کا جو دیوان مرتب کیا ہے اس میں صرف نعتیہ کلام ہے یا سید نا عبدالقادر جیلانی کی مدح کی گئی ہے۔ دوسرا کوئی کلام نہیں ہے۔ بطور نمونہ دو رباعی ملاحظہ ہوں۔

جب عشق ہو پستی و بلندی پھر کیا　　　ہے بے خبری تو ہوشمندی پھر کیا
رکھ طاق میں یار تو مریدی پیری　　　رندی میں خیال ارجمندی پھر کیا

پہلے غم ہجر گرمی محفل تھا　　　چندے برکات شوق ہم منزل تھا
اے یار اب آکے دیکھ تربت میری　　　یہ مشت غبار کچھ دنوں دل تھا

اس دور کے دوسرے مشہور شاعر زیب۔ رسا۔ مست۔ عاجز۔ اصغر وغیرہ تھے جن کا تذکرہ یہاں طوالت کا موجب ہے اس لئے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

دکن میں اردو کا چھٹا دور ۱۲۸۱ھ سے شروع ہوتا اور ۱۳۶۲ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں اردو زبان کو جو ترقی حیدر آباد میں ہوئی اس کی طویل داستان ہے۔ نہ صرف شمالی ہند کے مشہور شعراء۔ امیر۔ داغ۔ ظہیر۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ حیدر آباد آ گئے بلکہ حکومت کی زبان بھی اردو کر دی گئی۔ اور اردو کے مشاہیر مصنف شبلی۔ ظفر علی خاں خرر۔ مولوی عبدالحق وغیرہ بھی حیدر آباد آ گئے تھے۔ ان وجوہ سے ہر طرف اردو کا بول بالا ہو گیا۔ اس زمانہ کے ہندو شعراء کی فہرست سب سے طویل ہے۔ پچاس ساٹھ شعراء سے تو ہم بخوبی واقف ہیں جن کا کلام ہر طرح قابل ستائش قرار پاتا ہے۔ اس موقعہ پر ہم صرف تین شعراء کا تعارف کراتے ہیں۔

۱۔ بہاری لال نام اور رمز تخلص۔ ان کے دادا دہلی سے حیدر آباد آئے تھے اس زمانہ میں رمز کے باپ صغیر سن تھے ان کو حیدر آباد کے مشہور عالم اور شاعر حضرت فیض کی ہم درسی کا شرف حاصل تھا۔ رمز کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی اور حضرت فیض کی صحبت اور تربیت سے فیض یاب ہوئے۔ ان ہی سے تلمذ بھی حاصل تھا۔ رمز نے اپنے حالات زندگی خود اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ فیض کے انتقال کے بعد رمز پر حالت جذب طاری ہو گئی ایک عرصہ تک مجذوب بنے رہے کبھی تو شہر

حیدرآباد سے غائب ہو جاتے اور کبھی یک بیک فیض کے مزار کے پاس نمودار ہو جاتے تھے۔ کبھی ایک قفل بند کرتے تو دوسرا قفل بیں شیشہ ہوتا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ جذب دور ہو گیا۔ حالت جذب میں شعر کہتے تھے۔ ۱۴ رجب ۱۳۲۵ھ کو اپنے مرشد فیض کے عرس کے دن عین مشاعرہ کے روز ان کی روح یکایک پرواز کر گئی۔ کلیات غیر مطبوعہ ہے جس میں ساٹھ ہزار اشعار سے زیادہ ہیں جو جملہ اصناف سخن پر مشتمل ہیں۔ رمز فطری طور پر شاعری کا ذوق رکھتے تھے بعض مرتبہ ایک رات میں سو سو شعر کہہ دیا کرتے تھے۔

سرود عاشقاں ہر دم مرے تار نفس میں ہے
کبھی آواز یا ہو ہے کبھی ہو ہو کبوتر ہے

گھٹ گئیں عمر کی راتیں یونہی گرتے پڑتے
دن قریب آ گئے آرام سے سو جانے کے

جواہر میں تلے گا یہ فسانہ عشق کا میرے
چھپے گا بعد میرے قصہ بن کر لعل و گوہر کا

بت دل جلا رہے ہیں جفا انتہا کی ہے
کعبہ کو پھونکتے ہیں دہائی خدا کی ہے

لے جا رہا ہے کھینچ کے دل کوئے یار میں
رسی گلے میں الفت زلف دوتا کی ہے

خود ان کو شوق وصل ہے لیکن کریں وہ کیا
چلتا نہیں ہے بس یہی فکر انتہا کی ہے

کرتے ہیں جان بوجھ کے انسان دوڑ دھوپ
ہوتا وہی ہے رمز جو مرضی خدا کی ہے

۱۰۔ باقی۔ گردھاری پرشاد نام باقی تخلص۔ راجہ محبوب نواز ونت خطاب تھا۔ ان کے اجداد آصفجاہ اول کے ہمراہ دہلی سے آئے تھے۔ باقی عربی فارسی اور اردو کی بہت اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ مرحوم نظام میر محبوب علی خاں کے اتالیق تھے۔ اس کے ساتھ میر عثمان کی خدمت پر بھی مامور رہے۔ صاحب منصب اور جاگیر اور فیض کے شاگرد تھے ۱۳۱۴ھ میں انتقال ہوا۔ مذہبی جوش اور ذوق و شوق کے باعث کئی دیول بنائے۔ ہندو دھرم کے احکام کی پیروی بھی سختی سے کرتے تھے۔ اس کے ساتھ تصوف سے خاص لگاؤ تھا اور وہ کلام تصوف سے مملو ہے۔ کئی اردو کتابوں کے مصنف تھے۔ بہائے باقی کے نام سے دیوان شائع ہو چکا ہے۔ ان کی آل اور اولاد میں آج بھی کئی اچھے شاعر اور ادیب موجود ہیں باقی کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بوسے اس لب کے لیا کرتا ہوں
مرض دل کی دوا کرتا ہوں

مقام اپنا ہے باقی بے مقامی
مکاں رکھتے نہیں جز لامکاں ہم

آگ دیتا ہوں جگر کو دل سے — حق ہمسایہ ادا کرتا ہوں

گریباں چاک ہے جو گل نظر آتا ہے گلشن میں — ذرا سوچو تو کیا تاثیر ہے بلبل کے شیون میں

بام پر یار کا چہرا دیکھا — طور پر نور کا شعلہ دیکھا

آپ نے لطف سے آنسو نہ پوچھے ہوتے — دیکھتے پھر یہ مرا دیدہ تر کیا ہوتا

حباب آسا ہے اپنا دم لبوں پر — کوئی دم میں ادھر ہے یا ادھر ہے

۳۔ مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت جو مہاراجہ چندو لال کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۶۴ء مطابق ۱۲۸۰ھ میں تولد ہوئے۔ اپنے زمانے کے رواج کے مطابق عربی۔ فارسی۔ انگریزی اور اردو میں دستگاہ پیدا کی ایک اچھے خوش نویس تھے۔ شاعری کا ملکہ خداداد تھا۔ داغ سے تلمذ رکھتے تھے۔ آپ کے گرد و پیش ہمیشہ شعرا کا جمگھٹا ہوتا تھا جن میں ظہیر۔ سرشار۔ جلیل۔ فانی۔ جوش۔ ہوش۔ بیکم۔ ضیاء۔ محوی۔ صفیر۔ فرحت۔ عالی۔ الم۔ وحید۔ آصفی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد کو اولاً اُن کی موروثی خدمت پیشکاری ملی اس کے بعد دیوانی یا مدار المہامی پر سرفراز ہوئے دس سال کے بعد اس سے سبکدوش ہوئے پھر دوبارہ صدر اعظم بنے اور گیارہ سال تک اس خدمت کو انجام دے کر بہ وجہ پیرانہ سالی کنارہ کشی اختیار کی۔ ۱۹۴۰ء میں جہان فانی سے کوچ کیا۔

مہاراجہ کشن پرشاد بڑے خوش اخلاق۔ ذی مروت۔ جہان نواز۔ سخاوت اور داد و دہش میں مشہور تھے مشرقی تہذیب اور مشرقی کلچر کا نمونہ تھے۔ ان کی رواداری اور ان کی پوری زندگی مغلیہ دور کی یاد تازہ کرتی تھی۔ ان کی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے اوقات فرصت کو علمی تذکروں اور علمی مشاغل میں گزارتے تھے ان کی بے شمار کتابیں جو مختلف فنون پر حاوی ہیں شائع ہو چکی ہیں۔

مہاراجہ ایک قادر الکلام شاعر تھے جب شعر کہنا شروع کرتے تو سینکڑوں اشعار منظم کرتے ہوئے چلے جاتے تھے ان کے متعدد دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ جس میں قدیم طرز کی شاعری عشق و محبت۔ وصال و فراق۔ گل و بلبل۔ شاہد و ساقی رند و محتسب کے متعلق تخیلات بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں نازک خیالی کا بہت کچھ سواد حاصل ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا دوسرا جز توحید اور تصوف سے متعلق ہے۔ تصوف کے حقائق اور

اسرار بیان کئے ہیں۔ یا پھر آنحضرت رسول اکرم صلعم اور خواجہ معین الدین اجمیری کی مدح اور ستائش کی ہے۔ انھوں نے جملہ اصناف سخن میں خیال آرائی کی ہے۔ غزل کے علاوہ مثنوی۔ قصیدہ۔ قطعہ اور رباعی وغیرہ کا کافی ذخیرہ ان کی شاعری میں ہم دست ہوتا ہے۔ ہندو اوتاروں کے متعلق مہاراجہ نے جو نظمیں کہی ہیں وہ اردو شاعری میں ایک نئی چیز ہے۔ کرشن جی کی ولادت۔ کرشن جی کا درس عمل۔ متھرا میں کرشن جی کے چرچے وغیرہ عنوان کے تحت انھوں نے بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں کے خاتمہ کے تین شعر یہ ہیں۔

او بانسری کے بجانے والے　　ہر ایک کا دل لبھانے والے
مرلی کی صدا مجھے سنا دے　　وہ نغمہ جاں فزا سنا دے
سنتوس ہو من وہ روپ دکھلا　　بھگوان بھگت کے بس میں آجا

غزلیات کے چند شعر ملاحظہ ہوں

بندے کی بھی وہی رضا ہے　　مولا جس میں تیری خوشی ہے

دربار محبت کا قانون ہی ایسا ہے　　دیوانہ ہے فرزانہ، فرزانہ ہے دیوانہ

ہاں سیر کرو دل کی اور اس کی ہوا کھاؤ　　آبادی کی آبادی ویرانے کا ویرانہ

خاک کا تو ذرہ بھا ذات میں فنا ہو کر　　کیا سے کیا ہوا آخر بندہ خدا ہو کر

حسن ہے جبہ و دستار کا دشمن اے شیخ　　عشق میں ساری کرامات چلی جاتی ہے

اس کے جلوے کا حال کیا کہئے　　جو سنا اس سے بھی سوا دیکھا

آگئی پیری، گیا عہد شباب　　زندگی کیا چیز تھی کیا ہو گئی

شاد کہتے ہیں جسے سب، وہ ہے صوفی لاریب　　نہ تو ہندو ہی رہا وہ نہ مسلماں نکلا

محبت بھی عجب شے ہے کہ دل سادہ ہے دلکو وہ ہم کو یاد کرتے ہیں ہم ان کو یاد کرتے ہیں

یہ کیا گفتگو ہے ذرا منہ سنبھالو بہت ہو چکی بدزبانی تمھاری

اگلی سی مجھ سے اس کو محبت نہیں رہی اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بدگماں نہیں

اب ہم دکن میں اردو کے ساتویں دور کے شعراء کا تعارف کراتے ہیں۔ اس دور کی ابتدا ہم نے ۱۳۳۶ھ قرار دی ہے جبکہ جامعہ عثمانیہ کا رائل چارٹر فرمان خسروی نافذ ہوا تھا۔

اس دور کے ہندو شعراء میں ایک تو وہ اصحاب ہیں جن کو عثمانیہ یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے دوسرے وہ شعراء ہیں جنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی ہے۔ جو اصحاب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حیدرآباد کی اصلی زبان تلنگی مرہٹی یا کنڑی ہے وہ بڑی حد تک حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد کے علاقے میں تلنگانہ اور مہاراشٹرا کا علاقہ بھی شامل ہے۔ لیکن تلنگی یا مرہٹی تمام ملک کی زبان نہیں ہے تلنگانہ میں مرہٹی بولنے والے اصحاب نہیں ملتے اور مہاراشٹرا میں تلنگی جاننے والے نایاب ہیں۔ مگر اردو زبان ایسی ہے جو حیدرآباد کے تمام علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ میں نے اپنی ملازمت کے زمانے میں دیہات کی عورتوں سے بھی اردو زبان سنی ہے۔ بہرحال جامعہ عثمانیہ سے بلالحاظ مذہب استفادہ کیا گیا ہے اور بلاشبہ مسلمانوں سے ہندو اصحاب کی تعداد زیادہ ہے جنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی اور میدان عمل میں کارفرما ہیں۔

دکن میں اردو کا ساتواں دور ۱۳۷۰ھ یا ۱۹۵۰ء پر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اردو کی ترقی کے جو ذرائع تھے وہ بڑی حد تک بند ہو چکے ہیں جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

ساتویں دور کے ہندو شعراء کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے وہ شعراء جن کو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں ہے بعض مشہور افراد یہ ہیں۔

راگھویندر راؤ جذب۔ رگھناتھ راؤ درد۔ گورسرن لال آزاد۔ راجہ نرسنگھ راج عالی راجہ محبوب راج محبوب۔ راجیشور راؤ اصغر۔ پاپالال ناظر۔ مدن موہن مدن وغیرہ۔

وہ شعراء جو عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

ڈاکٹر رگھوبیندر راج سکسینہ۔ روشن رائے روشن۔ شنکر موہن ارمان۔ چندر راج۔ کنول پرشاد کنول۔ ہیم چندر پرشاد فہیم وغیرہ۔ ان میں سے ہم صرف چار شعراء کا تعارف کراتے ہیں۔

۱۔ راگھویندر راؤ نام اور جذب تخلص۔ کرناٹک کے باشندے ہیں عالم پور ضلع رائچور ان کا وطن ہے یادگیر

زبان کنڑی ہے مگر اردو سے خاص دلچسپی ہے۔ وکالت کرتے ہیں صوفی مشرب ہیں۔ امجد سے تلمذ ہے۔ تصوف و روحانیت کے نکتہ بالکل ساعی موزوں کرتے ہیں۔ رباعیات کے دو مجموعے شائع کر چکے ہیں۔ جذب کے کلام میں اخلاق کی سادگی اور پند و وعظ و نصیحت کی متانت پائی جاتی ہے۔ وہ سنسکرت کے خیالات کو اردو میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے کلام کی بڑی خوبی سادگی اور سلاست ہے۔ یہاں صرف تین رباعیات پیش کی جاتی ہیں۔

کرجاتی ہے تاثیر بروں کی صحبت　　یعنی کہ بگڑ جاتی ہے اچھی خصلت
ملتے ہی سمندر میں وہ کھارا ہوگا　　گنگا کا وہ پانی جو ہے میٹھا شربت

آتی جاتی ہے یوں تو دولت اے یار　　دیکھا نہیں اس میں تو سکون اور قرار
گھنگھور گھٹا چھائے اگر گرما میں　　کیا اس کا بھروسہ کہ وہ برسے ہر بار

رہتی ہے غریب کی نظر ہر اک پر　　کرتا نہیں مفلس کی طرف کوئی نظر
اے جذب جو کرتا ہے غریبوں پہ نظر　　وہ مثل خدا ہوتا ہے بندہ پرور

۲۔ راجہ نرسنگ راج نام عالی تخلص۔ گردھاری پرشاد باقی کے فرزند ہیں۔ باقی کے خاندان کے اکثر افراد کو اردو شاعری سے بڑی دلچسپی ہے۔ عالی کو حضرت جلیل مرحوم سے تلمذ حاصل تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے مصاحبوں میں شامل تھے اور مہاراجہ کے مشاعروں میں خاص طور پر حصہ لیا کرتے تھے اور اب بھی بہ یادگار مہاراجہ کشن پرشاد مشاعرے کیا کرتے ہیں۔ عالی کی شاعری پرانی وضع کی ہے۔ نازک خیالی اور تخیل کی بلند پروازی کے جوہر پائے جاتے ہیں۔ کلام صاف ہوتا ہے ؎

کون ہمدرد ہو پھر جب نہ ہو اپنا اپنا　　غیر ممکن ہے کہ ہو جائے پرایا اپنا
سر بھی سودائے محبت میں دیا جان بھی دی　　کس گرانی سے ہوا دیکھئے سودا اپنا
وہ گھڑی کیسی مبارک تھی خدا پھر لائے　　روٹھنا ان کا شب وصل منانا اپنا

تلملانا تڑپنا جان دینا　　ہیں دل ناصبور کی باتیں

زمیں پر رہ کے تم خود کو نہ بھولے　　ابھی سر پر تمہارے آسماں ہے

اب ہم دو جوان شعراء کا ذکر سناتے ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔
۱۔ ارمان تخلص، شنکر موہن نام۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ترقی پسند زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جذبۂ تخیل کو اردو شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ کلام میں سادگی ہوتی ہے۔ نازک خیالی پائی جاتی ہے۔ نظم بھی کہا کرتے ہیں اور غزل بھی۔

اب کہاں وہ لطف عیش سرمدی تیرے بغیر — اک عذاب مستقل ہے زندگی تیرے بغیر

جب ہوا بے دل تو پردہ غیرت کا اٹھ گیا — سوز میں بھی ساز آجاتا ہے دل جانے کے بعد

ایک نظم "ہندی عورت عالم خیال میں" کے دو بند ملاحظہ ہوں

میرے پریتم آؤ آؤ — بن کے جوانی مجھ پر چھاؤ
آؤ مست فضائیں لے کر — بھولی بھولی ادائیں لے کر
آؤ آؤ میرے پریتم
رات کو چھپ کر گاؤں میں آؤ — تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آؤ
آؤ بھیگی بھیگی فضاؤں میں — کالی کالی مست گھٹاؤں میں
آؤ آؤ میرے پریتم
دھندلے دھندلے سپن میں آکر — میرے مست احساس پہ چھاؤ
آؤ لب پہ تبسم لے کر — ارمانوں کا تلاطم لے کر
آؤ آؤ میرے پریتم

۲۔ کنول پرشاد کنول۔ حیدرآباد میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد کے مختلف مدرسوں میں ابتدائی تعلیم پائی۔ بنارس سے میٹرک کامیاب ہوئے اور جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا۔ تشنگی علم نے ابھارا۔ لاہور سے اردو آنرز پاس کیا۔ پھر الہ آباد سے ساہتیہ رتن میں کامیابی حاصل کی اس طرح اردو اور ہندی میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔
سولہ سال کی عمر سے شاعری کرتے ہیں۔ ایک مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ دوسرا انجمن ترقی اردو علی گڈھ کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔ کنول ترقی پسند شاعر ہیں ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں قابل تعریف ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسی زبان میں شاعری کرتے ہیں جس کو اردو رسم الخط میں لکھیں تو اردو، ناگری رسم الخط میں لکھیں تو ہندی سمجھی جائے۔ کنول کی شاعری میں لوچ ہے۔ شیرینی ہے حلاوت ہے۔ ندرت ہے تخیل کی بلندی ہے خیالات کی ندرت ہے۔ اسلوب کی نزاکت ہے۔ غرض کئی باتیں جمع ہو گئی ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم اس کے متعلق ہے اس

کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

ہم امن کے دیوانے ہیں ہم امن کے شیدائی
ہم امن کے دیوانے
مزدور ہیں دہقاں ہیں محنت کے پجاری ہیں
پھولوں سے بھی ہلکے ہیں پربت سے بھی بھاری ہیں
جس آنکھ سے دیکھو گے اس روپ میں پاؤ گے
رادھا کے بہاری ہیں وشنو کے مراری ہیں
سنسار کے منھ پر ہیں اب اپنے ہی افسانے
ہم امن کے دیوانے

آخر میں ہم شاعرہ خواتین کا تعارف کراتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

تلسی | مس تلسی۔ مانک لال صاحب کی دختر ہیں۔ آپ کے والد کشمیر سے آکر حیدرآباد میں بس گئے۔ مس تلسی کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ اولاً گھر پر اردو۔ ہندی۔ انگریزی کی تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد پونہ کے مشن اسکول میں شریک کی گئیں گھر کی تعلیم بھی بدستور باقی رہی۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد مس تلسی لاہور گئیں اور وہاں سے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور سے حیدرآباد چلی آئیں۔ اب بھی حیدرآباد اور کبھی پونہ میں قیام کرتی ہیں۔ آپ کو اردو ادب سے بڑی دلچسپی ہے ادب اردو کی شاید ہی کوئی اچھی کتاب ایسی ہوگی جو آپ کے کتب خانہ میں نہ ہو۔ اردو شاعری سے دلچسپی ہے۔ کلام صاف اور پر اثر ہوتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ایک ہی وقت میں اتنے آنسو وہ اگر بار دگر یاد آیا
سجدۂ شوق کو کیا قید مقام کر لیا سجدہ جدھر یاد آیا
کس قدر آنکھ سے نکلے آنسو جب بھری شام کو گھر یاد آیا

رباعیات

مانا کہ گنہگار ہوں بدکار ہوں میں سو ڈھنگ سے آفت میں گرفتار ہوں میں
تیرا ہے زیاں گر نہ چھڑایا مجھ کو آئینہ اگر تو ہے تو زنگار ہوں میں

انگارۂ خاکی میں یقیں پیدا کر بال و پر جبریل امیں پیدا کر
کیوں دو کو جگہ دیتا ہے اپنے دل میں اک گھر کے لئے ایک مکیں پیدا کر

مسز دی برکت رائے | مسز دی برکت رائے حیدرآباد کے مشہور آنجہانی دیوان مہاراجہ کشن پرشاد کے

خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ۱۸۹۴ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئیں۔ اردو۔ فارسی۔ اور ہندی کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اچھی قابلیت رکھتی ہیں اردو ہندی مضمون نگاری اور شاعری سے دلچسپی ہے۔ رسالوں میں آپ کے مضامین اور کلام شائع ہوا کرتا ہے ملکی اور قومی کاموں سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ ان کے تعلق داری صوبہ داری کے زمانے میں مختلف اضلاع اورنگ آباد محبوب نگر وغیرہ میں معاشرتی۔ تعلیمی کاموں میں حصہ لیتی رہیں۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو میں اور بچوں کے بتاشے کے نام سے چھوٹے بچوں کے لئے نظمیں شائع کی ہیں۔ پبلک جلسوں اور گھر میں ٹھیٹ اردو بولتی ہیں۔

شیل بالا بی اے بی ٹی | شیل بالا صاحبہ کے اجداد آگرہ کے رہنے والے ہیں آپ منشی منگل پرشاد صاحب کی دختر ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں تولد ہوئیں۔ ابتدائی اور میٹرک تک اندور میں تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد اجمیر سے انٹرنس اور بنارس سے بی اے میں کامیابی حاصل کی اور پھر بنارس ہی سے بی ٹی کا امتحان دیا۔ اور امتیاز کے ساتھ پاس ہوئیں اب ایک مدت سے حیدرآباد میں قیام ہے۔ حیدرآباد کے مشہور ہندی اور اردو کے نوجوان شاعر کنول پرشاد صاحب کنول کی شریک زندگی ہیں۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۸ء تک سر بنسی لال گرلز ہائی اسکول کی پرنسپل رہیں اور اب حکومت حیدرآباد کے سرکاری مدرسہ نسواں میں ملازم ہیں۔

شیل بالا صاحبہ کو میٹرک کے زمانہ تعلیم سے افسانے اور نظمیں لکھنے کا شوق ہے۔ موسیقی اور اداکاری میں خاص ملکہ ہے۔ زمانہ تعلیم ہی سے آپ اداکاری میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ "اجنتا" وغیرہ مختلف ڈراموں میں ہیروئن کا کردار اس عمدگی سے انجام دیا کہ پبلک کے اصرار پر بنارس۔ گورکھپور۔ ٹانڈا وغیرہ مقامات میں متعدد بار اسٹیج کیا گیا۔ شعر گوئی ریڈیائی فیچر اور ڈرامے لکھنے میں کافی مہارت ہے۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد کی نشر گاہوں سے آپ کے ریڈیو ڈرامے۔ افسانے نظمیں اکثر و بیشتر نشر ہوتے ہیں۔ اور ہندی اور اردو کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے ہیں ہندی شاعری میں آپ کا مقام خاصا بلند ہے۔ شیل بالا صاحبہ کی ہندی شاعری بڑی صاف اور سلیس ہوتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دراصل آپ کی شاعری "ہندوستانی شاعری" ہے جو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ اگرچہ شائع نہیں ہوا مگر بہت سا کلام رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ کلام پُر اثر اور وجد آفریں ہوتا ہے۔ خصوصاً اس کو اگر آپ ہی کی زبان سے سنا جائے تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ آپ کو تقریباً تین چار سو سال کی شاعری کا تذکرہ سنایا گیا ہے اگرچہ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو شعرا کی تعداد کم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دکن کے ایک بڑے حصے کے ہندو اصحاب کی مادری زبان اردو نہیں ہے تاہم صدیوں سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرت اس طرح ملی جلی رہی ہے کہ دونوں حقیقی بھائی کی طرح زندگی بسر کرتے رہے ہیں اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ہندو شاعر پیدا نہ ہوں اگرچہ ان کی تعداد کم ہے لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے متعدد ہندو شعراء ہوئے ہیں جن کو استاد سخن کہا جا سکتا ہے اور ان کے کارنامے تاریخ ادب اردو میں آب زر سے لکھے جائیں گے۔

شاہ عبدالحئی اختر

(حامد اللہ صاحب ندوی)

اگر ہم نظام کائنات کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کے رشد و ہدایت کی روشنی ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوکر تمام عالم کو مطلع انوار بناتی رہی ہے۔ دنیا کے تمام مذہبی و روحانی رہنما مشرق ہی کی خاک سے پیدا ہوئے، علم و حکمت کا چراغ اسی گوشہ میں روشن ہوا اور فضل و کمال کے ستاروں نے یہیں سے لوگوں کی قیادت کی۔ اِن روحانی ستاروں سے متعلق چاہے آج کی مادی دنیا کچھ بھی کہے مگر تاریخ کے روشن واقعات گواہ ہیں کہ اخلاقی قدروں کو متوازن کرنے میں ان کی معمولی کرنوں نے جو کام کیا وہ افلاطون کے اشراق اور ارسطو کی مشیت سے بھی نہ ہو سکا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ ان کی عطا کردہ روشنی نسلاً بعد نسلاً بھی مسلسل ضیا پاش اور نور افگن ہوتی رہی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت شاہ ولی اللہ اور اُن کی اولاد کے روشن کارنامے ہیں۔ اس مقدس خاندان کے ہر فرد نے نہ صرف یہ کہ ذاتی علم و عمل کا غیر فانی نقش چھوڑا بلکہ بعض شاگرد بھی ایسے پیدا کیے جن کی خاک پا ہزاروں کے لئے سرمۂ ہدایت تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں، اسی قسم کے ماحول کے اندر، اسی انداز کے ساتھ شاہ ابوالحسن قربی اور ان کی اولاد نے بھی آرکاٹ کے ذرہ ذرہ کو اپنے علم و عمل کے پرتو سے منور کردیا۔ وہ ہزاروں پروانے جو کسی شمع ہدایت کے نہ ہونے کی وجہ سے تاریکی میں بھٹک رہے تھے اس کے روشن ہوتے ہی دوڑ پڑے اور دارالسرور ویلور کو ایک حسین قربانگاہ میں تبدیل کردیا، در اصل قربی نے جس کام کی بنیاد ڈالی اس کو اُن کے فرزند شاہ عبداللطیف محی الدین ذوقی نے بہت کچھ آگے بڑھایا، مگر اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور تینتالیس سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ ذوقی کے بعد ذوقی کے فرزند ابوالحسن ثانی نے اس کو اور ترقی دی مگر اس کو انتہائے عروج پر پہنچانے کا سہرا ابوالحسن ثانی کے فرزند شاہ عبداللطیف محی الدین ثانی متخلص بہ شیدا کے سر ہے جن کے مریدوں کی تعداد ہزاروں سے گذر کر لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ اور آرکاٹ انھیں آج بھی قطب ویلور کے نام سے یاد کرتا ہے۔

شاہ عبدالحئی اختر کو انھیں کی نظروں نے آگاہ ثانی بنایا تھا۔ شاہ صاحب سنہ ۱۲۳۴ھ میں پیدا ہوئے، مولد و مسکن بنگلور تھا، ابتدائی تعلیم کچھ اپنے والد ماجد شاہ ابراہیم سے اور کچھ مقامی اساتذہ سے حاصل کی، چونکہ اس زمانے میں دارالسرور ویلور کے قربی خاندان کی عظمت کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا۔ اور کرناٹک کے عوام اس خاندان کو اس کی علمی اور عملی فیض رسانی کی وجہ سے آرکاٹ کا خاندان ولی اللہ سمجھ رہے تھے اس لئے شاہ صاحب کو بھی آٹھ سال کی عمر میں ویلور بھیج دیا گیا۔ تاکہ ان کی علمی اور عملی صلاحیتوں کو ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ شیدا کی قربت اور ان کی ذرہ نوازیوں نے انھیں خوب چمکایا۔ یہاں تک کہ دس سال کے اندر اندر وہ اس قابل ہوگئے کہ زبان

اثر میں ڈوبی ہوئی، دل غیبی الہامات کا مرکز اور دماغ علمی ذخیروں کا ایک بھرپور خزانہ تھا۔

انیس سال کی عمر میں انھوں نے تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ جو زبان اور قلم دونوں کے ذریعہ زندگی بھر جاری رہا، ان کے پرتاثیر مواعظ کی وجہ سے لوگ انھیں واعظ کے نام سے یاد کرنے لگے، اور ان کی اثر و سوز میں ڈوبی ہوئی تصنیفات نے مسلمانان کرناٹک کے دل میں اس طرح گھر کرلیا کہ سو سال گزر جانے پر بھی آج تک انھیں کی تصنیفات سے میلاد و شہادت کی محفلوں کو گرمایا اور مسجدوں کو آباد کیا جارہا ہے۔ ان کے فرزند و جانشین صادق شاہ عبدالقادر علی کی تصریح کے مطابق ان کی تصنیفات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

"مصنف کتاب جنان السیر حضرت مولانا مولوی شاہ عبدالحی واعظ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں بڑی بڑی جو مطبوع و مشہور اور فیاض عالم ہوئی یہ ہیں، فیض الباری شرح صحیح بخاری عبادات تک، جنان السیر دو دفتر آنحضرت کے احوال میں، ریاض الازہر دفتر سوم جنان السیر کا حضرت کے احوال میں، مناہج النبوۃ نثر سیر میں مطول ہے، جواہر التفسیر ان آیات کی تفسیر میں جن سے حضرت کا حال معلوم ہوتا ہے، شرح سر الشہادتین در احوال حسنین کریمین، حدیقۃ الابرار در مناقب اہل بیت اطہار، روضۃ الابرار حضرت کے اور آپ کے ازواج و اولاد و خلفاء و دوازدہ آئمہ اہل بیت کے احوال میں حدیقۃ الاحباب مطول کتاب ہے چاروں خلیفوں کے احوال اور جنگ و جہاد میں، چہار گلشن مذہب کے چار اماموں کے احوال میں، تذکرۃ المحدثین چہل محدثین کے احوال میں، ترجمۂ تذکرۃ الاولیاء در احوال اولیائے متقدمین، تذکرۃ الصالحین در احوال اولیائے متاخرین، فوائد قدسیہ در احوال جناب محبوب، خلاصہ ترجمۂ تاریخ الخلفاء در احوال خلفائے بنو امیہ و عباسیہ، مجموعۂ خطب مترجم یک سالہ حرمین شریفین، ترجمۂ شرح سفر السعادت کتاب ضخیم در حدیث، ترجمۂ ایضاح الحق رسالہ کلید معرفت تصوف میں، لوامع النبوۃ سیر میں، دلائل منیفہ در مذہب ابی حنیفہ، ابیات عقائد اہل سنت، رد الملحدین تحفۃ الاحناف، تحفۃ المریدین، ید بیضا و نصرۃ التوحید در اثبات تصوف، تنبیہ العوام رد شرک و بدعت، سعادت ابدیہ وظائف میں، حقوق الزوجین، قدح کونین، تحفۂ مقبول در احوال بتول، مطلع النور در احوال قطب ویلور، تحفۂ مرغوب شرح محبوب القلوب، خلاصۃ السیر، تنویر العقول در اسلام آبائے رسول، دیوان احقر در نعت، تبیین الاسناد و مفید مختصر در میلاد شریف، رسالہ تحقیق الشفاعۃ، انیس القاری شرح چہل حدیث بخاری، شرح ثلاثیات بخاری، تحفۃ البنات در اعمال صالحات، حقوق المومنین، فضیلت علم و علماء، رسالہ در مصافحہ، رسالہ در حکم منبر عیدگاہ، آداب مسجد، رد الرد در جواز میلاد، تاریخ مکہ و مدینۂ منورہ، فوائد عزیزیہ در سیر، اخلاق النبی، ترجمۂ شعب الایمان، مفید المصلی، آداب لباس۔"

"ان رسائل و کتب کے علاوہ غیر مطبوعہ رسائل بہت ہیں۔ غرض کہ آپ چھیاسٹھ سال کی عمر میں ایک سو بیس کتب تصنیف کئے، فقہ میں ۱۰، عقائد میں ۱۱، سیر و تواریخ میں ۲۳، جواز میلاد شریف میں ۸، پند و نصائح میں ۱۵، اخلاق و آداب میں ۹، وظائف میں ۲، رد شرک و بدعت میں ۷، سلوک و تصوف میں ۷، اور حدیث و فقہ و عقائد و تصوف میں رسائل اور ضخیم کتابیں ۱۵ عدد، جملہ ۱۲۰ عدد۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء" (جنان السیر رسالہ آثار نبوت حاشیہ ص۱ تا ص۲)

مذکورہ بالا تصنیفات میں سے حسب ذیل کریمی لائبریری، کتب خانہ جامع مسجد اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں:-

جنان السیر:- سنہ تصنیف ۱۲۶۵ تا ۱۲۷۵ھ

جب ہزار و دو صد و شصت و پنج تھا سن　　　تب تر و تازہ ہوا دسرا چمن
یعنی گلزار نبوت اسے نام　　　پایا آگے دس برس کے اختتام
اب ہیں بارہ سو پہ جو ہفتاد و پنج　　　میں ہوا پھر سہ چمن کا نظم سنج
پس مرتب ہو گئی پوری کتاب　　　یعنی یہ چاروں چمن اے کامیاب

رسول اللہ کی سیرت سے متعلق ہے، اس کے دو دفتر ہیں، پہلا دفتر تاریخی حالات پر مشتمل ہے اور دوسرا نتیجہ جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صفحات ۲۲۵، اشعار تقریباً بیس ہزار، سائز ۸½ × ۱۱، ۱۳۰۷ھ میں مطبع محمدی بنگلور نے پہلی بار شائع کیا ہے، (کریمی لائبریری، پروفیسر ندوی)

شرح سر الشہادتین:- سنہ تصنیف ۱۲۷۳ھ

ہزاراں شکر ہے اب یہ رسالہ　　　ہوا آخر بہ فضل حق تعالے
سن ہجری نبوی تھا سنو تم　　　ہزار و دو صد و ہفتاد و سوم
مہ ذوالحجہ کے ستائیسویں روز　　　کیا آغاز میں یہ نظم پرسوز
بہ حسن اتفاق آں روز عاشور　　　ہوا ذکر شہادت تک یہی مسطور
بروز جمعہ در ماہ محرم　　　تھی اٹھائیسویں تاریخ اکرم
بعون اللہ پایا حسن انجام　　　یہ نسخہ ایک مہینہ بیچ اتمام

شاہ عبدالعزیز نے حسنین کی شہادت سے متعلق سر الشہادتین نامی ایک پُر تاثیر رسالہ عربی زبان میں لکھا تھا، یہ کتاب اس کی منظوم شرح ہے، صفحات ۷۰، اشعار تقریباً ایک ہزار سات سو، سائز ۶½ × ۱۰، اس کے مختلف نسخے پیش نظر ہیں، ایک ۱۲۷۴ھ میں مطبع انوار عظیم مدراس نے شائع کیا ہے، دوسرا ۱۲۹۲ھ میں حدیقۃ الابرار کے ساتھ پانچویں بار مطبع محمدی بنگلور نے شائع کیا ہے اور تیسرا ۱۳۰۶ھ میں جداگانہ طور پر پانچویں بار اسی مطبع سے شائع کیا گیا ہے (کریمی لائبریری، پروفیسر ندوی)

قرآن السعدین:- سنہ تصنیف ۱۲۷۴ھ

ہزار و دو صد ہفتاد پر چار　　　برس ہجرت سے جب گذرے تھے اک بار
بنے ہیں یہ ہر دو نسخہ خوب　　　کرے حق مومنوں کے دل کو مرغوب

عورت اور مرد کے حقوق سے متعلق ایک منظوم رسالہ ہے، اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مرد کے حقوق سے

بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں عورت کے ہر مسئلہ کو قرآن وحدیث کی روشنی میں سمجھایا گیا ہے۔ صفحات ۴۳، تعداد اشعار ایک ہزار، سائز ۶ ۳/۴ × ۹ ۱/۲، فتح الکریم بمبئی نے شائع کیا ہے (کریمی لائبریری)

حدیقۃ الابرار:۔ سنہ تصنیف تقریباً ۱۲۷۴ھ، اس میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حسنؓ وحسینؓ کے حالات اور ان کی شہادت کے واقعات کو جو قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں انھیں مل سکے ہیں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، صفحات ۸۵، سطریں ۲۳، سائز ۶ ۱/۲ × ۹ ۱/۲، ۱۲۹۶ھ میں مطبع محمدی بنگلور نے پانچویں بار شائع کیا ہے (پروفیسر ندوی)

تحفۂ مرغوب:۔ سنہ تصنیف ۱۲۷۵ء

سن ہجرت سے جب اے معرفت سنج ۔۔۔ تھے بارہ سو اوپر ہفتاد اور پنج
لیا تھا صورت تسوید بے ریب ۔۔۔ لیا اب خلعت تبئیض سے زیب

باقر آگاہ نے محبوب سبحانی کی شان میں محبوب القلوب کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جس کے بعض مقامات مجمل ہونے کی وجہ سے تفصیل طلب تھے، اس کتاب میں ان ہی مقامات کی منظوم تشریح کی گئی ہے۔ صفحات ۱۲۴، اشعار تقریباً دو ہزار، سائز ۵ × ۸، ۱۲۸۶ھ میں مخزن الاخبار مدراس نے شائع کیا ہے۔ (کریمی لائبریری)

چہار گلشن:۔ سنہ تصنیف ۱۲۷۶

شکر للہ کہ اب یہ گلشن چہار ۔۔۔ ختم کا پائے آب و رنگ و بہار
یک ہزار و دو صد سن ہجری ۔۔۔ اور ہفتاد و شش تھے زائد بھی
شب جمعہ تھی از مہِ رمضان ۔۔۔ لیلۃ القدر تھی وہ اے ذی شان
اس کے ابیات جملہ تین ہزار ۔۔۔ اور ایک سو پہ تین ہیں بہ شمار

یہ ایک منظوم کتاب ہے جس میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ تاریخ کی روشنی میں جمع کئے گئے ہیں، صفحات ۱۳۲، سائز ۵ ۱/۲ × ۸ ۳/۴، ۱۳۰۳ھ میں مطبع محمدی بنگلور نے شائع کیا ہے۔ (کریمی لائبریری)

تحفۂ طرفین دو بیۂ طریقین:۔ سنہ تصنیف ۱۲۷۸، اس رسالے میں ان لوگوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی گئی ہے جو محض غلط فہمی کی بنا پر دو گروہوں میں بٹ گئے تھے، ایک گروہ شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے معتقدین کو کافر قرار دے رہا تھا اور دوسرا ان کے مخالفین کو، صفحات ۴۹، سطریں ۱۳، سائز ۵ × ۷ ۳/۴، مدراس اور بنگلور میں کئی بار شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ مطبع حیدری بمبئی نے بھی ۱۲۸۰ھ میں اسے شائع کیا ہے (کریمی لائبریری)

منتخب تذکرۃ المحدثین:۔ سنہ تصنیف تقریباً ۱۲۸۳، یہ آخر کی ایک ضخیم کتاب تذکرۃ المحدثین کا خلاصہ ہے، جس میں آئمہ اربعہ کے علاوہ، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کے حالات تاریخ کی روشنی میں

جمع کئے گئے ہیں، صفحات ۷۳، اشعار تقریباً ایک ہزار، سائز ۵½ × ۸¾، یہ تذکرہ چہار گلشن کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کیا گیا ہے۔ (کریمی لائبریری)

تذکرۃ الاولیاءؒ :- سنہ تصنیف ۱۲۸۴ھ

بس کہ یہ حسنِ اتفاق ہوا　　کام یہ حسب اشتیاق ہوا
کہ وہ عرفہ تھا روز جمعہ کا　　نویں ذوالحج کی حج اکبر تھا
سن ہجری تھا اک ہزار و دو صد　　اور اسّی پہ چار اے امجد
ایسی تاریخ و روز اقدس میں　　اور ایسے مہ مقدس میں
زینتِ اختتام پائی ہے　　خلعت انصرام پائی ہے

یہ شیخ فریدالدین عطار کی مشہور تصنیف تذکرۃ الاولیاءؒ کا منظوم ترجمہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں صدیق اکبرؓ سے لے کر شیخ ابونصر سراج تک اور دوسرے حصے میں ابوسلیمان دارائی سے لے کر محبوب سبحانی تک تقریباً تین سو اولیائے کرام کے حالات ہیں، صفحات ۳۰۲، اشعار تقریباً سولہ ہزار، سائز ۷½ × ۱۱، دفتر مخزن الاخبار مدراس اور مطبع مواہب الرحمان مدراس نے ۱۲۸۶ھ میں شائع کیا ہے (کریمی لائبریری، جامع مسجد)

حدیقۃ الاحباب :- سنہ تصنیف ۱۲۸۶ھ)

شکر حق یہ کتاب فیض نصاب　　نام جس کا حدیقۃ الاحباب!
حسنِ انجام کا لئے ہے بہار　　اس سے رخشاں ہیں ختم کے آثار
لیلۃ القدر تھی مہ رمضاں　　بست و ہفتم شب وہ جمعہ کی جاں
سال ہجرت سے اک ہزار دو صد　　اور اسی پہ تھے چہار برس
ہے یہ ایسی کتاب فیض مآب　　کہ ہے ہندی میں آج تک نایاب
فارسی میں بھی ہے بہت کمیاب　　نزد سی غیر روضۃ الاحباب

علامہ جلیل محدث نے صحابۂ کرام کے احوال میں روضۃ الاحباب کے نام سے فارسی زبان میں ایک تذکرہ لکھا تھا یہ اسی کا اردو ترجمہ ہے جو ترمیم و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ صفحات ۶۰۰، سطریں ۲۳، سائز ۷ × ۱۰، مطبع محبوب شاہی حیدر آباد دکن نے ۱۳۱۲ھ میں شائع کیا ہے (کریمی لائبریری)

مجموعۂ خطب مترجم :- سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ یہ حرمین میں پڑھے جانے والے عربی خطبات کا منظوم ترجمہ ہے، جس میں پچاس سے زیادہ متداول خطبے ہیں، ہر خطبہ کا مضمون قمری مہینوں کی ضروریات کے مطابق دینی معلومات پیش کرتا ہے، آخر میں خطبات عیدین، خطبۂ نکاح اور دوسرے ضروری خطبات کو بھی شامل کیا گیا ہے صفحات ۲۴۰، اشعار تقریباً چار ہزار، سائز ۶½ × ۹½، ۱۳۱۱ھ میں مطبع احمدی مدراس نے شائع کیا ہے (کریمی لائبریری)

دلائل حنفیہ :- سنہ تصنیف معلوم نہ ہوسکا۔ اس میں مذاہب اربعہ کے اجتہادی اختلافات کو وجہ رحمت بتایا گیا ہے اور صحیح حدیثوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف فیہ مسائل میں مسلک حنفی کے مجتہدات درست ہیں، صفحات ۳۱، اشعار تقریباً ایک ہزار، سائز ½۶ × ½۹ ۱۲۹۶ھ میں نظام المطابع مدراس نے شائع کیا ہے۔ (پروفیسر ندوی)

فلاح کونین :- سنہ تصنیف معلوم نہ ہوسکا، اس میں حسنین کے فضائل سے بحث کی گئی ہے اور یوم شہادت منانے کے جواز کو ثابت کیا گیا ہے، صفحات ۸، سطریں ۲۳، سائز ¾۶ × ۱۰، مطبع محمدی بنگلور نے اسے شرح سر الشہادتین کے ساتھ شائع کیا ہے (کریمی لائبریری)

فیض الباری :- سنہ تصنیف ۱۲۹۲ تا ۱۲۹۵ھ، شیخ نور الحق محدث دہلوی نے تیسیر القاری کے نام سے فارسی میں بخاری کی شرح لکھی تھی جو نہایت مقبول ہوئی، فیض الباری اسی کا اردو ترجمہ ہے، یہ ترجمہ کتاب الایمان سے کتاب الجمعہ تک آکر ختم ہو جاتا ہے، پہلے جز میں شاہ صاحب نے جابجا حاشیوں کا اضافہ کیا ہے مگر چونکہ اس طرح کتاب کی ضخامت بڑھ رہی تھی اور طباعت میں مشکلیں پیش آنے کا خوف تھا اس لئے دوسرے اور تیسرے جز کے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے، صفحات ۲۵۹، سطریں ۲۹، سائز ۹ × ۱۲ ۱۲۹۶ھ میں مطبع محمدی بنگلور نے تیسری بار شائع کیا ہے۔

مذکورۂ بالا کتابوں میں سے تقریباً ہر کتاب میں مصنف نے اپنی دو چار اور کتابوں کی طرف ضرور اشارہ کیا ہے، علاوہ ازیں بعض کتابوں کے خاتمے میں اس کی تصریح کی گئی ہے کہ مصنف کی کتابوں کا حق طباعت محمدی بنگلور کے حق میں محفوظ ہے کوئی صاحب بلا اجازت چھاپنے کی جرأت نہ کریں اس کے باوجود بہت ساری کتابیں، مدراس، حیدر آباد اور بمبئی کے مختلف مطبعوں نے شائع کی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطبع محمدی بنگلور کے مالک شاہ عبد القادر علی قوتی نے جو مصنف کے فرزند ارجمند ہیں اپنے والد ماجد کی تالیفات کی بڑھتی ہوئی مانگ سے گھبرا کر حقِ طباعت کو عام کر دیا تھا،

بہرحال شاہ صاحب کا آخری شاندار کارنامہ فیض الباری ہے جس کے بعد وہ مسلسل ریاضت میں مشغول ہو گئے، عمر بھر انھیں یہی آرزو تھی کہ اُن کی زندگی کے آخری دن آستانۂ نبوی کی جبہ سائی میں بسر ہوں، اور اُن کی روح کے ساتھ ہی ان کے جسم کو بھی قربت رسالت کی سعادت نصیب ہو، ان کی اس آرزو اور التجا سے اُن کی محبوب تصنیف جنان السیر کا کوئی خاتمہ خالی نہیں ہے، خاص کر ان کے مرشد شاہ عبد اللطیف محی الدین شیدا نے ۱۲۸۹ھ میں جب دیار حبیب پہنچ کر اپنی ہشتاد و دو سالہ زندگی کو گنبد خضرا کے مکیں کی نذر کر دیا اور نہایت احترام کے ساتھ امام حسنؓ کی آغوش میں دفن کئے گئے تو اُن کی اس بے تابی کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ نہایت بے چینی کے ساتھ اس دن کا انتظار کرنے لگے جب انھیں سرزمین حجاز کی زیارت کا شرف حاصل ہوگا، اور وہ اپنی ایک دیرینہ آرزو کو پوری ہوتے دیکھیں گے۔

شیدا کی اس قابل رشک وفات کا تذکرہ شاہ صاحب نے مختصر طور پر جنان السیر کے اس نسخے میں کیا ہے جو شیدا کی وفات کے بعد شائع کیا گیا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر مفصل حالات معلوم کرنے ہوں تو مطلع النور کا مطالعہ

کریں، غرض ایک طویل انتظار کے بعد ۱۰ محرم [illegible] کا وہ مبارک دن آہی گیا کہ جب وہ زیارت حرم سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ پہنچے اور جیسا سٹھ سال تک جس سرزمین کی زیارت کے لئے تڑپ رہے تھے، اس کو ایک بار اس طرح اپنا مسکن بنا لیا کہ قیامت تک اُن کو وہاں سے کوئی جدا نہیں کر سکتا، ملاحظہ ہو شاہ صاحب کی التجا۔

اے خداوندِ کریم کارساز	اس سعادت سے مجھے کو سرفراز
ہند سے لے جا مدینے تک مجھے	بحرِ مقصد کے سفینے تک مجھے
روضۂ نبوی کے پس دیوار سے	چشمِ نگراں کو منور کر مرے
اور وہیں کر دے مری موت و حیات	بعث کر میرا وہیں سرور کے ساتھ
تحفۂ گلہائے صلوات و سلام	اس پہ پہنچا مجھ سے یارب صبح شام

(جان السیر ص ۱۲۶)

اگر پوری تفصیل کے ساتھ شاہ صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالی جائے تو یہ مضمون کتاب بن کر بھی ختم نہ ہوگا اس لئے کہ ان کی تبلیغ و ارشاد اور تالیف و تصنیف کا میدان بہت وسیع تھا جو تنقید کے ہاتھوں سر نہیں ہو سکتا مگر ہماں ان کی دو خدمات پر نظر ڈالنا نہایت ضروری ہے جو مجموعی طور پر ان کے موقف کو واضح کرتی ہیں، ایک شاہ صاحب کی مذہبی خدمات، اور دوسری اُن کی ادبی خدمات، ان کی مذہبی خدمات کو سمجھنے کے لئے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ اُس زمانے میں ہندوستان کا مذہبی ماحول کیا تھا، اور یہاں مسلمان کس بحران سے دوچار ہو رہے تھے۔

بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمان ہر زمانہ میں کسی نہ کسی بحران میں مبتلا رہا۔ کبھی سیاسی بحران میں، کبھی معاشی بحران میں، اور کبھی مذہبی بحران میں، جب سیاسی بحران آیا تو خانہ جنگیوں اور بغاوتوں نے اس کی مٹی پلید کی، جب معاشی بحران آیا تو حکومتِ وقت نے اس پر روزی کے دروازے بند کئے، اور جب مذہبی بحران آیا تو علمائے نفس پرست نے اس کی بُری قیادت کی کہ اُس کو دنیا و آخرت دونوں میں رسوا کر کے چھوڑا۔

۱۲۵۴ھ تا ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۳۸ء تا ۱۸۷۹ء جو شاہ صاحب کی تصنیف و تالیف اور تبلیغ و ارشاد کا زمانہ ہے وہ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کے نیم سیاسی اور نیم مذہبی بحران و انتشار کا زمانہ تھا، دلی کی سلطنت انگریزوں کی باجگذار بن چکی تھی، بنگال اور دکن سے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کا خاتمہ کیا جا چکا تھا، اور سید احمد شہیدؒ کی چلائی ہوئی تحریک جہاد بھی ناکام ہو چکی تھی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان اچھی قیادت سے محروم ہو گئے اور ان کی رہنمائی کچھ ایسے عالموں کے ہاتھوں میں آ گئی جو محض جزوی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کو کافر بنانے کے عادی ہو چکے تھے، ظاہر ہے کہ ایسی قیادت سے سوائے مذہبی تفریق و انتشار کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا، لہٰذا آہستہ آہستہ ہر طرف مذہبی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے، کہیں مقلد و غیر مقلد کی بحث تھی، کہیں شیعہ اور سنی کے جھگڑے

تھے، کہیں کچھ تھا کہیں کچھ، ان مذہبی مجادلات میں سب سے زیادہ خطرناک وہ تھا جو شاہ اسماعیل شہید اور ان کی تقویت الایمان کے خلاف ابھرا، اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان پر چھا گیا، آج ہماری نظروں سے وہ فتوے، وہ رسالے اور وہ کتابیں گذرتی ہیں جن کا موضوع محض شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے حامیوں کی کافرسازی ہے تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور ہم یہ یقین کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ کافروں کو مسلمان بنانے کے لئے جو جانفروشی مجاہدین ملت نے کی اس کے بالکل برعکس یہ خود غلط مولوی اہلسنت مسلمانوں کو کافر بنانے میں لگے رہے ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے کہ اس بحران میں بعض سلیم الطبع بزرگوں نے جذباتی روش سے ہٹ کر واقعات پر غور کیا ہے اور اس بحران کا صحیح تجزیہ کر کے عوام کو اس سے بچانے کی کوشش کی ہے، یہ خوش قسمت طبقہ قطب ویلور اور ان کے شاگردوں کا تھا جس نے ہندوستان بھر کی مخالف آوازوں کے سننے کے بعد بھی حق کو حق کہا، جس وقت شاہ اسمٰعیل شہید کے کفر کے فتوے آرکاٹ پہنچے اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ان پر اپنی مہر تصدیق ثبت کریں تو قطب ویلور پہلے بزرگ تھے جنھوں نے اس قسم کے فتووں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، اور ان کے شاگرد رشید شاہ عبد الحئی پہلے صلح کوش تھے جنھوں نے تنبیہ العوام، تحفۂ طرفین اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے رسالے لکھ کر ملت کا شیرازہ بکھیرنے والے اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی، ان رسالوں میں سب سے زیادہ مقبولیت تحفۂ طرفین کو حاصل ہوئی تھی جو کئی سال تک مختلف مطبعوں سے مکرر سہ کرر شائع ہوتا رہا، یہاں میں اس کی تمہید کے بعض اقتباسات نقل کرتا ہوں جن سے قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ شاہ صاحب کا مذہبی طرز فکر کس قدر سنجیدہ تھا، وہ لکھتے ہیں :-

"تقویت الایمان کے رد میں خیر الزاد اور کئی رسائل اور خیر الزاد کے رد میں تنبیہ الضالین اور کئی رسائل طرفین کے علماء لکھے اور لکھتے جا رہے ہیں، یہ اختلاف عظیم ستائیس سال سے جاری ہے، ہنوز انفصال پایا نہیں، جب اس باب میں علمائے وقت کا ایسا اختلاف ردو کد رہے اور طرفین کے علماء کے معتقدین جا بجا رہے، تو عامہ مومنین کا اس میں دخل دینا اور ہر جگہ دو فرقے ہو جانا اور ہر فرقہ ایک طرف کے علماء کی سند لا کر دوسری طرف کے علماء کی طعن و تشنیع اور تحقیر و تکفیر میں لب کشائی کرنا، آئین دین داری سے نہایت دور ہے اور قول متفق علیہ " لا نزاع فی الدین ولا جدال فی الدین " معتمد و مشہور ہے، مقصود شارع کا باہم اتفاق ہے، نہ جدال و نفاق، تفریق کلمۃ المسلمین خلاف رضامندی حضرت رب العالمین اور خلاف خوشنودی جناب سید المرسلین ہے، انہی آپس کے جھگڑوں سے رعب اسلام جاتا ہے اور دشمنانِ دین کا مدعا ہاتھ آتا ہے۔"

"ان ہی کتابوں کے عمل اور اعتقاد پر یا ان ہی کتابوں کے انکار اور ابطال پر مسلمانی موقوف نہیں ہے، اعتقاد و عمل کے واسطے کتاب و سنت اور قدیم کتب معتبر اولۂ اہل سنت و جماعت کہ جس پر طرفین کے علماء بلکہ جمہور اہل سنت متفق ہیں، بس کافی ہے، مصلحت دینی اور امت کی خیر خواہی یہی ہے کہ اس کتاب کو اور اس کے رد کے

کتابوں کو بحث میں نہ لادیں اور محض اتنی ہی بات پر گروہ اہل سنت میں تفرقہ نہ ڈالیں، اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور شرک و بدعت کی برائی، اور حضرت کی اتباع سنت اور ثبوتِ جاہ و شفاعت، جو اصل مطلب اہل سنت و جماعت کا ہے، قرآن و حدیث اور اہل سنت کے کتب قدیم سے بلا نزاع و جدال ثابت ہو سکتا ہے، لیکن ان ہی کتابوں کے سند لانے اور رواج دینے میں جب ہر دو طرف امید قبولیت مفقود اور ردّ و انکار موجود ہو تو پھر ان ہی کتابوں کی ترویج میں کوشش کرنا دین کی خیر خواہی تو نہیں بلکہ اہل دین کی تباہی اور بدخواہی ہے اور اس بحث و جدال میں اصل مطلب بھی فوت ہو جاتا ہے......"

"طرفین کے کتابوں میں ایک دوسرے پر جو طعن و تشنیع کئے ہیں اگر ہم اُن سے قطع نظر کریں اور نظرِ عمیق اور فکرِ دقیق سے دیکھیں تو اصل مذہب اہل سنت و جماعت کا طرفین کے کتابوں سے بھی مانند آفتاب کے روشن ہوتا ہے یعنی ہر دو جانب کے علماء اہل سنت کہلاتے ہیں اور اہل سنت کے قدیم کتب ہی کی سند لاتے ہیں اور رفع شرک و بدعت و اثباتِ جاہ و شفاعت ہر دو طرف کے کتابوں سے حاصل ہے، چنانچہ صاحب تقویت الایمان و صاحب نصیحت المسلمین کے دوسرے تصانیف سے بھی یعنی صراط المستقیم اور مشارق الانوار سے آنحضرت کی تخصیص شفاعت کبریٰ جو مقام محمود میں ہووے گی اور اس جناب کی خاتمیت اور جاہ و فضیلت اور جواز و توسل صراحتاً ثابت ہے۔ بلکہ جو احادیث کہ علمائے مدراس اثباتِ شفاعت میں لائے ہیں وہی احادیث مشارق الانوار میں بھی آئی ہیں اور صاحب تقویت الایمان کے معتقدین کی کتابوں سے حرمین شریفین کے آداب ماثور میں ایک رسالہ مستقل کہ جس کا نام آداب الحرمین مشہور ہے اور تنبیہ الضالین اور توقیت الایقان شرح تقویۃ الایمان سے زیارت شریف کا وجوب اور فضائل کثیرہ ثبوت کو پہنچے ہیں، بلکہ شرح تقویت الایمان میں اٹھائیس احادیث صحیحہ صریحہ زیارت بابرکت کی فضیلت میں لایا ہے، اور علمائے مدراس سے صاحب سفینۃ النجات اور صاحب گلزار ہدایت بھی شرک و بدعت کا ردّ لکھے ہیں"

"جب طرفین کے علما کا مقصود اور مآل اعتقادِ رفعِ شرک و بدعت اور اثباتِ جاہ و فضیلت میں ایک ہی ہو تو پھر طرفین کے علماء کے معتقدین میں یہ نزاع و جدال کیا ہے، یہ نزاع و جدال اور یہ قیل و قال اصلاح دین متین اور تجدیدِ شرعِ مبین کے واسطے اور اعتقاد و عمل کے لئے نہیں بلکہ نادانوں کا تعصب و عناد ہے اور نفسانیت و جاہ طلبی کا فساد، نعوذ باللہ منہا"

مذکورۂ بالا تجزیہ آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے کا ہے، زبان کی دقیانوسیت کو نظر انداز کر کے محض نفس تجزیہ اور خاص کر اس کے آخری جملوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ جس طرح اُس زمانے کے ہزاروں خود پرست اس تجزیہ کے آئینہ میں اپنی بری شبیہیں دیکھ دیکھ کر شرما چکے تھے اسی طرح آج بھی اس آئینہ میں وہ عباپوش اپنا عکس دیکھ سکتے ہیں جنھیں کسی اصلاح پسند شخص یا تحریک کے محض جزوی اختلافات کو غلط رنگ میں پیش کر کے اس کے خلاف کفر کے فتاویٰ صادر کرنے اور عوام کی نظروں کو اپنی طرف پھیر کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی عادت ہے۔

شاہ صاحب کی مذہبی خدمات کے سلسلہ میں اس مذہبی بحران کے خلاف اُن کے اقدام کا ذکر محض ایک تمہید کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ اُن کی اصلی خدمات تو وہ ہیں جو مذہب کے ہر موضوع پر کتابوں اور رسالوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں، اگر ان کی تمام تصنیفات کو ایک جا کرنے کے بعد بہ حیثیت موضوع ان کو الگ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے مذہب کے ہر ضروری موضوع پر ہزاروں اشعار یا صفحات اپنا ترکہ چھوڑا ہے اور یہ ترکہ ایسا نہیں جو صرف الماریوں کی زینت ہو بلکہ ایسا ہے کہ آج بھی آرکاٹ کی ہزاروں مسجدیں، لاکھوں مسلم گھر اور لاتعداد میلاد و شہادت کی محفلیں اس سے فیض حاصل کر رہی ہیں اگر یہ کہا جائے کہ اس علاقہ میں قرآن کے بعد جو کتاب ہر گھر، ہر مسجد اور ہر محفل میں ہوگی وہ جنان السیر، مجموعہ خطب اور شرح سر الشہادتین ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

مذہب اسلام کے اہم موضوع بہ حیثیت فن، قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، عقائد وغیرہ ہیں اور بہ حیثیت تذکرہ نگاری، سیرت رسول، سیرت اہل بیت، سیرت خلفائے راشدہ، احوال ائمہ اربعہ اور منقبت صوفیائے کرام وغیرہ، اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جتنے بھی مشہور اور کامل مصنفین گذرے ہیں انھیں زیادہ تر ایک ہی موضوع سے دلچسپی رہی اور ایک ہی موضوع پر انھوں نے متعدد رسائل اور کتابیں تصنیف کیں، مگر شاہ صاحب کا معاملہ اس کے برعکس تھا انھیں مذہب اسلام کے ہر موضوع سے دلچسپی تھی، انھوں نے تفسیر بھی لکھی، احادیث کا ترجمہ بھی کیا، فقہ کے رسائل بھی مرتب کئے اور تصوف کا دریا بھی بہایا غرضکہ ہر موضوع پر قلم اٹھایا، اور اس کے بہتر سے بہتر نتائج پیش کئے۔

شاہ صاحب کی بہت سی تصنیفات تو وہ ہیں جو ذاتی مطالعہ اور ذاتی طراوش قلم کا نتیجہ تھیں، جیسے جنان السیر، ریاض الازہر، جواہر التفسیر، حدیقۃ الابرار، چہار گلشن وغیرہ، مگر وہ بھی بعض ہیں جو کسی معتبر اور مستند عالم کی تالیف کا ترجمہ یا خلاصہ ہیں، ذاتی تالیف پر ترجمہ یا خلاصہ کو انھوں نے اس وقت ترجیح دی جب اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب کا پیش کرنا انھیں ناممکن معلوم ہوا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر جس مصنف کی تصنیف کا ترجمہ کیا وہ اس موضوع کا مجتہد اور نکتہ سنج تھا، علم حدیث میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے جانشین شیخ نور الحق محدث دہلوی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کو علم حدیث سے متعارف کرایا، ظاہر ہے کہ اس فن میں اُن کی لکھی ہوئی کتابوں سے زیادہ اور کس کی کتابیں مستند ہو سکتی ہیں، لہذا شاہ صاحب نے بجائے اس کے کہ وہ براہ راست بخاری اور سفر السعادۃ کی شرح لکھتے، تیسیر القاری اور شرح سفر السعادۃ کا ترجمہ کر دیا جو شیخ نور الحق اور شیخ عبدالحق کی نوشتہ فارسی شرحیں ہیں، اسی طرح شاہ عبدالعزیز ہندوستان کی وہ بزرگ ہستی تھی جس کا ہر کام معتبر اور مستند ہوتا تھا، جب حسنین کے معاملہ میں نہایت غلو ہونے لگا تو انھوں نے سر الشہادتین نامی ایک عربی رسالہ لکھا جس میں ان دونوں کے معتبر حالات جمع کئے، جب شاہ عبدالحی نے حسنین کے حالات لکھنے چاہے تو سر الشہادتین کی تشریح ہی انھیں بہتر معلوم ہوئی، اس طرح شرح سر الشہادتین مرتب ہوگئی۔ اسی طرح خلفائے راشدہ کے احوال کے لئے علامہ جلیل محدث کی روضۃ الاحباب کا، صوفیائے کرام کے احوال کے لئے عطار کے تذکرۃ الاولیاء کا اور محبوب سبحانی کی منقبت کے لئے باقر آگاہ کی

مجوب القلوب کا ترجمہ کر دیا یا شرح لکھ دی۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے رسائل کو چھوڑ کر جہاں تک شاہ صاحب کی ضخیم کتابوں کا تعلق ہے اُن میں نصف کے قریب ترجمے خلاصے یا شرحیں ہیں، اگر اُس زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاہ صاحب نے مذہب پر بہت بڑا احسان کیا کہ ہزاروں اُن اشخاص کے لئے جو عربی اور فارسی سے نا واقف تھے اور جنھیں اُردو میں اِن موضوعوں پر کوئی مواد نہیں ملتا تھا، ان کے علم کا دروازہ کھول دیا اور ہر شخص کو اس قابل بنا دیا کہ وہ براہ راست قرآن و حدیث اور دوسرے مذہبی علوم کے اسرار معلوم کر سکے۔

مذہبی معاملات میں شاہ صاحب کی نظر بہت نکتہ رس تھی اور مطالعہ بھی بے انتہا وسیع تھا جس موضوع پر وہ لکھنا شروع کرتے اس موضوع سے متعلق قرآن کی ہر وہ آیت اور حدیث کی ہر وہ روایت استعمال کر جاتے جس میں ذرہ بھر بھی اس موضوع سے لگاؤ ہوتا تھا اور اس کا ہر پہلو اس قدر جامع ہوتا کہ اُس میں کسی مزید تشریح کی گنجائش نہیں رہتی اس جامعیت کی وجہ سے بعض مقامات میں ضعیف روایتیں بھی استعمال میں آگئی ہیں مگر ایسا بہت کم ہے وہ بھی صرف ایسے مقامات میں جہاں ترغیب و ترہیب کا موقع تھا اور یہ چیز اصولی حیثیت سے بعض محدثین نے جائز قرار دی ہے، اور صوفیائے کرام کا عمل بھی یہی تھا، ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ چونکہ ان کے ہر کام میں خلوص اور للہیت ہوتی تھی اس لئے ان کی تصنیفات کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی، ہر تصنیف کے پانچ پانچ، دس دس اور اس سے بھی زیادہ ایڈیشن شائع ہو گئے اور جنوبی ہند کے مختلف مطبعوں نے انھیں کئی سال تک مسلسل شائع کیا ہے

شاہ صاحب کی خدمات کے سلسلہ میں اگر اُن کے مواعظ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یقیناً بے انصافی ہوگی یہی وہ چیز تھی جس نے لوگوں کے دلوں میں اُن کی عقیدت پیدا کی اور لوگ ان کے ہر کام کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اُن کے دل نشین اور موثر مواعظ کا یہ عالم تھا کہ جس مسجد یا محفل میں ان کے وعظ رکھے جاتے وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی، ان کے وعظوں سے ہزاروں گم کردہ راہوں نے اپنی راہ پائی، اور ہزاروں مذہب پرستوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر کے ہمیشہ کے لئے سیدھی راہ پر چلنے کا عہد کیا اُن کے اِن پُر تاثیر مواعظ ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ بجائے حضرت کے واعظ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اور آج بھی شاہ عبد الحیٔ واعظ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، اُن کے پُر تاثیر وعظوں کی طرف ان کے معاصر قلندر حسین اثرؔ نے کئی جگہ اپنی تقریظات میں اشارہ کیا ہے، مگر میں یہاں اُن کے صرف پانچ شعر نقل کرتا ہوں جو شاہ صاحب کی مذہبی خدمات کی طرف ہلکے ہلکے اشارے ہیں:-

وعظ قرآں جو وہ ہمام کیا — دل نے آ گوش میں مقام کیا
سورۂ نمیل کی کہی تفسیر — یا سحر تھی کہ اس کو شام کیا
کسب علم شہود و معنی کا — اکتساب اُن سے ہر کدام کیا
بیخ و بنیاد بدعت و الحاد — کئی جگہ سے وہ انہدام کیا
اک جہاں مستفیض ہے اس سے — یوں جو وہ کثیر فیض عام کیا

اوپر تصریح کردی گئی ہے کہ شاہ صاحب کے پیش نظر صرف مذہب تھا جس کی خدمت کو وہ اپنے لئے زاد آخرت سمجھتے تھے، مگر مذہب کی خدمت کے لئے انھوں نے جس زبان کو اختیار کیا، جس زبان میں سوا سو کتابیں مذہب کے ہر موضوع پر لکھیں اور جس زبان میں تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رکھا وہ یقیناً ان کی زبان سے متعلق خدمات کا قابل قدر پہلو ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس پہلو پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے ادبی ماحول کا تعارف کرایا جائے تاکہ آسانی کے ساتھ ان خدمات کے سلسلے میں ان کا موقف سمجھ میں آسکے۔

ہم شاہ صاحب کی مذہبی خدمات کے سلسلے میں بتا چکے ہیں کہ ان کی تصنیف و تالیف کا زمانہ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۷۹ء ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے اس زمانہ تک وہ کافی ترقی کر چکی تھی شعر کی کوئی صنف ایسی نہ رہی جس کو باکمال شاعروں نے انتہائے عروج تک نہ پہنچا دیا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ میر، مومن اور غالب کی غزلیں سودا اور ذوق کے قصیدے، میر و میر حسن کی مثنویاں، انیس و دبیر کے مرثیے آج بھی اس مقام پر ہیں کہ جنھیں معیار بنا کر زبان کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

مگر نثر کا حال نظم سے جدا تھا، اس میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی تھی، اور لوگ اپنی علمی تصنیفات کے لئے عربی، فارسی پر اس کو ترجیح دینے کے لئے تیار نہیں تھے، غالب کے خطوط نے نثر نگاری کی نئی بنیادیں قائم کیں بھی تو اس کے اثرات محدود تھے، مہر نیمروز کے لئے انھیں بھی بہ جبر یا بہ اختیار فارسی زبان ہی کو اختیار کرنا پڑا اور اول نثر کو علمی و فنی زبان بنانے کا شرف سر سید کو حاصل ہے جنھوں نے اپنی بہت سی علمی تصنیفات کے لئے اردو زبان کو اختیار کیا اور ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کر کے ایک طرف مقالہ نگاری کی بنیاد ڈالی جو ترقی کی شاہراہ کی طرف پہلا قدم تھا اور دوسری طرف ایک بڑے مخالف گروہ کو اپنے اطراف جمع کر لیا جو جوابی مضامین اور رسائل شائع کرنے میں مشغول تھا، اس طرح وقتی طور پر ایک بحران تو پیدا ہو گیا، مگر اس کے نتیجے میں زبان بدلی، طرز بیان بدلا، طریقہ ہائے استدلال بدلے، یہاں تک کہ آزاد، نذیر احمد اور حالی و شبلی تک ہر وہ چیز بدل گئی جو اب تک نثر کو غیر مقبول بنائے ہوئے تھی۔

یہ تھا اس زمانہ کی ادبی ترقی کا مختصر سا خاکہ، مگر سچ پوچھئے تو یہ ترقی ایسی ترقی نہ تھی جس کو صحیح معنوں میں ہمہ گیر کہا جائے بلکہ اس کے اثرات دہلی اور صوبجات متحدہ تک محدود تھے اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اس کی ترقی کے بعض خاص اسباب ہیں جو دوسرے مقامات میں موجود نہیں تھے، ان تمام اسباب میں سب سے بڑا سبب اُن نوابوں اور امیروں کی موجودگی اور سرپرستانہ ہمت افزائی تھی جو ہر حال میں پرانی روایات کے مطابق شاعروں کو کسی نہ کسی حیثیت سے سہارا دے رہے تھے شاعر بھی ان کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنے اور اُن کے دربار تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اُن کی قصیدہ خوانی کرتے اور اپنے کلام کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر میں لگے رہتے تھے

دوسرے یہ کہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ علاقے انگریزوں کے انتظام کی ایسی جگہ بن گئے جس کو کچھ نے اپنے وقت کے مطابق مسلمانوں کے مزاج کو بدلنے کیلئے سرسید نے آواز اٹھائی جو اُردو ہی کے ذریعہ عوام تک پہنچائی گئی تھی۔ تیسرے یہ کہ اردو یہاں کی ہر قوم اور ہر قبیلہ کی مادری زبان تھی جس کے علاوہ انھیں کبھی دوسری زبان بولنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ چوتھے یہ اور اسی قسم کے بہت سارے ایسے اسباب جمع ہو گئے جنھوں نے یہاں کے ماحول ہی کو مزاج اُردو کے مطابق بنا دیا تھا ایسے موافق ماحول میں رہ کر اگر یہاں کے شاعر اور ادیب اپنی زبان کو اتنا بھی ترقی نہ دیتے تو اُن کے پاس اور کیا تھا کہ تاریخ اُن کو یاد رکھنے کی فکر کرتی۔

یہ ساز گار حالات مدراس کو جو جنوب کا انتہائی گوشہ ہے اور جہاں کی سات فی صدی مسلم آبادی غیر اُردو بولنے والوں میں گھری ہوئی تھی اور جہاں برائے نام کبھی کوئی دربار لگا تھا، کہاں نصیب تھے پھر بھی یہاں اُردو کے بہت سے ایسے شاعر اور نثر نگار پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے اپنی دسترس کے مطابق اردو زبان کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا اور اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے جدّ و جہد کی، مگر ان سب میں قابل احترام اور با اثر ہستیاں صرف دو ہیں ایک باقر آگاہ اور دوسرے بدر الدولہ، اِن بزرگوں نے جہاں اپنی تصنیفات کے لئے عربی اور فارسی زبان کو منتخب کیا وہاں بیسیوں کتابیں اُردو زبان میں بھی لکھیں اور ایک ایسا چشمہ جاری کر دیا کہ کئی سال تک وہاں کے مسلم عوام اس سے اپنی پیاس بجھاتے رہے، اِن دونوں بزرگوں کی تصنیفات میں جو زیادہ مقبول ہوئیں وہ ہشت بہشت، ریاض الجنان، محبوب القلوب، فوائد بدریہ، نثر الجواہر، اور گلزار ہدایت وغیرہ ہیں، اول الذکر تین آگاہ کی ہیں اور باقی بدر الدولہ کی۔ یہ سیرت رسول، منقبت اہل بیت اور کرامات محبوب سبحانی وغیرہ سے متعلق ہیں۔

اِن دونوں بزرگوں کے بعد اگر کسی کو یہ درجۂ بلند نصیب ہوا تو وہ شاہ عبد الحی احقر تھے جنھوں نے فارسی اور عربی پر تبحر رکھنے کے باوجود اُردو زبان ہی کو اپنی پوری ایک سو بیس تصنیفات کے لئے منتخب کیا، اِن تصنیفات میں اگرچہ بعض کے موضوع ایسے تھے جو آگاہ اور بدر الدولہ کے آزمودہ تھے، لیکن اکثر ایسے کہ جو نقش اول کی حیثیت رکھتے تھے، آزمودہ موضوع کو ترقی دی اور نا آزمودہ کی بنیادیں ڈالیں، اس طرح اُس زبان کو جس کو دلی اور لکھنؤ کے شاعروں نے محض ادبی اعتبار سے ترقی دی تھی، علمی زبان بنانے کا شرف حاصل کر لیا،

شمال اور جنوب کی اُردو میں الفاظ، لہجہ اور تلفظ کے اعتبار سے جو اختلافات تھے وہ تیرھویں صدی ہجری کے نصف اوّل تک تقریباً ختم ہو چکے تھے اور جن الفاظ کو شمال نے ترک کر دیا تھا جنوب نے بھی ترک کر دیا۔ مگر تین ایسی چیزیں نصف آخر تک بھی باقی رہیں جو اِن دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر رہی تھیں، اول یہ شمال حرف "نے" کو علامت فاعل کے طور پر استعمال کرتا تھا اور جنوب میں یہ بات نہیں تھی، دوم یہ کہ جب کسی لفظ کی جمع بنانی ہو تو شمال میں فارسی اور ہندی الفاظ کے لئے ہندی قاعدے اور عربی الفاظ کے لئے عربی قاعدے برتے جاتے تھے، مگر جنوب ہر لفظ کی جمع کے لئے چاہے وہ جس زبان کا بھی ہو فارسی قاعدے کے مطابق الف و نون زیادہ

بلکہ دہنے کو کافی سمجھتا تھا، سوم یہ کہ مونث و مذکر کی صفت و اضافت میں شمالی مطابقت کا خیال رکھتا تھا، موصوف و مضاف مونث ہوں تو صفت و اضافت بھی مونث، اور موصوف و مضاف مذکر ہو تو صفت و اضافت بھی مذکر، مگر جنوب میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہاں کے لوگ ہر حالت میں صفت و اضافت کو مذکر ہی استعمال کرتے تھے محض ان تین بنیادی اختلافات کی وجہ سے شمال اور جنوب کا طرزِ بیان ہی بدل گیا۔ اور ایک ہی مفہوم نے قلبند ہونے کے بعد دو مختلف قالب اختیار کر لئے جہاں تک حرف "نے" کے استعمال کا تعلق ہے ایک حد تک گجرات کا جنوب سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ شمال کی طرح یہاں بھی اس حرف کا استعمال مدت سے جاری تھا۔

شاہ صاحب کی مجھے جتنی کتابیں ملی ہیں اُن میں یہ دکھنی خصوصیتیں اکثر پائی جاتی ہیں، نثر میں ایک حد تک تدریجی ارتقا نظر آتا ہے خاص کر ان کی آخری تصنیف فیض اباری کی جو نثر ہے وہ خاصی ترقی یافتہ اور سُلجھی ہوئی ہے۔ مگر نظم میں چونکہ مجھے کوئی آخری تصنیف نہیں ملی اس لئے میں تمیز نہ کر سکا کہ اس میں بھی کوئی ارتقا ہے یا نہیں جہاں تک قیاس کا تعلق ہے، نثر سے زیادہ اس میں ارتقا ہونا چاہیئے، اس لئے کہ شاہ صاحب کو نثر کی بہ نسبت نظم پر زیادہ قدرت حاصل تھی۔ ادبی ارتقا کے ساتھ ساتھ اُن کی تمام شعری تصانیف اثر و سوز میں ڈوبی ہوئی اور نہایت ہی رقت انگیز ہیں جن کو پڑھ کر اس کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ شعر واقعی الہام ہے جو خود ساختہ نہیں ہوتا بلکہ خداداد ہوتا ہے، انھوں نے اپنی نظموں کے لئے جن کے اشعار کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے ایسی چھوٹی اور ہلکی بحریں استعمال کی ہیں اور طرزِ بیان اس قدر سادہ اور فطری اختیار کیا ہے کہ جیسے ایک دریا اُمڈا ہوا نہایت خاموشی کے ساتھ بہہ رہا ہو، میں یہاں بجائے اس کے کہ اُن کی نظم و نثر کے مختلف نمونے پیش کروں صرف ایک ایک نمونہ پر اکتفا کرتا ہوں، یہ اُن کی زبان کے مرتبے کو سمجھنے میں ہماری مدد کرے گا۔ ان نمونوں کے انتخاب کے لئے میں نے کوئی اہتمام نہیں کیا ہے۔ بلکہ پہلی نظر میں جو مسلسل بیان مجھے مل سکا اس کو نقل کر دیا ہے تاکہ عمومیت برقرار رہے،

نمونۂ نثر:-

"مخفی نہ رہے کہ آمین کے اخفا میں بھی حدیث وارد ہے اور جہر میں بھی، پر حدیث اخفا کی کئی وجہ سے راجح ہے اوّل یہ کہ حدیث جہر کی بعضے وقت میں وارد تھی، یعنی امت کی تعلیم کے لئے تا لوگ جانیں کہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا چاہیئے، جیساکہ مروی ہے کہ حضرت ظہر کی نماز میں کبھی آواز بلند کر کے قرأت فرماتے تھے تا لوگ قرأت کے مقدار کو معلوم کر لیں چناں چہ بخاری شریف اور تیسیر الوصول میں وہ حدیث آئی ہے، دوسری وجہ یہ کہ حدیث اخفا کے راوی حضرت عمر و علی و عبداللہ بن مسعود اور اُن کے امثال ہیں، اور یہ صحابہ بہ نسبت راوی جہر کے بڑے فاضل ہیں، اور یہ قاعدہ ہے کہ جس حدیث کا راوی بڑا فقیہ اور فاضل ہو تو وہ دوسری حدیث پر جس کا راوی ویسا نہ ہو راجح رہے گی جیسا کہ اصول کی کتابوں میں مذکور ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت بھی حدیث اخفا کے موافق ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ یعنی دعا کرو تم تمہارے رب سے عاجزی اور پوشیدگی کے ساتھ بے شک اللہ دوست نہیں رکھتا حد سے گذر جانے والوں کو، دوسری اذکر ربک ... یعنی یاد کر اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی اور ڈر سے اور پکار کے نہیں۔

تیسری وادا اسالک...... صحابہ نے حضرت سے پوچھا کہ پروردگار ہمارا نزدیک ہے تو چپکے دعا کریں یا دور ہے تو شور سے پکاریں، تب یہ آیت نازل ہوئی اے میرے رسولؐ! جب پوچھیں تجھ سے میرے بندے میرے حال کو تو کہہ کہ بے شک میں نزدیک ہوں، سب ان تینوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ہر دعا میں اخفا واجب ہے........

چوتھی وجہ یہ کہ حدیث جہر کی جو وائل بن حجرؓ سے مروی ہے ضعیف ہے جیسا کہ یحییٰ بن معین نے کہ سردار ہیں محدثوں کے اور شیخ و استاد ہیں امام بخاری کے سب کہا ہے، اور پانچویں وجہ یہ کہ جہر آمین کا مقدم اور اخفا اس امر کا موخر ہے اس واسطے جہر منسوخ ہے جیسا کہ کنایہ اور عنایہ اور نہایہ میں ہے قال عبد اللہ..... کہا عبد اللہ بن مسعود نے کہ لوگوں نے آمین شور سے کہنا چھوڑ دیا، اور نہ چھوڑا اسے مگر جب یقین حاصل ہو گیا ان سب کو اس کی منسوخیت کا......
فیض الباری، کتاب الصلوٰۃ ص۱۹۱

نمونۂ نظم:-

گلدستہ ایمان لانے میں حضرت عمر فاروقؓ کے

وجہ ایمان میں عمرؓ کے اے میر — ہیں روایات و حکایات کثیر
مختصر ایک روایت کا بیاں — نقل کرتا ہوں معارج سے یہاں
ہے روایت کہ وہ سالار ہدیٰ — حق تعالیٰ سے کئے تھے یہ دعا
یاالٰہی بہ عمر بن خطاب — یا عمر ابن ہشام اب تو شتاب
دینِ اسلام کو بس غالب کر — کیونکہ وے دونوں تو تھے اشہر
ہے ابوجہل لعین ابن ہشام — تھا شقی وہ تو ازل کا ناکام
حق میں کیونکر ہو دعا اس کے قبول — ہو گئی حق میں عمر کے مقبول
جاہلیت میں بھی ہرگز وہ کبھو — رنج و ایذا نہ دیا تھا شہ کو
بہن بہنوئی عمر کے پنہاں — لائے تھے سرورِ دیں پر ایماں
جبکہ اسلام سنے اُن کا عمر — جلد تر آن کہ وہ بہن کے گھر
پوچھے اس طرح سنا ہوں میں یقیں — باپ دادوں کا تو چھوڑی ہے دیں
بولی تھا ہوش نہ کی وہ انکار — تب کئے بہن کے سر پہ یک وار
گئے سر پھوٹ کے تب اس کا وہیں — منھ ہوا خون سے اس کے رنگیں
تب بہن کہنے لگی یا توفیق! — میں مسلماں ہوئی ہوں تحقیق
تو بھی چاہتا ہے ہو کر مجھ کو قبول — ہے خدا ایک محمد ہے رسول
سن کی جب یہ دلیری دیکھے — رہ گئے ناچار اُسے چھوڑ دئے

ہے کہتے ہیں سو رہے وے رات کو جب — بہن بہنوئی ہو بیدار بہ شب
کئے قرآں کی تلاوت آغاز — پڑھتے تھے سورۂ طٰہٰ بہ نیاز
سُننے جب اس کو عمر ہو بیدار — ہو گئے سنتے ہی بے صبر و قرار
بہن کے پاس کہے آ کے شتاب — دے مجھے دیکھوں یہ کیسی ہے کتاب
وہ کہی ہاں یہ کتاب اللہ ہے — جو منزّل بہ رسول اللہ ہے
بے وضو اس کو نہ چھونا ہے روا — وصف میں اس کے ہے فرمایا خدا

لا یمسہ الا المطہرون

شرک کی تو ہے نجاست میں بھرا — دوں میں کس طرح ترے ہاتھ بھلا
بس وہیں جلد عمر غسل کئے — آ کے پھر بہن سے اپنے مانگے
وہ کہی ہے یہ کتاب مولا — بے ادب اس سے کہیں تو ہوگا
تب عمر عہد کئے کھا کے قسم — ہاتھ میں ان کے وہ دی ہے اسدم
پس وہ طٰہٰ سے لگے ہیں پڑھنے — جب اس آیت پہ ہیں آکر پہنچے

وان تجہر بالقول فانہ یعلم السر و اخفی اللہ لا الہ الا ھو لہ الاسماء الحسنی

پس لگے کہنے کو رو رو وہ ہمام — کہ ہے بے شبہ خدا کا یہ کلام
اور پڑھے کلمہ شہادت کا وہیں — اور پوچھے کہ کہاں ہیں شہ دیں
ہے روایت کہ رسول و یاراں — دارِ ارقم میں ہی تھے تب وہ نہاں
کیونکہ سب جمع ہو کفارِ عرب — قتل سرور کے ہی تھے فکر میں تب
ڈھونڈتے تھے بھی صحابہ کو تمام — تا ہلاک ان کو کریں وے ناکام
اس لئے سارے صحابہ ذی شاں — تھے حفاظت میں نبی کے ہر آں
اور پوشیدہ ہی پڑھتے تھے نماز — ظلم کفار سے سب اسے دمساز
یوں تو اصحاب ہیں مظلوم اِدھر — اور کفار کا ہے دھوم اُدھر
یک روایت ہے کہ جب پیغمبر — دیکھے یوں یاروں کو اپنے مضطر
حق کی درگاہ میں دعا کرنے لئے — عجز و زاری سے بہت جلد اُٹھے
سر سے عمامہ اتار اپنے وہیں — ڈال چادر کو گلے میں سجدہ دیں
یوں لگے کہنے اُٹھا عجز کے ہاتھ — اے خداوند مجیب الدعوات
بندگاں تیرے ہیں یہ اتالیس — اہل توحید ہیں اور میرے انیس

سارے بیکس ہیں مساکین و درویش
سربسر سارے ہیں غمگیں دلریش

جب وے کرتے ہیں عبادت تیری
دل سے رکھتے ہیں محبت تیری

کوئی سوا تیرے انھیں یار نہیں
کوئی معاون و مددگار نہیں

اشک غم آنکھوں سے ہے ان کے رواں
سوزش دل سے ہیں بے تاب و تواں

اپنے یک فضل کی کر اُن پہ نگاہ
شر سے کفار کے دے ہم کو پناہ

ان ضعیفوں کی مددگاری کو
اُن کی غمخواری و دلداری کو

کوئی جوانمرد کو بھیج ایسے اب
دین کو جس سے ہو قوت یارب

تھے اسی عرض میں وہ شاہ ہدا
آئے ہیں ایسے میں وہ پیک خدا

یعنی جبریل معظم آئے
شہ کی خدمت میں بشارت لائے

یوں کہے عرض کہ اے حق کے رسول
کی دعا آپ کی مولا نے قبول

یا نبی دیکھئے آتا ہے عمرؓ
شرف ایمان کا پاتا ہے عمرؓ

ہم نے بھیجا ہے اسے ہو خوش حال
تو بلا اس کو کر اب استقبال

تھے اسی بات میں جبریل ابھی
آئے ایسے میں عمر در پہ تبھی

آن کے سرور دیں استقبال
ہاتھوں کو ان کے کمر اندر ڈال

دابے اس زور سے خوش ہو بسیار
کہ گری دست عمر سے تلوار

سر جھکا اپنا عمر با آواز
پس پڑھے کلمہ شہادت بہ نیاز

شاہ خوش ہو کے کہے تب تکبیر
اور صحابہ بھی کہے تب تکبیر

سب لگے کرنے سرور و شادی
اور لگے دینے مبارک بادی

تھے جو اصحاب نبی انتالیس
ہوئے فاروق سے پورے چالیس

پھر عمر عرض کئے اے سالار
لات و عزیٰ کی پرستش کفار

کیا کرتے ہیں بلا شبہ عیاں
حق کی طاعت کریں کیوں ہم پنہاں

ساتھ حضرت کو لے میں اس ہی روز
سب چلے کعبہ کو فرحت اندوز

(حقائق السیر)

میر کے مقطعے

(از محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ایم، اے)

میں اس مختصر سے مضمون کو فراق گورکھپوری کے ایک خوبصورت جملے سے شروع کروں گی۔ فراق، میر کے لئے لکھتے ہیں "اردو شاعری بھی اپنا ایک خدا رکھتی ہے۔ جو میر کہلاتا ہے" — آج کل میر پر مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ بس اس سلسلہ میں ان کا کلیات ہے اور میرے اوقات فرصت۔ ویسے بھی ہم کالج کے بیگاروں کو فرصت کہاں۔ چھٹیاں ملیں تو بیماری تاک لگائے بیٹھی ہے۔ اس کو بھی ہماری فرصت کا خاص طور پر انتظار رہتا ہے — خیر — اس کی ہمدردی کا بھی شکریہ۔ تو اس طرح میں کلیات میر کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کر رہی تھی۔ غزل کی غزل کبھی بیکار ملی اور ساری جان سمٹ کر مقطع میں آگئی۔ جیسے جیسے ورق الٹتے گئے مقطع پر مقطع لاجواب اور جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو کہ "مجھ پر کچھ لکھو — اس کلیات کے اوراق پر موٹی موٹی جلد چڑھا کر مجھے قید کر دیا گیا ہے"۔ بات بھی جی کو لگی — اور میرا بھی جی چاہنے لگا کہ بس آج صرف میر کے مقطعوں پر کچھ خامہ فرسائی کروں۔

اس کی سب سے پہلی غزل کی اٹھان ہی غضب ڈھاتی ہے۔ "تھا استعارہ حسن سے اس کے جو نور تھا"۔ اس غزل کی تعریف کے لئے تو میرا منہ کیا ہے۔ ساری غزل مرصع ہے۔ لیکن ایک آیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلتا ہوا دیکھئے۔ جس کو مقطع میں واضح کر دیا ہے ؎

سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر

اب چلئے آگے بڑھیے۔ اپنے مذہب سے متعلق یہ ستم ظریفی بھی خوب ہے ؎

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا!

کبھی رنجش عمر اس منزل پر ہے ؎

تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

اور کبھی غم جاناں نے ان حالوں کو پہنچا دیا ؎

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

اسی موضوع پر حسرت کا مقطع بھی خوب ہے ؎

عشق بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے
حسرت یہ تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہے

ایک گہرا خیال کہ "اچھا وقت" پری کے بازو لگائے اڑا جاتا ہے اور خوشی کو ثبات نہیں۔ میر کی تحقیق ہے۔ خوب دریافت جو کیا ہم نے

وقت خوش میر نکہت گل تھا!

حالی نے کہا تھا ؎

جس کا تو قاتل ہے پھر اس کے لئے ۔۔۔ کون سی لذت ہے خنجر سے لذیذ!

میر کی دیوانگی کا یہ عالم ہے ؎

وہ جو خنجر بکف نظر آیا ۔۔۔ میر سو جان سے نثار ہوا!

اور یہ رہی خاکستر پروانہ ؎

آہوں کے شعلے جس جا اٹھتے تھے میر سے شب ۔۔۔ واں جا کے صبح دیکھا مُشت غبار پایا!

کبھی چہرہ واردات قلب کی چغلی کھاتا ہے اور سارا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے ؎

پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے ۔۔۔ چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اس جواں کا

پھر اسی موضوع کو کس کس طرح سجا سجا کر پیش کیا ہے شاید ہی اُردو شاعری میں اس کا کہیں جواب ملے ؎

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں ۔۔۔ رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

غالب نے بھی چہرہ کا رنگ اڑایا ہے اور بڑی خوبصورتی سے ؎

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا ۔۔۔ رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

کوئی پیش پیش اگر مشہور ہوا اور کوئی میر کی طرح عزلت میں مقبول بنا ؎

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میر ۔۔۔ پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا!

اب مرنے کے بعد تعجب ہی کس بات پر ہے کوئی ڈھنگ قرینہ کی زندگی تو نہ تھی ؎

مت کر عجب جو میر ترے غم میں مرگیا ۔۔۔ جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

دل گیا رونق حیات گئی۔ اس کے جانے کے بعد گئی بجلی۔ یہ حضرت رہتے ہیں تو ایک مصیبت کا سامنا رہتا ہے، چلے جاتے ہیں، سینہ خالی، آنکھیں ویران کر کے، جب بھی ایک تڑپ باقی رہتی ہے ؎

دل جو نہ تھا تو رات ز خود رفتگی میں میر ۔۔۔ گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا!

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا ؎

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں ۔۔۔ میر کو تم عبث اداس کیا!

یہ ہر زمانے پر چسپاں ہونے والا تخیل ؎

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے ۔۔۔ اُن کو اس روزگار میں دیکھا

مصحفی نے کہا تھا ؎

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ۔۔۔ تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

وہ مصحفی کا دل تھا، یہ میرؔ کا نامۂ شوق ہے، لکھنے بیٹھے تو دفتر کا دفتر سیاہ کر دیا ؎

ہم نے جانا تھا کہ لکھے گا کوئی حرف اے میرؔ　　　پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا!

اور یہ مقطع نہیں قیامت ہے ؎

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ　　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

یہ پیشین گوئی کتنی برحق ہے ؎

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں　　　ماتم زدہ میرؔ اگر نہ ہوگا

غالبؔ کو "دماغِ عطرِ پیراہن" نہیں تھا، میرؔ کے لئے بات کرنا بھی ایک عذاب ہے ؎

میرؔ کس کو اب دماغِ گفتگو　　　عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

ایک سچی سچی بات ؎

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ　　　مذہبِ عشق اختیار کیا

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے ؎

رشک کی جا گہ ہے مرگ اس کشتۂ حسرت کی میرؔ　　　نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم　　　تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے — یہ ہمارا غالبؔ ہے

اور یہ رہے میرؔ صاحب ؎

کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں　　　نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

یہ دولت بیدار کسے ملی ہے ؎

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر　　　میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

جب بھی دُنیا بستی تھی، اور اب بھی دُنیا بستی ہے ؎

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گیے　　　ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا!

غالبؔ قرض کی پیتے تھے مے اور میرؔ یوں بہکے ہیں ؎

نہ بہکے میکدے میں میرؔ کیونکر　　　گرو تلو جا ہے پیراہن ہمارا

کبھی اس مشتِ خاک کی آشفتگی کا یہ عالم ہے ؎

نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن　　　غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

وقت کی قدر پر کتنے پیارے انداز میں نصیحت کی ہے ؎

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز　　　میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

طبیعت دار عاشق نازِ معشوقانہ رکھتے ہیں ؎

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے — عشق بن یہ ادب نہیں آتا!

اس مقطع کی مقبولیت اور شہرت خود اس کی ضمانت ہے ~

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

واللہ اعلم۔ جانے حقیقت میں کیا ہے ~

کہیں ہیں میرؔ کو مارا گیا شب اس کے کوچے میں — کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا ہوگا!

اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے ~

دے پہلی التفاتیں ساری فریب نکلیں — دینا نہ تھا دل اس کو ہیں میرؔ آہ چوکا!

اک وہ بھی زمانہ تھا — اور اب ~

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ! — یہ میرؔ اب جو گدا ہے شراب خانے کا!

ع من کی دنیا میں نہ دیکھے ہیں نے شیخ و برہمن ~

شرکت شیخ و برہمن سے میرؔ — کعبہ و دیر سے بھی جایئے گا

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا مسجد — کسی ویرانے میں بنایئے گا!!

ع غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا — یہ بھی قسمت کی بات ~

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پُرخشم سے وہ میرؔ — میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا!

بڑے بول کا سر نیچا — ساقی کی نگاہِ مست نے بھی کیا انتقام لیا ہے ~

کس کی نگہ کی گردش تھی میرؔ رو بمسجد — محراب میں سے زاہد مست و خراب نکلا!

جانے کب پیام اجل آئے۔ آج آئے یا کل۔ کسے خبر ~

اس کارواں سرا میں کیا میرؔ بار کھولیں — یہاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا!

خدا کے چہیتے پیارے بندے 'شاکی' نہیں ہوتے۔ جب 'صاحب نظر' بنے تو پھر کیسا شکوہ اور کس کی شکایت

ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے ~

خوش رہا جب تلک رہا جیتا — میرؔ معلوم ہے قلندر تھا!

ایک عبرت و الم کا مرقع تھی۔ تربت کیا تھی ~

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ — میرؔ کا کھول کر کفن دیکھا!

اب دل تو گیا کیا اندھے بھی ہونے کا ارادہ ہے؟ ~

گھر چشم کا ڈبو مت دل کے گئے پہ رو رو — کیا میرؔ ہاتھ سے تو یہ بھی مکان دے گا!

اس کی بزم میں پہنچے تو منھ پر مہر لگ گئی ع "بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری" کے مصداق ~

رات حیران ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میر — دردِ پنہاں تھے بہت پر لبِ اظہار نہ تھا!

چوٹ پہ چوٹ کھائے جا، جاناں سے دل لگائے جا ؎

کُھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میر — سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا!

اس بندش کا جواب نہیں ؎

گئی تسلیم اس کی نزع میں کب میر کے دل سے — اُسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا!

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب، کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا — اور "ریختہ" کو رتبہ ملا، بلندی ملی، عزت ملی، میر نے یوں اس حقیقت کا اظہار کیا ؎

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے — معتقد کون نہیں میر کی استادی کا!

بڑے نصیب کھلے۔ جانے کیا جاتی دنیا دیکھی ؎

زہے طالع اسے میران نے یہ پوچھا — کہاں تھا تو اب تک، تجھے کیا ہوا تھا؟

اب جب اس حالت سے پہنچے ہوں گے تو ترس کھا کر پوچھ لینے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں ؎

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا — نمناک چشم، و خشک لب، و رنگ زرد سا!

کوئی بھی تو قبول نہیں کرتا۔ اب اپنا کیا ٹھکانہ ؎

دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکے گا میر — ادھر تو اس سے بت پھرے، ادھر خدا پھرا!

نامۂ اعمال کا یہ حال ہے۔ سارے کا سارا سیاہ ؎

وصفِ خط و خال میں خوباں کے میر — نامۂ اعمال سیہ کر گیا!

اور میرے پسندیدہ و محبوب مقطعوں کا یہ سلسلہ جو "الف کی ردیف" کا انتخاب ہے اس آخری مقطع پر ختم کیا جاتا ہے جو سر خود کرے گا وہ سرفراز ہوگا۔ خاکساری خدا کو پسند ہے۔ جو چیز اپنے پاس نہیں ہوتی دوسرے کے پاس ہوتی ہے وہ عموماً پسند آتی ہے۔ خاکساری اور عاجزی کی بھلا اس بے نیاز کو کیا ضرورت۔ لیکن صفات کی حد تک وہ اسی صفت کو پسند کرتا ہے۔ میر نے کتنا پیارا خیال ظاہر کیا ہے ؎

بسانِ خاک ہو پامال راہِ خلق اے میر — رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

(باقی آئندہ)

"قطب مشتری" میں گجراتی، کنڑ اور مرہٹی الفاظ

(جناب گرناتھ راج صاحب دیوکر)

اُردو زبان کی خصوصیت اس کی وسعت مشرب اور اس کے دامن کی فراخی ہے۔ اس نے اپنی تعمیر میں کبھی بھی حد بندی، تعصب اور تنگ نظری کو جگہ نہیں دی بلکہ اس کو جہاں سے اور جس زبان سے بھی کوئی ایک ایسا لفظ مل گیا جو ایک خاص معنی کے اظہار کے لیے بہتر ہوا سے اس نے اپنا بنا لیا۔ اُردو ادب اس کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ جب اُردو کے اسی بچے کو دکنیوں نے گود میں لیا تو اس کے الفاظ کے خزانہ کو بڑھانے کے لیے انھوں نے نہایت فراخ دلی سے دکن کی مرہٹی، کنڑ، تامل، تلگو اور گجراتی کے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کرنا شروع کیے۔ آج کی بحث میں ہم اس سلسلہ میں صرف ایک کتاب قطب و مشتری مصنفہ وجہی سے ان زبانوں کے الفاظ اور ان کے بعض محاورے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ یہ جاننا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ان زبانوں میں عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ اپنی اصلی یا مسخ شدہ صورت میں آج بھی مستعمل ہیں، ایسے الفاظ کی سب سے زیادہ تعداد گجراتی میں پائی جاتی ہے اس کے بعد مرہٹی کا نمبر آتا ہے۔ کنڑ اور دوسری دراوڑ زبانوں میں زیادہ تر وہی الفاظ رائج ہیں جو نظام حکومت یا اسلامی تمدن سے متعلق ہیں۔

(الف) قطب مشتری میں گجراتی الفاظ اور محاورے

دکن میں اُردو زبان کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دکن کے بعض نامور ادیب مہاجر تھے جو گجرات سے آنکر بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی زبان پر گجراتی کا کافی اثر ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ دکن میں "پڑیا" "ستیا" "بولیا" جیسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو گجراتی کا اثر ظاہر کرتے ہیں کیونکہ یہ اضافت صرف گجراتی کی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ 'تے'، 'تھے'، 'ستے'، 'سکتے'، 'سکے گا'، وغیرہ الفاظ جو دکنی میں پائے جاتے ہیں وہ اسی نظریہ کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

صفحہ	مصرعہ	لفظ	(دیوناگری میں)	معنی
۸	خدا سوں گمے توں یہاں آئے خلیل	گمے	गमे	پسند ہو
۱۴	پچھیں یا حقیقت اچھو یا مجاز	پچھیں	पछीं	پھر
۱۹	نہ کر بات توں ناسمج آمنا	(ناسمج) آمنا	अमना	اس طرح کی
۲۹	ہریک ڈگ میں شرد چمن کو جوتا اتھا	جوتا	जोता	دیکھتا

(ضمیمہ)

صفحہ	مصرعہ	لفظ	(دیوناگری میں)	معنی
۲	کہاں لگ سو بیوا سو کہانا ہیے	ہیے	हवे	اب
۳	اندھارا جو تھا سو گیا نھاٹ کر	نھاٹ کر	न्हाटकर	بھاگ کر
۱۴	سو خاطر پہ ٹک ماندگی لیائے کر	ماندگی	मान्दगी	بیماری
۵۴	نکو نھاس جاتوں مرے پاس تے	نھا(ناس)	न्हास	بھاگ
۶۸	عطارد کہیا شہ او تاول نہ کر	اوتاول	उतावल	بے صبری، جلد بازی
۱۰۵	کہ ڈوسا ہوا ہیں کراب راج تو	ڈوسا	डोसा	بوڑھا

(ب) مراٹھی الفاظ اور محاورے

مراٹھی میں عربی اور فارسی الفاظ نہ صرف کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں بلکہ انشاپردازی کے لئے باعث ناز بھی تصور کئے جاتے ہیں۔ مراٹھی میں بعض فارسی اور عربی الفاظ اس قدر زبان کے جزو ہو گئے ہیں کہ ان کے عربی یا فارسی الاصل ہونے کا شبہ ہی نہیں ہوتا۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ دکن میں جو بعض عربی اور فارسی الفاظ اپنے بدلے ہوئے معنی اور مسخ شدہ صورت میں مستعمل تھے اُسی معنی اور صورت میں آج بھی مراٹھی میں پائے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ مراٹھی اور دکنی دونوں زبانیں ایک دوسرے سے متاثر ہوئی ہیں۔

صفحہ	مصرعہ	لفظ	(دیوناگری میں)	معنی
۱۹	اگر ٹک جو دوڑوں بلند دھاؤں کو	دھانو	धाँव	دوڑ
۱۱	جتے تا سچ جھنج نیا شور کیا	جھنج	झुंज	لڑائی
۲۰	اگر راجوٹ ؟ فرستیاں سوں لائے	راجوٹ	राजवट	سلطنت
۲۰	سو بھوتیک اُمید ہور آس تے	بھوتیک	बहुतेक	غالباً
۲۰	یو نادان بالک ننھا لاڈکا	لاڈکا	लाडका	لاڈلا
۲۰	سورج چاند کے پھانسے نیت سے گھال	گھال (کر)	घाल (कर)	ڈال
۲۳	گڑگیاں پہ آیا بھٹونگ بھارتے	گڑگیاں پر آنا	गुडघ्याँ पर आना	گھٹنے ٹیکنا
۲۴	ہوئے عاجز اس کے سنپڑ کل منے	سنپڑنا	सपडना	پھنسنا
۲۴	یکسکو بلا ایک اڑنانوں سوں	اڑنانوں	अडनाँव	خاندانی نام (ذاتی)
۲۷	لگیا شہ اُساساں بھرن آہ مار	اُساساں	उसासाँ	آہیں
۲۹	دلے کوئی جانتا نہیں ہے کہ بھوندو دو کہاں اپے اچھتا	بھوندو	भोंदू	مکار، دل چور

صفحہ	مصرعہ	لفظ	(دیوناگری میں)	معنی
۴۲	محبت تو لئے گرم بھرتا ہے	لئے	लई	بہت
۴۴	بنستا ہے کام کچ لاج تے	بنستا	बिन सता	الجھتا
۴۳	تو بات اب نہیں سدے، کو اڑباٹ جائے	اڑباٹ	अडबाट	مرہٹی + کنڑی غلط راستہ
۴۴	نکو ہو تو ہڈپن میں منج تے جُدا	ہڈپن	हडपन	طفلانہ حرکت؟
۴۶	سو اُس ماولی پاس شہ یہ کہے	ماولی	माउली	ماں
۵۱	کہ محشر کے بارے تھے ڈونگر لیا	بارا، ڈونگر	बारा	۱۲، پہاڑ
۵۶	لگیا سنگ بھرکانے دُور دُور تے	بھرکانا	थिरकाना	پھینکنا
۶۰	تیا پیک ہوا تھا وہاں کشت کوں	پیک	पीक	فصل
۸۰	تھوڑی بھوت جاتی ہے بھی جان گے	گے	गे	ری
۸۶	کہ کچ ساتھ مل کر وہ ناندیا ہے	ناندنا	नान्दना	خیریت سے زندگی بسر کرنا
۸۶	تیری ناندنگ شہ ہے دھات دھات	ناندنک	नान्द णुक	خوشحالی
۸۷	تو بہا منجے کیا سبب جالتا	جالتا	जालता	جلاتا
۹۱	نکو بول رکھ منج اوپرا ہے کندھر	بول رکھنا	बोल रखना	موردِ الزام ٹھہرانا
۱۲	سو دو بیل لا کر تجے نانگر کرو	نانگر	नाँगर	ہل
۱۵	پھکٹ کا ہے گرڑا سو لا دو دوگن	پھکٹ کا	फुकटका	مفت
۱۳	یو ککلوت سوں کیوں سٹیا آکے ہوں	ککلوت	ककलूत	محبت
۱۸	ہنڈیں بور بچے وہاں بے حساب	ہنڈنا	हिंडना	پھرنا

کنڑی الفاظ

صفحہ	مصرعہ	لفظ	(دیوناگری میں)	معنی
۱۸	شعر بولنا گرچہ اپروپ ہے	اپروپ ہے	अपरूप	نوادر میں سے ہے
۳۱	جو عاقل اتھے سے بہت ہچ ہوئے	ہچ	हुच्च	دیوانے
۳۲	کدھن تر سوں کوئی جیوں لائی تھی	جیوں	जीव	محبت

صفحہ	مصرعہ	لفظ	(دیوناگری میں)	معنی
۳۷	اُسی تار کی واں دراہی ہے	دراہی	डराही(ई)	اقتدار
۵۰	بلند ایک بنڈا پڑا واں نظر	بنڈا	बन्डा	پتھر
۷۸	نکو پڑ جھٹے میرے دنبال توں	جھٹے	झूटे	بیکار کنٹر محاورہ

دکنی میں عربی و فارسی کے مسخ شدہ الفاظ

صفحہ	مصرع	لفظ	معنی
۳۲	بڑھے شہ ہر ایک تل ہر یک تاس کوں	تاس (طاس ساعت)	گھنٹہ، ساعت
۳۲	بھوتیک اُسے عشق کا درد ہے	درد بیماری کے معنوں میں	گجراتی میں دردی بیمار کو کہتے ہیں
۲۵	گئے زیاستی بہت رہے مختصر	زیاستی	زیادہ

مرہٹی کنٹر اور گجراتی کے مندرجۂ بالا الفاظ اور اس قسم کے کئی اور الفاظ جو دکن کی زبانوں میں مستعمل ہیں آج بھی دکنی اُردو میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اس اشتراک باہمی کے سبب دکنی اُردو دکن میں عام طور پر سمجھی جاتی ہے حالانکہ یہ بہت کم لوگوں کی مادری زبان ہے۔

اُردو شاعری میں گل و بلبل

(محترمہ رفیعہ سلطانہ ایم اے لکچرار کلیہ اناث حیدر آباد دکن)

اُردو شاعری نے اپنا چراغ فارسی سے روشن کیا اسی لئے فارسی شاعری کی جملہ روایتیں اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اُردو میں موجود ہیں۔ گل و بلبل، فارسی شاعری کا ایک کلاسیکل موضوع ہے۔ گل و بلبل کے باہمی ربط کو ایرانیوں کے جمالیاتی ذوق نے "گل و بلبل" کا رمزیہ نام دے دیا۔ لیکن اس رمز میں کچھ حقیقت بھی ہے اور اس کو وہی لوگ پا سکتے ہیں جنھوں نے ایران میں اپنی آنکھوں سے گل و بلبل کا نظارہ کیا۔ محمد حسین آزاد نے سفرنامہ ایران میں ایران کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ بلبل کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ادھر گلاب کھِلا ادھر بلبل ہزار داستان اس کی شاخ پر بیٹھی نظر آتی ہے۔ بلبل نہ صرف پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درخت پر منڈیر پر بولتی اور چہچہاتی ہے۔ گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے بولتی ہے بولتی ہے بولتی ہے جب حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو پھول پر منھ رکھ کر آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتی رہ جاتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے جو اس کے اور گل و لالہ کے مضمون باندھے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ اور ان میں کتنی اصلیت ہے۔ اس کی جوش و خروش نے چہکار سن کر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اسی لئے ایرانیوں نے بلبل کو گل کا شیدائی بنا دیا یہ اصطلاح دراصل ان کے تصورِ عشق پر حاوی ہے یوں بھی ایرانی خیال پرست زیادہ اور عملی کم ہیں۔ ایرانی مزاج کی مناسبت سے ان کا تصورِ عشق بھی انفعالی ہے عملی نہیں۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ "خیالیاتی" ہے وہ گل کو ٹہنی پر کِھلا دیکھ کر دستار میں رکھنا یا زیبِ گلو کرنا نہیں چاہتے یا نہیں کر سکتے۔ گویا وصل کی تمنا ہی کرتے ہیں وصال پر قادر نہیں۔ اسی لئے ایک قسم کی "محرومی" اور "یاس" ان کے تصورِ عشق پر محیط ہے۔ اور ان کی تمام شاعری کی لَے میں ایک آرزوئے ناتمام کی جھلک ملتی ہے۔ گل و بلبل کا رشتہ بھی اسی قسم کا ہے۔ شاید اسی لئے فارسی شعرا نے اس تشبیہ سے بہت فائدہ اٹھایا اور بیشتر غزلوں میں بلبل کو اپنا ہم نوا و ہم داستان تصور کیا چنانچہ سعدی کہتے ہیں ؎

اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم — تو عشق گلے داری من عشق گلِ اندامے

یا حافظ کا مشورہ ہے ؎

بنال بلبل اگر با منت سرِ یاریست — کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست

اُردو شاعر نے اسی کا چربہ یوں اتارا ہے ؎

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

چونکہ محبوب کو "گل" فرض کیا ہے اس لئے کبھی محبوب کے لب پنکھڑیاں معلوم ہوتے ہیں تو کبھی رخساروں پر پھولوں کا

گمان ہوتا ہے وہ پھول کو اس وجہ سے پسند کرتے ہیں۔

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلبل صرف ایرانی پرندہ ہے اور گلوں نے صرف ایرانی دلوں ہی کو لبھایا۔ یورپ میں بھی بلبل ہوتا ہے اور مغربی شعرائے گل و بلبل کو موضوع سخن بنایا ہے لیکن ان کا تخیل عملی ہے وہ جیسے کہ میتھیو آرنلڈ نے کسی جگہ کہا ہے This Worldliness ارضیت کے قایل ہیں۔ ستاروں پر نظر جاتے وقت یہ نہیں بھولتے کہ ان کی زمین بھی ایک ستارہ ہے۔ یعنی حقیقتوں سے منہ نہیں موڑتے۔ چنانچہ گل و بلبل کا تصور بھی ان کے ہاں مجرّد نہیں مجسّم ہے۔ وہ ایرانی شاعر کی طرح تمام کائنات میں ایک عالم گیر روح کو جاری و ساری دیکھتے ہیں اس کے باوجود کسی ایک ندی ایک پہاڑ ایک چشمہ تک شاعری کو محدود نہیں کرتے۔

چنانچہ کیٹس Keats نے جب بلبل کا نغمہ لکھا تو اسے ایک پرند فرض کرتے ہوئے اس پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے۔ "اے ارض جنت کی حور! تم ہم انسانوں کے دکھ درد کو نہیں سمجھ سکتیں، جہاں شمع بجھنے کے لئے آفتاب ڈوبنے کے لئے اور پھول مرجھانے کے لئے کھلتا ہے۔

Where youth grows pale and spectre thin and dies
Where but to think is to be full of sorrow and
leaden eyed despair

رابرٹ برجز Robert Bridges اپنی نظم Nightingales "بلبل" میں اس تن و دھن پر رشک کرتا ہے جو بلبلوں کا مسکن ہیں۔ ساتھ ہی اسے بلبل کے زمزموں میں ناتمامی اور نارسائی کا احساس ہوتا ہے وہ محسوس کرتا ہے ان میں زندگی کا بھرپور احساس نہیں بھرپور زندگی کی تمنا پائی جاتی ہے

Their song is the voice of desire
That haunts their dreams
A throe of the heart whose pining visions dim
forbidden hopes profound.

ہندوستان میں اوّل تو اصل بلبل کا وجود نہیں۔ یہاں بھونرا، کوئل اور پپیہا ہیں کیونکہ یہاں مرد محبوب اور عورت محب ہیں۔ چنانچہ ہندی شاعری کا یہی رجحان ہے۔ ہندی شاعر بھونرے کے ہرجائی پن اور بیوفائی کا شاکی ہے۔ جو پھولوں کا رس پی کر اڑ جاتا ہے۔ یا پھر چاتک پپیہے کا ہمنوا ہے جو پی کی تلاش میں ہے کبھی کوئل کی کوک سے اس کے من میں ہوک اٹھتی ہے۔ بلبل سے زیادہ بھونرا اس کی توجہ کھینچتا ہے۔ بہاری کہتے ہیں ؎

بھونرا بھوگے بن بھرے سود نہ مانے آپ کو سومنی میں رس کرے کلی بند ہو جائے آپ

یعنی عیش پرست بھونرے کو غم و خوشی سے کیا سروکار ! وہ دن بھر نت نئے پھولوں کا رس پیتا پھر ان سے بیگانہ ہوکر کنول میں اپنے کو بند کر لیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھونرا دن بھر پھولوں کا رس پیتا رہتا ہے جب کنول پر بیٹھتا تو رات ہو جاتی اور کنول بند ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ بھونرا بھی اس میں بند ہو جاتا ہے ۔ اور

جن دن دیکھے وہ کسم، گئی سے بیتی بہار اب آلی رہی گلاب میں اپت کٹیلی ڈار

یعنی اے بھونرے پھولوں کی بہار بیت گئی اب سوائے کانٹوں کے اس میں کیا رہا؟ مطلب یہ کہ تو تو رس کا لوبھی ہے۔ سوکھے خاروں سے تجھے کیا دلچسپی؟ ــــــــ

لیکن اردو شعرا فارسی کی تقلید میں بلبل کو اپنے خیال و انشا کے جال میں گرفتار کرتے رہے ہیں۔ ان ہی کی تقلید میں محبوب کو گل سے تشبیہہ دی ہے۔ میر کہتے ہیں ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

اور

پہنچے ہے کوئی اس گل نازک کے وصف کو گل گو چمن میں جامے سے اپنے نکل رہا

ایک جگہ خیال تک خسرو سے لیا ہے۔ خسرو کا شعر ہے ؎

حسن تو دیر نہ ماند چو زخسرو رفتے گل بسے دیر نہ ماند چو شد از خار جدا

میر کہتے ہیں ؎

تو ہو دے جہاں مجھکو بھی ہونا وہیں لازم تو گل ہے میری جان تو میں خار ہوں تیرا

اس حقیقت کو کہ عاشق کی حالت زار سے ایک زمانہ واقف ہوتا ہے اس کے عشق کا چرچا ساری دنیا میں ہوتا ہے لیکن محبوب کو خبر نہیں ہونے پاتی یا جان بوجھ کر انجان بنتا ہے اپنے خاص انداز میں بیان کرتا ہے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لیکن میر گل کی صورت میں محبوب ہی کا جلوہ نہیں دیکھتے اس سے آگے بھی ان کی نظریں جاتی ہیں چنانچہ کہتے ہیں ؎

یہ عیش گہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

درد گل و بلبل کو کس حسرت سے دیکھتے ہیں ؎

دامن بلبل کا جب دیکھوں ہوں گوش گل پہ گلشن میں تو اپنا درد دل کہنا کسو سے یاد آتا ہے

غالب بھی فارسی شاعر کی طرح بلبل کو سوختہ جگر جانتے ہیں ؎

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

اس موضوع پر جگر نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے۔ عموماً ابھی تک ہماری شاعری میں گل کو بجیں اور جفا شعار ہی پیش کیا گیا غالب کو یہاں تک شبہ ہوا کہ عذر بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ۔ لیکن جگر نے اس کی جاکد امانی

دیکھ لی۔ کہتے ہیں ؎

اور کیا چاہتی ہے بلبل شوریدہ مزاج پردۂ گل میں ہے خود چاک گریباں کوئی

یہ احساس بڑا دلنواز ہے۔ نئے شعرا گل کو تصور کی نہیں حقیقت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں وہ استعارہ سے زیادہ تشبیہ کے قائل ہیں یعنی گل سے صفات مستعار نہیں لیتے پھول ان کے نزدیک بہترین تحفۂ محبت اور اظہار عقیدت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

غلام ربانی تاباں اسے تحفۂ محبت سمجھ کر اس کی تعریف یوں کرتے ہیں ؎

یاد ہے تم کو بھی وہ ننھا سا پھول

نرم و نازک خوبصورت بادہ فام　　رنگ و بو کا پیکر رعنا تمام
وہ پیام حسن وہ حسن پیام　　جو مجھے بھیجا گیا تھا ایک شام
ماہ وش شعلہ جبیں رنگیں قبا　　کیف پرور دلنواز و جانفزا

اسی طرح اس کی تعریفیں کرتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں

حسن کا پیغمبر آتش بیان　　ربط باہم کی مجسم داستان
ظاہری بیگانگی کا راز دان　　باطنی کیفیتوں کا ترجمان

ساحر پھول جیسی جاندار اور خوبصورت چیز کو اپنی بیجان چیز پہ چڑھتا دیکھ کر چڑھتے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قایل　　میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟

اس طرح بلبل کا تصور بھی اُن کے پاس بڑا جرأت آمیز ہے۔ ظہیر کاشمیری بلبل کی زبان میں کہتے ہیں ؎

مرے لئے ایک سے ہیں دونوں وہ کوئی صیاد ہو کہ گلچیں　　نظام گلشن میں شاخ گل سے الگ نہیں شاخ آشیانہ

اقبال کی عظمت فکر اور اس کا رنگ و آہنگ ماضی و حال کے شعرا سے مختلف ہے۔ اس نے بلبل و گل کو بھی نئی نظر دی ہے ؎

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے　　کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اور ؎ اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل　　نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

جہاں وہ بلبل کو نیا شعور بخشتے ہیں وہیں گل کو بھی خودداری جرأت کا نیا عزم دیتے ہیں ؎

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو　　کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

اور ؎ تمنا آبرو کی ہے اگر گلزار ہستی میں　　تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

سچ تو یہ ہے گل و بلبل کی اصطلاح زندگی کی ایک مانی اور رہائی حقیقت ہے جس کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بقول میر

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول　　گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا

ضمیمہ مقالہ نما

مرتب ۔۔۔۔۔۔ محمد ابراہیم ڈار

شریک مرتب ۔۔۔۔۔۔ عالی جعفری ۔۔۔ عصمت جاوید ۔۔۔ احمد ملک

مذہبیات

۱۔ ابوالجلال ندوی، اصحاب الاخدود (معارف جولائی ۱۹۵۱ء ۵ ۔۔۔ ۱۷)

الاخدود سے مراد آتشی خندق ہے جسے ہندی میں اگنی کنڈ کہتے ہیں، اصحاب الاخدود کے بارے میں مفسرین کے دس سے زائد اقوال ہیں۔ ہمارے خیال میں اصحاب الاخدود کا نام لے کر خدا نے کسی معیّن قوم کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ آیت کا مصداق ہر وہ واقعہ ہے جس پر یہ آیت صادق آجائے، اخدود بابل، اخدود نجران، اخدود شام اور اخدود حبش کی مثالیں دی گئی ہیں۔

۲۔ ادارہ : تدبّر قرآن (چراغ راہ جولائی اگست ۴۷ ۔۔۔ ۵۱ء)

اس کے مؤلف امین احسن اصلاحی ہیں جن سے ہندوستان اور پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ پہلے حصّہ میں مؤلف نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ قرآن کے فہم کے لئے تدبّر اور اس کے ساتھ ساتھ حسن نیت کی ضرورت ہے۔ دوسرے حصّہ میں قرآن کے آسان ہونے کی بحث ہے۔ ہم مؤلف کے اس کارنامۂ علمی کا استقبال پورے جذبۂ اعتراف کے ساتھ کرتے ہیں۔ کتاب کی قیمت زیادہ رکھی گئی ہے۔

۳۔ حافظ محمد علی شاہ، علم تفسیر پہلے مدوّن ہوا یا علم حدیث (برہان جولائی ۱۹۵۱ء ۱۴ ۔۔۔ ۲۴)

تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے علم حدیث کی تدوین ہوئی، اگرچہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ عقلاً قرآن پاک کی تفسیر ہی مدوّن و مرتب ہونی چاہیئے۔

۴۔ محمد علی شاہ، علم تفسیر پہلے مدوّن ہوا یا علم حدیث (برہان اگست ۱۹۵۱ء [illegible])

کشف الظنون میں پہلی اور دوسری تیسری صدی کی جن کتب تفسیر کا تذکرہ ہے ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسلامی علوم و فنون میں اوّل علم تفسیر مدوّن ہوا یا حضرت مجاہد کی تفسیر اس علم کی اوّل تالیف ہو۔ ہر حیثیت سے تفسیر ابن عباس کو اوّلیت کا شرف ہوگا نہ کہ تفسیر مجاہد کو۔

۵۔ عبدالحمید : اسلام کا فلسفۂ معاشیات (چراغ راہ کراچی ۱۵ ستمبر ۱۷ ۔۔۔ ۳۶)

یہ کہنا کہ اسلام تو صرف اخلاقی پیغام ہے جس کا معاشیات سے کوئی تعلق نہیں ایک بڑی جسارت ہے۔ اس کی اصل وجہ ایسے کہنے والوں کی قرآن کریم کی ترتیب سے ناواقفیت ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے معاشیات کی ابتداء و ترقی بیان کرنے کے بعد قرآن کی آیتوں سے مدد لے کر اسلام کا فلسفۂ معاشیات پیش کیا ہے۔

۶۔ عبدالحمید : مارکسیت یا اسلام (چراغ راہ کراچی ۱۵ ستمبر ۳۹ ۔۔۔ ۴۷ء، ۵)

دوسرے فلسفیوں کی طرح مارکس بھی افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے اس کے عقیدت مندوں کے ساتھ محض مخالفت کی خاطر مخالفت کرنے والے نقاد بھی پیدا ہو گئے۔ مولانا محمد مظہر الدین نے انگریزی میں Marxism or Islam ایک کتاب لکھی اور اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر بے لاگ تنقید کی اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو گنایا ہے۔ بعد میں اسلامی معاشی نظام کو سمجھایا اور بتایا ہے کہ صحیح معاشی نظام اسلام ہی پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں جو دراصل مولانا کی کتاب پر ایک تفصیلی اور تاثراتی تبصرہ ہے مضمون نگار نے مارکسیت اور اسلام کے "حقائق" کو اردو داں طبقہ کے لئے بیان کیا ہے۔

۷۔ مناظر احسن گیلانی۔ تدوین حدیث محاضرۂ چہارم (۱۸) برہان جولائی ۱۹۵۱ء ۵ — ۱۶)

صحابیت کے خلاف جس نے سب سے پہلے مخالفانہ باتیں شروع کیں وہ عبداللہ بن سبا تھا، یہی شخص ایک دوسرے فتنے یعنی جھوٹی حدیثیں رسول کریم کی طرف منسوب کرنے کا ذمہ دار بھی تھا، حضرت عثمان کے عہد خلافت میں ابن سبا نے اپنی فتنہ پردازانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔

۸۔ مناظر احسن گیلانی، تدوین حدیث محاضرۂ چہارم (۱۹) برہان اگست ۱۹۵۱ء ۷۹ — ۸۰)

ابن سبا اور اس کے کارندوں کے پاس ایک بڑا حربہ جھوٹی حدیثوں کا پھیلانا تھا، جھوٹ کا یہ سیلاب کوفہ، بصرہ، شام، حجاز اور دوسرے علاقوں پر چھا گیا، اس فتنے نے ایک دوسرے فتنے کو پیدا کیا یعنی چاہا گیا کہ سرے سے حدیث کے قصے ہی کو ختم کر دیا جائے، اسی صورت حال کا اندازہ کر کے کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علیؓ نے پیغمبر اسلام صلعم کی گفتار و رفتار اور سیرت و کردار کے متعلق تحریراً اور تقریراً اپنی معلومات کی وسیع پیمانے پر اشاعت شروع کر دی۔

۹۔ مناظر احسن گیلانی، تدوین حدیث محاضرۂ چہارم (۲۰) (برہان ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۳۳ — ۱۴۴)

حضرت علیؓ۔۔ فتنے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے جھوٹ کے مقابلے میں صحیح معلومات کا جو ذخیرہ آپ کے پاس تھا اس کی اشاعت فرماتے رہے اور صحیح حدیثوں کو جعلی و مصنوعی روایتوں سے جدا کرنے کے لئے ایک ایسا علمی معیار مسلمانوں کے حوالے کر دیا جو اسی زمانے کے لئے نہیں بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی کار آمد رہے گا۔

۱۰۔ مناظر احسن گیلانی، تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام (برہان ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۴۵ — ۱۵۶)

مختلف زمانوں میں یہودی قوم جن مفسدانہ عوارض میں مبتلا رہی ہے ان کی اجمالی داستان بیان کی گئی ہے۔

۱۱۔ نجم الدین اصلاحی، مصارف زکوٰۃ کے سلسلے میں چند ضروری باتیں (برہان اگست ۱۹۵۱ء ۱۱۹ — ۱۲۱)

زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف فی سبیل اللہ ہے جس کے بارے میں عام مفسرین اور فقہا یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حاجت مجاہدین اور سامان جہاد ہے مگر یہ تحدید صحیح معلوم نہیں ہوتی، فی سبیل اللہ میں مصالح عامہ کا جواز نکلتا ہے۔

جغرافیہ

۱۲۔ اسرار احمد آزاد: نہر سویز (آج کل دہلی ۱۵ ستمبر ۱۹ — ۲۱)

نہر سویز کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ۱۳۰۸ ق م میں یہ موجود تھی۔ لیکن ۵۰۰ ق م میں اس کا پتہ نہ تھا۔ قلوپطرہ، رومی شہنشاہ ٹراجن اور ہارون الرشید نے تحقیق کرانے کے بعد از سر نو اسے تعمیر کرنا چاہا تھا۔ ۱۷۰۰ء میں لوئس چہاردہم نے اور اس کے بعد نپولین نے اسے تعمیر کروانا چاہا، آخر کار فرانس کے ایک انجینیر ایوریس میری نے نپولین کے خاکہ کو سامنے رکھ کر ۱۸۵۸ء میں اس کی تعمیر شروع کی جو دس سال بعد پوری ہوئی۔ برطانیہ نے اس کی تعمیر کی سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن اب اس کا سب سے بڑا محافظ وہی ہے۔ نائب خدیو اسمٰعیل پاشا نے اپنے حصص برطانیہ کو بیچ کر اسے یہ حیثیت دے دی۔ یہ نہر ۱۸۶۹ء سے ایک بین الاقوامی بحری شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی سال بہ سال کی تاریخ اور سویز کنال کمپنی سے متعلق معلومات مضمون نگار نے بہم پہنچائی ہیں۔

۱۳۔ ملسیانی عرش: شادی آباد مانڈو (آجکل ۱۵ اگست ۱۹۵۱ء)

دریائے نربدا کے کنارے وندھیاچل کی پہاڑیوں میں قلعۂ مانڈو اور اس کی عمارتیں روپ متی اور باز بہادر کے قصۂ حسن و عشق کو اب بھی زبان حال سے بیان کر رہی ہیں۔ مقالہ میں مانڈو کی تاریخ، وہاں کی عمارتوں اور روپ متی اور باز بہادر کے داستان عشق کو پیش کرنے کے بعد آخر میں روپ متی کے مقبول گیتوں کا ملخص دیا ہے۔

تاریخ و سیاست

۱۴۔ ادارہ: تاریخ انقلاب فرانس کا ایک پوشیدہ ورق (نگار ماہ اگست ۵ — ۷)

ہسپانوی رئیس زادی "تریزیا" کے عشق کی سرگزشت بیان کی گئی ہے کہ کس طرح اس نے انقلاب فرانس کے ہنگاموں میں [illegible]

بھاشنے کی غرض سے انقلابی حکومت کے ایک افسر ڈالا بر تلاشیں پر ڈورے ڈالے اور آخر میں اسی سے شادی کر لی۔

۱۵۔ اسرار احمد آزاد، مشرق و مغرب کی باہم آویزی (برہان ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۸۲ — ۱۸۶)

معاہدۂ جاپان، کوریا میں مذاکرات مصالحت، ایرانی تیل کے قضیے، نہر سویز، مصر اور برطانیہ کے معاملات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہی ادارہ جو بین الاقوامی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے قائم کیا گیا تھا مشرق و مغرب کے مابین سرد جنگ کو بڑھانے کا ذمہ دار ہو رہا ہے۔

۱۶۔ انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، امیر الامرا نواب نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت (برہان اگست ۱۱۱ — ۱۱۸)

نجیب الدولہ نے دہلی میں اپنے نو سالہ قیام کے دوران میں امور سلطنت کو بڑی نیک نیتی سے انجام دیا، وہ اپنی سیرت، علم پرستی رواداری اور معدلت گستری کے لئے مشہور تھا۔

۱۷۔ انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، امیر الامرا نواب نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت (برہان ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۷۹ — ۱۸۱)

نجیب الدولہ نے امور سلطنت کو نہایت قابلیت اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا، مرہٹوں کو دو آبے سے نکال دیا اور آگرہ میں صرف جاٹوں کا ایک قلعہ باقی رہ گیا۔

۱۸۔ محمد ظفیر الدین، تاریخی حقائق (برہان جولائی ۱۹۵۱ء ۴۴ — ۵۴)

ندوۃ المصنفین دہلی کی شائع کردہ تاریخ ملت کے دو حصوں — (چہارم و پنجم) کے مطالعے سے متاثر ہو کر مقالہ نگار نے بعض سلاطین اندلس و بغداد کے شخصی حالات کا تذکرہ لکھا ہے، اس قسط میں عبدالرحمٰن الداخل، الحکم، عبدالرحمٰن الناصر، الحکم الثانی اور حاجب المنصور کے بعض دلچسپ اور سبق آموز واقعات زندگی بیان کئے گئے ہیں، آخر میں عباسی خلیفہ المنصور کا بھی ذکر ہے۔

۱۹۔ محمد ظفیر الدین، تاریخی حقائق (۲) (برہان اگست ۱۹۵۱ء ۱۰۳ — ۱۰۵)

عباسی خلفاء منصور، مہدی، ہادی، ہارون الرشید، امین، مامون اور معتصم کے عہد حکومت کے بعض سبق آموز واقعات ندوۃ المصنفین کی شائع کردہ کتاب خلافت بنی عباس جلد اول سے لے کر بیان کئے گئے ہیں۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۰۔ آغا حیدر حسن مرزا: میرے بچپن کی دلی (۱)، (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۱۱ — ۱۴)

میرزا صاحب نے حمید سلطان بیگم کے کہنے پر اپنے زمانہ کی دلی کی کہانی تحریر فرمائی ہے جس میں بقول خود اپنے چھٹے پینے کے بعد کے واقعات و حالات خود ان کے دیکھے بھالے ہیں اور اس سے قبل کی چیزیں بزرگوں سے سنی ہیں۔ اس مضمون کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو مرزا صاحب کے بچپن کے سوانح اس سے خود ان کی زبانی مل جائیں گے، دوسرے دلی کی معاشی و معاشرتی زندگی کا حال جو بجو معلوم ہو جائے گا۔ (مسلسل)

۲۱۔ بشیر محمد خاں۔ مولانا مولوی میر شجاع الدین حسین (رشید جولائی ۱۹۵۱ء ص ۳۶ — ۳۹)

مولانا مولوی میر شجاع الدین حسین برہانپوری کے مختصر سوانح حیات ان کی عظمت و فضیلت، تصنیف و تالیف، تبلیغ و ہدایت اور عادات و اخلاق کا بیان۔

۲۲۔ حافظ محمد مظہر: دارالعلوم کے سپوت (سب رس اگست ۱۹۵۱ء ص ۹ - ۱۶)

مدرسۂ دارالعلوم حیدر آباد تقریباً صد سالہ زندگی کی ایک عظیم الشان داستان محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے نامور فرزندوں نے کس درجہ کمال علم و فضل حاصل کیا اور پھر ملک کو کیا فائدہ پہنچایا!

دارالعلوم کی علمی خدمات اور اس کے نامور فرزندوں کی علمی فتوحات اور کارناموں کا بیان۔

۲۳۔ حافظ محمد مظہر، دارالعلوم کے سپوت (بسلسلۂ گذشتہ) سب رس ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۹-۱۶۔

دارالعلوم حیدر آباد کے نامور فرزندوں کی علمی فتوحات اور کارناموں کا تذکرہ۔

۲۴۔ خورشید احمد فارق، مختار بن ابی عبید الثقفی (۴)

(برہان جولائی ۱۹۵۱ء ۱۷ — ۲۸)

تنظیم حکومت: کوفہ پر قبضہ کرنے کے بعد بڑی رواداری اور حسن سلوک سے حکومت شروع کی موالی اور غلاموں کا وہ بڑا محسن تھا، البتہ وہ کوفہ کے شوریدہ سر اور جاہ پسند عربوں کو مطمئن نہ کرسکا کچھ مدت کے بعد مختار قاتلین حسینؓ کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا۔

۲۵۔ خورشید احمد فارق، مختار بن ابی عبید الثقفی (۵) (برہان اگست ۱۹۵۱ء ۸۱ — ۹۲)

جنگ مذار نے مختار کے اقبال کی بنیادیں ہلادیں، اس کو جتنا فوجی نقصان ہوا اس سے زیادہ اس کی اخلاقی حیثیت کو زک پہنچی، مختار کا مقصد جاہ طلبی تھا اور اہل بیت کی تحریک اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک زبردست آلۂ کار تھی، اس کی خارجی سیاست میں بھی یہی چیز نمایاں تھی چنانچہ ابن الحنفیہ سے اس کے تعلقات بھی اسی بنا پر تھے۔

۲۶۔ خورشید احمد فارق، مختار بن ابی عبید الثقفی (برہان ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۵۷ — ۱۷۰)

ابن الحنفیہ اور ابن زبیر سے مختار کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ مختار کے سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے تھا لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام رہا،

۲۷۔ شفقت رام: فریڈرک پنکاٹ (آج کل دہلی ۱۵ جولائی ۲۷ — ۲۸)

بھارت اندو بابو کے زمانہ کے فریڈرک پنکاٹ ہندی کے مشہور مبلغ و شیدا اور ادیب تھے۔ ہندی کے ادیبوں سے خط کتابت کیا کرتے تھے۔ اور ہندی کو عام کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ بھارت کی سیاسی اور مجلسی زندگی سے بھی دلچسپی تھی۔ بال دیپک اور وکٹوریہ چرت ہندی میں دو کتابیں لکھی ہیں۔ انگلینڈ کی مشہور پبلشنگ کمپنی ڈبلیو۔ ایچ۔ ایلن کے منیجر اور سموئٹ ۱۸۹۰ء میں اس سے الگ ہو کر گلبرٹ اینڈ رری۔ وی گلن پریس میں شامل ہو گئے اسکے رسالہ "آئین سوداگری" کے مدیر تھے۔ اسکے کچھ صفحے ہندی کیلئے مخصوص تھے یہ پہلے انگریز ہیں جنہوں نے انگلینڈ میں ہندی کو جاری کیا۔ ۱۸۹۵ء میں گھاس کی کھیتی کے پرچار کیلئے ہندوستان میں آئے اور بھارت کی زبان اور شعر سے محبت کرنے والا ۱۸۹۶ء میں بھارت کی مٹی (لکھنؤ) میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

۲۸۔ عبدالرحمٰن خاں، ابن الجوزی اور تاریخ نویسی (برہان ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۷۱ — ۱۷۸)

اس مقالہ کا مواد اس رسالہ سے اخذ کیا گیا ہے جو ڈاکٹر جوزف سوموگی نے ابن الجوزی کی کتاب المنتظم پر جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا، اس میں ابن الجوزی کے مختصر حالات زندگی اور تصنیفات کا مختصر بیان ہے۔

۲۹۔ قاری۔ حامد حسن: ملک الشعراء بہار خراسانی (آجکل ۱۵ اگست ۲۹ — ۳۱)

بہار خراسانی کے مختصر حالات زندگی اور ان کے سیاسی مشاغل پیش کرنے کے بعد۔ ان کی قومی اور سیاسی نظموں پر رائے زنی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قدیم اصول شاعری کے پابند تھے۔

۳۰۔ قاضی عبدالودود، خاتمۂ خلاصۃ الافکار (نوائے ادب جولائی و اکتوبر ۱۹۵۱ء ۵۶ — ۲۷)

میرزا ابوطالب کے والد ایران سے ہندوستان آئے تھے مگر یہ خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ان کا سال ولادت ۱۱۶۶ھ ہے، ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ سفر یورپ ہے اور ان کا سفرنامہ جس کا نام مسیر طالبی ہے چھپ بھی گیا ہے۔

میرزا کی خلاصۃ الافکار فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے اس کے خاتمہ میں بہ شمول مصنف ۲۳ شاعروں کے تراجم اور منتخب اشعار ہیں، خاتمہ میں معاصرین سے متعلق کچھ قیمتی اطلاعات ہیں اور کچھ تاریخی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے یہاں اسے نقل کیا گیا ہے،

۳۱۔ مالک رام: نواب صدر یار جنگ بہادر — حبیب الرحمٰن خاں شروانی (آجکل ۱۵ اگست ۸ — ۱۹)

مضمون نگار نے نواب موصوف سے اپنی ملاقات کی تقریب بیان کرنے کے بعد ملاقات کے تاثرات کو با تفصیل پیش کیا ہے اور ان کے کتب خانے کی بعض نادر کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً غالب کی "سبد چین" (جو تقریباً پہلا قاعدہ نہیں تھی) مومن کا فارسی

دیوان، طالب آملی کا دیوان جس میں کلام کا بیشتر حصہ خود طالب
کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ مثنوی کا قدیم نسخہ جو اورنگ زیب کے
کتب خانہ میں تھا اور بوستانِ سعدی جس پر نصیر الدین حیدر،
امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مہریں ثبت ہیں اور دوسری
نادر کتابیں۔

۳۲۔ مبارز الدین رفعت۔ شفیق اورنگ آبادی (سب رس
اگست ۱۹۵۱ء ص ۱۲ ـ ۲۴)

مغلوں کے دورِ انحطاط میں بھی اورنگ آباد کی علمی و ادبی
سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آنے پائی۔ اس دور میں ولی اور سراج جیسے
شعرا نے جنم لیا۔ اسی زمانے میں ایک شاعر ہوئے ہیں شفیق پورا نام تھا
لچھمی نارائن اردو میں صاحب تخلص کرتے تھے اور فارسی میں شفیق
تصنیف و تالیف کا بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ شفیق کی اردو نظم و نثر پر
تبصرہ۔

۳۳۔ محمد مجیب اللہ ندوی، خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ
(معارف جولائی ۱۹۵۱ء ۳۱ ـ ۴۴)

اس قسط میں نویں صدی ہجری کی محدثات کا تذکرہ ہے، زیادہ تر
شذرات الذہب اور الضوء اللامع سے مدد لی گئی ہے صرف مشاہیر
کی خدمات کا خاکہ حروف تہجی کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔

۳۴۔ محی الدین قادری زور۔ کشن پرشاد یمین السلطنۃ ـــــ
"داستانِ ادبِ حیدرآباد" کے چند صفحات (سب رس اگست
۱۹۵۱ء ص ۳ ـ ۷)

کشن پرشاد وقار الامرا جیسے شائستہ و باوقار اور مربی فضلا و
کمال وزیر اعظم کے جانشین ہوئے اور اس وقت حیدرآباد کی
سیاسی، علمی، ادبی اور تمدنی زندگی اتنے اعلیٰ معیار پر پہنچ چکی تھی کہ اس کو
جاری رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لئے ایک غیر معمولی شخصیت کی
ضرورت تھی۔ حسن اتفاق سے کشن پرشاد کی ذات میں بعض غیر معمولی باتیں
جمع ہوگئی تھیں۔ شاد کی علمی و ادبی سرگرمیوں، ادب نوازی اور داد بیداد کی
سرپرستی کا تذکرہ۔

۳۵۔ نصیر الدین ہاشمی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (شاعر
جولائی ۱۹۵۱ء ص ۹ ـ ۱۲)

جامعہ عثمانیہ کو اپنے جن فرزندوں پر ناز ہو سکتا ہے ان میں سے ایک
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بھی ہیں، ڈاکٹر صاحب نہ صرف ادیب
ہیں بلکہ مورخ، نقاد اور شاعر بھی ہیں اور پھر ان کی یہ مختلف النوع
حیثیت ماہر فن کی صورت رکھتی ہے۔ زور صاحب کے حالاتِ زندگی
اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ قلمبند کیا گیا ہے۔

تنقید، ادب، لسانیات

۳۶۔ ابراہیم یوسف: فن ڈراما نویسی (نگار لکھنؤ ۱۵ ستمبر ۵۱ ـ ۲۱)

نقالی ڈراما کو جنم دیتی ہے اور یہ ڈراما تاریخ کے ہر دور میں
کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ دیگر صنف ادب سے یہ کسی
طرح کم اہم نہیں۔ چنانچہ مضمون نگار نے ڈراما کے لوازم، ناول اور
ڈراما کا فرق، ڈراما کی بنیاد، ڈراما کا ڈھانچہ اور پلاٹ پر تفصیل کے
ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

۳۷۔ اثر محمد علی خاں: مرزا غالب کے تین خط (آجکل دہلی
۱۵ ستمبر ۲۵)

مالک مطبع اخبار دبدبہ سکندری رام پور کے نام غالب کے تین
خطوں کی نقل پیش کی ہے۔ یہ خطوط دبدبہ اخبار مذکور کی جلد ۲۴ نمبر ۳۴
میں یکم جولائی ۱۸۸۹ء میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن ان کی نقلیں چونکہ مکاتیب
غالب میں ہیں نہ انفرادی طور پر ملتی ہیں اس لئے اثر رامپوری نے انہیں
مکتوبات کا ریکارڈ مکمل کرنے کے لئے شائع کیا ہے۔

۳۸۔ احمد مجتبیٰ حسن۔ حالی اور اردو نثر (شاعر جولائی ۱۹۵۱ء
۱۶ ـ ۱۷)

حالی کی نثر سادگی کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ بڑے آسان انداز
میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ طرز بیان میں شگفتگی ایسی کہ زبان
چٹخارے لے، سلاست و روانی کا یہ عالم جیسے پہاڑ کے دامن
سے چشمہ بہہ رہا ہو۔ حالی کی نثر پر مختصراً تبصرہ کیا گیا ہے۔

۳۹۔ احمد مجتبیٰ حسن۔ فکر سیماب اور فکر وطن (شاعر ستمبر ۱۹۵۱ء
ص ۹ ـ ۱۱)

سیماب جذبۂ وطنیت سے سرشار ہیں اور حب وطن ان کا دین

دامیان۔ سیماب کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبے سے بحث کی گئی ہے۔

۴۰۔ اعظمی فیض الرحمٰن : سردار جعفری کے سماجی شعور کا تجزیہ۔ (نگار ۱۵ اگست ۰۔۲۰ ۔ ۲۷)

سردار جعفری کی شاعری کی عمر تقریباً وہی ہے جو ترقی پسند تحریک کی ہے ابتدا میں اس تحریک میں شعور کی پختگی کی بجائے جذبہ اور جوش اور ایک نوع کی انقلابی رومانیت کی فراوانی تھی۔ سردار کی ابتدائی نظمیں اس سماجی شعور کی پوری نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ رومان سے انقلاب تک منزل طے کرنے میں کہیں بھی روح عصر سے الگ نہیں ہوئے۔ طبقاتی شعور ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری محض نعرہ یا سیاسی اور جماعتی پروپیگنڈہ نہیں وہ انقلاب وارتقاء کے سائنٹیفک اور وسیع مفہوم پر قائم ہے۔

۴۱۔ امتیاز علی عرشی ، انند رام مخلص کے اردو شعر (معاصر نمبر ۱ [illegible] ۰۔۵ ۔ ۵۶)

مخلص اصل میں فارسی کا شاعر ہے، کتاب خانہ رام پور میں اس کے کلیات نظم فارسی کے ایک مخطوطے میں اس کے اردو اشعار جن کی تعداد ۳۳ ہے شامل ہیں، وہی اشعار یہاں درج کئے گئے ہیں۔

۴۲۔ تمکین کاظمی : امراؤ جان ادا اور مرزا رسوا (آجکل ۱۵ ستمبر ۵ ۔ ۱۰)

امراؤ جان ادا کا قصہ تخیل کی پیداوار نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں، مرزا رسوا نے مضمون نگار سے اس کی صراحت کر دی تھی تراب علی آزر کی مملوکہ کتابوں میں ایک کتاب "جنون انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا" ملی ہے۔ یہ رسوا اور امراؤ جان کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے۔ امراؤ جان نے ناول کے روپ میں اپنی سوانح عمری کا چھپنا پسند نہیں کیا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے ایک روز موقع پاکر مرزا رسوا کی کتابوں میں سے یہ رسالہ نکالا اور ۱۸۹۹ء میں دربار برادرس لکھنؤ کے ذریعہ منشی گلاب سنگھ کے پریس سے چھپوا دیا۔ مقدمہ کے مضمون اور تاریخ کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے امراؤ جان ادا جس کی تاریخ اشاعت اول نہیں معلوم ہوا اسی سال چھپی ہوگی (مسلسل)

۴۳۔ حبیب اللہ غضنفر ، اردو کا عروض (اردو جولائی تا ستمبر [illegible] ۳۹۶ ۔ ۱۰۴)

یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے کہ اردو کا عروض بھاشا کے قواعد عروض پر مبنی ہے، ہندی اور فارسی کی اصل ایک ہے لہٰذا ان کے اوزان میں مماثلت ہونا بعید نہیں مگر صدیوں کی علاحدگی کے بعد ان کی مطابقت کا پہچاننا دشوار ہے، صاحب مقالہ نے عربی اور فارسی کی جملہ بحور نقل کر کے بتایا ہے کہ دونوں زبانوں کے عروض میں صرف بحروں کے نام مشترک ہیں اور فارسی اشعار کی تقطیع عربی ارکان کے بموجب کی جاتی ہے مگر عربی اوزان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، البتہ فارسی کے بہت سے اوزان ہندی سے مشابہ ہیں اور اس مشابہت کی وجہ یہی ہے کہ دونوں ایک ہی جگہ سے نکلی ہیں۔

۴۴۔ جمیل الدین ، 'مہر نیمروز' کا ایک خاص نسخہ (نوائے ادب جولائی و اکتوبر [illegible] ۰۔ ۷ ۔ ۸۵)

میرزا غالب نے 'مہر نیمروز' کا ایک نسخہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی خدمت میں بطور نذر بھیجا جو دوسری خصوصیتوں سے قطع نظر اس بنا پر اہمیت رکھتا ہے کہ غالب نے اس کے حاشیوں پر بعض لغات کے معنے اپنے قلم سے لکھے ہیں اور کئی جگہ کتابت و طباعت کی غلطیوں کی تصحیح کی ہے، 'مہر نیمروز' سے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں، آخر میں نواب وزیر الدولہ کے مختصر حالات اور ان کے غالب کے ساتھ تعلقات کا بیان ہے۔

۴۵۔ جمیل مہدی۔ ساحر کی انقلابی شاعری (شاعر جولائی [illegible] ص ۲۱ ۔ ۲۶)

ساحر ان چند ترقی پسند شاعروں میں ایک ہے جنہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کو ان کی تکنیک اور ردیف و قوافی میں تبدیلی کئے بغیر آگے بڑھایا۔ ساحر کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

۴۶۔ جمیل مہدی۔ جذبی کی ایک نظم (شاعر اگست [illegible] ص ۲۱ ۔ ۲۴)

جہانی کی نظم "مری شاعری اور نقاد" سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس نظم کے پورے جسم میں کمال سال و اثاثہ روح یہاں تک کہ ہڈیاں اور شریانیں تک اپنی ہیں لیکن اس میں خون دوسرا بہہ رہا ہے۔

۴۷۔ حامد حسن قادری: تواریخ وفات مولانا حسرت موہانی۔ (آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۶)

دو قطعے مولانا حسرت کی تاریخ وفات کے سلسلے میں لکھیں پہلے کے شروع کے دو مصرعوں سے ۱۳۷۰ھ اور دوسرے دو مصرعوں سے تاریخ عیسوی ۱۹۵۱ء نکالی ہے۔ دوسرے قطعہ کے آخری دو مصرعوں کو ملا کر ایک اور تاریخ عیسوی پیش کی ہے۔ پہلے قطعہ سے زیادہ دوسرے قطعہ میں مولانا حسرت کی زندگی شاعری، شخصیت اور فن تنقید پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

۴۸۔ راجیندر ناتھ شیدا: جائسی کی پدماوت (آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۱۸۔۲۰)

ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط کے بعد ہندی شاعری میں بھگتی کا دور شروع ہوا۔ تصوّف اور بھگتی کے سبب ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ ملک محمد جائسی عشق یا تصوف کے شاعر ہیں۔ ان کی تصانیف پدماوت، "اکھراوٹ" اور "آخری کلام" ہیں۔ پدماوت اہم ہے اور اسی کی وجہ سے جائسی ہندی شاعری میں زندہ جاوید ہیں۔ اس کی زبان اودھی اور انداز مثنویوں کا ہے۔ یہ ۹۲۷ھ میں لکھی گئی۔ اس کا تقریباً پہلا دو تہائی حصہ تخیلی ہے اور باقی کی بنیاد تاریخ ہند کے ایک واقعہ پر ہے۔ اس میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ اس کے مختلف کردار مختلف مخصوص علامتیں ہیں۔ اس کی تصریح کتاب کے آخر میں درج ہے۔ پدماوت کی ضیا گنج قضا اور رائی اور رفیق انظری کا ملا ہوا ہے۔ فارسی نظم و نثر کے علاوہ بنگلہ وغیرہ میں بھی اس کے تراجم ملتے ہیں۔ پلاٹ کے ساتھ کردار نگاری بھی ملتی ہے۔

۴۹۔ رحمت قطبی: اردو غزل (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۶ ۔ ۷)

اردو غزل کی تنگ دامانی کی شکایت غالب نے کی اور حالی بھی اسے ختم داخل سمجھتے تھے۔ بہتوں نے اسے متروکات میں سمجھ لیا۔ لیکن سب سے جب ادب میں انقلاب آیا تو اس میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی اور اب یہ پہلے کی طرح "مردہ" نہیں بلکہ زندہ صنف سخن ہے اور ہماری زندگی کا ہر پہلو اس کا موضوع بن سکتا ہے۔ البتہ موجودہ دور کی فارسی الفاظ و تراکیب سے گریز لازم ہے۔

۵۰۔ رشید حسن خاں: ارباب لغات کے چند لطیفے (شاعر ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۲۰ ۔ ۲۴)

اردو میں مستعمل فارسی، عربی، ہندی اور دوسری زبانوں کے الفاظ و مشتقات کی لغتی حرکات اور اشتقاق سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے مضمون نگار نے مختلف لغات کی ورق گردانی کی۔ اس مطالعہ کے دوران میں بعض مقامات پر عجیب عجیب اختلافات سامنے آئے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ نظر طلب بھی تھے۔ ایسے اختلافات کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

۵۱۔ سلامت اللہ خاں: شمع و پروانہ (آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۴۹ ۔ ۵۲)

اردو زبان میں شمع کو ایک ہمہ گیر رومانی حیثیت حاصل ہے۔ شعراء نے انسانی زندگی کی غم انگیزی اور گرانی کی جھلک شمع کی زندگی میں دیکھی ہے۔ بلکہ کبھی فلسفیانہ اور کبھی اس سے الگ ہو کر شمع اور پروانہ کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال منفرد ہیں، ورنہ عام طور پر شمع محبوب اور پروانہ عاشق کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ شمع امید، شمع آرزو، شمع محفل شمع زندگی وغیرہ کی صورت میں شمع انسانی زندگی میں بڑی اہمیت کی مالک ہے۔

۵۲۔ سہیل بخاری ایم اے۔ جوش کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ (شاعر ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۱۲ ۔ ۱۵)

جوش کی شاعری کے نفسیاتی محرکات اور ان کے شاعرانہ محاسن سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جوش کی عظمت کا راز ان کی رومانی شاعری میں مضمر ہے۔

۵۱۔ سید ریاض الرحمٰن : جگر کی غزل گوئی (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۵۱۔ ۵۲)

جگر موجودہ دور میں بہت مقبول ہیں۔ ان کی غزلیں محض الفاظ کی شعبدہ بازی نہیں، اور نہ پامال و فرسودہ روایات کی تقلید، یہ حقیقی جذبات سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ اعلیٰ شاعری کی بہترین مثالیں ہیں۔

۵۴۔ سید محمد عقیل : قصۂ چہار درویش میری نظر میں (نگار اگست ۸۔ ۱۶)

مضمون میں محمود شیرانی کے حوالے کے ساتھ قصۂ چہار درویش کا اصلی مصنف حکیم محمد علی کو بتایا ہے اور ڈاکٹر عبدالحق نے میر امّن کی باغ و بہار کو نو طرز مرصع کا جو ترجمہ بتایا ہے اس کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ کلی ترجمہ نہیں۔ بطور ثبوت دونوں کتابوں سے وہ مثالیں دی گئی ہیں جن میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کے بعد مضمون میں میر امّن کی باغ و بہار کے الجھے ہوئے پلاٹ اور ناقص کردار نگاری وغیرہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

۵۵۔ سید عبداللہ، اقبال کی فطرت نگاری (اُردو جولائی تا ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۵۔ ۱۲۸)

اقبال حسن فطرت کے دلدادہ و شیدائی مگر وہ حسن فطرت کو پہلے اخلاقی اور روحانی حقائق کے ادراک کا ذریعہ بناتے ہیں بعد میں تسخیر فطرت کا۔ وہ جب مفرد اشیا کی مصوری کرتے ہیں تو خارجی جزئیات سے زیادہ ان اشیاء کے پوشیدہ اسرار حکمت کا بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مفرد اشیاء کے مقابلے میں ان کی مرکب تصویریں مرقع کشی کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔

۵۶۔ سید محمد فاروق : تجلی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں (آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۷۔ ۱۲)

میر تجلی کے ناموں میں اختلاف ہے تاہم میر حسین یا محمد حسین زیادہ قرین قیاس ہے۔ یہ محمد حسین کلیم کے صاحبزادے اور میر تقی میر کے بھانجے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ لیکن ناموں میں اختلاف کیا ہے مصحفی نے ان کی عرفیت میاں لاجی پر ہی قناعت کی ہے۔ ایک مثنوی لیلیٰ مجنوں ان کی تصنیف کا تذکروں میں ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ نایاب تھی مضمون نگار نے اس کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ اسے سودا و میر کے عہد کا ایک ادبی و تاریخی کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔

۵۷۔ شاہ مقبول احمد : بھارت میں اُردو کے مسائل (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۸۔ ۱۱)

ہندستان کی تقسیم کے بعد اُردو کے باقی رہنے کی دو صورتیں ہیں۔ اولاً فارسی و عربی سے قریب تر رہتا جس سے وہ محض ایک اقلیت ہی کی زبان بن جائے گی۔ دوسری صورت بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر ہندی سے قریب ہونا ہے۔ اس کے لئے دونوں ہی زبانوں کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹنا ہوگا۔ یہ امتزاج ایک عظیم زبان اور اس کا عظیم وسیع ادب تیار ہو جائے گا۔ اُردو سارے دیس کی زبان بن جائے گی۔

۵۸۔ شری یاد جوشی : مراٹھی زبان میں اُردو کے الفاظ (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۲۲۔ ۲۴)

مراٹھی یا مرہٹی نہیں بلکہ مرہٹوں کی زبان مراٹھی ہے۔ اس زبان کے شاعر اور ادیب غیر شعوری طور پر تقریباً ہر جملہ میں اُردو کا ایک آدھ لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ اس میں عربی، فارسی، اور پرتگالی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ مراٹھی میں اُردو الفاظ اولاً مسلمانوں کی مقامی حکومت کے ذریعہ آئے۔ عربی الفاظ اس سے پہلے بھی دخیل تھے اور خود مراٹھی کے لفظ بن گئے۔ مراٹھی میں اُردو الفاظ کے آنے کے سبب کئی ہیں: (۱) ہندوؤں کا مسلمان ہونا (۲) فارسی دانوں کا مراٹھی میں اُردو، فارسی لفظوں کا استعمال کرنا اور (۳) باہمی شادی بیاہ وغیرہ۔ اُردو لفظوں کی مراٹھی میں کہیں شکل بدل گئی ہے تو کہیں معنی دوسرے ہیں۔ تلفظ بھی تھوڑا بہت کے مطابق ہوتا ہے۔ اُردو الفاظ سنسکرت کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ بھی مستعمل ہیں۔ ان کا چلن مراٹھی کے محاوروں میں بھی ہے۔

۵۹۔ شکیل الرحمٰن شکیل: رشید احمد صدیقی کا آرٹ (نگار لکھنؤ
ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۳۲-۴۲)

رشید احمد صدیقی کا فن زندگی کا سطحی ترجمان ہے اس لئے ان
کی طنز مضحکہ خیزی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ صرف سطحی دلچسپی پیدا کرنا چاہتے
ہیں اور سکتے۔ وہ اردو کے چسٹرٹن ہیں اور برنارڈ شا بن کے ان کے مضامین
کی فضا اور افادیت عموماً ایک طبقہ کے لئے محدود ہوتی ہے۔ تاہم بعض
اوقات ان کے ہاں تندی بھی مل جاتی ہے۔ اس لئے ان کے آرٹ اور
شعور کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

۶۰۔ شمشاد احمد: گلیری جی (آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۲۲-۲۴)

ان کا نام پنڈت چندر دھر شرما گلیری تھا۔ الہ آباد سے بی اے کیا
اور یونیورسٹی امتحان میں اول آئے۔ ۱۹۰۴ء میں ایم اے کرتے ہی
کھیتڑی کے راجہ کے معلم اور اتالیق بن کر میو کالج گئے۔ ۱۹۰۴ء سے
۱۹۱۷ء تک وسیع مطالعے اور ادبی خدمات میں مصروف رہے۔ ۱۹۲۰ء
میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے چندر دھر ہندی اسکالر اور پرنسپل کالج
آف اورینٹل لرننگ اینڈ تھیالوجی بنا کر بنارس بلایا۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال
کیا۔ ہندی اور سنسکرت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ لیٹن، فرنچ اور جرمن سے
بھی واقف تھے۔ اور بنگلہ، مراٹھی، پراکرت اور ویدک سنسکرت پر بھی
پورا عبور حاصل تھا۔ ان کے کل تین افسانے ہیں (۱) سکھ ملے جیون (۲)
بدھو کا کانٹا اور (۳) اس نے کہا تھا جو ان کی مستقل شہرت کا باعث
ہیں۔ ان کے ہاں سلاست، روانی، نفسیات اور حقیقت پسندی اور
انوکھا پن ہے۔

۶۱۔ شوکت سبزواری، عزیز حسن مراد آبادی: زبان اور رسم خط سے
تعلق۔ (نگار ۱۵ اگست ۷۸-۳۵)

جون ۱۹۵۰ء کے نگار میں احتشام حسین کا ایک مقالہ زبان اور رسم
خط کے باہمی تعلق پر شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اس موضوع پر
اظہار خیال کی دعوت عام دی تھی۔ مولانا شوکت سبزواری
اور عزیز حسن مراد آبادی کے یہ مضامین پر مشتمل ہے احتشام حسین نے اس
بنیاد پر کہ زبان اور رسم خط کا تعلق "باطنی" نہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ
اردو کا رسم خط بدل جائے۔ شوکت اور عزیز حسن نے اپنے اپنے مضمون
میں زبان اور رسم خط کے باہمی تعلق کو فطری ثابت کرنے کی کوشش کی
ہے اور موجودہ رسم خط کو برقرار رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔

۶۲۔ ظفر عالمگیر: اردو کے حامیوں اور ہمدردوں سے (سب رس
جولائی ۱۹۵۱ء ص ۳-۸)

اردو ہندی کے جھگڑے کا اجمالی طور پر ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا
ہے کہ اردو کو کیوں اور کیسے زندہ رکھا جائے۔ اس ضمن میں انجمن ترقی
اردو کی پالیسی پر بھی نکتہ چینی کی گئی ہے۔

(ماخوذ از رہنمائے دکن ہفتہ وار ایڈیشن ۱۷ جون ۱۹۵۱ء)

۶۳۔ ظفر عالمگیر: شیلان کا قیدی (شاعر اگست ۱۹۵۱ء ص ۷۱-۸۰)

ابتدا میں بائرن کی شاعری کا اجمالی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور پھر
اس کی مشہور نظم "شیلان کا قیدی" کا ترجمہ دیا گیا ہے اور اس سے
بحث کی گئی ہے۔

۶۴۔ عبدالحق: مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہؓ (اردو جولائی۔
ستمبر ۱۹۵۱ء ۵-۲۰)

اپریل ۱۹۵۱ء کے اردو میں ڈاکٹر عبدالحق کا مضمون جو اس مثنوی
پر شائع ہوا تھا جس میں صراحت کی گئی تھی کہ یہ شمالی ہند کی سب سے قدیم
مثنوی ہے، یہاں اس مثنوی کو درج کیا گیا ہے۔

۶۵۔ عشرت حسن انور: اقبال اور نیٹشے (معارف جولائی ۱۹۵۱ء
۵۴-۶۵)

اقبال کو جب وجدان ذات میسر ہوا تو وہ برگساں کے فلسفہ
سے غیر متعلق سے ہو گئے اور بہت سی باتوں میں نیٹشے کے ہم خیال
ہو گئے یعنی کائنات کی تخلیق ہی ہماری خودی کا نتیجہ ہے وجود بے ما خودی
کی تعمیر بھی خودی ہی کرتی ہے، خودی کا مظاہرہ طاقت اور جبروت
میں ہوتا ہے، البتہ نیٹشے کے فلسفۂ خودی میں جو باتیں مخرب مذہب
و اخلاق ہیں اقبال کو ان سے اختلاف ہے۔

۶۶۔ عشرت حسن انور: اقبال اور جیمس وارڈ (حصہ اول) (معارف
اگست ۱۹۵۱ء ۱۱۳-۱۲۵)

جیمس وارڈ کثرت وجود کو ایک لازمی حقیقت مانتا ہے یعنی
میرے علاوہ دوسرے افراد بھی موجود ہیں جو قطعاً ہر اعتبار سے مجھ سے

مختلف ہیں، کائنات میں ہر شے ایک خصوصی، انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور ہر جگہ ذوقِ انفرادیت جاری و ساری ہے، اقبال کا نظریۂ خودی مسلمان صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے کو کسی حد تک اقبال مغرب کے مرہونِ منت ہیں۔

۶۷۔ ع۔ م۔ ٹونکی: غالب اور ٹونک (نگار لکھنؤ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۱ء)

والیانِ ٹونک ہمیشہ اہلِ علم و کمال کو نوازا کرتے اور خاطر خواہ داد و دہش سے ان کی ہمت افزائی کرتے۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء میں غالب نے ایک فارسی قصیدہ نواب وزیرالدولہ کے ہاں بذریعہ عرضداشت بھیجا جس کے بدلے انھیں حسب دلخواہ صلہ ملا۔ قطعہ عرضداشت اس مضمون میں درج ہے اور ساتھ ہی والی رامپور کے نام ۸ ارجون ۱۸۶۵ء کا لکھا ہوا غالب کا خط بھی شائع کیا گیا ہے جو نواب محمد علی خاں والیٔ ٹونک کے ہاتھ لگا اور انھوں نے ناخوش ہو کر غالب سے ترکِ تعلق کر لیا۔

۶۸۔ فاروقی اظہر علی: مولانا شبلی کی مقالہ نگاری (آج کل ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء)

مولانا شبلی کے ماحول کے سیاسی و معاشرتی تحریکوں کا پس منظر پیش کرنے کے بعد ان کے سیاسی و ذہنی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ان کے مذہبی، ادبی تنقیدی اور تعلیمی مقالوں کی فروگذاشتوں کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ بقول مقالہ نگار ان کے مذہبی مقالات موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے غیر دلچسپ ہیں۔ ادبی و تنقیدی مقالات زیادہ تر ترجمہ اور ماخوذ ہیں۔ جو معلومات کے لحاظ سے تشنہ اور نامکمل ہیں۔ ان کے تعلیمی مقالے سطحی اور وقتی افادیت کے حامل ہیں۔ رسائلِ شبلی میں جو مضامین درج ہیں۔ ان میں تحقیقات سطحی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین، "اردو ہندی، "بھاشا اور مسلمان" اور "تحفۃ الہند فرقہ پرست ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔" بھاشا اور مسلمان میں انھوں نے والمیک کی رامائن کا مترجم تلسی کے بجائے کالیداس کو بتایا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے ہندی لکھنے والے بعض مشہور مسلمان اہل قلم کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ تحفۃ الہند علمی حیثیت سے چنداں اہم نہیں۔ اس میں انھوں نے سنسکرت کی ناواقفیت کی وجہ سے مصطلحات کا تلفظ غلط لکھا ہے۔ انھوں نے انگریزی کے چند الفاظ بھی ان کے غلط مفہوم میں استعمال کیے ہیں۔ ان کے اسلوبِ نگارش میں بھی پہلی دلآویزی مفقود ہے لیکن ان کے مقالات کا اکثر حصہ خشک اور غیر دلچسپ ہے۔

۶۹۔ فیض الرحمٰن اعظمی: سلام کی ایک نظم (شاعر جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۳ — ۱۵)

ادب میں بیک وقت تخئیلیت اور واقعیت، جمالیت اور افادیت، انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کے عنصر ہونا لازمی ہیں۔ اسی وجہ سے اچھا ادب اپنے زمانے کی چیز ہوتے ہوئے بھی ہر زمانے کا چیز ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا نظریۂ ادب کی روشنی میں سلام مچھلی شہری کی نظم "میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں" سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ سلام اس حقیقت سے واقف نہیں اور اگر ہیں تو اس سے گریز کرتے ہیں۔

۷۰۔ قاضی عبدالودود، آوارہ گرد اشعار، (معاصر نمبر ۱ ۱۹۵۱ء ۷ — ۵۶)

بعض اشعار جن میں فارسی کے کم اور اردو کے زیادہ ہیں اور جو اپنے اصلی مصنفوں کے بجائے دوسروں سے منسوب ہیں اس مقالے کا موضوع ہیں، ایسے اشعار کے اصلی مصنفوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔

۷۱۔ قاضی عبدالودود، آصف الدولہ کا جشنِ ہولی اور افسوس کی مثنوی (معاصر نمبر ۱ ۱۹۵۱ء ۱۷ — ۲۹)

آصف الدولہ کے عہد میں جشنِ ہولی بڑی شان سے منایا جاتا تھا جس کی طرف میر نے اپنی ایک مثنوی میں اور مرزا قتیل نے اپنے ہفت تماشا میں اشارہ کیا ہے۔

میر شیر علی افسوس شاعری نہیں ناثر کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں انھوں نے آصف الدولہ کے جشنِ ہولی پر جو مثنوی کہی ہے وہ ان کے قلمی دیوان میں ہے جو کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں موجود ہے، مثنوی کے کل اشعار ۲۰۰ ہیں، ۱۰۰ یہاں شائع کیا گیا ہے اس کا نام بہارِ سخن ہے۔

۷۲۔ قاضی عبدالودود، نظامی کی مثنوی خالص ہندوستانی زبان

ہیں۔ (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۵۷-۶۰)

انشا کی مثنوی شکار ہندوستانی زبان میں کلیات انشا کے مطبوعہ نسخوں میں نہیں اور یہی حال اس کے بیشتر مخطوطات کا ہے، اس وقت تک کلیات کے صرف دو قلمی نسخوں میں اس مثنوی کے اشعار ملے ہیں اور یہ دونوں کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں ہیں، یہاں وہ اشعار درج کئے گئے ہیں۔

۷۳۔ قاضی عبدالودود، ایک انگریز مستشرق کا سرقہ (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۶۱-۶۴)

ایڈورڈ ہنری پامر گزشتہ صدی کے مشہور مستشرقین میں تھے اور اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں ان کی نظم و نثر موجود ہے۔ ۳ اپریل ۱۸۷۴ء کے اودھ اخبار میں ان کا ایک طویل مضمون ہے جس میں ڈیوک آف ایڈنبرا اور زار روس کی بیٹی کی شادی کا مفصل حال قلم بند کیا ہے۔ اس مضمون میں جابجا اشعار ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ کس کے ہیں۔ ایک جگہ پامر کا نام آیا ہے، پڑھنے والے ان اشعار کو پامر کے زادۂ فکر کا نتیجہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک شعر کے سوا باقی ماندہ اشعار میر حسن کی ایک مثنوی سے لئے گئے ہیں جو ان کے قلمی کلیات میں موجود ہے۔ یہاں یہ مثنوی بجنسہٖ درج کی گئی ہے۔

۷۴۔ قاضی عبدالودود، سودا اور مکین (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، [illegible])

سودا اور مکین کے تعلقات کا کب آغاز ہوا، اس کا پتہ نہیں لیکن یہ خبر ہے کہ جھگڑے سے پہلے دونوں میں اتحاد تھا۔ ان کے درمیان ہنگامۂ نزاع کا باعث سودا کے رسالہ عبرت الغافلین اور سودا کے ایک شاگرد کے قصیدہ سے متعلق ہے۔ رسالہ اور قصیدہ دونوں کلیات سودا کے مطبوعہ نسخوں میں شامل ہیں۔ یہ جھگڑا اشرف علی خاں اشرف کے تذکرے پر مکین کی اصلاحوں سے شروع ہوا۔ سودا نے شہر آشوب مکین کی ہجو میں لکھی۔ رسالہ عبرت کی تصنیف کے بعد کے واقعات کے لئے قصیدہ ہمارا واحد ماخذ ہے لیکن اس کے مندرجات کی تصدیق یا تکذیب کا جاسے پڑی کہ کوئی ذریعہ نہیں۔ انہیں ایام مکین کے ایک ہندو شاگرد کا تصنیف ہو لیکن معدوم ہے۔ مکین و سودا کی اس میں تفاصیل نہیں آئیں۔ یہ نزاع سودا اور مکین کا مفصل حال درج ہے لیکن آزاد نے یہ نہیں

بتایا کہ ان کا ماخذ کیا ہے۔

۷۵۔ قاضی عبدالودود، مرگ انیس (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۸۴-۱۰۱)

انیس کی وفات اواخر ۱۸۷۴ء میں ہوئی، دسمبر ۱۸۷۴ء سے ۲۰ جون ۱۸۷۵ء تک کے اودھ اخبار میں جو نظم و نثر مرگ انیس سے متعلق شائع ہوئی تھی وہ بہ استثنائے تاریخ ہائے نوشتۂ تسلیم سہسوانی یہاں درج کی گئی ہے۔ اس زمانے میں اودھ اخبار کی عنانِ ادارت غلام محمد تپش کے ہاتھ میں تھی۔

۷۶۔ قاضی عبدالودود، مرگ دبیر (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۱۳۱-۱۴۴)

۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء سے جون ۱۸۷۵ء تک کے اودھ اخبار میں دبیر یا ان کے اخلاف کے متعلق جو نظم و نثر چھپی تھی وہ بعض چیزوں کو چھوڑ کر یہاں درج کی گئی ہے۔

۷۷۔ قاضی عبدالودود، لسانیات (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۱۴۴-۱۴۵)

بعض الفاظ یعنی اڈگیہ یا اڈگیا، ضرخرچی یا خرچی خرچ اور تنقید سے متعلق دادِ تحقیق دی گئی ہے۔

۷۸۔ قاضی عبدالودود، آب حیات کے دو ماخذ (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۱۴۶-۱۵۰)

آزاد نے آب حیات کی تصنیف میں ایسی کتابوں سے بھی کام لیا ہے جن کا حوالہ کسی نہ کسی وجہ سے انھوں نے نہیں دیا، ان میں سے ایک، شیفتہ کی فہرست ہے، دوسرا ماخذ جس کا نام آب حیات میں نہیں آتا سعادت خاں ناصر کا تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ہے۔

۷۹۔ قاضی عبدالودود، تعین زمانہ (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۱۵۸-۱۶۱)

جعفر علی حسرت، میر محمد مہدی مخاطب بہ میر خاں، موسی کاظم خاں، امیر اللہ تسلیم، منظور شاگرد مصحفی، غلام حسین قدر بلگرامی کا مفتی صدر الدین خاں آزردہ، فتح علی خاں پدر ظہور علی ظہور، ظہور علی ظہور، شیخ محمد حسن علی رسالدار، میر خلیق پدر انیس، ناصر علی عشرت گیاوی،

مسیحا شاگرد ناسخ، عقیل صفاہانی اور صاحب عالم مارہروی کے زمانے کی تعیین کی گئی ہے۔

۸۰۔ قاضی عبدالودود، جہانِ غالب (۱)، (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء ۱۵۱—۱۵۷)

فارسی میں لسانی تحقیق کے میدان میں غالب کے بعض بیانات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

حکیم میر قطب الدین باطن نے اپنے تذکرہ گلشن بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب میں غالب کو بہت بری طرح یاد کیا ہے، باطن کو لکھنے کا مطلق سلیقہ نہیں اور اس کی تحریریں صریح تناقض (موجود ہے)،

۸۱۔ قاضی عبدالودود، سودا کے کبت (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء، ۱۸۱)

سودا کے چند کبت کلیات سودا کے اس نسخے میں ہیں جو کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں ہے، ان میں سے دو کبت یہاں پیش کیے گئے ہیں۔

۸۲۔ قاضی محمد ابراہیم، دولت شاہ اور اس کا تذکرۃ الشعراء۔ (معارف ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۸۴—۲۰۴)

دولت شاہ کے سوانح زندگی کے مختصر تذکرہ کے ساتھ اس کی تالیف تذکرۃ الشعراء پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور دولت شاہ کی حیثیت بطور تذکرہ نگار اور ناقد کے متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۸۳۔ کلیم الدین احمد، غزل اور قطعہ (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء ۹۱—۱۲۰)

غزل کے شعروں میں اور ہر شعر کسی رنگ کے کیوں نہ ہوں کوئی ربط نہیں ہوتا، (اس خیال کی تائید میں حالی، نظم طباطبائی، اور عظمت اللہ خاں کے مضامین کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں)، غزل کی بے ربطی مسلم ہے اور اسی بے ربطی کی وجہ سے غزل مغربی ادب میں مقبول نہ ہو سکی، غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے حالانکہ یہی چیزیں تہذیب کا سنگِ بنیاد ہیں، اس کمی کی بنا پر غزل ایک نیم وحشی صنف ہے، غزل کی خامیاں واضح کرنے کے بعد قطعہ سے بحث کی گئی ہے، قطعہ میں غزل کی طرح محدود مضامین ہوتے ہیں، یہ مضامین زیادہ تر اخلاقی ہوتے ہیں۔

اردو میں مسلسل غزل اور قطعہ ایسی چیزیں تھیں جن پر نظم کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

۸۴۔ گیان چند جین، پدماوت اردو نظم میں (اردو جولائی تا ستمبر ۱۹۵۱ء ۱—۳۸)

اردو میں پدماوت کے چار منظوم ترجمے دیکھنے میں آتے ہیں، ان کے علاوہ ایک ترجمہ نثر کا ہے، زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ صاف اور قابلِ فہم ترجمہ عبرت و عشرت کا ہے، ضیاء الدین عبرت دہلوی تعمیر رام پور سے مجو خاں سپہ سالار نے پدماوت کو اردو میں نظم کرنے کی فرمائش کی، عبرت نے ایک تہائی سے کچھ کم نظم کیا تھا کہ موت نے آگھیرا، سات آٹھ سال بعد دیباچے کے مصنف میر غلام علی عشرت ساکن بریلی نے اس کی تکمیل کی، اس مثنوی میں ۴۳۳۴ اشعار ہیں، اس کی ادبی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے

۸۵۔ مانی جائسی، جگناتھ آزاد کی ایک نظم (سب رس ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۳—۵)

جگناتھ آزاد کی نظم "میرا موضوعِ سخن" پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۸۶۔ م۔ ج، ہندی اردو نزاع (نگار لکھنؤ ۱۵ ستمبر ۵—۱۲)

ہندی اردو نزاع کے متعلق یہ کہنا کہ فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتا ہے غلط ہے۔ اس سے پہلے بھی دبے دبے طور پر یہ پایا جاتا ہے۔ البتہ انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج اور دوسرے اداروں کے ذریعہ اس آگ پر تیل ضرور چھڑکا۔ اس نزاع کی لسانی، کلچری مذہبی اور ساتھ ہی سیاسی وجہیں ہیں جن پر انتہائی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

۸۷۔ محمد بشیر الحق دیسنوی، حضرت شیخ سیف الدین باخرزی اور ان کی رباعیات (معارف ستمبر ۱۹۵۱ء ۲۰۵—۲۱۲)

جس طرح رباعیات عمر خیام میں دوسرے شعرائے فارس کی رباعیاں مخلوط پائی جاتی ہیں اسی طرح رباعیات ابو سعید ابوالخیر میں بھی رباعیات باخرزی کے علاوہ دوسرے فارسی شعرا کی رباعیاں مخلوط ہیں، اس قسم کی رباعیوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔

۸۸۔ محمد خادم حسن معینی، معین الارواح کی تنقید کے جوابات[1]
(معارف اگست ۱۹۵۱ء ۱۴۴ — ۱۵۷)
مصنف کی کتاب معین الارواح پر رسالۂ معارف کی اشاعت ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۰ء میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے تنقید کی تھی اس مقالہ میں مصنف نے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

۸۹۔ محمد خادم حسن معینی، معین الارواح کی تنقید کے جوابات (۲)
معارف ستمبر ۱۹۵۱ء ۲۲۵ — ۲۳۶)
دوسری قسط میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے باقی ماندہ اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۹۰۔ محمد سخاوت میرزا، مثنوی ریاض العارفین (نوائے ادب جولائی و اکتوبر ۱۹۵۱ء ۵۰ — ۶۹)
نوائے ادب ماہ جنوری ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے مثنوی ریاض العارفین مصنفہ مولانا اسحاق بیجاپوری پر ایک مضمون کے دوران میں اسحٰق کو دکن کا ایک غیر معروف شاعر بتایا تھا ان کے جواب میں سخاوت میرزا صاحب کا یہ کہنا ہے کہ مولانا اسحاق کی یہ مثنوی نہ تو غیر معروف ہے اور نہ اس کا مصنف غیر معروف ہے اس لئے کہ یہ مثنوی مدراس، بمبئی اور بنگلور میں خاص اہتمام کے ساتھ آج سے کئی قرن پہلے طبع ہوئی۔ بمبئی میں حسب ایمائے قادری محمد سلیم متوفی ۱۲۶۵ ہجری با محاورہ اردو میں حافظ محمد اکبر خاں مرادآبادی کے ذریعہ اس کو منتقل کرایا گیا۔

۹۱۔ محمد عبدالقادر مرادی البہاری، بات پہ بات،
(شاعر جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۸ — ۲۰)
علامۂ اقبال کے ایک شعر
عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں!
سے نیاز فتحپوری کے مضمون (نگار جولائی ۱۹۵۱ء) اور احمد کے جی میں لکھے گئے جمیل نقشدائی کے مضمون (ماہ نو ستمبر ۱۹۵۱ء) کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

۹۲۔ محمد عزیز حسن مرادآبادی: بکھرے مضمون (نگار لکھنؤ اپریل ۱۹۵۱ء ۳۱ — ۳۴)
ہر شاعر کے کلام میں خود اس کے مستقل نظریات کے متعلق جو اشعار ملتے ہیں ان میں ترقی و تنزل کی بے شمار کیفیات موجود ہوتی ہیں اسے واضح طور پر دکھانے کے لئے مضمون نگار نے فانی کے انتخاب شعر لئے اور ان پر بحث کی ہے۔

۹۳۔ محمد علی خاں اثر رامپوری، کرم خاں رامپوری اور ان کا کلام
(معارف جولائی ۱۹۵۱ء ۵۵ — ۶۸)
کرم خاں رام پوری کے حالات زندگی سے متعلق بہت کم معلوم ہے، ان کے بھانجے احمد اخوند زادہ بے غفلت تخلص کرم خاں کو خسرو ثانی کے خطاب سے یاد کرتے ہیں، ان کا کلام بہت صاف اور اغلاق، عربی و فارسی ترکیبوں سے پاک، دلچسپ اور عام فہم ہے ان کے کلام کی خوبی منتخب شعروں سے ظاہر ہوتی ہے جس میں بڑی دماغ سوزی سے کام لیا گیا ہے اور مضمون آفرینی کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔

۹۴۔ محمد علی خاں اثر رامپوری، کرم خاں رام پوری اور ان کا کلام (۲) (معارف اگست ۱۹۵۱ء ۱۲۶ — ۱۳۸)
اس قسط میں بھی کرم رام پوری کے کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

۹۵۔ محمد مظہر: یاد ماضی (سب رس ۱۵ جولائی ۔ ۱۷ — ۲۳)
(سلسلۂ گذشتہ) رسالہ الحقائق ۱۸۸۹ء میں حیدرآباد سے ڈاکٹر لائٹنر نے نکالا تھا۔ اس سے قبل اس کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ اس قسط میں اس کے دوسرے شماروں کے مضامین اور مضمون نگاروں کا ذکر ہے اور ان سے متعلقہ معلومات فراہم کی ہیں، ضمنی طور پر انگلستان اور ہندوستان کے آپسی سیاسی روابط اور خصوصاً ہندوستان میں تعلیم اور ذریعۂ تعلیم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

۹۶۔ مختار الدین احمد: غالب اور مفتی میر محمد عباس (آجکل ۱۵ اگست ۵۳ — ۵۷)
غالب اور مفتی میر محمد عباس کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی اس کی روشنی میں ان کے باہمی تعلقات کی وضاحت

پیش کی ہے۔ اور "کلیات" کے حوالے کے ساتھ مفتی میر محمد عباس کے حالات زندگی پر سرسری روشنی بھی ڈالی ہے۔ مقالے میں غالب کے ایک نایاب خط کا اقتباس درج ہے اور مفتی عباس کی مثنوی "خطاب فاصل" کا بھی ذکر ہے۔ جس کے چند اشعار جن میں غالب کا ذکر ہے درج کئے گئے ہیں۔

۹۷۔ مسعود جاوید: غالب — ایک اور زاویۂ نگاہ سے (راہ چراغ ۱۵ جولائی ۱۹ — ۲۳)

مغل بادشاہوں نے اسلام کو کبھی بحیثیت مجموعی نافذ نہیں کیا بلکہ اسے اپنے ذاتی اغراض کے لئے استعمال کیا غالب نے جن کی مذہبی تربیت ناکافی تھی، مروجہ اسلامی تصورات کا مذاق اڑایا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا بچپن ایک انحطاط پذیر امیرانہ ماحول میں گزرا تھا اور وہ فطرتاً آزادہ رو تھے۔ دور غالب میں اسلام کا تصور اسلامی ضوابط کی پابندی اور ان کا اثر زندگی پر واعظ کی روش —— سب کچھ غالب کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۹۸۔ مطیع اللہ راشد برہانپوری، صوفیائے گجرات کا ایک عجیب قلمی مجموعہ۔ (نوائے ادب جولائی/اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۸ — ۴۹)

اس مجموعہ میں صوفیائے رفاعی کے وہ عملیات، وظائف اور ستر وغیرہ درج ہیں جن کی برکت و تاثیر سے رفاعی فقرا کھلے ہوئے سینے پر بے تحاشا ضربیں لگانے کے باوجود زخموں سے محفوظ رہتے ہیں، ان عملیات کے علاوہ سلسلۂ رفاعیہ کے چند بزرگوں کے مرتبہ رسالے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں،

ان تمام نوادر کے علاوہ خاص چیز اردو منظومات ہیں جو رفاعی بزرگوں کی منقبت میں ہیں، اردو منقبتوں کی تعداد ۲۲ ہے، ان کو مع متنوں کے روشناس کرایا گیا ہے۔

۹۹۔ منوہر سہائے انور، معارضۂ حزین و آرزو، (معاصر نمبر ۱۵ ۱۹۵۱ء ۳۰ — ۶۱)

سراج الدین علی خاں آرزو کا عقیدہ ہے کہ حزین نے تذکرۃ الاحوال محض اس غرض سے لکھا کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ہجو کی جاسکے۔ آرزو نے دیوان حزین سے بکثرت غلط اشعار نکال کر اپنی کتاب تنبیہ الغافلین میں اعتراضات کئے، رسالہ ثبات کا مصنف آرزو کا ایک شاگرد محمد عظیم ثبات بن میر محمد افضل ثابت ہے۔ اس رسالہ کو تنبیہ الغافلین کا تتمہ سمجھنا چاہیئے، شیخ علی حزین کا ابطال ابطال تنبیہ کے رد میں ہے، میر محمد محسن کی محاکمات الشعرا بھی اس سلسلہ میں اہم ہے، اس معارضے کی نسبت معاصر تذکرہ نویسوں کی رائیں مختلف ہیں، صہبائی کی قول فیصل معارضۂ حزین و آرزو پر آخری کتاب ہے۔

۱۰۰۔ نارش پرتابگڈھی: نقد آزادی (شاعر کے "مشاعرہ نمبر" کی روشنی میں) (شاعر اگست ۱۹۶۱ء ص — ۱۱ — ۱۹)

اجمالاً "غزل" سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ "شاعر" کے "مشاعرہ نمبر" (ستمبر ۱۹۶۰ء) میں کس حد تک آزادی سے پیدا شدہ تاثرات اور موجودہ ماحول کی بھیانک تصویر دکھائی دیتی ہے اور ایک تابناک مستقبل کی پیشین گوئی ملتی ہے۔

۱۰۱۔ نارش پرتابگڈھی: یہ الفاظ (سب رس ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۲۸ — ۳۳)

اُردو میں آنے کے بعد دوسری زبانوں کے جن الفاظ کے معنی اور اعراب تبدیل ہو گئے ہیں ان کی فہرست مع تبصرہ پیش کی گئی ہے۔

۱۰۲۔ نصیر الدین ہاشمی: قدیم اردو میں مثنوی (شاعر نمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۶ — ۱۹)

مندرجہ بالا عنوان پر محترمہ تہمینہ مجیب کے مضمون (آجکل دہلی) میں ظاہر کئے گئے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اردو کی قدیم مثنویوں میں زیادہ تر مذہبی یا تصوف کی مثنویاں پائی جاتی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ قدیم مثنویوں میں ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ لحاظ موضوع قدیم مثنویوں کی آٹھ قسمیں بتائی گئی ہیں اور ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۰۳۔ نصیر الدین ہاشمی: حیدرآباد کی افسانہ نگار خواتین (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۲۶ — ۲۸)

موجودہ دور میں خواتین نے زیادہ تر ناول اور افسانے لکھے ہیں اور مرد ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے

چند ایک نے براہ راست آپ بیتی لکھی ہے جیسے عصمت، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور۔ حیدر آباد کی خواتین افسانہ نگاروں نے ان کی تقلید کی ہے۔ تاہم ان کے ہاں جنسی بھوک اور عریانی نہیں ملتی۔ حیدر آباد کی چیدہ افسانہ نگار خواتین صغرا بیگم ہمایوں مرزا، جہاں بانو نقوی، زینت ساجدہ، رفیعہ سلطانہ بیگم، عزیز النساء بیگم حبیبی، سلطانہ عزیز، محمودہ یاسین، صغرا بیگم پریم پجارن، رضیہ بیگم اور خدیجہ بیگم ہیں جن کے بارے میں تفصیل سے معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

۱۰۴۔ نیاز فتح پوری: مومن کے قصائد (نگار لکھنؤ ۱۵ ستمبر ۳۸ — ۱۴)

مومن نے کل ۹ قصیدے لکھے ہیں جن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ مستقل طور پر قصیدے لکھتے تو یقیناً سودا اور ذوق کے ساتھ ان کا بھی نام لیا جاتا۔ فلسفہ و نجوم وغیرہ کی اصطلاحیں اور تاریخی و مذہبی تلمیحات ان کے ہاں بہت ہیں۔ قصیدہ کے پہلے کے متعین اصول نقد کے پیش نظر کہہ سکتے ہیں کہ مومن کے قصیدے بھی کامیاب ہیں اور اگر اس رنگ تغزل کو دیکھا جائے جو مومن کے قصائد میں پایا جاتا ہے تو کہنا پڑے گا کہ اس باب میں مومن کی انفرادیت نمایاں ہے۔

معاشرتی حالات

۱۰۵۔ ابو سلمہ شفیع احمد بہاری، کتاب خانہ ڈوبانواں (پٹنہ) (معارف جولائی ۱۹۵۱ء ۴۷ — ۵۹)

ڈوبانواں پٹنہ سے کچھ فاصلے پر جنوب و مشرق میں سادات کی قدیم آبادی ہے، مولانا شمس الحق ۱۲۴۳ھ میں یہیں پیدا ہوئے، مولانا کے مختصر حالات زندگی اور تصانیف کے ذکر کے بعد ان کے کتب خانہ کا جائزہ لیا گیا ہے، مولانا کتابوں کی فراہمی اور اس کے حصول میں زر کثیر صرف کیا کرتے تھے، ان کے کتب خانہ میں ہر فن کی بے شمار کتابیں تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد کچھ کتابیں مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں داخل کر دی گئیں۔

۱۰۶۔ تارا چند، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک۔ (معارف ستمبر ۱۹۵۱ء ۲۰۶ — ۲۲۴)

ڈاکٹر تارا چند کی مشہور تصنیف "اسلام کا اثر ہندوستانی کلچر پر" کے کچھ حصے کی تلخیص اس غرض سے کی گئی ہے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ ہو کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے کس رواداری کے ساتھ حکومت کی اور ان کی اس رواداری کے کیا کیا اثرات مترتب ہوتے گئے۔

۱۰۷۔ سید ابو ظفر ندوی، گجرات کا بحری بیڑہ (۱) معارف جولائی ۱۹۵۱ء ۱۸ — ۳۰)

گجرات کی جغرافی حیثیت، اسلامی عہد کی بندرگاہوں، بحر عرب میں قدیم زمانے کی جہازرانی، بندرگاہوں کے نظام، بحری مرکز گجرات کی جہازرانی اور جہازوں کی بناوٹ اور ساخت سے بحث کی گئی ہے۔

۱۰۸۔ سید ابو ظفر ندوی، گجرات کا بحری بیڑہ (۲) معارف اگست ۱۹۵۱ء ۹۵ — ۱۱۲)

عرب اور گجرات کے درمیان تجارتی تعلقات، گجراتی بیڑے سلاطین گجرات کے عہد میں جہازرانی کی ترقی، بندرگی آمدنی، جہازوں کے اقسام، جہاز بنانے کے مرکز اور تجارتی اور مسافری جہازوں سے بحث کی گئی ہے۔

۱۰۹۔ سید ابو ظفر ندوی، گجرات کا بحری بیڑہ (۳) معارف ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۶۵ — ۱۸۳)

اس قسط میں جہازوں کے عہدے دار اور عملہ، ملاحوں، جہازوں کی رفتار، جہازوں کے سامان، جہازوں کے لئے ضروری علم، جہازوں کے نام، جہازی عملوں کی تنخواہ، گجراتی سواحل سے آمد و رفت، بحری رستے اور مسافت، درآمد اور برآمد، گجراتی جہازوں کے نام، بحری تصانیف اور بحری کتابوں کے مضامین کا بیان ہے۔

۱۱۰۔ صباح الدین عبد الرحمن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں، فوجی قیام گاہوں کے ساز و سامان۔ (معارف اگست ۱۹۵۱ء ۸۵ — ۹۴)

عربی اور فارسی کتابوں اور دیگر ذرائع سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں فوجی قیام گاہوں کے ساز و سامان، رسد کی فراہمی اور سفری اسپتال وغیرہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

۱۱۱۔ عبدالعلیم نامی، اردو تھیٹریکل کمپنیوں کے ابتدائی سفر۔ (نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۸ء ۸۹۔۱۰۲)

اردو تھیٹریکل کمپنیوں کی ابتدا اور کارگزاری کا تفصیلی بیان ہے اور ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر ان کے ابتدائی سفروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۱۲۔ محمد شرف الدین: حیدرآباد کی گھریلو صنعتیں (آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۴۲۔۴۷)

دستی پارچہ بافی، اونی صنعت، قالین بافی، ریشم سازی، صنعت دباغت و چرم سازی، صنعت بیدری (بیدری منقش ظروف)، صنعت تارکشی، کاغذ سازی، بٹن سازی اور صنعت تارگر حیدرآباد کی قدیم گھریلو صنعتیں ہیں۔ انگریزی تہذیب و تمدن اور بدیسی مالوں کی درآمد کی وجہ سے یہ صنعتیں آئے دن کم ہوتی گئیں۔ اسی لئے ۱۹۰۷ء اور ۱۹۳۹ء میں حکومت حیدرآباد نے ان کی بقا کا انتظام کیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

آرٹ
(علوم و فنون)

۱۱۳۔ احتشام حسین: قدیم ہندوستانی مصوری (آجکل ۱۵۔ اگست ۲۳۔۲۸)

مقالہ نگار نے قدیم ہندوستانی مصوری کے دو دور قائم کئے ہیں پہلے دور میں جس کی ابتدا پردۂ اخفا میں ہے اجنتا کی مصوری کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس دور میں یونانی اور وسط ایشیائی اثرات نمایاں تھے۔ دوسرا دور مغلوں کے عہد سے شروع ہوا ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دورِ حکومت میں فن مصوری میں جو ترقی ہوئی ہے اس کا فرداً فرداً ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ دکن، راجپوت آرٹ اور کانگڑا اسکول کا بھی جائزہ لیا ہے۔

۱۱۴۔ ٹی کاسی ناتھ: فوٹوگرافی کا مشغلہ (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۳۳۔۳۵)

فوٹوگرافی آجکل ایک مشغلہ کے طور پر مقبول ہو رہی ہے اسے مہنگا مشغلہ کہنا غلط ہے۔ اگر اس کے لازمی اور ضروری آلات وغیرہ کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو پھر یہ مہنگی نہیں پڑتی۔ نو آموز کو پہلے سستے کیمرے لینے چاہئیں۔ تجربہ کے بعد اچھے کیمرے لینے چاہئیں۔ کیمسٹوں، عینک سازوں اور انجینیروں نے فوٹوگرافی میں حیرت انگیز اضافہ کیا ہے۔ اور جنگ نے اس کی اہمیت واضح کی اور بڑھا دی ہے۔ اب یہ سائنس اور صنعت کا اہم جزو ہے۔

۱۱۵۔ رام سنگھ راول: ہماری فلم انڈسٹری (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۴۸۔۵۰)

فلم انڈسٹری درجۂ اول کی صنعتوں میں شمار ہوتی ہے۔ عوام کی تعلیم، ان کے دل بہلاؤ، ان کے رجحان کو بدلنے اور ان میں نئی روح پھونکنے کے لئے فلم بہت مفید ہے۔ ہماری اس صنعت کی داغ بیل مرحوم دادا پھالکے نے ڈالی۔ ۱۹۱۳ء میں راجہ ہریشچندر نام کی پہلی خاموش تصویر بنائی۔ بولتی فلم امپیریل کمپنی نے عالم آرا کے نام سے ۱۹۳۱ء میں بنائی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ انڈسٹری ترقی کرتی ہوئی سیاسی اور سماجی مسائل کو پیش کرنے لگی، تاہم آجکل فلمیں بنانے والے اچھی فلمیں نہ بنا کر ایک ناقابل معافی گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

اقتصادیات

۱۱۶۔ عبدالحمید، پروفیسر: پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ (چراغ راہ جولائی ۷۔۱۵)

مذکورہ منصوبہ کا خاکہ پیش کرنے کے بعد اس کے سب پہلوؤں کا "غیر جانبدارانہ موازنہ" کیا گیا ہے اور اس کے فوائد و نقصانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تبصرے

۱۱۷۔ ادارہ، اردو آسان کتاب حصۂ اول از مولوی یوسف جلال بہاری (برہان اگست ۱۹۵۸ء ۱۲۷)

اس کتاب میں باسٹھ سبق ہیں، ان سبقوں کو اگر محنت اور توجہ سے یاد کر لیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو کی ابتدائی تعلیم میں ان سے خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے۔

۱۱۸۔ ادارہ: افادات حسن بصری مرتبہ قاضی اطہر مبارکپوری

مشہور شاعر شفیق جونپوری نے اپنے سفر حجاز اور وہاں کے باطنی تاثرات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس سفر نامہ کا سب سے اہم اور اس کی اصل روح وہ پرکیف نظمیں ہیں جو مصنف نے بارگاہ رسالت میں گذرانی ہیں۔

۱۲۸۔ ادارہ، خاندان زبیری کنبوہ، از مولوی حسین احمد زبیری (معارف اگست ۱۵۸ ۔ ۱۵۹)

صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع میں زبیری کنبوہ خاندان مشہور و معروف خانوادہ ہے۔ مولوی حسین احمد زبیری نے اپنے خاندان اور قبیلے کی تاریخ، ان کے نسب کی تحقیق، اس کی عربیت و قرشیت کے ثبوت اور اس کی مخالف روایات کی تردید میں یہ ضخیم کتاب لکھی ہے۔ مصنف کی محنت اور تلاش و تحقیق لائق ستائش ہے کہ انہوں نے ایک محدود موضوع پر معلومات کا اتنا متنوع، دلچسپ اور مفید ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔

۱۲۹۔ ادارہ: غمستان کیفی (نگار ۱۰ اگست ۴۷)

منشی چندر بھان کیفی مرحوم کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ ان کی غزلیں پرانے رنگ میں ہیں لیکن نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں سے بے خبر نہیں تھے۔ جنگ جبش و اطالیہ پر لکھی ہوئی ان کی مثنوی بہت کامیاب ہے۔

۱۳۰۔ ادارہ: خوابوں کے ویرانے (نگار ۱۰ اگست ۴۷)

جناب مسعود جاوید کے دس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں انھوں نے سماج کے ازادی وغیرہ ازادی مظالم کی طرف اشارے کئے ہیں۔ ادب و انشا کی دلکشی و بلندی کے لحاظ سے مشکل ہی سے کوئی دوسرا شخص مسعود جاوید کا ہمسر ہو سکتا ہے۔

۱۳۱۔ ادارہ، دیوان شاہ گورکھپوری (نگار ۱۰ اگست ۴۷)

سید شاہ شاہد علی سبز پوش کی غزلوں کا مجموعہ۔ شاہ صاحب مولانا شاہ آسی مرحوم کے خلیفہ تھے۔ مقدمہ میں صاحب دیوان کے حالات ذکر کئے ہیں اور ان کے شاعرانہ ذوق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کلام صاف و سلیس ہے اور دبستان لکھنؤ کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب ریاض و امیر کا طوطی بول رہا تھا۔

۱۳۲۔ ادارہ، رسول اکرم صلعم کی سیاسی زندگی، از ڈاکٹر حمید اللہ (برہان ستمبر ۱۹۴۷ء ۱۹۱ ۔ ۱۹۲)

یہ کتاب دراصل ان مقالات کا مجموعہ ہے جو فاضل مصنف آنحضرت صلعم کی سیاسی زندگی کے پیش نظر وقتاً فوقتاً لکھتے اور مختلف رسائل میں شائع کراتے رہے ہیں۔ انھوں نے حیات مقدسہ کے ایک نہایت اہم اور عظیم الشان خاکہ تیار کیا ہے جو معلومات افزا بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ مصنف کا انداز بیان بعض بعض جگہ ایسا شوخ و بیباک ہو گیا ہے جو کسی مسلمان کے لئے مشکل سے ہی قابل برداشت ہو سکتا ہے۔

اس نقص سے قطع نظر پوری کتاب قابل مطالعہ ہے اور اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی کیا جائے۔

۱۳۳۔ ادارہ، رعنائیاں ۔ از برج لال رعنا (برہان اگست ۱۹۴۷ء ۱۲۵ ۔ ۱۲۶)

مجموعے کا بڑا حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے، باقی حصے میں غزلیں اور نظمیں ہیں۔ رعنا کی رباعیوں میں اس مشکل صنف کی تمام خصوصیتیں اور نزاکتیں بوجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ غزلیں اور نظمیں بھی لطیف و دلپذیر ہیں۔ رعنا نوجوان ہونے کے باوجود پختہ فکر شاعر ہیں۔

۱۳۴۔ ادارہ، رمز سخن ۔ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور (معارف ستمبر ۱۹۴۷ء ۲۳۴)

حیدر آباد کے مشہور شاعر سدا سکھ جوگی بہادر لال کے کلام کا انتخاب ہے۔ ان کے زمانے میں شاعری کی دنیا میں داغ و امیر کا رنگ چھایا ہوا تھا، اس لئے رمز کے کلام کا عام رنگ بھی یہی ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتب کے قلم سے دکن کی اردو شاعری، رمز کے حالات اور ان کے کلام پر مختصر تبصرہ ہے۔

۱۳۵۔ ادارہ، زندگی کا رخ ۔ از سعید انصاری پرنسپل ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ (معارف جولائی ۱۹۴۷ء ۔ ۷۹)

اس کتاب میں مصنف نے زندگی کے پانچ اہم مسائل یا مراحل ۔ بچپن، گھر کا اثر، مدرسہ کی زندگی، پیشے کے لئے رہنمائی، جیون ساتھی کے انتخاب اور ازدواجی زندگی کے معاملات پر نفسیاتی نقطۂ نظر

مصنف نے ہر شخص کی اصل ہستی اور اس کو عمل کرنے کے اصول اور عملی طریقے بتلائے ہیں جن سے زندگی کا صحیح رخ متعین ہو سکتا ہے۔

۱۳۶۔ ادارہ: مہاتما گاندھی بادشاہ خاں کے دیس میں (نگار اگست ۵۱ء)

یہ کتاب مہاتما گاندھی کے سکریٹری پیارے لال کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کے دورۂ سرحد کا مفصل حال درج ہے۔ ترجمہ کی خوبی کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ ڈاکٹر عابد حسین کا کیا ہوا ہے۔

۱۳۷۔ ادارہ: لیلۃ المعراج۔ از مولوی بلالی (معارف اگست ۱۹۵۱ء ۱۴۴)

مصنف نے معراج نبوی کے واقعات کو خوبی اور خوش سلیقگی کے ساتھ نظم کیا ہے اور حتی الامکان روایات کی صحت، واقعات کے استقصا اور حسن بیان ہر پہلو کا لحاظ رکھا ہے۔

۱۳۸۔ ادارہ: المکالمۃ العربیہ یا اُردو عربی ترجمہ۔ از محمد حسن اعظمی ازہری (معارف جولائی ۱۹۵۱ء ۷۹ — ۸۰)

مصنف نے عربی زبان و ادب کی تعلیم کے جدید اصولوں کے مطابق یہ کتاب مرتب کی ہے یہ کتاب اس لحاظ سے بہت مفید ہے کہ اس سے قواعد اور دونوں زبانوں کے ترجموں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو جاتی ہے لیکن مصنف نے ہندیوں کی عربی دانی کے متعلق جو عام حکم لگایا ہے وہ صحیح نہیں۔

۱۳۹۔ قاضی عبدالودود: نادراتِ غالب۔ مرتبہ آفاق حسین آفاق (معاصر نمبر ۱، ۱۹۵۱ء ۱۴۳ — ۱۶۹)

نادراتِ غالب، غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جن میں … منشی نبی بخش حقیر اور … ان کے بیٹے عبداللطیف کے نام ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے خطوط جو غالب کے بہترین خطوط میں شمار ہونے کے لائق ہیں … ان کی اشاعت سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ مقدمہ اور حواشی محنت سے لکھے گئے ہیں لیکن کچھ مطالب [illegible] آگئے ہیں اور کچھ غلط [illegible] اور استدلال کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ خطوط کے متن کی صحت کا کما حقہ اہتمام نہیں کیا۔ خطوط کے تاریخ تحریر کی قیاسی تعیین میں بھی جا بجا غلطی ہوئی ہے۔

۱۴۰۔ ادارہ: ناول کیا ہے۔ از محمد احسن فاروقی و نور الحسن ہاشمی (نوائے ادب جولائی و اکتوبر ۱۹۵۱ء ۱۲۶)

اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دسواں باب اردو داں طبقہ کے لئے خاص دلچسپی کا موجب ہے۔

۱۴۱۔ ادارہ: زاد راہ الالفاظ۔ مرتبہ سید عبداللہ (نوائے ادب جولائی و اکتوبر ۱۹۵۱ء ۱۱۵ — ۱۱۶)

سراج الدین علی خان آرزو نے عبد الواسع ہانسوی کی غرائب اللغات کو تصحیح و تہذیب کے بعد مرتب کیا اور اس کا نام نوادر الالفاظ رکھا۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صدر شعبۂ اردو جامعہ پنجاب، پاکستان نے کئی سال کی محنت کے بعد ایک عالمانہ مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان اس کی ناشر ہے۔

۱۴۲۔ ادارہ: نسیم نو۔ تذکرۂ مخطوطات جلد دوم (سب رس جولائی ۵۱ء ص ۲)

ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانے میں جو قلمی نوادر محفوظ ہیں، ان میں سے پانچ سو کتب کا تذکرہ مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ان میں ۲۰۰ عربی، ۵۰ فارسی، ۲۵۰ اردو اور ۵ ہندی مخطوطات ہیں۔

۱۴۳۔ ادارہ: ہفت رنگ۔ از بال مکند عرش (ہمایوں جولائی ۱۹۵۱ء ۶۳ — ۶۴)

ہفت رنگ پنجاب کے مشہور شاعر عرش ملسیانی کا سات رنگوں میں مجموعۂ کلام ہے۔ دوسری بہت سی خصوصیتوں کے علاوہ عرش کی یہ خصوصیت خاص طور پر قابل داد ہے کہ ان کی غزلیں خیالات و جذبات کی جدت کے ساتھ پوری طرح رنگین و لطیف بھی ہوتی ہیں۔

۱۴۴۔ ادارہ: ہمارا راج (نگار اگست ۵۱ء)

جائے ذوقِ ادب پیدا کرنے میں مدد ہوگا۔

۱۵۲۔ عرش ملسیانی: انیس کی مرثیہ نگاری (آجکل ۱۵ اگست ۵۹ء)
یہ اثر لکھنوی کے ان چار مقالوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے انیس پر لکھے تھے۔ پہلا مضمون ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مضمون کا جواب ہے۔ دوسرا مضمون نیاز فتح پوری کے تردیدی نوٹوں کے جواب میں ہے۔ باقی دو مضامین انیس کی مرثیہ نگاری سے متعلق ہیں علمی مذاق رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب قابل مطالعہ چیز ہے۔

۱۵۳۔ عرش ملسیانی: پرکھ (آجکل ۱۵۔ اگست ۵۰ء)
یہ کتاب غلام سرور صاحب کے چھ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو نگار اور دوسرے متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ غلام سرور جواں سال نقاد ہیں اور یہ مضامین پڑھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ ان کا مستقبل تابناک ہے۔

۱۵۴۔ عرش ملسیانی: خطوطِ اکبر (آجکل ۱۵ اگست ۵۰۔ ۵۱ء)
اس کے مرتب مختار الدین احمد ہیں۔ یوں تو ابتک ان کے خطوط کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن مختار الدین احمد نے اس مجموعہ میں کچھ غیر مطبوعہ خطوط اور مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے خطوں کو جمع کر دیا ہے۔ ان خطوں سے مرتب نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔ حواشی کے عنوان سے جو نوٹ لکھے ہیں وہ بہت مفید مطلب اور مرتب کی محنت اور عرق ریزی کے آئینہ دار ہیں۔

۱۵۵۔ عرش ملسیانی: علی گڈھ میگزین اکبر نمبر (آجکل ۱۵ اگست ۵۹۔ ۶۰ء)
یہ نمبر اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس شمارہ میں زیادہ تر مضمون انھیں لوگوں نے لکھے ہیں جو اکبر سے مراسم رکھتے تھے۔ مقالہ نگاروں میں عبدالماجد دریابادی، عبدالقادر سروری، اثر، احتشام اور آل احمد سرور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آج تک اکبر کی شاعری، سیرت اور ادبی حیثیت پر ایسا سیر حاصل مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

۱۵۶۔ عرش ملسیانی: مقتل الحسین (آجکل ۱۵ اگست ۵۹ء)
اس کے مصنف سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری مجتہد العصر ہیں۔ اس میں واقعہ کربلا کے ایک قدیم ترین ماخذ مقتل ابی مخنف بن سمعان کا ترجمہ ہے۔ اس کا عربی متن اور اس پر تفصیلی مقدمات تاریخی معلومات سے پُر ہیں۔

۱۵۷۔ قاضی عبدالودود، بزم عام (معاصر نمبر ۱ ۱۹۵۱ء ۱۸۱ — ۱۹۰)
اس میں مندرجہ ذیل مضامین کے بعض مندرجات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

(۱) اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۴۸ء و فروری ۱۹۴۹ء مصحفی از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
(۲) اردو ادب علی گڈھ جولائی ۱۹۵۰ء۔ اندر سبھا از محمود حسن، سودا کا ایک قصیدہ از امتیاز علی عرشی، راماین اور مولوی لطف از محمد مصطفیٰ خاں، غالب کا تفکر اور اس کا پس منظر از سید احتشام حسین، تحقیقی نوادر از نور الحسن ہاشمی۔
(۳) اردو ادب اکتوبر ۱۹۵۰ء۔ میر کا تاریخی ماحول، میرزا شوق لکھنوی، مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی تحقیق، مصحفی اور انشا

۱۵۸۔ قاضی عبدالودود، چھان بین۔ از۔ اثر لکھنوی۔ (معاصر نمبر ۱ ۱۹۵۱ء ۱۶۹)
چھان بین کے سرورق پر تنقیدی مضامین لکھا گیا ہے لیکن اس میں تحقیقی اور تشریحی مضامین بھی ہیں، تبصرہ میں اثر صاحب کے متعدد بیانات سے اختلاف کیا گیا ہے اور تاریخی، علمی ادبی اور لسانی امور کے بارے میں مفید معلومات کو فراہم کیا گیا ہے۔

۱۵۹۔ قاضی عبدالودود، دیوان فائز۔ مرتبہ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب (معاصر نمبر ۱ ۱۹۵۱ء ۱۷۸ — ۱۸۱)
جناب مرتب کے خیال میں شمالی ہند کے شاعروں میں جن کا کلام دستیاب ہوا ہے شاید کوئی بھی اتنا قدیم نہیں جتنا نواب صدرالدین محمد خان بہادر فائز دہلوی۔ جب تک کلیات فائز کا وہ نسخہ جو ۱۱۲۶ء میں مرتب ہوا تھا یا کوئی نسخہ جس کا وہ منقول عنہ رہا ہو نہیں ملتا فائز کا تقدم تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔
فاضل مرتب نے فائز کے کلام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے،

ترتیب کا معیار بلند معیار قابلِ تقلید ہے لیکن یہ امر افسوس ناک ہے کہ اس میں فاحش اغلاطِ طباعت ہیں۔

۱۶۰۔ محمد عبد الرحمٰن خاں، داستانِ ادب حیدرآباد۔ از ڈاکٹر محی الدین قادری زور (سب رس ستمبر ۵۹ء ص ۲)

ڈاکٹر زور نے کوئی دو سو صفحات پر حیدرآباد کی قدیم و جدید علمی تاریخ لکھ کر اصحابِ علم کی یاد کو دستبردِ زمانہ سے بچانے کی کوشش کی ہے۔

۱۶۱۔ ناصرہ فضل اللہ، مشامِ روح اور ہفت پیکر پر ایک نظر (سب رس ستمبر ۵۹ء ص ۷ — ۸)

(۱) مشامِ روح :- تاباں القادری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ تصوف آمیز اشعار پر توارد اور سرقہ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ تمام کلام ایسے نمونوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ جا بجا زبان و بیان کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔

(۲) ہفت پیکر :- عرش ملسیانی کا مجموعۂ کلام ہے جس میں ہم کو سات رنگ نظر آتے ہیں جس میں غزل کا رنگ نسبتاً بہتر ہے۔ عرش کے کلام کو دیکھ کر اردو ہندی کا جھگڑا بیکار نظر آتا ہے۔

۱۶۲۔ نصیر الدین ہاشمی، "اسلام کے معاشی نظریے" پر ایک نظر (سب رس جولائی ۵۹ء ص ۹ — ۱۴)

ڈاکٹر محمد یوسف الدین کے حالاتِ زندگی اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی کتاب "اسلام کے معاشی نظریے" سے بحث کی گئی ہے۔ "ہم اردو ادب ڈاکٹر صاحب کے جس قدر شکر گزار ہوں، کم ہے اور پھر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور مسلم حکومتوں کے لئے یہ کتاب جس قدر مفید اور سود مند ہو سکتی ہے وہ پوشیدہ نہیں۔"

۱۶۳۔ نصیر الدین ہاشمی، "اعک و آہ" مصنفہ جگدیش بھٹناگر حیات (سب رس اگست ۵۹ء ص ۲۲)

یہ جناب جگدیش بھٹناگر حیات کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں جناب تنویر لکھنوی کا تعارف نامہ ہے۔ حیات کی شاعری زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے لیکن ان کا رنگ عام شاعروں سے جداگانہ ہے۔ ان کے یہاں لطیف بے تکلفی اور چلبلا شوخ موجود ہے۔ کلام زیادہ تر المیہ ہے۔

۱۶۴۔ نصیر الدین ہاشمی، تحقیق و تنقید، مرتبہ اختر اور رینوی (سب رس اگست ۵۹ء ص ۲۷ — ۲۸)

تحقیق و تنقید کے نام سے اختر اور رینوی صاحب نے ایک کتاب مرتب کی ہے جس کو شاد بک ڈپو پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے مضامین ہر آئینہ قابلِ ستائش ہیں۔ تلاش و تحقیق کے بعد مضامین مرتب کئے گئے ہیں لیکن ساتھ ساتھ دو باتیں نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ اول ماخذوں کا حوالہ فرو گزاشت کر دیا گیا ہے دوسرے جن رسالوں میں یہ مضامین چھپے تھے ان کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

۱۶۵۔ نصیر الدین ہاشمی، تنقیدِ جدید۔ از۔ اختر اور رینوی (سب رس اگست ۵۹ء ص ۳۹)

اختر اور رینوی صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ سب مضامین کافی محنت سے لکھے گئے ہیں اور معلومات آفریں ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جن پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب قابلِ قدر اور لائقِ داد ہے۔

۱۶۶۔ نصیر الدین ہاشمی، سیاسی ادارات، از، محمد رحمت علی بی، اے (سب رس اگست ۵۹ء ص ۳۹)

اس کتاب میں یونان۔ روما۔ اور وسطی زمانے کے تمام سیاسی ادارات وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ مؤلف کی محنت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے ایک ضروری مضمون پر قلم اٹھا کر دادِ تحقیق دی ہے۔

۱۶۷۔ نصیر الدین ہاشمی، نئی بیاری۔ از۔ جہندر ناتھ (سب رس اگست ۵۹ء ص ۲۸ — ۲۹)

مکتبہ جامعہ دہلی نے جہندر ناتھ صاحب کے افسانے "نئی بیاری" کو بارِ ثانی طبع کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں ۹ افسانے شامل ہیں۔ جہندر ناتھ صاحب ترقی پسند مصنف ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "نئی بیاری" کا دوسری بار شائع

ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ بہت مقبول عام ہو چکے ہیں۔

۱۶۸۔ نصیر الدین ہاشمی، "نور معرفت"، مرتبہ، ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (سب رس اگست ۱۹۵۱ء ص ۴۰)

یہ رسالہ ولی دکھنی کی تصنیف ہے جسے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں گجرات کے مدرسہ "ہدایت بخش" اور اس کے بانی شیخ نور الدین اور ان کے صاحبزادہ محمد صالح کی مدح کی گئی ہے۔ مدنی صاحب کی یہ کوشش ہر آئینہ قابل قدر ہے۔ انھوں نے ولی کے متعلق ایک اہم کتاب شائع کر کے بہت سی فرضی روایات کو غلط ثابت کرنے کا سامان مہیا کر دیا ہے۔

۱۶۹۔ نصیر الدین ہاشمی، "ہندوستان کا جدید دستور"، مولفہ سید عبدالباری ایم اے (عثمانیہ) (سب رس اگست ۱۹۵۱ء ص ۴۰ و ۴۱)

سید عبدالباری نے ہندوستان کے دستور سے متعلق ایک مفید کتاب شائع کی ہے جو موجودہ حالات کے لحاظ سے تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے نہایت ضروری تھی۔

۱۷۰۔ نصیر الدین ہاشمی، "حکیم اسلم اور اس کا ادب" (سب رس اگست ۱۹۵۱ء ص ۳۵ - ۳۶)

ادارۂ دار ابلاغ لاہور نے یہ کتاب شائع کی ہے۔ اس میں چودہ اصحاب کے مضامین ایم۔ اسلم کے متعلق ہیں۔ اکثر تنقید نگاروں نے صحیح تنقید کا حق ادا کیا ہے اور اسلم کی ادبی خدمات کا جائزہ انصاف کے ساتھ لیا ہے۔

وفیات

۱۷۱۔ جوش ملیح آبادی: وا حسرتا (آجکل دہلی ۱۵ جولائی ۱۹۵۱ء)

مولانا حسرت موہانی کی وفات پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مومن کے پکے، بات کے دھنی، وضع کے پابند، قناعت کے مرکز اور اصول پرستی کے پیامبر تھے۔ ان کی شاعری میں ان کا حال کچھ اس طرح سمویا ہوا تھا کہ قدامت پرست اور جدت پسند دونوں ان کے مداح تھے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلے "مکمل آزادی" کی آواز حسرت ہی نے بلند کی۔ جیل کی چکی کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی۔ [illegible]

ایک سرفروش مجاہد اور حقیقی معنی میں ایک انسان بھی تھے۔

۱۷۲۔ رحیم علی الہاشمی، حسرت موہانی چل بسے (آجکل دہلی ۱۵ ستمبر ۱۲ - ۱۸)

ہم میں سے جو بھی مرا اپنی مخصوص انسانی خصوصیات رکھتا تھا۔ گویا ان کی موت انسانیت کی ایک قسم کی موت تھی۔ حسرت موہانی انھیں مرنے والوں میں ہیں۔ وہ پکے مسلمان بھی تھے اور حال و قال کے صوفی بھی، سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور تجارت بھی کرتے تھے۔ جیل کی قید و بند بھی جھیلی اور ساتھ ہی شاعری بھی کی۔ کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے۔ اور شرع کے پابند بھی تھے۔ اب یہ ساری باتیں ایک ہی شخص میں پیدا ہونا مشکل ہیں۔ مضمون نگار سے پہلی ملاقات ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ اپنے ایک قطعہ میں مولانا حسرت نے ان کی نوعمری کے باوجود کیا تھا۔ اختلافات کا احترام کرتے تھے۔ مرحوم نے غالب پر خلاصۂ دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان کے مشورہ پر کانپور سے بڑی کوششوں کے بعد ایک روزنامہ استقلال نکالا گیا مگر دو سال کے اندر بند ہو گیا۔ حسرت غزل کے رسیا اور اردو کے لئے ہر قربانی کرنے پر تیار رہتے تھے۔

۱۷۳۔ محمد ابراہیم ڈار، باقر علی ترمذی (اردو جولائی تا ستمبر ۱۹۵۱ء ۱۲۹ - ۱۳۸)

اسمٰعیل یوسف کالج کے استاد عربی ڈاکٹر باقر علی ترمذی نے ۸ جون ۱۹۵۱ء کو قاہرہ کے قصر العینی ہسپتال میں انتقال کیا، اس مضمون میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مختصر بیان ہے۔

۱۷۴۔ محمد ابراہیم ڈار، ڈاکٹر باقر علی ترمذی (نوائے ادب اکتوبر ۱۹۵۱ء ۱۰۳ - ۱۱۲)

مقالہ نگار کے محرک مرحوم ڈاکٹر باقر علی ترمذی کی ذاتی خوبیوں اور علمی کارناموں کا مختصر تذکرہ ہے۔

صحافت

۱۷۵۔ بدر الدین علوی، سو سال پہلے کے اخبارات میں میرے اساتذہ کا ذکر (معارف ستمبر ۱۹۵۱ء ۲۱۳ - ۲۱۹)

[illegible]

آگرہ مورخہ ۶ مارچ ۱۸۵۱ء اور ۸ا رجنوری ۱۸۵۲ء سے اقتباسات لے کر شائع کئے گئے ہیں۔

۱۷۶۔ میرزا صادق، مضمون "دہلی اردو اخبار" (معارف جولائی ۱۹۷۵ء ۶۹ــ۷۳)

ان مضامین میں سے جو اُردو کے پُرانے اخبارات و رسائل سے متعلق شائع ہوئے ہیں مسٹر کے سجن لال کا مضمون بابت دہلی اردو اخبار مندرجہ رسالہ اسلامک کلچر نہایت دلچسپ اور مفید معلومات سے پُر ہے لیکن افسوس ہے کہ اس میں ٹائپ کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں جن کو یہاں درست کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

متفرقات

۱۷۷۔ کیاڑی مسعود الدین حسن۔ ڈاکٹر: دوا سازی اور شراب (چراغ راہ ۱۹۵۱، اگست ۳۳ــ۳۴)

موجودہ ادویہ کا بیشتر حصہ شراب کی کم یا زیادہ آمیزش پر مشتمل ہے۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو شراب کے استعمال سے بڑی حد تک بچ سکتے ہیں۔ مضمون میں وہ تجربے پیش کئے گئے ہیں جو انگلستان میں اس سلسلہ میں کئے گئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ قرابادینی دواؤں کے لئے فی الحقیقت شراب ضروری نہیں۔

۱۷۸۔ ماتھر گرجا پرشاد: کوہ نور ہیرا (آجکل دہلی اوجولائی ۱۹۵۲ء)

دنیا کے پانچ معروف ہیروں میں ایک کوہ نور ہندوستان کے ہیں۔ کوہ نور گولکنڈہ سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کی پچھلی تاریخ پردۂ اخفا میں ہے۔ معلوم طریقہ پر مہا بھارت کے زمانے میں راجہ کرن کے پاس تھا پھر صدیوں لاپتہ ہونے کے بعد اڑیسہ میں جگن ناتھ جی کی مورتی میں نظر آیا۔ ۱۳۰۴ء میں مالوہ سے علاء الدین خلجی کے ہاتھ لگا۔ دوبارہ مالوہ کے بکرماجیت کے پاس سے ہمایوں، بابر اور پھر ہمایوں کے پاس آیا۔ مغلیہ سلطنت سے نکل کر نادر شاہ کے ہمراہ خراسان (۱۷۳۹ء) اور ۱۸۱۳ء میں شاہ شجاع کے ساتھ ہندوستان آیا اور ایک قلیل مدت کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ لگا۔ دلیپ سنگھ کے پاس سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ۱۸۴۹ء میں آیا جس نے ۱۸۵۰ء میں اسے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آج کل یہ انگریزی تاج کی رونق ہے۔

اس کی تاریخ اور اس سے وابستہ واقعات وغیرہ کی ایک انگریزی کمپنی نے فلم بنائی ہے۔

پرنٹر و پبلشر محمد فضل اللہ فاروقی ندوی نے انصار فائن آرٹ لیتھو پریس سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے چھپوا کر دفتر نوائے ادب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ مہاتما رنی روڈ بمبئی ا سے شائع کیا

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی
کے سلسلۂ مطبوعات کی پہلی کڑی
ولی گجراتی
از ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
اس کتاب میں امام غزل شاعر ولی کے سوانح حیات، وطنیت، اس کی علمی قابلیت اور بحیثیت
مصلح زبان ولی کی خدمات اور اجتہاد پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ کاغذ عمدہ۔ کتابت و
طباعت دیدہ زیب۔
قیمت :- دو روپیہ چار آنے (ہندوستانی و پاکستانی سکہ) (علاوہ محصول ڈاک)
ملنے کا پتہ ــــــ اور ــــــ ترسیل زر
نمائندہ خصوصی
PRINTERS
PUBLISHERS
WRITERS EMPORIUM LTD.
PEOPLES' BUILDING
BOMBAY

VOL. 3] APRIL — JUNE [NO. 2.

THE

NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY JOURNAL

OF

The Anjuman-e-Islam Urdu Research Institute

PUBLISHED EVERY

JANUARY & APRIL
JULY & OCTOBER

Publishing Agents:

THE WRITERS' EMPORIUM LTD.

POST BOX 1411 — BOMBAY 1.

Annual Subscription
Inland & Pakistan:
Rs. 3/-

Price each Copy
Re. 1/-

نوائے ادب

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

چندہ سالانہ
تین روپیہ
ششماہی
دو روپیہ

قیمت
فی پرچہ
ایک روپیہ

نوائے ادب

جلد (۳) — جولائی ۱۹۵۲ء — نمبر (۳)

فہرست مضامین

شذرات

اُردو ادب کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ اس کا دامن نہ صرف فکر زا تعمیری تصانیف سے بڑی حد تک خالی ہے، بلکہ زبان کی وسعت اور نئے الفاظ و اصلاحات کی بھی کمی ہے، دور کیوں جائیے تاریخ، اقتصادیات، سیاسیات وغیرہ ہی کو لیجئے کہ ان موضوع پر ایک بھی مستند کتاب ہمارے یہاں نہیں ہے، اور اگر جامعہ عثمانیہ نے اُردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا ہوتا اور دارالترجمہ نے اس سلسلہ میں انگریزی، فارسی اور عربی تصانیف کے تراجم کا انتظام نہ کیا ہوتا تو اس کا دامن اور بھی تہی ہوتا اسی طرح ملک کی مختلف زبانوں میں جو ادب پیدا ہو رہا ہے اس سے بھی ہم الگ رہے ہیں، چنانچہ خود ملک کی مختلف زبانوں کی تصانیف کے ترجموں سے بھی ہمارا خزانہ محروم ہے، اس کے ساتھ ہی ہم نے اُردو کو دہلی اور لکھنؤ کے خاص طبقہ کی زبان تک محدود کر کے اس کی وسعت کا بھی خاتمہ کر دیا ہے اب اس کے مقابلہ میں ہندی کو دیکھئے اس نے ایک طرف تو ملک کی ساری آریائی زبانوں کو اپنا کر ہندی بنایا اور پھر مغربی ہندی، مشرقی ہندی، اور ان کی شاخوں کو اپنے دامن تربیت میں لے کر ان کو بھی اپنے ادب کا حصہ بنالیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ ستر سال سے تو یہ کوشش ہو رہی ہے کہ اُردو ادب اور اس کی اچھی تصانیف کو بھی ہندیا لیا جائے چنانچہ اردو کی کہانیاں، اُردو کے ناول اور اُردو شعراء کا کلام ہندی میں نہیں شائع ہو رہا ہے۔ بلکہ اب باقاعدہ طور پر اردو ادب و تاریخ اور اس کے شعراء کے تذکرے اور حالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے چنانچہ کتابوں کے علاوہ جو آج سے ۱۰، ۱۲ سال پہلے چھپ چکی ہیں گذشتہ چند برسوں میں اس سلسلہ میں ہندی کی بعض اہم تصانیف ہندی خواں طبقہ تک پہنچ چکی ہیں۔ ان میں سب سے اہم تصنیف شری اجودھیا پرشاد گوئلیہ کی "شعر و شاعری" کا سلسلہ ہے۔ اس کتاب کی ابھی پہلی جلد شائع ہوئی ہے جو تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ابتدا سے لے کر ۱۹۰۰ء تک کے شعراء کے حالات ان کے کلام کا انتخاب اور ان پر تنقید ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری جلدوں کے موضوع یہ ہیں۔

(۲) شعر و سخن جلد ۲ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک
(۳) 〃 〃 〃 ۳ نظموں اور گیتوں کا انتخاب و تعارف
(۴) 〃 〃 〃 ۴ اُردو شاعری کے باوا آدم
(۵) 〃 〃 〃 ۵ اُردو کی شاعرائیں
(۶) 〃 〃 〃 ۶ استادوں کی اصلاحیں

اس سلسلہ سے پہلے لائق مصنف ایک اور ضخیم کتاب شعر و شاعری کے نام سے لکھ چکے ہیں۔ اس کتاب میں شاعری کے اصناف، اس کے موضوع اور ان موضوعوں کے نمونوں کے ساتھ ۱۳۱ ایسے شاعروں کے جو بڑی حد تک اپنے عہد کے سب سے اچھے نمائندہ ہیں، حالات اور ان کے کلام کے انتخابات ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی شری نرائن پرشاد جین کی تازہ تصنیف اردو شاعری ہے، اس کے ساتھ ہی آپ اُردو کے افسانہ نگار و ادیب شری اپندر ناتھ اشک کی تصنیف اردو کاویہ کی ایک نئی دھارا کو بھی ملا لیجئے یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا اس کے ساتھ، شری ہری شنکر شرما کی اردو ادب، ساہتیہ پری چے شری جوشی کی کتاب اُردو کے ادیب وغیرہ بھی اس کی مختلف کڑیاں ہیں۔ حال ہی میں ادبی مورخ مسٹر سکسینہ نے دکھنی ہندی پر ایک کتاب لکھی ہے۔

اس کے علاوہ حال میں شری جوالا پرشاد نے حالی اور ان کی کاویہ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور فراق کا کلام اندر دھنش کے نام سے شائع ہوا ہے۔

چکبست، اکبر، نظیر اکبرآبادی، اقبال وغیرہ کا کلام مکمل یا انتخاب کی صورت میں بھی ہندی میں آچکا ہے،

اب اس کے مقابلہ میں آپ اُردو میں ہندی سے متعلق تصانیف کی کھوج لگائیے؟ ہماری مساعی صفر کے برابر ہیں زبان و ادب کو اگر زندہ رہنا ہے تو اسے ہمیشہ اپنے دروازوں ہی کو کھلا نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ باہر سے ہر قسم کے لسانی و ادبی جواہر پاروں کو لاکر جمع بھی کرنا چاہیئے۔

رسالہ خاور (ڈھاکہ) کا ذکر نوائے ادب کے ایک گذشتہ شمارے میں آچکا ہے، یہ رسالہ حضرت عندلیب کی زیر ادارت و ہدایت ہر مہینہ بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے اس رسالہ کے پہلے ہی نمبر میں شادانی صاحب نے اُردو کی تحریر سے متعلق دعوت فکر دی ہے، مختلف لوگوں نے اس پر مختلف زاویہ نظر سے بحث کی ہے، یہ سوال آج نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ برسوں سے لوگ اس کی حمایت و مخالفت میں بہت کچھ لکھ رہے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ یہ خیال اصلاح و ترمیم پیدا ہی کیوں ہوا۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہ ایک فراری ذہنیت کا نتیجہ ہے اور صرف ان لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے جو ہندی یا انگریزی حروف کی افادیت کے پروپیگنڈہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ ورنہ ہمارے یہاں ایک ہی قسم کے باریک تنوع کے ساتھ ہم آواز الفاظ کی کثرت تو اردو کے حروف تہجی کے مکمل ہونے کا بیّن ثبوت ہے، کہ ہم موجودہ حروف کی موجودگی نہ صرف ملکی الفاظ بلکہ عربی فارسی، ترکی، انگریزی وغیرہ الفاظ کے

تلفظ صحیح طور سے ادا کر سکتے ہیں، بلکہ ان حروف میں لکھی جانے والی زبانوں کے املا کو بھی علی حالہ باقی رکھ سکتے ہیں، اس کے علاوہ اگر ہم اصلاح کو مان لیں تو اس کا صرف ایک نتیجہ ہوگا اور وہ یہ کہ صرف عربی کے الفاظ پہلے مسخ اور پھر معدوم ہو جائیں گے۔

ہم انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں اس پر مفصل اظہار خیال کریں گے۔

تقسیم ملک کے بعد تعلیمی سلسلہ میں سب سے بڑی مصیبت کالجوں کے لئے اردو فارسی عربی میں مستند معیاری درسی کتابوں کی ضرورت ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے تو ابتداء ہی سے پہلے سال سے لے کر بی۔اے کے آخر سال تک کے لئے اپنے انتخابات شائع کر لئے تھے اور اب تک وہی کام آرہے ہیں لیکن کثرت ایسی یونیورسٹیوں کی ہے جو ہر سال اپنے نصاب کے لئے مختلف کتابیں منتخب کرتی تھیں، پھر اس کے ساتھ یہ انتخاب نصاب کا مسئلہ ___ اس نصاب کی تعلیم کی ابتداء سے تقریباً ۲ سال پہلے طے ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب کتابوں کے پڑھانے کا زمانہ آتا ہے تو کتابیں نہیں ملتیں۔ یونیورسٹی کو اطلاع دی جاتی ہے۔ عرصہ کے بعد کوئی دوسری کتاب تجویز ہوتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ دوسری کتاب بھی ناپید ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اس مشکل کو حل کرنے کی طرف دہلی یونیورسٹی نے پہلا قدم اٹھایا ہے اور ملک کی دوسری یونیورسٹیوں سے ان کی رائے پوچھی ہے، ہم دہلی یونیورسٹی کے اس اقدام کا خیر مقدم ہی نہیں کرتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اگر ملک کی مختلف یونیورسٹیاں مل کر ایک ایک انتخاب ہر امتحان کے لئے متفقہ طور سے مرتب کر لیں تو نہ صرف یہ کہ کتابوں کے نہ ملنے کی مصیبت دور ہو جائے گی بلکہ تمام یونیورسٹیوں کا تعلیمی معیار بھی بڑی حد تک ایک ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں یہ کہنا شاید بے موقع نہ ہوگا کہ فارسی اور عربی زبانوں کے ممالک کے ہمارے ساتھ جو تعلقات ہیں ان کی روشنی میں اگر ہم موجودہ عربی و فارسی کے نظم و نثر کے ٹکڑے ان انتخابات میں شریک کریں تو ہمارے طلباء کے لئے ___ ان کی زندگی میں مفید و منفعت بخش ثابت ہوں گے۔

گجرات کی مذہبی مثنویاں

(جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین صاحب مدنی، ایم، اے پی، ایچ ڈی)

گزشتہ صحبتوں میں گجرات کی مذہبی مثنویوں کو روشناس کرایا گیا ہے اسی سلسلہ کی یہ آخری کڑی ہے۔ اس صحبت میں ہم تیرھویں صدی ہجری کی چند مثنویاں پیش کرتے ہیں اور آئندہ گجرات کی رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔

حامد:۔ حامد گجرات کا ایک مثنوی نگار شاعر ہے۔ اب تک اس کی چار تصنیفیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ۱۔ قصۂ نازنیں پٹھان۔ ۲۔ قصۂ برالالم۔ ۳۔ قصۂ مسافر۔ ۴۔ معجزۂ رسول مقبول۔ حامد مقام انجار واقع کچھ کا رہنے والا تھا۔ نازنیں پٹھان کے اختتام پر لکھتا ہے

بنایا ہوں قصہ بڑے شوق سے　　　لطافت نزاکت کے پُر ذوق سے
لکھا او سکوں میں نے سو انجار میں　　　مہینے مبارک سو رمضان میں

آخری شعر ہے:۔

وہ حامد کی سنو کچھ میں زاد و بوم　　　اسی کی تھی انجار میں بسکہ دھوم

شاعر کا زمانۂ حیات اس کی تصنیفات سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں سے یہ ظاہر ہے کہ اس نے تیرھویں صدی کے آغاز میں یہ مثنویاں لکھی ہیں۔ اس کی مثنوی قصۂ مسافر ۱۲۰۵ھ کی تصنیف ہے اور برالالم میں لکھی گئی ہے۔ نازنیں پٹھان میں کسی جگہ سنہ تصنیف نہیں پایا جاتا مگر ان دو مثنویوں کے زمانۂ تصنیف کو دیکھتے ہوئے گمان غالب ہے کہ نازنیں پٹھان بھی اسی کے قریبی زمانہ یعنی ۱۲۰۷ھ سے ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ لکھی گئی ہے اور اس طرح یہی زمانہ شاعر کی ادبی زندگی کا متعین کیا جاسکتا ہے۔

قصۂ نازنیں پٹھان کے متعلق گذشتہ صحبت میں مفصل بیان کیا جاچکا ہے۔ یہ قصہ مذہبی تبلیغ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نوع کی دوسری مثنویاں بھی دستیاب ہوئی ہیں ان کے متعلق آگے چل کر عرض کیا جائے گا نازنیں پٹھان کا قصہ سورت کے ایک نواب تیغ بیگ خاں ۱۱۲۵ھ تا ۱۱۴۹ھ کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ مثنوی میں تیغ بیگ خاں کا حوالہ اس طرح آتا ہے جب نازنیں سے خاں صاحب اظہار عشق کرتے ہیں تو نازنیں گجراتی زبان میں جواب دیتی ہے:۔

کہوں چھوں تو جانہ ایہاں تھی پٹھان　　　سمجھ کیم میلی تھیو چھے اجان

(کہوں چھوں = کہتی ہوں۔ ایہاں تھی = یہاں سے۔ کیم = کیوں۔ میلی = چھوڑ کر۔ تھیو چھے = ہوا ہے)

جو تیغ بیگ خاں چھے شہر نو نواب ستادیشے تو نے لے کرشے خراب

(دیشے - دیگا - کرشے - کریگا -)

اگر چہ قصہ من گڑھت ہی سہی لیکن یہ ظاہر ہے کہ قصہ کا بنانے والا تیغ بیگ خاں کے دور میں گذرا ہے۔
حامد اس قصہ کا اصل مصنف نہیں ہے۔ حامد اس امر کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

قصہ ناگری کا سُنا تھا اصل کیا اوس کے اوپر سے میں نے نقل

مذکورۂ بالا شعر سے یہ مطلب ظاہر ہوتا ہے کہ قصہ ناگری کا یعنی ہندی زبان میں لکھا ہوا قصہ پہلے سے موجود تھا جسے شاعر نے اُردو میں ڈھالا لیکن ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ اس شعر میں لفظ ناگری سے زبان ہندی مراد نہیں ہے بلکہ ناگر سے مونث ناگری یعنی اس ناگر عورت کا قصہ شاعر کا مطلب ہے۔ اس مثنوی کا نمونہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے اس لئے اس کا اعادہ یہاں مناسب نہیں۔

حامد کی دوسری مثنوی قصۂ بڑا الم ہے۔ یہ بھی تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی شجاعت کا بیان ہے۔ سات اشعار حمد و نعت اور مدح خلفائے راشدین میں لکھنے کے بعد اصل قصہ جعفر تیار کی روایت سے شروع کیا گیا ہے کہ رسولؐ مقبول ایک دفعہ ایک جنگ سے لوٹتے ہوئے ایک جنگل میں منزل فرماتے ہیں اور حضرت علیؓ کو پانی تلاش کرنے کے لئے حکم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ پانی کی تلاش میں ایک ایسے مقام پہنچتے ہیں جہاں ایک بوڑھا برہمن بُت کی پوجا کر رہا تھا۔ برہمن کو علیؓ نے دعوت اسلام پیش کی۔ برہمن کی عورت نے اس شرط پر اسلام قبول کرنا منظور کیا کہ اس مقام پر ایک کنواں ہے اگر علیؓ اس کنویں سے ایک ڈول پانی لے آئیں تو یہ لوگ اپنے بُت توڑ دیں اور اسلام قبول کرلیں۔ علیؓ شرط منظور کرنے کے بعد کنویں سے پانی کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن علیؓ کو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کنواں جنوں کا مسکن ہے۔ علیؓ اس کنویں میں اُترتے ہیں۔ اس جگہ جنوں سے لڑائی ٹھنتی ہے۔ بڑے بڑے سورما جن مارے جاتے ہیں اور آخر کار باقی ماندہ ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور مشرف بہ اسلام ہو جاتے ہیں۔

شاعر مثنوی کے آغاز میں سبب تالیف اور ماخذ کے متعلق لکھتا ہے

کروں اس آگے سو میں یک ذکر سنو اس حکایت کوں تم کان دھر

آئے ایک سادات سنگر دل تھی انوں نے حکایت سوں مجکوں کہی

حضرت شہ جہانیاں کی اولاد سیں نیارے تھے تشریف اجار سیں

اسم شاہ ان کا ہے طاہر میاں انوں نے میرے پاس کیتا بیاں

کیا ہے ایک داستاں مجہ سکنے ہے بڑا الم کا قصہ اس منے

ولیکن ہے گا زری در نظم وہ پڑنے کوں آیا ہے ہرکوں کم

- - - - - - - - - - - -　　　- - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - -　　　- - - - - - - - - - - -

نہیں فارسی پر کسی کوں دیہان　　　عجب خوب ہوئے سو ہندی زبان

قصہ کو لکھنے کے بارے میں فیصلہ کرنیکے بعد شاعر خدا سے دعا مانگتا ہے کہ

جو ہر دے زباں کوں میری توں اثال　　　ہووے گوجری میں یہ قصہ کمال۔ وغیرہ

اوپر کے اقتباس کے دوسرے شعر کے، آخری مصرعہ میں (میں) کے بجائے (مں) ہونا چاہئے کیونکہ پہلے شعر میں شاعر کے بیان سے واضح ہے کہ سید طاہر میاں مانگرول سے تشریف لائے تھے لہذا یہ سہو کاتب ہے۔ مانگرول کاٹھیاوار کی ایک مسلم ریاست ہے۔ ریاست کے اکثر و بیشتر رئیسوں نے اُردو نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے ایک رئیس شیخ حسین میاں بڑے ادب پرور اور قدردان فنون گذرے ہیں۔ موسیقی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ انھیں شعر و سخن سے بھی بہت شغف تھا۔ ان کے زمانہ میں داغ جلال وغیرہ مانگرول کے مشاعروں اور ادبی صحبتوں میں شریک ہوئے ہیں۔

مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۲۰۸ھ ہے۔

صدی تیرہیں کے ہشتم سال میں　　　مہینہ مبارک سو رمضان میں

تاریخ سولیں کو یہ آیا خیال　　　اتھا مشتری روز وقت زوال

شاعر مثنوی کے اختتام پر ایک شعر لکھتا ہے

ہے حامد اوں کا توں کمتر غلام　　　کیا جنگ نامہ کوں جس نے تمام

مذکورہ بالا شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر اپنے استاد کی طرف اشارہ کرتا ہے یا اپنے کسی خلیفہ یا پیر و مرشد سے عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔

یہ بھی کہنا دشوار ہے کہ مصنف جنگ نامہ کون ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ شاعر اپنے استاد کی طرف اشارہ کرتا ہے تو پہلے ہمیں جنگ ناموں کے مصنفین پر ایک نظر ڈالنا چاہئے۔ قصہ زیتون و محمد حنیف جنگ نامہ کہلاتا ہے۔ حامد کا کسی صاحب قصۂ زیتون و محمد حنیف سے عقیدت رکھنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس قصہ کی مثنویاں گیارھویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی ہیں، گجرات کے ایک شاعر مسکین نے اس قسم کا جنگ نامہ ۱۰۹۰ھ کے لگ بھگ لکھا ہے دکن کے شاعر سیوک نے اس قصہ کو ۱۰۹۲ھ میں منظوم کیا ہے۔ دکن کے غلام علی لطیف نے بھی ایسا جنگ نامہ ۱۰۹۵ھ میں لکھا ہے۔ دکن کے ایک اور شاعر محمود نے ظفرنامہ کے نام سے ۱۳۰۷ھ میں اس قصہ کو نظم کیا ہے۔ قصۂ بنرالالم کو بھی عام طور پر جنگ نامہ ہی کہا گیا ہے۔ ایک شاعر عظیم الدین نے قصۂ بنرالالم کو ۱۱۰۰ھ میں نظم کیا ہے۔

شاعر عظیم الدین کی طرف بھی حامد کا اشارہ نہیں ہو سکتا کیونکہ عظیم الدین نے ۱۲۱۴ھ میں یہ جنگ نامہ تصنیف کیا ہے اور حامد ۱۲۰۵ھ میں مثنوی لکھتا ہے۔ حامد کے زمانہ کا ولی تخلص کا ایک شاعر (ولی گجراتی نہیں) پایا جاتا ہے جس نے تقریباً گیارہ سو اشعار میں واقعہ کربلا کو ۱۲۱۲ھ میں نظم کیا ہے اور اس مثنوی کا نام بھی جنگ نامہ ہے نیز صاحب جنگ نامہ ولی مثنوی کے لب و لہجہ سے گجراتی معلوم ہوتا ہے اگرچہ حامد اور ولی کی ادبی زندگی میں ۲۵ سال کا فرق ہے تاہم دونوں ہمعصر ہونے چاہئیں اور ولی کا مشاق ہونا پر گو نیز ایک گجراتی شاعر ہونا ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ حامد کو شاید اسی سے شرف تلمذ حاصل ہو۔

حامد نے رسول مقبول کا معجزۂ شق القمر بھی تیس اشعار میں نظم کیا ہے اس کا سنہ تصنیف نہیں دیا ہے۔

نمونۂ کلام

از ثمر الالم۔

اتھا چاہ کے درمیاں ایک شہر　　　کھڑے شاہ مرداں اوسکے اوپر
ہوئے شاہ اسجاگ اوپر نظار　　　جناں اور دیواں ہیں گے بیشمار
نظار اکیا شاہ نیں اس مکاں　　　اندر چاہ کے شہر آباد واں
بڑا ایک دیکھا سو بستان ہے　　　اندر اس کے جنونکا میدان ہے
وھاں سارے جنات ہیں گے کھڑے　　　دیکھت (دیکھی) (جنوں) شاہ حیدر کوں سب تھرتھرے
بیٹھا بادشاہ تخت پر رعد نام　　　گرد اس کے لشکر سو ہیگا تمام
دیکھا جن ہے رعد مثل بہار　　　کہوں سر کی اوس کے صفت کیا بچار
قلعہ پر جیسا برج ہیگا دھرا　　　بلک (بلکہ) اوس برج تھی بھی سر تھا برا
سرافیل کے صور جیسا گلا　　　دیکھی آدمی سیں نجاوے بلا
انکھیاں دو اوس کی ہے گویا تلاب　　　بینی دیکھ اوس کی سو ہے بیحساب
جیسا غار ہیگا جبل میں بڑا (تالاب)　　　چلا جاوے اوس میں سو اشتر کھڑا
سیہ رنگ تھا رعد جن بد شکل　　　دیکھیں دور سیں ہیگا جیسا جبل
دونوں بازوا اوپر ہاتھے اسکوں پر　　　کدا (کدھر) نہ آدے کسی کوں نظر
جیسے کیس دھاری ہے اسپاں پر　　　ویسے بالا اوس کے اُتھے جان پر

وغیرہ

حامد کی ایک مثنوی قصۂ مسافر ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۰ھ ہے یہ ۱۱۳ ابیات پر مشتمل ہے۔ قصہ حکیم سنائی صاحب حدیقہ سے لیا گیا ہے۔ مثنوی کا خلاصہ یہ ہے کہ شہر غزنی میں ایک مسافر ایک دیوار کے سایے میں دم توڑ

تھا۔ قضارا حکیم سنائی کا وہاں سے گذر ہوتا ہے۔ جب حکیم نے اس مسافر کے کراہنے کی آواز سنی تو اس کے پاس گئے اور اس جوان مسافر کو نزع کی حالت میں دیکھ کر اس کے وطن وغیرہ کے متعلق دریافت کیا۔ مسافر نے اپنا وطن بلغار بتایا اور افسوس کرنے لگا کہ اس غریب الوطنی میں کون اس کی تجہیز و تکفین کرے گا۔ حکیم سنائی نے اس کو ہر طرح تسلی دی اور دریافت کیا کہ اگر تیری کچھ آرزو ہو تو کہدے مسافر نے کہا کہ میری موت کی اطلاع میرے والدین کو نہ دی جائے۔ غرض مسافر مرجاتا ہے اور حکیم اور ان کے دوست اس کی تکفین و تدفین کرتے ہیں۔ شاعر نے آخر میں حاصل مطلب یہ بیان کیا ہے کہ غریب الوطنی کی موت بہت ہی پُرالم ہوتی ہے۔

شیخ دین میاں

اس دور کے دوسرے شاعر شیخ دین ہیں۔ ان کا نام عظیم الدین اور والد کا نام قاضی شیخ محمد بن قاضی مصطفےٰ تھا۔ شیخ دین کے مورث اعلیٰ شیخ قاضی جلال الدین سلطان محمود غزنوی کے ساتھ سومناتھ پٹن آئے اور یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ چند واسطوں سے اس خاندان کا شجرۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ شیخ دین نے اپنے خاندان کے ورود ہند کے متعلق اپنی مثنوی میں بھی اشارہ کیا ہے۔

سلطان شاہ کے ساتھیں دو شیخ تھے صدیقی　　فرزند ابابکر کے تحقیق تھے رفیقی
سلطان نے اونہوں پر یوں مہربانی کیتی　　پٹن کے پرگنے پر اونکو قضا (ۃ) لے دیتا
یاران

سونپی قضادت جنھوں کو کیا نام تھا انہوں کا　　شیخ جلال الدین لقمان سب کام تھا انہوں کا
بھائی سگے تھے دونوں ماں باپ ایک انہوں کا　　سپرش (سپرد) نوے مسلماں رہنا ہوا انہوں کا
یاران

شیخ دین کا ایک لڑکا شیخ تاج الدین نامی تھا۔ یہ خاندان کاٹھیاوار میں بہت پھلا پھولا۔ اس خاندان کی لڑکیاں کاٹھیاوار کے مختلف روٴسا کے گھروں میں بیاہی گئیں ان میں سے ایک رئیس مانگرول کا خاندان ہے۔ شیخ دین کا خاندان جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی حال مقیم کراچی کا ننھیال ہے۔ شیخ دین کے خاندان کے بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ شیخ دین میاں نے اخیر زمانہ میں بمقام مانگرول سکونت اختیار کرلی تھی اور ان کا انتقال بھی مانگرول میں ہوا۔ پٹن ویراول (سومناتھ) میں اب تک قاضیوں کا محلہ مشہور ہے۔ شیخ دین کی حویلی بھی اسی جگہ اب تک موجود ہے جو ان کے بیٹے تاج الدین (تاج دین) نے کسی عیسٰی نامی شخص کے ہاتھ بیچ دی تھی اور یہ حویلی

اس وقت اسی کے قبض و تصرف میں ہے۔

اب تک شیخ دین کی دو تصانیف دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک "حاجی منگرولی شاہ المشہور بہ تاریخ ملک سورٹھ" اور دوسری چند شعر کی ایک مختصر مثنوی قصۂ کالی گوری! شیخ دین کی ایک غزل بھی پائی جاتی ہے۔ مثنوی حاجی منگرولی شاہ کا قصہ محمود غزنوی کے حملۂ سومناتھ سے تعلق رکھتا ہے۔ قصہ من گھڑت اور مبالغہ آمیز ہے اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں پائی جاتی۔

قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ پربھاس پٹن کے ایک راجہ کا یہ دستور تھا کہ ہر روز سومناتھ کی پوجا کے لئے جانے سے پہلے ایک مسلمان کے خون سے اپنے ماتھے پر چندن کرتا اور اس عمل کو یہ کار ثواب سمجھتا۔ لہذا روزانہ شہر کے ایک مسلمان کو قتل کیا جاتا۔ سرزمین عرب میں ایک بزرگ حاجی محمود شاہ کو یہ بشارت ہوئی کہ وہ پٹن جائیں اور مسلمانوں کو اس ظلم و تشدد سے نجات دلائیں لہذا یہ فوراً عرب سے عازم ہندوستان ہوئے۔ حاجی صاحب بڑے باکرامت شخص تھے۔ یہ کشتی پر سوار ہوئے تب سے پٹن میں ان کے انتقال تک ان کی بے شمار کرامات ظہور میں آئیں۔ جب جہاز بحر عرب میں مانگرول بندر کے قریب پہنچا تو اگرچہ جہاز سورت جا رہا تھا اور مانگرول کی بندرگاہ میں جہاز نہیں ٹھہرنے والا تھا تاہم یہ ایک تختہ پر کھڑے ہو گئے اور یہ تختہ انہیں بندرگاہ تک لے آیا۔ حاجی صاحب مانگرول سے پٹن آئے اور تمام واقعات سے واقف ہونے کے بعد موقع کا انتظار کرتے رہے۔ آخر ایک دن ایک تیلی کے لڑکے کی باری تھی اس موقع پر حاجی صاحب نے شہادت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ شہادت گاہ سے لے کر مندر کے اندر تک حاجی صاحب سے بہت خوارق عادات ظاہر ہوئے۔ جب راجہ کو اس بات کا پتہ چلا تو راجہ خود آیا اور حاجی صاحب کی کرامات کو دیکھا ان سے کافی بحث ہوتی رہی لیکن آخرالامر حاجی صاحب کو مندر سے نکال دیا اور اسی تیلی کے لڑکے کو لا کر قتل کر دیا گیا۔ جب تیلی کی ماں بہت رنج و غم کرنے لگی تو حاجی صاحب نے اسے محمود غزنوی کے پاس ان کا ایک خط لے جانے پر راضی کر لیا۔ اس موقع پر حاجی صاحب بڑھیا کو چشم زدن میں اپنی کرامت سے غزنی پہنچا دیتے ہیں۔ غرض محمود حالات سے آگاہ ہونے کے بعد لشکر ترتیب دیتا ہے اور سومناتھ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس اثنا میں حاجی صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ جب محمود پٹن آتا ہے تو اس سے کسی طرح پٹن کا قلعہ سر نہیں ہوتا۔ محمود کو بڑی تشویش ہوتی ہے تو حاجی صاحب کے مزار پر جا کر دعا مانگتا ہے۔ اسی شب حاجی صاحب محمود کو خواب میں بشارت دیتے ہیں کہ ایک مقام پر جعفر و مظفر نامی دو سید زادے رہتے ہیں اگر سلطان ان کی مدد لے تو قلعہ فتح ہو سکتا ہے۔ سلطان نے ایسا ہی کیا اور آخر یہ قلعہ فتح ہو جاتا ہے۔ دونوں سید زادے اس جنگ میں جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ محمود یہاں سے بتوں کو توڑ کر دولت سمیٹتا ہوا لوٹ جاتا ہے۔

اگرچہ قصہ میں کسی قسم کی صداقت نہیں پائی جاتی لیکن کاٹھیاوار میں اسی طرح مشہور ہے۔ حاجی منگرولی اور

جعفر و مظفر کے مزارات اسی مقام پر اب تک مرجع خلائق ہیں۔

یہ مثنوی مسدس کی ترکیب پر ہے۔ اس میں بند ہیں مثنوی ۲۴ شعبان روز جمعہ ۱۲۱۶ھ میں بمقام پٹن لکھی گئی ہے۔ شاعر اس امر کا بھی اظہار کر دیتا ہے کہ قصہ فارسی سے ہندی میں نقل کیا گیا ہے اس کے آخری بند یہ ہیں:۔

قصہ پٹن پر بھاس کا کیتا ہے اب سارا جمع — خوش بیت پر میں نے لکھا کیتا ہے سب عا
شعبان کی چوبیس وہ روز تھا عید جمعہ — یہ بات ہے ساچی سبی سنکر نہ کرو کچھ گماں
یاراں دیکھو ہمت کو حاجی محمود شاہ کی
سنیو رے کان دھر کے کرنی جو ہے خدا کی

یک ہزار دو سو برس سولہ اوپر گذرے تھے جب — شیخ دین نے قصہ کتیں پٹن منیں کہیا ہے تب
اول تھا فارسی میں اس کو کیا ہندی میں سب — کیتی فکر یوں دل منیں آوے سمجھ میں سب کی تب
یاراں دیکھو ہمت کو حاجی محمود شاہ کی
سنیو رے کان دھر کے کرنی جو ہے خدا کی

نمونہ از قصہ

حاجی منگرولی شاہ

حاجی نے تب کہا یوں دیکھیں دیول سو تیرا — تو ساتھ چل ہمارے کس شان کا ہے ڈیرا
دکھلا سبھی تماشا کیا روپ ہے گھنیرا — ہم کر ادھر پھر تو کیجئے دیکھیں سو کام میرا
یاراں دیکھو ہمت کو حاجی محمود شاہ کی
سنیو رے کان دھر کے کرنی جو ہے خدا کی

حاجی کو تب وہ راجا دیول منیں لے آیا — ڈیرے منیں پھرا کر سومنات کو دکھایا
کتیں راگ رنگ تماشے باجے سبھی بجایا — باجنے کے باجنے سے دیول سبھی گجایا
یاراں دیکھو ہمت کو حاجی محمود شاہ کی
سنیو رے کان دھر کے کرنی جو ہے خدا کی

دیول منے عجائب قندیل یک ٹنگایا — کیا کام ہے او سیکا کتیں رنگ سے رنگایا
قیمت منیں او سیکی دو لاکھ کو منگایا — راجہ نے تب بلا کر حاجی کتیں دکھایا
یاراں دیکھو ہمت کو حاجی محمود شاہ کی
سنیو رے کان دھر کے کرنی جو ہے خدا کی

ایک خیال کس طرح کا اون بہنوں نے گایا حاجی نے سنکے دل کو حق کی طرف لگایا
کہتے سمجھ حقیقی حاجی کو حال آیا کر یاد حق کی ہر دم گھٹ میں ذکر اوٹھایا

یاراں دیکھو ہمت کو حاجی محمود شاہ کی
سنیو رے کان دھر کے کرنی جو ہے خدا کی

وغیرہ

اس قصہ کو اہل کاٹھیاوار کی فرمائش پر ۱۲۷۱ھ میں ایک شاعر حیدری نے بھی نظم کیا ہے۔ سبب تالیف کے متعلق شاعر لکھتا ہے

بیاں جنگ پٹن بہ محمود شا زباں ملک سورٹھ میں ترتیب تھا
پٹن میں بہ مسجد میاں چاند کے گدا حیدری نام وارد ہوئے
کہا سب نے قصہ یہ سلطان کا زبان ہند میں ہم کو دو تم بنا
غرض سب کے خاطر سے قصہ کہا عبارت نثر میں جو دریا بہا
کہا سب نے اس کی ہے مشکل زمیں یہ دشوار مطبوع ہوگا نہیں
لکھو نظم تسلیس جو یہاں کے لوگ پڑھیں اوس کو گاکے بشادی و سوگ
غرض یہ ہے قصہ بہ لفظ سلیس عبارت سہل تر نہ معنی نفیس
نہم عرض اندر یرک و ہوشمند کہ جائے عبادت بود نا پسند
بہ الفاظ نکتہ درشتی دہند دگرنہ برب پردہ دارند بند

مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ دین کی مثنوی اگرچہ گجرات کی گجری اردو میں لکھی گئی تھی لیکن زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سورٹھ نے اس کو نظم کرنے کے لئے حیدری سے استدعا کی۔ کلام میں روانی تشبیہیں اور فارسی کی ملاوٹ یہ پتہ دیتی ہے کہ حیدری اچھے پرگو شمالی ہند کے شخص تھے جن کی نظر سے شمالی ہند کا ترقی یافتہ اور شستہ لوب گذر چکا تھا چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

جو دیکھا تو مندر تھا آئینہ ساں طلسمات کی تھی زمیں آسماں
منقش وہ دیول تھا با زر طلا منڈیروں کی تھی زر طلا سے جلا
بہت بہمنی نوجواں خوش نوا کھڑی تھیں وہ تصویر سی جابجا
پڑا سر سے کولے (کولہے) پہ زریں لحاف وہ کرتی تھیں ہنس ہنس کے بت کا طواف
کوئی موتیوں میں سراپا لدی کوئی اپنے عالم میں سب سے جدی
کسی پر تھی ساڑی سنہری پڑی کوئی راگ گاتی کوئی ناچتی

کوئی تھی پری اور کوئی رشک حور غرض سب کے منھ پر برستا تھا نور

بظاہر تو لیتے تھے وہ بُت کا نام مگر اونکو تھا دید بازی سے کام
بدیسی مہادیو کے نام سے ادا حوریاں آنکر دیکھتے
سوا اونکے طفلاں کئی خردسال ہر ایک باغ خوبی کا تازہ نہال
وضع دار بارہ و چودہ کا سن مزا چلبلاہٹ کا طفلی کے دن
کڑے اور توڑے طلائی پڑے ادب سے وہ سب بُت کے آگے کھڑے
وہ اس لَے سے کرتے تھے ہر ہر دہاں کہ چہچائیں جوں بلبل بوستاں
چند تشبیہ اور استعارے ہ۔
تھے اسلام اور کفر لوہو میں غرق چمکتی تھی ساون کی راتوں میں برق
غرض کوئی کافر نہ مسلم بچا گئی چاٹ ساروں کو ناگن قضا
جو دستوں میں غازی کے شمشیر تھی کفاروں کو تھی آرسی موت کی

مثنوی کے مختلف حصّے ساقی نامہ سے شروع ہوتے ہیں جیسے

ارے واعظو میرا ساقی ہے حور بھلا پھر مجھے مے سے کیوں ہو نفور
پلا ساقیا جلد ساغر کو بھر چڑھائی ہے اسلام کی کفر پر
مقفل کر اب مے کدہ ساقیا کہ ہے دور سلطان باشرع کا
نہ کر دیر شیشہ کو لا ساقیا کہ ہے مغز خالی مرا جام سا
وغیرہ

شاعر نے بعض جگہ پند و نصیحت میں بھی اشعار سپرد قلم کئے ہیں۔ غرض مثنوی ہر پہلو سے اچھی ہے۔ قصہ میں جہاں کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے اس کے متعلق شاعر نے چند اشعار آخر میں بڑھا دئے ہیں۔

سخن اس میں ہیں بس خلاف از قیاس وہ ایراد ظاہر ہوں دانا کے پاس
کرو طور پٹن کا نشا قلعا یہ کس طور بارہ برس تک لڑا
دو یم ہے جو فوجوں کی لکھا میعاد نہ ہو گی کسی سو ہزاروں سے زیاد
وغیرہ

سنہ تصنیف کے متعلق شاعر لکھتا ہے

جو سن چاہئے مصرعہ آخر کا لے ۔۔۔ دریں مصرعہ تاریخ داند کسے

اس شعر کے بعد گیارہ شعر چھوڑ کر آخری شعر یہ ہے

یہاں میں نے حجت لکھی اس لئے ۔۔۔ کہ قصہ نہیں یہ تو تاریخ ہے

تو تاریخ کے عدد ۱۲۱۷ ہوتے ہیں لہذا اسی کو سنہ تصنیف سمجھنا چاہئے۔ مثنوی ۵۶۰ اشعار پر مشتمل ہے۔
یہ ۱۳۱۱ھ میں بمبئی کے مطبع فتح الکریم سے شائع کی جا چکی ہے۔

شیخ دین کی دوسری مثنوی 'قصۂ کالی گوری' ہے۔ یہ صرف باون شعر پر مشتمل ہے۔ اس کا سنہ تصنیف یکم شعبان ۱۲۱۶ھ ہے۔

ایک ہزار دو سو برس اور سولہ ہوئے تھے جب ۔۔۔ قصہ میں نے بولا ماہ شعبان میاں تب
شروع تاریخ پہلی کو قصہ کتیں چلایا ہے ۔۔۔ کیا ہفتے اندر پور اجمعہ کے دن بنایا ہے
سخن شیخ دین کہتا ہے یہ باتاں نہیں ہوں گی ۔۔۔ پڑھو کلمہ محمد کا لے ہر دم یاد مولی کی

یہ مثنوی بھی مطبع فتح الکریم کے بارہ قصوں کے مجموعہ میں شامل ہے جو ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ شہر سورت کے ایک شخص کی دو بیویاں تھیں جن میں ایک کالی اور دوسری گوری تھی۔ جب ان کا خاوند پردیس سے زر و مال لیکر لوٹتا ہے تو دونوں میں سے ہر ایک بیوی شوہر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے اور ہر ایک بڑے پیار محبت کا اظہار کرتی ہے۔ ان دونوں میں جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ آخر خاوند جھگڑے کا منہ کالا کرنے کے خیال سے تمام زر و مال دونوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

غلامی

غلامی گجرات کا ایک نہایت پرگو شاعر تھا۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ اس کا اصل وطن سورت تھا لیکن کھمبایت میں بود و باش اختیار کر لی تھی تخلص کے متعلق خود شاعر کا بیان ہے کہ یہ ریختہ میں مطلب، مناقب میں انور، مثنویوں میں غلامی اور مرثیوں میں غلام رسول تخلص کرتا تھا۔

غلام رسول نام ہیگا مرثیوں میں ۔۔۔ تخلص مطلب ہے سب ریختوں میں
مناقب مدح میں انور مدامی ۔۔۔ ہے قصوں میں لقب میرا غلامی

مثنوی کے اختتام پر شاعر کے مولود، سنہ تصنیف، تعداد اشعار وغیرہ کے لئے چند اشعار ہیں۔

میرا مولود ہے در شہر سورت ۔۔۔ کیا کھمبایت میں چند مدت سکونت
یہ قصہ فارسی تھا نثر منقول ۔۔۔ کیا اس کو میں ہندی نظم بے مول
تھی فرمایش جو کہتا کنا بھائی کی یوں ۔۔۔ کہ تم ہندی کرو اس فارسی کوں

جدا لا کر دیا اس کے اصل کو　　　تتبع میں کیا ہندی نقل کو
بہت تاکید سعدالدین کی تھی　　　میاں جعفر نے بھی کچھ کم نہیں کی
میں کی قصہ میں اس خاطر اتا دل　　　خدا قفل دل کے کھول دئے گل
مجھے قصہ کی کچھ امید نیں تھی　　　ولیکن کچھ مدد ہو گئی علی کی
بارہ سو اٹھارہ کے درمیاں　　　تھی تاریخ چودھویں اور ماہ شعباں
میں نے کھمبایت میں اس کو کیا تھا　　　بندھاروں کی سو مسجد میں لکھا تھا
جمعہ کی صبح ٹھنڈ کی سرسری تھی　　　وہ مسجد دوست داروں سے بھری تھی
یہ قصہ اس گھڑی پہنچا ہے آخر　　　پڑھے سب فاتحہ حضرت نبی پر
بیتاں نوسو اوپر چالیس پر دو　　　ہوئیں اس قصہ کی فی الجملہ گن لو
ابھی قصے کو یہاں بس کر غلامی　　　درود اں پڑھ محمد پر مدامی

مذکورہ بالا اقتباس کے تیسرے شعر میں گجراتی ہندوئی نام کتا بھائی ہے مطبوعہ نسخہ میں کیتا بھائی لکھا ہے جو غلط ہے۔ اسی کے پانچویں شعر میں سعدالدین اور میاں جعفر کے نام ہیں۔ یہ دونوں شاعر تھے۔ ان کی نظمیں اور ریختے مختلف بیاضوں میں پائے جاتے ہیں۔ اقتباس کے نویں شعر میں بندھاروں کی مسجد کا ذکر ہے جہاں شاعر نے یہ مثنوی لکھی اور اپنے دوستوں کو سنائی یہ مسجد اب تک بوسیدہ حالت میں موجود ہے۔

اس میں ۹۴۲ ابیات ہیں اور ۱۲۱۸ھ اس کا سنہ تصنیف ہے۔

شاعر ایک جگہ اپنے استاد فدؔا کے متعلق بھی لکھتا ہے:۔

فدؔا ہیں گے میرے استاد اشعار　　　میں سیکھا جس سے کہنا اشعار

مثنوی کا قصہ حضرت تمیم انصاری سے تعلق رکھتا ہے۔ مثنوی گیارہ ابواب پر مشتمل ہے ہر باب میں تمیم انصاری کی مہم سے متعلق ایک حکایت بیان کی گئی ہے۔ مثنوی بمبئی سے کئی بار شائع کی جا چکی ہے جناب پروفیسر عبدالقادر سروری بھی اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔

نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے:۔

غلامی کس سبب سے چپ رہا تو　　　ابھی تو دو سخن بھی نین کہا تو
ابھی یاروں کے دل قصہ بھیتر ہیں　　　سبھی سننے کے سامع منتظر ہیں
سخن کی گردن شیطاں کو جو لات　　　تمیم انصاری کی چوتھی اب کہہ بات
تمیم انصاری بولے یا علی میں　　　چلا چلے طرف سیمرغ لے میں
چلا کئی روز او س جنگل کے بھیتر　　　کہ دیکھا دور سے پھر یک جانور

وہ ایسا تھا بڑا جیسا پہاڑ ایک / کہ جاں ہو جاوے قبض اس کی طرف دیکھ
نہ اوس کا سر نہ اوس کا پاؤں نا ہاتھ / نہ اوس کا منہ تھا وہ بولتا بات
نہ پشت اوس کی نہ پر اوس کا نہ اڑتا / چلا آتا ہے وہ لڑتا ہے بڑھتا
گلاتاں کھاتا کھاتا مجھ تلک جب / میں اس سے ڈر کے حیرت میں رہا تب
کہا اوس نے تمیم انصاری بولو / مجھے دیکھے سے کیوں حیرت رہے ہو
خدا پیدا کیا مجھ لے کئے ہیں / کہ کھیل اوس رب کے قدرت کے بڑے ہیں
سخن اس مرغ کی یوں میں سنی جب / ہوا بیہوش گئی میری عقل تب

حاجی محمد

ایک غیر معروف شاعر حاجی محمد نے ایک مثنوی قصۂ شیخ تھو و گنگا با منی ۱۹۲۰ء میں مرتب کر کے بمبئی کے مطبع فتح الکریم سے شائع کی ہے۔ مثنوی قصۂ نازنیں پٹھان کی ترتیب پر لکھی گئی ہے۔ نازنیں پٹھان والا قصہ سورت سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح یہ قصہ کاٹھیاوار کی ریاست مانگرول میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ دونوں قصوں میں زبان و مکان کے سوا خاص فرق نہیں ہے۔

قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مانگرول کے حاکم کا ایک سپاہی شیخ تھو کسی ہندو عورت پر عاشق ہو گیا۔ تھو کے اظہار محبت پر گنگا برہمنی اسے ہر طرح سمجھاتی ہے کہ مذہبی اور سماجی نقطۂ نظر سے یہ فعل و عمل نہایت نازیبا ہے۔ آپس میں مذہبی بحث و تکرار بھی ہوتی ہے اور دونوں میں سے ہر ایک اپنی ذات پات کی برتری کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک رہتا ہے آخر ایک روز گنگا تنگ آ کر اپنے عاشق سے دامن چھڑانے کے خیال سے کہتی ہے کہ اگر تو واقعی میرے عشق کا دم بھرتا ہے تو شہر کی فصیل پر سے کود پڑ۔ چونکہ تھو گنگا کو صدق دل سے چاہتا تھا اس امتحان سے پہلو تہی نہیں کرتا اور فوراً فصیل پر سے بے خطر کود پڑتا ہے گنگا یہ دیکھ کر گھبراتی ہے اور اپنے مکان چلی جاتی ہے لیکن عاشق صادق کا جذبۂ محبت گنگا کو چین نہیں لینے دیتا۔ گنگا اپنے گھر سے واپس آتی ہے اور بلا خوف رسوائی عاشق کے سرہانے بیٹھ جاتی ہے اور برملا عشق کا اظہار کرتی ہے اور عاشق سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ اگر تو اس تکلیف سے جانبر ہو جائے تو تادم مرگ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ اتفاق سے راستہ پر چند ہندو جمع ہو جاتے ہیں اور جب یہ خبر شہر میں پھیل جاتی ہے تو مسلمان بھی اس مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں میں تھوڑی بہت مڈبھیڑ بھی ہو جاتی ہے۔ مسلمان تھو اور گنگا کو ان کے مقام پر لے جاتے ہیں۔ دوسرے روز ہندو نواب کے حضور شکایت لاتے ہیں۔ نواب نے تھو اور گنگا کو طلب کیا اور تھو کو بہت کچھ سخت سُست

کہا۔ نتھو صفائی میں گنگا کو پیش کر دیتا ہے اس موقع پر گنگا اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے لہذا ہندو یہ دیکھ کر لوٹ جاتے ہیں اور نتھو اور گنگا کا عقد کر دیا جاتا ہے۔

شاعر کے بیان کے مطابق یہ منظوم قصہ پہلے سے موجود تھا جسے حاجی محمد نے بڑھا چڑھا کر نظم کیا۔

اول تھا یہ قصہ بہت ہی قلیل　　بنایا میں اس کے مطابق طویل
نظم اس کا بد تھا جو اول بنا　　نئے سر سے قصہ کیا میں بنا

معلوم ہوتا ہے کہ مانگرول میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا ہوگا جس کو کسی شاعر نے نظم کیا ہوگا لیکن ۱۲۹۰ھ میں اشاعت کے خیال سے مطبع کے کوئی کاتب حاجی محمد نے اسے دوبارہ نظم کیا۔ اور نظم کرنے کے وقت قصہ نازنین پٹھان کو سامنے رکھا ہوگا۔ اس زمانہ میں بمبئی کے مطابع سے ایسے بہت قصے شائع کئے جاتے تھے۔ چونکہ ان کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ اسی دوران میں ان مطابع سے بے شمار مثنویاں شرمندۂ اشاعت ہوئی ہیں۔

ہمارے خیال کی تائید میں ذیل کے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

بارہ سو پہ نود کیا جب طلوع　　مہینے میں عاشورہ کے میں شروع
اسی ماہ اندر کیا اختتام　　ہوا شیخ نتھو کا قصہ تمام

- - - - - - - - - - - -　　- - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - -　　- - - - - - - - - - - -

وہ حاجی محمد سمہ قوم ہے　　بمبئی کے بندر میں وہ الیوم ہے
قران کا وہ کاتب ہے مشہور تر　　وہ ہی چھاپ خانے میں لکھتا مگر

شاعر حمد و نعت میں چند شعر کہنے کے بعد عشق حقیقی کے متعلق چند شعر سپرد قلم کرتا ہے۔ اس کے بعد آغاز داستان میں شہر مانگرول اور اس کے حاکم کے متعلق کچھ اشعار ہیں اور بعدہٗ اصل واقعہ شروع کرتا ہے شاعر نے مثنوی میں بعض جگہ شاعرانہ فنکاری سے بھی کام لیا ہے۔ گنگا کے حسن و جمال بیان کرنے میں تقریباً بچاس اشعار کہے ہیں جن میں سے چند یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

شکم اس کا سانچے میں گویا ڈھلا　　قیامت وہ قد تھا اسی کا بلا
عجب اس کا چہرہ تھے ابرو کماں　　پری کی شکل تھی وہ ہی ہے گماں
وہ آنکھوں میں کاجل لگا تھا عجب　　وہ رفتار اس کی قیامت غضب
نرم اس کا سینہ تھا صاف　　عجب اس کے بالوں کا تھا کچھ بیاف

عجب حال رُخ کا کشادہ فراغ — چمک اس کی جیسی تھا روشن چراغ
سیہ اس کے گالوں پہ خوش خال تھا — ہمیشہ اسی کا بھی خوش حال تھا

- - - - - - - - - - - -

دونوں ہاتھ چھوٹے انگشتاں دراز — زرینوں سے نازک بدن تھی طراز

- - - - - - - - - - - -

عجب اس کے تن کا سبھی تھا سجوگ — نگہ تیز جیسی تھی بھالے کی نوک

وغیرہ

عاشق و معشوق میں سوال و جواب کا طریقہ مثنوی نازنیں پٹھان کے ڈھنگ پر ہے۔ دونوں مثنویوں کے سوال و جواب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قصۂ نازنیں پٹھان میں جو کچھ ہندو لڑکی کیسر کی زبان سے کہلوایا ہے وہ سورت کی مقامی گجراتی میں ہے اور اس مثنوی میں گنگا کی گفتگو خاص کاٹھیاوار کے محاورے اور لب و لہجہ میں[1] ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں گنگا کہتی ہے۔

کمسی عقل تارو گیو ہے گیان — تیری عقل (کھس گئی ہے) ہٹ گئی ہے
چالو جاتو یاں تھی آدیو سے جیاں — تو جہاں سے آیا ہے وہاں چلا جا
تلی آماں تارے نہ جڑسے کنیں تیل — ان تلوں میں سے تجھے تیل نہیں ملے گا
ترک[2] مارد کیڑو (ملیگا) کہوں سوں تو میل — اے مسلمان تو میرا پیچھا چھوڑ دے
کہسے لوگ (مسلمان) (پیچھا) تو نے بدھو بے عقل — تجھے لوگ بدھو کہیں گے

وغیرہ

میلی مارو مارگ نے جا تو چلو — مرا راستہ چھوڑ اب تو چلا جا
نہ تو سیشخ صاحب کٹ سے گلو — نہیں تو شیخ صاحب (نواب) تیرا گلا کٹوا دیں گے
ایں بدھ (تمام) ہندو ماں چھیے موٹی جات — ہم تمام ہندوؤں میں اونچی ذات کے ہندو ہیں

---

[1] معیاری گجراتی کے تین مرکز مانے جاتے ہیں (۱) سورت (۲) احمد آباد (۳) کاٹھیاوار۔ ان تینوں مقامات کی زبان میں لب و لہجہ اور محاوروں میں خفیف سا فرق ہے۔ جیسے گجراتی میں ایک پیسہ کو سوا اکا کہتے ہیں جو احمد آباد میں بولا جاتا ہے مگر سورت اور کاٹھیاوار میں ہوا کا کہیں گے۔ اسی طرح گجراتی چھے بمعنی ہے کو کاٹھیاوار میں سے کہتے ہیں۔ کہوں چھوں بمعنی کہتا ہوں کو کاٹھیاوار میں کہوں سوں کہتے ہیں یا شوں چھے بمعنی کیا ہے کو سوں سے کہتے ہیں۔

[2] کاٹھیاوار میں مسلمان کو ترک کہا جاتا ہے۔ وہاں کے دیہاتوں میں جو پرانے مسلمان باشندے تھے وہ بھی اپنے آپ کو ترک ہی کہتے تھے۔ ممکن ہے یہ سپاہی زادے ہوں۔

آسیوں وات کرتا امارے سنگات　　ہمارے ساتھ یہ ایسی بات کیوں کرتا ہے
اوبھو کیم یا تسے نکارا تو آ کھڑا کیوں　　یہاں آکر تو اسے ناکارہ کیوں کھڑا ہے

کیوں تو نے مارو تو اب یاں تی جا　　تجھے میں اچھا کہتی ہوں کہ تو چلا جا
مارگ مو ک مارو ترک اب گھڑی　　اے مسلمان (سپاہی) تو اب میرے راستے سے ہٹ جا
رباشتہ نکر مار کھائیں نے تھا سے بڑی نہیں تو　　نہیں تو مار کھائے گا اور خراب ہوگا
(خواب)　　(۹)

اگرچہ مذکورہ بالا مثنوی اور قصہ تازہ بیں پٹھان کو مذہبی نقطۂ نظر سے اس وقت کوئی اہمیت حاصل نہ ہو لیکن لسانی ارتقاء مقامی اور غیر مقامی الفاظ کے تلفظ اور اردو میں ان کے دخول کے پیش نظر بہت اہم ہیں۔ لسانیات کے طالب علموں کے لئے یہ سنگ میل کا کام دے سکتی ہیں۔ ایسی مثنویوں سے یہ بھی پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ پہلے پہل کس قسم کی زبان کون سے رسم خط میں لکھی جاتی ہوگی۔

اسی نوعیت کی ایک اور مثنوی یہاں پیش کی جاتی ہے جو لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے لطف سے خالی نہیں۔ اس مثنوی میں ایک مغل جو فارسی بولتا ہے، ایک حبشی جس کی مادری زبان عربی معلوم ہوتی ہے اور ایک گجراتی جس کی زبان گجراتی ہے کو پیش کیا گیا ہے اور تینوں اپنے اپنے لب و لہجہ میں فارسی عربی گجراتی کی ملاوٹ سے اردو بولتے ہیں قصہ یہ ہے کہ ایک مغل زادہ بڈنگر (گجرات) میں کسی ناگر عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے مغل زادہ کا ایک حبشی غلام ہے جو اپنے آقا اور ناگر عورت کے درمیان قاصد کا کام کرتا ہے۔ حبشی کے بار بار ناگر عورت کے گھر جانے کی وجہ سے اس کے خاوند کو شبہ ہوتا ہے لیکن عورت کچھ نہ کچھ بات بناتی رہتی ہے اور داد ہر حبشی کو کسی طرح ٹالتی رہتی ہے مگر مغل زادہ عاشق صادق تھا ایک دن عورت ہتھیار ڈال دیتی ہے اور مغل زادہ کے ساتھ اس شرط پر جانے کے لئے تیار ہو جاتی ہے کہ عورت دریا میں غوطہ لگاتی ہے مغل زادہ اسے اس میں سے بچالے۔ مغل زادہ یہ شرط منظور کرلیتا ہے اور اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے اور آخر ناگر عورت مسلمان ہو جاتی ہے اور تینوں ایران چلے جاتے ہیں۔

مثنوی سے مثنوی کا نام نہ مصنف نہ سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے مگر اس کی لسانی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مثنوی گیارھویں صدی کے نصف اول میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بعض خصوصیات کام دھنی اور خوب محمد چشتی کے دور کی پائی جاتی ہیں۔

مثنوی حمد و نعت سے شروع ہوتی ہے

پہلوں پرکتی جد پناہی تیرہ تو کھنڈ میں پرگھٹا ناں　　ذات جماعت نو جے کوئی جو ہیں بھو ملت پٹاناں

ماتا پتا کس کی جورو جیو تے بھاں بہین نے بھائی — مکتا دو پا چھوڑ دو اب تیری سوں جا پیت لگائی
پیم پٹے ہے پوچی کیا بن پیو تاں جائے سند لیا — پان لوہی پیت نکلی سدی بات سوہن میں کی بلیا

- -

کرکیں دھر کیں نیہ کے کارن رو رو کر سگلا بھرا — نینوں ماں ہتین پریاں پنواں سیپ کے دام کا چارا چرا

چند اشعار کے بعد اصل قصہ اس طرح شروع کرتا ہے

شاہ عباس کے دیس کا مغل بڈنگر کے آیا آری

ایک ناگر عورت کو یہ مغل زادہ دیکھتا ہے

ناگری بہاؤ سیں گاگری لیتے لٹ لٹکتے چال سیں آئی
دیکھتے مغل گھیر کھا پڑا رد نہہ رد نہہ میں نیہ بندھائی

مغل زادہ عورت کو دیکھتے ہی چکر کھا کر گر پڑا۔ اس جگہ اس کا غلام عنبر کھڑا تھا اس نے مغل زادہ کو اٹھایا اور حویلی پر لے گیا محبت کی آگ میں مغل زادہ سلگ رہا تھا اور بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا شاعر اس ضبط کو کس خوبی سے پیش کرتا ہے

داب دیو کر ہردے راکھا جییں بیج کو دھرتی ماہناں
نین کے آنجھوؤں سینچتے سینچتے اُگ اوٹھا پریم پر کھی ماہناں
پانڑدوں پانڑدوں شاخاں پھوٹیاں بھیتے لاگا نیہ نویلا
ہاڑوں ہاڑ مل جڑ گو نہتائی تا تاں نوٹی تا نہیں دیلا

مغل کے دل میں محبت اس طرح رہی جیسے زمین میں بیج بویا جاتا ہے۔ فراق میں آنسوؤں کے پانی سے اس تخم محبت کو ایسی تقویت ملی کہ یہ پھوٹ نکلا۔ اس تخم سے شاخیں پھوٹیں اور اس کی جڑ ہڈی ہڈی میں گتھ گئی۔ یعنی رگ و پے میں محبت سرایت کر گئی۔

آخر ایک دن مغل زادہ کے دل کا معاملہ ضبط سے باہر ہو گیا اور اپنے غلام عنبر پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو قاصد بناتا ہے۔ کہتا ہے

بشنو عنبر من بگویم بائی کی جاگے تمکوں راکھا ـــــ بائی = بھائی
یک سخن من برساں مجہ غریب اصفہاں کا
حالا برد بانی کے گھر خون مراکش کے کیا
راس بسر یا علی اب درتن من ہیچ نزہا

شعر میں راس اور سر غور طلب ہیں۔ ایک عربی اور دوسرا فارسی ہے چونکہ عنبر کی مادری زبان

عربی تھی۔
حبشی اپنے آقا کے کہنے پر برہمنی کے گھر جاتا ہے۔ ناگرنی کو دیکھ کر عنبر کی جو حالت ہوتی ہے اسے کس خوبی سے شاعر بیان کرتا ہے۔

دیکھ صورت بے سدھ ہو گیا جو بھنور کنول کے آگے
سدھ سنبھال سنتوک نے بارے بات مغل کی کرنے لاگے

عنبر ناگرنی سے مغل زادہ کا پیام کہتا ہے۔ اس کی زبان اور تلفظ ملاحظہ ہوں

میرقی عاشقی تم سیں لاغی یوں فوشا تم قاں رہتے ہو
میر کی عاشقی تم سیں لاگی یوں پوچھا تم کاں رہتے ہو

او شدناں تلاؤ کی فالیں میر شوار ہوشل آیا تھا
اوس دنان تلاؤ کی پالیں میر سوار ہو چل آیا تھا
تم شو فانی شرغرالی جاتی میر شوں جیو لایا تھا
تم جو پانی سر گھڑا لے جاتے میر سوں جیو لایا تھا

ناگرنی یہ سن کر جواب دیتی ہے

ہنیڈ پرد موڈ دیتو رہ کئیں کالو مونڈ ہوئی نے آود
پرے ہٹ کہاں سے یہ کالا منھ لے کر یہاں آیا
کیا تو مگل کیا تو ویڈ کیانی دات توں اپوی یاود
کہاں کا مغل کونسا وقت کہاں کی بات تو ایسی لے آیا
ہوں شر دور کیا ریں ہوتی توں نے تارو مگلو کیھو
میں دریا پر کب گئی تھی تو اور تیرا مغل کیسا
گانڈ مورکھ شان نہ تھی کئیں تجھے تو نس واندرا جیود
دیوانہ! بے وقوف تجھے کچھ لاج نہیں آتی بندر جیسا تو انسان ہے

عنبر گالیاں سن کر گھبرایا اور مغل سے کہنے لگا

قالا مونڈا مجنوں تھوے ...؟ میا جیاے ہا۔ کالا سر
انت مجنوں واللہ مغل کس جو رد سیں عشق کیا

فاندرا فاندرا مجقوں قہوے گانڈا غانڈا پکارے
باندرا (بندر) باندرا مجھکو کہتی ہے گانڈا (دیوانہ) گانڈا پکارتی ہے
تحن کاذب فامنی ساچا مجقوں چھوٹی دیوے غاری
بامنی مجھکوں بے ساختہ گالی

مغل زادہ عنبر کو سمجھا بجھا کر پھر بھیجتا ہے اور کہلاتا ہے

کر تواضع عذر خواہی سوں بگو عرض ہماری
چوں شوی تو منکر ما تیری چشم مجکوں ماری

جب عنبر ناگرنی کو یہ پیام دیتا ہے تو وہ دامن چھڑانے کے خیال سے کہتی ہے کہ اگر یہ عشق کی بات ظاہر ہوگئی تو تیرے مغل کی یہاں رسوائی ہوگی۔

عنبر سوچتا ہے کہ اب میں آقا سے کیا کہوں۔ راستہ میں خیال کرتا ہے کہ میں بھی ذرا نون مرچ لگا کر کہوں تاکہ مغل زادہ بھڑک اٹھے۔ کہتا ہے

قالت لنا انت نقل مو نہہ بجاؤنگی میر شبا ماں

شب مغل کی جائے اُغی جیا مخفی ظاہر ہوئی نگر ماں

میر یہ سن کر دوبارہ عنبر سے کہلا بھیجتا ہے کہ ہمارے گھر آکر ساتھ بیٹھ کر ایک فنجان شراب پی لے تاکہ روز روشن میں بھی تمھیں ستارے نظر آئیں۔ عنبر ناگرنی سے جا کر یہ کہتا ہے ناگرنی پھر اسے گالیاں دے کر نکال دیتی ہے۔ عنبر اب بہت غیظ و غضب میں آتا ہے اور میر صاحب کو بھی بُرا بھلا کہہ دیتا ہے۔ میر صاحب کو بھی غصہ آجاتا ہے اور ڈھال تلوار باندھ کر ناگرنی کے گھر جانا چاہتے ہیں مگر عنبر کہتا ہے کہ ذرا صبر سے کام لو میں ایک بار اور جاتا ہوں عنبر جب ناگرنی کے گھر پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ ناگرنی کا خاوند کھانا کھا رہا تھا۔ جب اس برہمن نے حبشی کو دیکھا تو ناگرنی سے دریافت کرنے لگا کہ یہ اکثر یہاں آتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ ناگر کہتا ہے

حبشی آیا تب نظر میں جو ٹھانی ماں لے چھپ گئیں
سنتی ہے کچھ

جب حبشی کو دیکھا تو ناگر عورت کو جو ٹھا کی ماں کے نام سے خطاب کر کے پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ تو سنتی ہے!

اوجلا دانت نے کالا مونڈا دھائی نے آ وچھے آئیں

یہ سفید دانت اور سیاہ سروالا بار بار یہاں آتا ہے

ناگرنی نے جھوٹ بات بنائی کہ یہ بیچارہ مصیبت کا مارا روٹی کی بھیک مانگنے آتا ہے۔ ناگر نے جواب دیا کہ ایسا ہے تو اس سے گاٹے کا گوبر اٹھو اور پھر روٹی دیا کر۔ عورت نے منظور کر لیا اور عنبر کو بلاکر کہا کہ یہ ٹوکرا اٹھالے جا اور میرجی کو میری طرف سے پہنچا دے۔ عنبر خوش ہو گیا اور بہت مسرت کے ساتھ گوبر کا بند ٹوکرا اٹھا کر چلتا بنا۔ میرجی یہ دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوئے لیکن جب آلائش پر نظر پڑی تو بہت بگڑے مگر عنبر نے کہا میرجی بگڑنے کی کوئی بات نہیں آپ بھی کوئی سوغات بھیجیے میرجی ایک دوشالا لے کر عنبر کو روانہ کرتے ہیں۔ جب عنبر ناگرنی کے گھر پہنچتا ہے تو ناگر سے دوچار ہوتا ہے۔ یہاں عنبر نے بات بنائی کہ ہمارے آقا میرجی کا آٹا پیسنے کے لئے ناگرنی کو دیا ہے وہ لینے آیا ہوں۔ ناگر یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ ناگرنی دوچار پیسے گھر بیٹھے کما لیتی ہے اور اپنے کام کاج سے لگ جاتا ہے۔ اب کی بار ناگرنی کہتی ہے کہ دیکھ حبشی تیرا میرجی تو دیوانہ ہے عشق کی باتیں قاصد کے ذریعہ نہیں ہوا کرتیں۔ عنبر مکان لوٹتا ہے

آیا عنبر میر کوں کہوے ہم کو جھگڑا کرنے بھیجا
جھگڑا
نحن قاذب ما فی لقم لیس پکاؤں گا من قلیجا

میرجی دوبارہ عنبر کو بھیجتے ہیں اس مرتبہ ناگرنی نے کہہ دیا کہ اچھا میرجی کو یہاں لے آنا میں دوبدو بات کروں گی۔ دوسرے دن عنبر میرجی کو ناگرنی کے مکان لے جاتا ہے۔ ناگرنی عنبر سے کہتی ہے کہ میرجی سے یہ کہہ کہ میں دریا میں غوطہ لگاتی ہوں میرجی مجھے اس سے نکال لائے تو میں اس کی ہو جاؤں گی۔ تمام قول قرار ہو لینے کے بعد ایک روز صبح ناگرنی پانی میں چھلانگ مارتی ہے میرجی اسے بچا کر لاتے ہیں اور آخر کار ان دونوں کا عقد ہو جاتا ہے۔ آخیر پھر عنبر کہتا ہے

عاشقی فاشقی شو لے بڑی گھر کے چھو کرے واٹ۔ دیکھیں گے
چھوٹے
انھوں کے سر دوس نہ دیکھیو آج سوکا غذ ہم لکھیں گے

یعنی میرجی نے یہاں دوسری شادی کر لی اور وطن میں ان کے بال بچے ان کا انتظار کرتے ہوں گے۔ پھر اگر یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اس کی وطن خبر کر دوں گا تاکہ اس کے سر کوئی دوس نہ رہے۔

مثنوی بہت مختصر ہے ہم نے اس میں سے چند مقامات چن کر پیش کئے ہیں ورنہ ان تینوں کی بات چیت اول تا آخر بہت ہی دلچسپ ہے۔ بعض جگہ اس میں میر اور عنبر کے درمیان فحش گالیاں بھی

آجاتی ہیں۔
مثنوی کسی شیخ صبغتہ اللہ نے مقام رادھنپور (گجرات) میں ۱۲۵۴ھ میں نقل کی ہے۔

عبد اللہ واعظ

عبداللہ واعظ کی مثنویوں پر گذشتہ وقت تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس وقت اس کی دو اور مثنویاں پیش کی جاتی ہیں۔ مثنویاں ٹھگوں کے قصوں سے تعلق رکھتی ہیں اور محض تفریح طبع کے لئے لکھی گئی ہیں اگرچہ شاعر ہر ایک کے آخر میں حاصل مطلب (اخلاق آموزی سے متعلق) بیان کرتا ہے۔ دونوں قصے نہایت دلچسپ ہیں۔
ایک قصہ ہے کہ دو ٹھگ کسی شہر میں پہنچے اور ایک جگہ ایک لڑکے کے گلے میں زیور دیکھا۔ لڑکے کو سمجھا پھسلا کر زیور اُتار لیا اور چونکہ شام ہو چکی تھی لہذا ایک ٹھگ نے کہا کہ اس کی بہن کا گھر اس شہر میں ہے وہاں رات بسیرا کریں اور صبح آگے چلیں۔ دونوں ٹھگ بہن کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ لڑکا ان کا بھانجہ ہے۔ دونوں بہت شرمندہ ہوئے اور بہن سے معافی چاہی اور زیور لوٹا دیا ــــ دوسرے روز جب دونوں ٹھگ جانے لگے تو بہن نے ان کے ساتھ توشہ دیا۔ اس موقع پر لڑکے نے بھی ساتھ جانے کے لئے ضد کی بہن نے اپنے بھائی سے کہا کہ اسے کیوں ساتھ نہیں لے جاتے کچھ نہ کچھ تم سے سیکھ ہی لے گا۔ لڑکا دونوں ٹھگوں کے ساتھ جانے لگا۔ لڑکے کے ماموں نے توشہ کی ہنڈیا اس کو دیدی کہ یہ لے کر ہمارے پیچھے چل۔ لڑکا بہت چالاک تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اپنے ماموں سے پوچھتا ہے کہ اس میں کیا ہے۔ ماموں نے جواب دیا کہ اس میں پالا ہوا سانپ ہے لڑکا راستہ میں تمام حلوا کھا گیا اور ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر گیا اور کہنے لگا ماموں! ہنڈیا میں سے سانپ نکل کر سامنے بل میں چلا گیا۔ غرض پورے سفر میں ایسے بے شمار واقعات پیش آئے ہر واقعہ میں لڑکا دونوں ٹھگوں کو جُل دیتا رہا۔ جب ٹھگوں نے یہ حال دیکھا تو چاہا کہ لڑکے کو کسی کے ہاتھ بیچ دیں لیکن اس سے پہلے لڑکا ہی ان دونوں کو ایک بقال کے ہاتھ بیچ کر چلا جاتا ہے۔ شاعر آخر میں حاصل مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ جو گڑھا کھودتا ہے وہی اس میں پہلے گرتا ہے۔
مثنوی ۲۸۴ اشعار پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کا سنہ تصنیف ۱۲۹۶ھ ہے۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار سے ایک بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ شاعر نے چند احمقوں کا بھی کوئی قصہ منظوم کیا ہے۔ مذکورہ قصہ ہماری نظر سے نہیں گذرا عبداللہ کی کافی تعداد میں مثنویاں دستیاب ہوئیں لیکن ایسی مثنوی اب تک نہیں پائی گئی۔ ٹھگوں کے قصے کے ماخذ کے متعلق شاعر لکھتا ہے:۔

هندی خط میں خط کا نامہ بھرا تھا ۔۔۔ اسے ایک سید سو پڑھتا اچھا
محمد شفیع ہے انونکا سو نام ۔۔۔ زباں سیں انوں کی سنا تھا سو ہم (۹)

یہ قصے کی ہندی زباں میں تھی بات — بچایا لکھ کے گجری میں رکھیں نکات
میں یک بے قوفوں کی کی ہے ذکر — میں باہوش کی اب کہتا ہوں خبر
اول پانچ احمق کوں کی ہیں بیاں — اونوں کی حماقتیں کیتی عیاں
نکر پانچ احمق کا اب توں ذکر — دو صاحب عقل کی سناؤں خبر
شتابی سیں عبداللہ ظاہر کرد — تماری شعر بیتیں ماہر کرو (؟)

مثنوی کے آخری اشعار میں اپنے پیر و مرشد محمد شریف اور سنہ تصنیف کے متعلق لکھتا ہے۔

محمد شریف نام ہے پیر کا — خلیفا بڑا ہے پیران پیر کا
مجھے ان کی حرمت میں رکھ ذراماں — ہمیشہ توں رکھ مجپر امن و اماں
کیا پورا آخر ربیع کے اندر — لکھا میں گیارہ سو چھنو بھتر
تھی تاریخ انیس وقت عصر — عقل والوں کوں ہے عقل کی خبر

دوسری مثنوی میں بھی ایک ٹھگ کا قصہ منظوم ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک ٹھگ کی مسافر پر نظر پڑی۔ ٹھگ نے جاکر بڑے تپاک سے سلام کیا اور اس طرح گفتگو شروع کی کہ کیوں صاحب اتنی مدت کہاں غائب رہے۔ تمھارے بال بچے تمھیں یاد کرتے ہیں۔ مسافر نے کہا میاں! تم بھولے پڑے ہو۔ میرے کوئی بیوی بچے نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی ٹھگ نے پینترا بدلا اور کہا کہ تو میرا داماد ہے۔ مدت ہوئی مکان سے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اب سیدھا سیدھا مکان چل۔ اس موقع پر کئی راہ گیر بھی جمع ہوگئے۔ اور جھگڑا چکانے کے خیال سے منھ بولے داماد کو اپنے خُسر کے ساتھ جانے کے لئے سمجھایا۔ مسافر نے اپنے آپ کو بُرا پھنسا پایا تو مصلحتاً ٹھگ کے ساتھ چلا گیا۔ ٹھگ نے مکان پہنچ کر اپنی بیٹی کو اطلاع کردی کہ آج شکار پھنسا ہے رات کو اس کی خوب خاطر تواضع کر اور اس کا کام تمام کردے۔ رات کو لڑکی مسافر سے بہت تواضع سے پیش آتی ہے اور پھر موقع پاکر مسافر کے سینہ پر چڑھ جاتی ہے۔ مسافر عقلمند تھا۔ لڑکی سے کہا کہ میں ایک کہانی سُناتا ہوں جس کے بعد تو میری جان لینا۔ اس طرح مسافر تین راتوں تک ایک سبق آموز کہانی سناتا رہا۔ لڑکی پر اس کا بہت اثر ہوا اور مسافر پر فریفتہ ہوگئی اور ایک روز مسافر کے ساتھ بھاگ نکلی۔ جب ٹھگ نے یہ حال دیکھا تو شور و غل مچایا۔ لوگ جمع ہوگئے تو لڑکی نے کہا کہ یہ میرا خاوند ہے چونکہ ٹھگ لوگوں پر یہی ظاہر کرچکا تھا اس لئے لوگوں نے ٹھگ پر لعنت ملامت کرنا شروع کیا اس طرح ٹھگ لوٹنے کے بجائے خود لٹ گیا۔

اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۲۹۵ھ ہے اور ۴۰۳ ابیات پر مشتمل ہے۔

مثنوی کے آخری اشعار یہ ہیں۔

اگیارہ سو پچانو کا تھا برس — رجب کا تھا مہینا تھا سب سے سرس

بیتاں تمن سو چہل ہیں اس منے　　میں گن کر کہیاں ہے یہ قصہ منے
یہ قصہ کوں عبداللہ کرتوں تمام　　پھر پڑھو (پڑھو)، تم درود اں صبح اور شام

عبداللہ کی یہ دونوں مثنویاں غیر مطبوعہ ہیں۔ چونکہ اس سے پہلے عبداللہ کے کلام کا کافی نمونہ پیش کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اعادہ مناسب نہیں۔

(باقی)

شہر بمبئی کے کتب خانوں میں دیوان ولی کے قلمی نسخے

(جناب عالی جعفری صاحب - الفنسٹن کالج بمبئی)

کلام ولی کی گوناگوں لسانی، ادبی اور علمی خصوصیات اور جو اثر اس نے ہم عصر و مابعد کے شعراء پر ڈالا ہے ان سب کے پیش نظر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مدتوں تک اس کی اشاعت نہیں ہوئی۔ اس کی پہلی اشاعت کا سہرا گارساں دتاسی کے سر بندھا۔ ہندوستانی ایڈیشن بعد میں سامنے آئے گویا مستشرقین یہاں بھی بازی لے گئے۔ اور ملکی ایڈیشن بھی کوئی تین، چار ہی نکلے۔ باقاعدہ ترتیب و تہذیب کے ساتھ انجمن ترقی اردو نے اسے ۱۹۲۷ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا، جس کے مرتب اردو کے مشہور زباں داں اور شاعر پروفیسر سید علی حسن صاحب احسن مارہروی مرحوم تھے۔ اور ۱۹۴۵ء میں ڈاکٹر سید نور الحسن صاحب ہاشمی کا مرتب کردہ ایک دوسرا صحیح اور مہذب ایڈیشن چھاپا۔ شہر بمبئی کے کتب خانوں کے دیوان ولی کے قلمی نسخوں کا تقابل اسی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اختلافات قرأت کے ساتھ وہ شعر اور غزل درج کر دی گئی ہے جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے۔

جمع و ترتیب دیوان | دیوان ولی کی جمع و ترتیب کے متعلق کسی قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ولی کا ایک شعر ضرور بتاتا ہے کہ اس نے اپنا دیوان "جمع" کیا تھا ؎

شاعروں میں اپس کا نام کیا — جب ولی نے کیا یو دیوان جمع

البتہ اس شعر سے یہ مطلب نکالنا کہ ترتیب دیوان کے بعد اس کی شہرت ہوئی ہو گی شاید درست نہ ہو۔ اس میں تو در اصل تذکروں کے "صاحب دیوان است" کی طرف اشارہ ہے۔ ولی نے مگر یہ نہیں بتایا کہ اس نے دیوان کب جمع کیا تھا۔ تذکروں کے بیانات بتلاتے ہیں کہ ۱۱۱۲ھ تک جب کہ ولی کا سفر دہلی ثابت ہے، ولی نے دیوان تیار نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ روایتی انداز کا دیوان ترتیب دینے میں کسی ردیف یا کسی ردیف کی غزل یا کسی اور صنف نظم کی کوئی شے باقی رہ گئی ہو۔ ولی کا انتقال ۱۱۱۹ھ میں ہوا ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۱۱۲ھ سے لے کر ۱۱۱۹ھ تک یقیناً اس نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کے انتقال کے دوسرے سال ہی سے دیوان کی نقلیں ہونے لگی تھیں جیسا کہ نواب نصیر حسن صاحب خیال مرحوم کے قلمی نسخہ کی تاریخ تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ دلی پہنچنے میں اسے چودہ سال کیونکر

لگ گئے۔ اپنے بیانات کی صحت کے لئے مصحفی کافی شہرت رکھتے ہیں، اس لئے ان کے بیان کو غلط بھی نہیں کہا جا سکتا یا غلط کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوگی۔ چونکہ ولی کے کلام سے متاثر ہو کر شعرائے دلی نے اردو میں باقاعدہ شعر گوئی شروع کی اور روز بروز ترقی کرتے جاتے تھے اور پھر میر، سودا، درد اور قائم کی ابھرتی ہوئی شاعری نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی، اس لئے غالباً بعد میں دلی والوں نے ولی کے ساتھ اگر بے اتفاقی نہیں تو کم التفاتی ضرور کی۔ اس لئے کہ اب تک ایسے قلمی نسخوں کا سراغ نہیں لگا ہے جو دلی یا شمالی ہند کے کسی شہر سے تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کا قوی امکان ہے کہ چاہے ولی کا "دیوان" دلی نہ پہنچا ہو، اس کے کلام کا بیشتر حصہ ضرور کبھی تحفتہً اور کبھی مطربوں کے ذریعہ شمال میں گیا ہوگا۔ ولی خود اس کی طرف اشارے کرتا ہے۔ مثلاً ؎

یو شعر تیرے اے ولی مشہور ہیں آفاق میں　　مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

اور ؎

ولی تجھ طبع کے گلشن میں جو کوئی سیر کرتے ہیں　　وہ تحفہ کر لیجاتے ہیں گلِ اشعار ہر جانب

ساتھ ہی ؎

شاید غزل ولی کی اس کوں لیجا سنا دے　　اس واسطے لیجا ہے مطرب سوں ساز کرنا

نواب خیال مرحوم کے کتب خانے والے دیوان ولی کے نسخے کے بعد ۱۱۳۳ھ والا معلوم نسخہ ہے اس کے بعد ہندوستان کے عدیم المثال محقق پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا نسخہ ہے۔ اس کے کاتب کا نام ثناء اللہ فانی ہے۔ اس نے ۱۱۴۸ھ میں اسے احمد آباد میں لکھا تھا۔ اس سے قریب کے نسخے بمبئی کے ہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ان کے بعد بارھویں صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے آخر تک دیوان ولی کے بے شمار نسخے تیار ہوئے جن کی ایک بڑی تعداد خود ہندوستانی کتب خانوں میں ہے اور بعض یورپ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

دیوان ولی کے مطبوعہ نسخے دلی میں ولی کے آنے کے بعد دو چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ دلی والوں نے اردو میں باقاعدہ شعر گوئی کی طرح ڈالی اور دوسرے یہ کہ شعر و شاعری کا مرکز نقل جنوب سے اٹھ کر شمال میں پہنچ گیا اور چونکہ کچھ ہی عرصہ کے بعد میر، سودا، درد، قائم وغیرہ جیسے باکمال شعرا نے زمین شعر کو آسمان پر پہنچا دیا اس لئے انھیں کے کلام کو اردو شاعری کی کل کائنات سمجھا گیا۔ ورنہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جب ولی جیسے عظیم شاعر کے دیوان یا کلیات کے کئی غیر مطبوعہ نسخے موجود ہوں، اس صورت میں اس کے دیوان کو شائع کیوں نہ کیا جائے۔ اور کیا قیامت ہے کہ ۱۹۲۷ء تک کوئی جامع، مبسوط اور تنقیدی ایڈیشن اس کا نہیں چھپا۔

اُردو زبان اور ادب مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کا اس کے خطبات کے علاوہ دیوانِ ولی کی پہلی طبع و اشاعت کے لئے بھی منت گذار ہے جسے اس نے اپنے مخطوطات کے مقابلہ کے بعد اپنی تصحیح کے ساتھ ۱۸۳۳ء میں پیرس سے دو جلدوں میں بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ جلد اول میں ۱۴۴ صفحات پر متن چھپا ہوا ہے اور کوئی بیس صفحوں میں فرنچ زبان میں ایک مقدمہ تحریر کیا ہے۔ جس میں ولی کے حالات اور اس کی شاعری سے بحث کی ہے۔ ولی کی زبان کی خصوصیات کے پیشِ نظر دوسری جلد میں اس کے اشعار پر لغوی اور نحوی حواشی لکھے ہیں اور اپنے نسخوں کے اختلافات بتائے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ تاہم آج کل یہ نایاب ہے۔

دیوانِ ولی کے سلسلہ میں اس نے اُردو دنیا سے بجا شکایت کی ہے:۔

"ہندستانی دیوانوں میں ولی کا دیوان بہت مشہور رہے۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ممالک مغربی و شمالی میں بہت کم پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ دکنی بولی میں ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کا طرز پُرانا ہے۔ سودا، میر، درد، جرأت اور یقین کے کلام کا یہ حال نہیں جو اس کے مقابلہ میں زیادہ جدید ہیں اور اب تک مقبول ہیں"۔ [1]

اس کے کوئی چالیس برس بعد سورت کے مشہور شاعر میاں سمجھو کے ایک شاگرد محمد منظور متخلص بہ نظم کی تصحیح اور شیخ عبد القادر وفا کی نقل و کتابت کے بعد دیوانِ ولی کا ایک ناقص و مختصر ایڈیشن ۱۲۹۰ھ میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اس کا ایک نسخہ جامع محلہ، بمبئی کی کھتری میونسپل لائبریری میں موجود ہے۔ مگر ویسے اس کا دستیاب ہو جانا بڑا مشکل ہے۔ اسی زمانہ میں ۱۸۷۸ء میں اُردو و فارسی کے بڑے محسن منشی نول کشور کے لکھنؤ کے مطبع سے اس کا ایک ایڈیشن چھپا۔ اور یہ بھی تقریباً نہیں ملتا۔ اس کا بھی ایک نسخہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ ۱۹۲۹ء میں صوبۂ بمبئی نے دیوانِ ولی کو شائع کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ پروفیسر حیدر ابراہیم سایانی صاحب نے اپنے دکن کالج کے زمانہ میں درس و تدریس سے وقت نکال کر غالباً گارساں کے نسخہ کو سامنے رکھ کر ایک دیباچہ کے ساتھ دہلی میں چھپوایا تھا۔ اسے مقبولِ عام کرنے کے لئے انھوں نے زبان اور املا کو بدل کر زمانۂ موجودہ کے مطابق کر دیا تھا۔ مولانا احسن مرحوم نے اس کی سخت گرفت کی تھی۔

ولی کے حالات اور کلام سے دلچسپی کے سلسلے میں اس موقع پر بمبئی کی مزید خدمات کا ذکر شاید بے جا نہ ہو۔ ۱۹۳۷ء میں پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کی مساعی جمیلہ سے اسمٰعیل یوسف کالج، جوگیشوری (بمبئی) میں ایک جلسہ یادِ ولی منعقد ہوا تھا۔ جس میں اساتذۂ کالج کے علاوہ طالب علموں نے بڑا حصہ لیا تھا۔ اور ابھی پچھلے سال ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین صاحب مدنی نے "ولی گجراتی" کے نام

[1] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۱۴۴

سے ولی پر ایک کتاب تحریر فرمائی جسے انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے شائع کردیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تفصیل کے ساتھ ولی کے حالات، زمانہ اور کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

کلیات ولی، طبع اول | اُردو کے مشہور شاعر و ادیب پروفیسر سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم نے ۱۹۲۷ء تک کے تمام مطبوعہ نسخوں، دوسرے مجموعوں اور بیاضوں سے بڑی کاوش سے ولی کا کلام حاصل کیا اور لگاتار دو ڈھائی سال صرف کرنے کے بعد "مسلسل جنبش قلم سے صاف شدہ دیوان ایسا مرتب کیا کہ مطبع میں بھیجا جاسکے"۔ چنانچہ انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۲۷ء میں اسے شائع کردیا۔ کلیات ولی کا یہ پہلا جامع ایڈیشن تھا جسے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کے لئے احسن مرحوم نے اس کے ساتھ ایک بسیط مقدمہ و فرہنگ بھی شامل کردیا تھا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ وہ کلام جو احسن مرحوم کو دستیاب نہیں ہوا تھا اس میں اضافہ کردیا اور انجمن کے مخطوطات کے اختلافات نسخ دکھانے کے لئے دو تفصیلی ضمیمے تیار کرا کر شامل کئے۔ طباعت کی غلطیوں کو دیکھتے ہوئے ایک غلط نامہ بھی آخر میں لگادیا۔ کچھ تو ٹائپ کی چھپائی اور کچھ کاغذ کی وجہ سے کلیات کی ضخامت کافی بڑھ گئی۔

اس کی ترتیب و تہذیب میں احسن مرحوم نے بڑی محنت اور کاوش کی تھی۔ گذشتہ زمانے کے کسی شاعر اور ادیب کا کوئی مجموعہ یا تصنیف شائع کرتے وقت اس کے حالات و واقعات، اس کے زمانے اور اس کے کلام وغیرہ سبھی کا جائزہ لینا کچھ ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر کسی قدیم تصنیف کی اشاعت تقریباً ادھوری رہ جاتی ہے اور پڑھنے والوں کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ کلیات ولی (طبع اول) کے چھاپتے وقت ضرورت تھی کہ ایسے دیوان کے لئے صاحب دیوان کے حالات لکھ کر تمام مراحل تبصرہ و نقد طے کئے جاتے۔ اور احسن مرحوم نے یہ تمام مراحل بحسن و خوبی طے کئے۔ ولی کے نام، حالات، وطن وغیرہ کے لئے بڑی تفتیش کی اور اس وقت کی تحقیقات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ایک رائے قائم کرلینے کا موقع دیا جس سے اُردو ادیبوں کا خاصا طبقہ متاثر ہوا۔ انھوں نے یہ بتایا تھا کہ ولی اورنگ آبادی یعنی دکنی ہے۔

اس کے بعد ولی کی شخصیت، قابلیت اور شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے انھوں نے بڑی محنت سے ولی کی علمی قابلیت، دنیائے نظم کا ولی کو باوا آدم کیوں کہتے ہیں صحیح معنوں میں اُردو نظم کا پہلا مدون کون ہے؟ اور ولی کی سخن گستری کے تحت اس کی غزل، حسن و عشق کے باہمی معاملات، احساسات، پھر صنائع بدائع وغیرہ پر اچھے خاصے نوٹ لکھے اور ولی کے کلام سے مثالیں دیں، جو ولی کے طالب علم کیلئے اب بھی مفید ہیں۔ حالانکہ ان میں کی کچھ چیزیں بعد کی تحقیقات کی روشنی میں غلط قرار دی جاچکی ہیں۔ تاہم اس ایڈیشن میں کچھ نقائص بھی تھے۔

(۱) سوائے ردیف کے مولانا احسن مرحوم نے قدیم املا کی خاطر خواہ پابندی نہیں کی۔
(۲) آپ نے نسخے تو بتا دیئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سی غزلیں کن کن نسخوں میں ملتی ہیں۔

(۳) کلیات میں شائع شدہ غزلوں سے متعلق کوئی ایسا نوٹ نہیں تھا جس سے الحاقی کلام کا پتہ چل سکتا۔
(۴) غزلوں وغیرہ کے اندراج میں کوئی اصول یا ترتیب نہیں برتی۔

موجودہ تحقیقات کی روشنی میں کلیات ولی، طبع اول میں کافی کسر معلوم ہوتی تھی۔ پھر وہ قریب الختم بھی تھا۔ اس لئے کلیاتِ ولی کے ایک دوسرے اور بہتر ایڈیشن کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کلیاتِ ولی طبع دوم نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

<u>کلیاتِ ولی، طبع دوم</u> | ۱۹۴۵ء کے قریب انجمن ترقی اردو نے اس کی دوبارہ ترتیب و تدوین کے لئے ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی کا انتخاب کیا اور انھوں نے بڑی جاں فشانی اور محنت کے بعد کلیاتِ ولی کا دوسرا نسخہ تیار کیا جو پہلے سے کہیں بہتر تھا۔ انھیں احسن مرحوم کے مقابلہ میں ۰ کی جگہ ۱۴ نسخے مل گئے تھے۔ اس سے بہت سارے اختلافات نسخ خود بخود ختم ہو گئے۔ اور ان کی مدد سے طبع اول کے الحاقی کلام کو بھی چھانٹ دیا۔ ولی کے حالات اور کلام سے متعلق بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں جن کے پیش نظر وہ احسن مرحوم کی غلطیوں سے بچ گئے۔ جو غزلیں وغیرہ کسی ایک نسخہ میں ملی ہیں انھیں تصدیق طلب نوٹ کے ساتھ ضمیمہ میں رکھا ہے کہ بعد میں توثیق ہو جانے کے بعد اصل متن میں شامل کر لیا جائے گا۔

ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے جس محنت اور دیدہ ریزی سے یہ خوبصورت ایڈیشن تیار کیا ہے اس کے لئے وہ بجا طور پر ہماری داد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ ان کے مرتبہ کلیات کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

(۱) ضروری امور پر مبنی ایک مختصر سا دیباچہ لکھا اور کچھ اور مخطوطات اور دوسرے ماخذوں، جن سے قرأت متعین کرنے میں مدد ملی ہے، ان کا ذکر کیا ہے۔ اور اردو کے فاضل محقق ڈاکٹر عبدالستار صاحب سے دکنی زبان کے متعلق ایک پُر مغز مقالہ حاصل کر کے کلیات میں مقدمہ کے طور پر شامل کر دیا ہے۔
(۲) پہلے کے حواشی میں ضروری ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔
(۳) قدیم املا اور کتابت میں یکسانیت قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔
(۴) حرف روی کے پیش نظر ردیف وار غزلیں درج کی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں یہ ترتیب باقی نہیں رہی ہے۔
(۵) ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کے بعد طبع اوّل کی فرہنگ انھوں نے آخر میں دی ہے۔
اور (۶) بعض الحاقی اشعار اور غزلیں اب بھی پائی جاتی ہیں۔
(۷) فرہنگ پر اب بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔
(۸) اختلافات نسخ کی کافی تعداد اب بھی اتنی اور ایسی ہے جن پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ قاضی احمد صاحب جوناگڑھی نے اپنے مضمون (ذکر آگے آتا ہے) میں کوئی ڈیڑھ سو زائد اختلافات پیش کئے تھے۔ میں نے کوئی ایک سو اختلافات نسخ دکھائے ہیں۔ ان میں چند ایک وہ بھی آ گئے ہیں جنھیں قاضی صاحب پہلے

بتا چکے ہیں۔ تاہم اتنے ہی کچھ اختلافات میں نے چھوڑ دئیے کہ ایک تو مضمون طویل ہو جائے گا اور دوسرے وہ مجھے کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوئے۔

کلیات ولی، طبع دوم پر ایک نظر | قاضی احمد میاں صاحب اختر جونا گڈھی اردو کے پرانے اور منجھے ہوئے شاعر اور ادیب ہیں۔ قبل پر انھوں نے بڑی کاوش کے ساتھ ایک مضمون رسالہ معنیٔ علی گڈھ کے شمارہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا اور اس میں ولی کے وطن، نام و نسب اور زبان پر سیر حاصل بحث کی تھی۔ اس کے بعد ایک اور مضمون لکھا اور کلیات ولی کی دوسری اشاعت پر انھوں نے اس پر ایک طویل تبصرہ اردو، اکتوبر ۱۹۴۸ء میں سپرد قلم کیا۔ اس میں ولی کے کلام کی قدر و قیمت محسوس کراتے ہوئے اس کی بتدریج تدوین وانشا سے متعلق معلومات فراہم کیں۔ اس مضمون کی جہاں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انھوں نے کلیات ولی طبع دوم کے مقابلہ میں ڈیڑھ سو اختلافات بتلائے ہیں، وہیں انھوں نے دیوان اشرف گجراتی کے کلام کے قلمی نسخے سے تقابل کرکے الحاقی کلام معلوم کیا اور مختلف تذکروں اور بیاضوں سے اشعار نکالے ہیں جو ولی کے نہیں بلکہ دوسرے شاعروں کے ہیں۔ فرہنگ کی غلطیوں کو درست کرنے کے علاوہ انھوں نے اس میں اضافہ کی گنجائش بھی دکھائی ہے۔

مخطوطے

قرأت کے اختلافات کے سلسلے میں اس دلچسپ چیز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں جب کہ طباعت کی تمام تر سہولتیں مہیا ہیں اور کاپی کے پتھر پر جانے سے قبل اور اگر ٹائپ ہو تو پھر کمپوزیٹر کے پروف بار بار دیکھنے کا موقع نہیں ملتا ہے مگر اس کے باوجود کتابت و طباعت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں اور بعد کو ایک غلط نامہ کا اضافہ بسا اوقات کسی کتاب کا ضروری جز بن جاتا ہے۔ پہلے تو ظاہر ہے کہ مختلف طبیعتوں، مقاموں اور زمانوں کے کاتبوں کے ہاں الگ الگ قرأتوں کا پیدا ہو جانا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کچھ اور باتیں ایک نیا انداز، ایک نیا پہلو لئے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً یہی کہ املا کی بدلی ہوئی صورتیں جو تلفظ اور لہجہ کے متنوع اتار چڑھاؤ کو نمایاں کرتی ہیں۔ یہیں لفظوں کی ارتقائی شکل بھی متعین ہوتی ہے۔ یہ لسانیات کے طالب علم کے لئے مفید مواد فراہم کر دیتا ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ عام ادب کے طالب علم کے لئے کوفت اور دوسری بھی ہی مہیا کرتا ہے۔ اس لئے کہ شاعر کے زمانہ کا املا یا قرأتیں دریافت کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تا وقتیکہ خود شاعر کے زمانۂ حیات یا اس کے قریبی زمانہ کا کوئی مخطوطہ دستیاب نہ ہو جائے۔

ولی کے دیوان کے مخطوطے مختلف سنین اور مختلف مقامات کے ملتے ہیں۔ مثلاً بمبئی میں منارہ مسجد کے کتب خانہ میں وہاں ولی کا ایک نسخہ ہے جو قصبۂ جالون (ضلع رتنا گری) میں ۱۲۰۵ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ جدید لب و لہجہ کی غمازی کرتے ہیں۔ اس نہج کے اور بہت سے مخطوطے تھوڑی بہت

کوشش سے مل جائیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ قرأت کی قدامت یا اس کی صحت کے سلسلے میں یہ ہمارے لئے مفید مطلب نہیں ہو سکتے۔ اب رہی قدیم نسخوں کی بات تو اختلاف مقام اور کاتب کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے۔ ایک قباحت اور رہوتی ہے کہ کسی شاعر کی شہرت سے متاثر ہو کر بعض کاتب یا شاعر اپنے یا کسی اور کے "خفائی" ہونے کی وجہ سے اپنی یا کسی اور کی غزل یا غزلیں وغیرہ مشہور شاعر کے دیوان میں تخلص کے بدلتے اور کبھی مصرعوں میں ترمیم کے بعد بڑھا دیتے ہیں۔ اس سے جو مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ بحث میں ڈالی ہوئی یہ چنگاری بڑی بڑی عمارتوں کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ اس کا علاج جہاں یہ قرار پا سکتا ہے کہ شاعر کے مزاج اور زبان کو پرکھ اور سمجھ لینے کے بعد ہم ان کا فیصلہ کریں، وہیں اگر قدیم نسخوں میں کوئی غزل ایسی نہ ملے جو مروجہ دیوان یا نسخہ میں ہو تو اسے خارج کر دینا چاہئے، چاہے ہمیں یہ یقین ہی کیوں نہ ہو چلا ہو کہ یہ غزل اسی شاعر کی ہے۔ بمبئی کے نسخوں میں مجھے کچھ زائد غزلیں ملی ہیں۔ انھیں اس مضمون کے اختتام سے پہلے درج کر دیا گیا ہے۔ ویسے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کسی قدیم دیوان کی اشاعت ایک آدمی کا کام ہونے کے باوجود بہت سے آدمیوں کا کام ہے۔ اگر ایڈیٹر اپنی غور و فکر کی صلاحیتوں، مطالعہ، اور انہماک سے کام لینے کے ساتھ ساتھ دوسرے عالموں سے بھی مشورہ کر لے تو بہتر ہے۔ اس سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غلطیوں کا امکان نہیں رہے گا تاہم ان کی تعداد گنتی ہی کی ہوگی ورنہ سینکڑوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

میں نے جن مخطوطوں کو مفید پایا ہے ان کی تعداد تین ہے اور ان کا ذکر علی الترتیب درج ذیل ہے۔

(۱) کامالائبریری کا مخطوطہ

کامالائبریری کی فہرست کتب مرتبہ اڈورڈ ریہ زیک، ام، سی، ای، مطبوعہ ۱۸۷۳ء کے صفحہ ۱۳۹ پر دیوان ولی، نشان ۵۴۹، ملتا ہے، جو اس فہرست کی ساتویں شق "شاعری" کے تحت ہے۔ اس مخطوطہ کے متعلق مرتب کا بیان یہ ہے:

"مختلف قسم کے خط پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض لاپرواہی کی غمازی کرتے ہیں۔ کہیں کہیں سے کرم خوردہ ہے۔ جلد اچھے چمڑے کی ہے۔ لمبائی ۸ء۵، چوڑائی ۵ء۴ اور دبازت ۳۰ ہے۔ یہ مخطوطہ ہندوستانی زبان کا ہے۔ آخری شعر میں شاعر ہمیشہ اپنا تخلص لاتا ہے۔ نام "نظمیں" (دواوین) میرے ہیں۔ ع۔ج (عشقیہ) ہیں۔ تاریخ درج نہیں ہے"

اس مخطوطہ کا خط بالعموم نسخ ہے جو کبھی کبھی شکست آمیز بھی ہو جاتا ہے۔ درمیان سے کچھ صفحے غائب ہیں اور کچھ نئے اضافہ ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کچھ ترتیب فہرست کے بعد ہوا ہو۔ ان نئے اوراق کے سلسلہ میں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل نسخے کے غائب شدہ اوراق کی غزلوں کی نقلیں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا خط زیادہ تر نستعلیق ہے۔ کاغذ یوں سب سفید ہے لیکن اضافہ شدہ اوراق کا کاغذ

زیادہ سفید اور بہتر ہے۔ اوراق پر باریک کاغذ یا جھلی چپکا دی گئی ہے۔ اس سے وہ محفوظ ہونے کے علاوہ مضبوط بھی ہو گئے ہیں۔ روشنائی سیاہ ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۳ سطریں ہیں اور تقریباً گیارہ شعر درج ہیں۔ نئے صفحوں کو چھوڑ کر جیسا کہ خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے اس کا کاتب ایک ہی شخص ہے۔ اس کا نام گوردھن ولد سندر داس ہے اور یہ موہ مالک اسورت کا رہنے والا ہے۔ اسی خاتمہ میں تاریخ کتابت بھی درج ہے جسے شاید مرتب فہرست نے نہیں دیکھا تھا

نئے صفحوں کے حاشیوں پر بعض اوقات متعلقہ غزلوں کے اشعار پائے جاتے ہیں جن کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ یا تو دوسرا کے کتابت کرتے وقت رہ گئے ہوں گے یا جس کاغذ سے انھیں نقل کیا گیا ہے اس میں بھی یہ اسی طرح درج ہوں گے اور دوسرے کاتب نے اس میں ترمیم مناسب نہیں سمجھی۔ دوسرا کوئی کاغذ چونکہ ان صفحوں میں جوڑ کر ان شعروں کو نہیں لکھا گیا ہے اس لئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ شعر بعد میں کہیں سے بڑھائے گئے ہوں گے۔

اس نسخہ کی پہلی غزل یہ ہے۔ مطلع ؎

کیتا ہوں تیرے ناؤں کوں میں ورد زباں کا کیتا ہوں تیرے شکر کوں عنوان بیاں کا

خاتمہ سے قبل اس میں "کفن ہرگز، حب الوطن ہرگز" والا مخمس ہے۔ جامع مسجد کے نسخہ ۱۸۶۱ کی طرح اس میں بھی مفرد اشعار نہیں۔ یہ نسخہ کافی قدیم ہے۔ اس لئے اس کی قرأتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے صفحوں پر بائیں طرف سے گجراتی ہندسوں میں پنسل سے ایک صفحہ چھوڑ کر سلسلہ وار نمبر لگائے گئے ہیں۔ بعض اوقات غلطیوں کی اصلاح حاشیہ میں کر دی گئی ہے۔ لیکن خط اور قلم ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے خیال گذرتا ہے کہ کاتب بھی ایک ہی ہوگا۔ غزلوں کا اندراج حروف تہجی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی حرف تہجی کی غزلیں آگے پیچھے بھی ہو گئی ہیں۔ جس کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے جیسے غزلیں دستیاب ہوتی گئیں لکھی جاتی رہی ہیں یا پھر جس نسخہ سے یہ نقل تیار ہوئی (اگر یہ واقعی نقل ہے) ہے، اس میں بھی یہی ترتیب رہی ہوگی۔

تاریخ کتابت کے سلسلہ میں خاتمہ میں سے یہ عبارت من وعن نقل کی جاتی ہے۔

"خاتمۃ الکتاب دیوان استاد الانامی مولانا ولی واقعہ (کذا) بتاریخ بست و پنجم شہر جمادی الاولے (کذا) سنہ دوم جلوس عہد پادشاہ جہانجاہ (کذا) محمد شاہ بادشاہ خلد اللہ خلافتہ فی الارض مطابق سنہ ۱۱۳۲ ہجری"۔

اس طرح قدامت میں اس کا نمبر پروفیسر شیرانی مرحوم کے مخطوطہ کے بعد آتا ہے۔ اس میں کوئی تین سو چھتیس غزلیں اور مطبوعہ نسخہ کا پانچواں اور ساتواں دکل دو مستزاد اور چودھواں، دسواں اور ساتواں مخمس علی الترتیب ملتے ہیں۔

اس کے املا کی خصوصیات

(۱) ک اور گ میں امتیاز نہیں۔

کفار فرنگ۔ ۶ کفار فرنک کوں دیا ہے۔

گرد۔ ۶ جس کرد ادپر پانو رکھیں تیرے رسولاں وغیرہ

(۲) "ہ" کو لفظ ماقبل سے اکثر ملا دیا ہے۔

دیدہ۔ ۶ اس گرد کوں میں کحل کروں دیدہ جانکا وغیرہ

(۳) حروف کو بالعموم ملا کر لکھا ہے۔

عدل، اے، اہل ۶ مجہ صدق طرف عدل سوں اےاہل حیا دکھ

پردہ ۶ لکھا ہوں پردہ دل پہ خیال اس یار جانے کا وغیرہ

(۴) "ھ" کو "ہ" سے ظاہر کیا ہے۔

بوجھ۔ ۶ یو بوجہ کے بلبل ہوں ہر یک غنچہ دہاں کا

کھایا، تجھ۔ ۶ کہایا ہے جہ کو ہے تیر تجہ ابرو کماں کا وغیرہ

(۵) زائد حروف کا استعمال۔

تیر کی جگہ تیری ۶ کہایا ہے جہ کو ہے تیری تجہ ابرو کی کمانکا

نکلنا، نکلنا ۶ اسے دشوار ہے جگ میں نکلناں غم کے پہاند سیوں

جھنکار، جھنکار ۶ ٹک پانوں کی جھنکار کار آواز سناتی جا وغیرہ

(۶) حرفوں کے ضروری شوشے یا خود حرفوں کا نہ لکھنا۔

گوہر کے لئے گہر ۶ ابر نیساں عید ہے مجہ چشم گہر بار کا

سیتی، ستی ۶ دلکوں میرے تب ستی حاصل ہوا ہے پیچ و تاب

نہاں، نہاں ۶ اگر تجہ حسن عالمگیر کوں دیکھیں سخن نہاں وغیرہ

(۷) مد چھوٹ گئی ہے۔

آفتاب۔ ۶ تجہ تل سوں ای افتاب طلعت

آزمائیگا۔ ۶ ولی چرچا اچھے مجلس میں جب طبع ازمائیگا

آشنا۔ ۶ ہے بحر دل میں طبع سخن اشنا بلند وغیرہ

(۸) یعنی کے لئے واؤ کا استعمال

اسے۔ ۶ چراغ دل اگر گل ہے تو کر جیوں گل ادسے روشن

سرج۔ ۶ نہیں دیکھتا سورج کی جھلکار کا تماشا

(۹) نقطے چھوٹ گئے ہیں

نزیک۔ ۶ کہ یو تحفہ ہے سالک کا نزیک حق کے لے جانے کا

مقتضا۔ ۶ یہی ہے مقتضا عالم میں ہنگام جوانی کا

بے اعتدالی۔ ۶ کہ جس میں مو برابر نہیں اثر لے اعتدالی کا وغیرہ

(۱۰) "ی" اور "ے" میں فرق ملحوظ نہیں۔

کی۔ ۶ لکھو نیچے اوپر حرف اس دہن کے نکتہ دانی کا

شرابی۔ ۶ ہوا ہے دل مرا مشتاق تجھ چشم شرابے کا (پوری غزل اسی طرح ہے) وغیرہ

(۱۱) "کہ" کو "کے" اور "کے" کو "کہ" لکھا ہے۔

کہ۔ ۶ عزیزاں بعد مرنے کے بوجھو تم کے تنہا ہوں

کے۔ ۶ سب دلبراں نے آکہ دیے تجکوں باج آج وغیرہ

(۱۲) "ہ" مفتوح کو "ا" سے ظاہر کیا ہے۔

زمانہ کی جگہ زمانا ۶ عجب رکھتا ہے کیفیت زمانا نیم خوابی کا

بندہ " بندا ۶ بندا ہوں پیا کی دلبری کا وغیرہ

(۱۳) ڑ کے لئے ر۔ ۶ پڑیا ہے لعل میں پرتو سجن تجھ لب کی لالی کا

ڑ " ڑ ۶ یو رنگ زرد اوڑا مجھ ضعیف کوں لیکر

ڑ " ر۔ ۶ یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا

ڑھا " را۔ ۶ چڑھا ہے آرسی پر تب سوں رنگ حیرت فزائی کا وغیرہ

(۱۴) "ی" کے نیچے کہیں کہیں دو نقطے دیے ہیں۔

۶ اہل گلشن پہ تیرے قد نے جب امداد کیا وغیرہ

(۱۵) "ڈ" کبھی "د" اور کبھی "ڈ" لکھا ہے۔

ڈر۔ ۶ کہ اطراف حرم میں ہے ہمیشہ ڈر حرامیکا

ڈھونڈ۔ ۶ نہ ڈھونڈو شہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانا تم وغیرہ

(۱۶) ٹ کو ت، ٹ اور ٹھ کو تھ سے ظاہر کیا ہے۔

تک ۶ تک چلنا جو دیکھا ہے بسکہ میں سیدھا معالیکا

اٹکا ۶ حلقہ میں تجھ زلف کے جو جیو جا کے اٹ کا

ٹھکانا۔ ۶ نہ ڈھونڈو شہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانا تم وغیرہ

(۱۷) زائد نقطے

چھنا۔ ۶ فلک چھنتا جو دیکھا بسکہ میں سید معالی کا

جھلکار۔ ۶ داغ ہے تجہ حسن کی جھلکار کا وغیرہ

(۱۸) علامت اضافت کا حذف

شہرۂ عالم۔ ۶ مرے دل کی حقیقت یوں ہوئی ہے شہرہ عالم

نسخۂ اسرار۔ ۶ بھید پایا نسخہ اسرار کا وغیرہ

(۱۹) "د" کو "ڈ" سے ظاہر کیا ہے

گدائیکا۔ ۶ میرے دل نیں یا ہے اس سبب شیوہ گدائیکا

دلدار۔ ۶ دل ہوا ہے بتلا دلدار کا وغیرہ

(۲۰) لفظ چھوٹ گئے۔

کھ۔ ۶ تیرا ہے دیکھ کر گلشن میں شمشاد

کے۔ ۶ عیاں ہے اشک طومار سوں احوال عاشق کا

نے۔ ۶ باتقریوں دیا ہے مجکوں دل کی بشارت وغیرہ

(۲۱) زیر کو "ی" کے دو نقطوں سے ظاہر کیا ہے۔

مرے، تری۔ ۶ دل کوں میرے بھنواں نے تیری جوں بینور کیا

دکھلا۔ ۶ اپسکی زلف کا فرکیش کی جہلکار ٹک دیکھلا وغیرہ

(۲۲) "ادلا" کے لئے "اولا" کا استعمال۔

۶ اولا سرد غلامی ستی آزاد کیا وغیرہ

(۲۳) "لالے" کی جگہ "لالا"

۶ تجہ مکھ کا پوتن دیکھ کر لالا کا دل کالا ہوا وغیرہ

(۲۴) محض "نشہ" کے لئے ہی نہیں بلکہ "نشہ" کے لئے بھی "نشاء" بار بار آتا ہے

محض نشہ ۶ نشاء بخشی میں سے سوں ہے بہتر

نشہ خط ۶ نشاء خط سبزۂ خوباں وغیرہ

(۲۵) "ء" کے لئے "ی" کا استعمال۔

قائل ۶ قایل اس بات کی ہے باد صبا

طائر۔ ؎ بچے گا کب تلک اے طایر دل روز وحشت سوں وغیرہ

(۲۶) لفظوں کو توڑ کر لکھنا۔

عصا۔ ؎ بخشتے ہیں عاسا آہ کا تجہ چشم کے بیمار کوں

چاہتا۔ ؎ گر مجہ کو چاہ تا ہے تو مت مل رقیب سوں وغیرہ

(۲۷) زائد لفظ

"کوں" غیر ضروری ہے۔ ؎ سورت ستی چلیا ہے کعبہ کوں جہاز گویا وغیرہ

(۲۸) لفظ ادھر ادھر ہو گئے

ہے ایک اخگر۔ ؎ تجہ حسن کی اگن کا ایک اخگر ہے آفتاب وغیرہ

(۲۹) نقطوں کا الٹ پھیر

جدا۔ ؎ کہ اہل عیش خدا ہور یہ درد مند جدا

بھار۔ ؎ سو رضیعت ہے ولی خاک قدم تہار اسے

بہا۔ ؎ متاع حسن کا دو جا نہا نہیں وغیرہ

(۳۰) اضافت کے لئے "ی" کا استعمال۔

گل گل رو۔ ؎ گلے گل رو کوں پایا ہوں مجھے گلشن سوں کیا مطلب وغیرہ

(۳۱) "و" کے ساتھ "ی" ہونے کی وجہ سے اسے "نیٔ" یا "تیٔے" لکھا ہے

کوئی۔ ؎ کہایا ہے جو کوئیے تیر تجہ ابرو کی کمانکا وغیرہ

(۳۲) غلط املا۔

عاجزاں۔ ؎ جو سنیا تجہ سوں دعوا کئے ہیں اجزاں

پھنسے۔ ؎ کہ اس کی چال میں لاکہاں پہسے ہیں اہل دل آکر

کثیف۔ ؎ کہ فرق ان میں ہے جیوں فرق ہے کسیف ولطیف

پڑھنا۔ ؎ پڑہناں مطول کا کیا ان نے درس میں مختصر

آج۔ ؎ اے ولی جیوں کوں آجہ کرتے ہیں وغیرہ

(۳۳) بے احتیاطی

زبر کے لئے مد۔ ؎ عین دیول پوتلی ہے یا کعبہ میں ہے آسود

ابرو " ادبرو۔ ؎ اوپر ادبرو کی کشتی کے پوتلا باغدادستا

گوشہ " کون۔ ؎ اشک کرتے ہیں مکاں کون داماں میں آ

بجھاتی	کے لئے	بجاتی۔	۶	ٹک بہر کے پانی سو (ں) یو آگ بجاتی جا
کمہ	"	کمے۔	۶	شکل تجھ کے کی دل میں جو ہوئی ہے منقش
سے	"	سے۔	۶	نام سے ہوتا ہے جیوں نسرن گلوگیر طلا
بلا بلند	"	بلند بلند۔	۶	سنتا ہوں ہر طرف سے صدائے بلند بلند
ہے	"	کے۔	۶	کمر اس دلربا کی دلربا کے
تحکم	"	تحلم	۶	نصیحت عاشقوں کوں ہے تحلم
بوٹے	"	بوٹیے۔	۶	یو تیتے نہیں نرگس کے دکھنم تیری قبا پر
نشانہ	"	نشاناں۔	۶	عالم میں ہے وہ تیر ملامت کا نشاناں وغیرہ

جامع مسجد کے مخطوطے

بمبئی کے تقریباً ہر دوسرے، تیسرے محلے میں ایک کتب خانہ یا دار المطالعہ پایا جاتا ہے۔ ان سے بعض محض اخبارات اور رسالوں ہی تک محدود ہیں اور بعض میں تھوڑی بہت کتابیں بھی ہیں۔ جن میں زیادہ تر مذہبی اور فقہی کتابوں کے ساتھ شرر کے ناول اور تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے ہوا کرتے ہیں۔ لیکن کچھ کتب خانے ایسے بھی ہیں جن میں مختلف علوم و فنون کی جدید اور قدیم، سنجیدہ و غیر سنجیدہ کتابوں کے علاوہ نظم و نثر کی قلمی کتابیں بھی موجود ہیں۔ آج کل کم و بیش یہ سب کتب خانے بمبئی میونسپلٹی کے تحت ہیں۔ ان سے الگ کاما لائبریری اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کتب خانہ ہے۔

جامع مسجد کا کتب خانہ مسجدی کتب خانہ ہونے کی حیثیت سے بمبئی کی لائبریریوں میں ایک علیحدہ نوعیت کا مالک اور قدیم مسجدی کتب خانوں کی روایات کا حامل ہے۔ اس میں زیادہ تر عربی، فارسی اور اردو کی مذہبی اور فقہی کتابیں ہیں لیکن دوسرے موضوع پر بھی یہاں ہیں کتابیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مخطوطوں کی بھی کچھ کمی نہیں ہے۔ انھیں مخطوطوں میں دیوان ولی کے دو قلمی مخطوطے ہیں جن کا میں تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ کاما لائبریری کے مخطوطہ کے ساتھ میں نے کلیات ولی دیوان دوم سے ان نسخوں کی بھی قراُتوں کا تقابل کیا ہے۔

موجودہ فہرست کے مطابق نشان ۱۱۸۵، ۱۱۸۶ پر دونوں مخطوطے ملتے ہیں۔ نشان ۱۱۸۵ والا مخطوطہ وہ ہے جسے ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے ولی کی تاریخ وفات متعین کرنے کے سلسلہ میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا نشان ۴۲۷۹ تھا۔[۱]

دیوان ولی نشان ۱۱۸۵

یہ نسخہ بھی کاما لائبریری کے نسخہ کی طرح سیاہ روشنائی سے خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ مگر یہ خط نسخ شکست کی بھی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کاغذ سفید ہے۔ جہاں تہاں سے کیڑوں نے کھا رکھا ہے۔ اس لئے پڑھتے وقت بھی

---

[۱] کلیات ولی، طبع دوم ص ۱۳۰-۱۳۱

کبھی وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درمیان سے کچھ صفحے نکل گئے ہیں۔ لیکن ان کی جگہ نئے صفحوں کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ کا سائز ۶ × ۹۳/۴ ہے اور ہر صفحہ پر باریک خط کی وجہ سے اوسطاً ۱۵ ورنہ موٹے خط کی وجہ سے بارہ سطریں اور پھر صفحہ پر اسی لحاظ سے تیرہ ۱۳ اور گیارہ ۱۱ شعر درج ہیں۔ کتابت کی غلطیوں کی اصلاح حاشیہ میں کر دی گئی ہے اور کبھی کسی غزل کے چھوٹے ہوئے شعر اور لفظ بھی حاشیہ میں ملتے ہیں۔ اور کبھی حاشیہ اور پیشانی پر مستقل غزلیں بھی نظر آتی ہیں۔ کتابت میں چونکہ کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ ایسی غزلیں پہلے لکھتے وقت لکھنے سے رہ گئی ہوں گی یا پھر بعد میں ملی ہوں گی اور ردیف کی رعایت سے یہاں اضافہ کر دی گئیں۔ ایک آدھ جگہ ایک غزل ختم نہیں ہوئی ہے کہ دوسری ہم وزن اور ہم ردیف غزل شروع ہو گئی ہے کبھی مطلع کے ساتھ اور کبھی بغیر مطلع کے۔ آخر میں تاریخ کتابت درج ہے۔ خاتمہ کی عبارت یہ ہے:-

"تمت تمام شد تحریر ایں نسخہ از فرست شہسوار بیگ بتاریخ بست و یکم
شہر ذی قعدہ ۲۱ سنہ جلوس والا، محمد شاہ بادشاہ غازی"

اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ تاہم پورے مخطوطے میں شروع سے آخر تک ایک انداز تحریر نظر آتا ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کاتب ایک ہی شخص ہے۔

اس نسخہ کی پہلی غزل یہ ہے، مطلع ؎

کیتا ہوں تیرے ناکوں میں درد زباں کا کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

اور ترجیع بند شروع ہونے سے قبل یہ غزل ہے، مطلع ؎

تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے تیری نگاہ گرم سوں گل گل پگھل گئے

اس کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) تین سو آٹھ ۳۰۸ غزلیں — دو چار غزلیں دو بارہ لکھی گئی ہیں اور میں نے انھیں الگ الگ ہی شمار کیا ہے۔ کیونکہ اختلافات معلوم کرنے کے لئے دونوں ہی کو سامنے رکھا ہے۔

(۲) ترجیع بند: ایک

(۳) ایک قصیدہ: پیغمبر اکرمؐ کی شان میں: "فانی کرے، پانی کرے"

(۴) مطبوعہ نسخے کے یہ مخمس مجھے اس ترتیب کے ساتھ ملے ہیں: ۹، ۷، ۱۳، ۱۰، ۱۸، ۱۷، ۱۶ اور ۱۱ ایک مخمس زائد ہے جسے میں مضمون کے آخر میں دے رہا ہوں۔

(۵) مستزاد: مطبوعہ نسخے کے یہ مستزاد علی الترتیب پائے جاتے ہیں: ۵، ۷، ۹، ۱، ۲۔

(۶) بازگشت کے عنوان سے دو غزلیں ہیں جو مطبوعہ کے نمبر ۱۴۱ اور ۲۳۲ پر درج ہیں۔

(۷) رباعیات: کل سات ہیں، ان میں چار مطبوعہ نسخہ میں نمبر ۲۴، ۸، ۲، ۱۱ پر ہیں۔ باقی تین ۳

زائد رباعیاں اس مضمون میں شامل ہیں۔

(۸) فردیات: کل پندرہ شعر ہیں۔ ان میں کے غیر مطبوعہ شعر میں نے لے لئے ہیں۔ مطبوعہ کا شعر نمبر ۲۸ من وعن اس میں درج ہے۔

(۹) ان سب کے بعد وہ تاریخی قطعہ ہے جس کی مدد سے بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے ولی کی تاریخ وفات متعین کی تھی۔

املا کی خصوصیات

(۱) ک اور گ کا املا یکساں ہے۔

اگر، عالمگیر۔	۶	اگر تجہ حسن عالمگیر کوں دیکھیں سخن فہماں
دلگا ریکا۔	۶	نہیں کوئی تا سنے احوال میری دلفکا ریکا وغیرہ

چنانچہ کہ اور گہ میں فرق نہیں رکھا ہے۔ اور کبھی کبھی محض ک یا گ سے کہ یا گھ کا کام لیا ہے

(۲) یائے معروف اور مجہول میں امتیاز نہیں۔

کی۔	۶	اگر تجہ حسن کامل کے سُنے تعریف مہ رویاں
ہے۔	۶	ترے غم میں نین سوں جیوں نکلتا ہی انجھو باہر وغیرہ

(۳) ڈ کا املا کبھی د اور ڈ اور ڑ کبھی ر اور ڑ کی صورت میں ملتا ہے۔

ڈالے۔	۶	جو کوئی دالے پرت کی آگیں تمن کوں یوں اپنے
ڈر۔	۶	کہ اطراف حرم میں ہے ہمیشہ ڈر حرامی کا
پڑا۔	۶	سنبل پرا ہے دام میں تجہ زلف کے اے گل بدن
جھگڑا۔	۶	تجہ ناز ستمگر سیں جھگڑ کون سکیگا

"خدا سوں ڈر"، "اڑ ہے، بڑہے" اور "پچھاڑ ہے، کراڑ ہے" والی غزلوں میں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔

(۴) افعال وغیرہ میں "ں" کا اضافہ کیا ہے جو قدیمی املا ہے۔ مثلاً کرنا کو کرناں لکھا ہے۔ اس کے لئے مطبوعہ نسخہ میں "باز کرناں" والی غزل ملاحظہ ہو۔

(۵) بعض دفعہ لفظوں کو ملا کر خط شکست میں لکھا ہے اور نقطوں کا دینا بھی غیر ضروری نہیں سمجھا بلکہ ان کے ادہر اُدہر پڑنے کی بھی پروا نہیں کی ہے۔

لیکے۔	۶	طالب جو تیرے لکی ہیں اونکوں شکر سوں کام کیا
مجلس میں۔	۶	ولی چرچا ایہے مجلسیں جب طبع آزمائیگا

کیفیت، نیم ۔ ۶ عجب رکھتا ہے کیفیت زمانہ نیم خوابیکا وغیرہ

(۶) تجھ، مجھ وغیرہ کو تجہ، مجہ لکھا ہے۔

مجھ ۔ ۶ پر پروانہ اوپر لکھ بیاں مجہ جاں فشانی کا

تجھ ۔ ۶ گر تجہ میں اے ہٹیلے ہوتا نہ طور ہٹ کا وغیرہ

(۷) پیش کے لئے واؤ کا استعمال

اس ۔ ۶ لکھا ہوں پردۂ دل پر خیال اوس یار جانیکا

اُنکوں ۔ ۶ طالب جو تیرے لبکے ہیں اونکوں شکر سوں کام کیا وغیرہ

(۸) زبر کے اظہار کے لئے "ہ" کا اضافہ۔

زندگی سوں ۔ ۶ مجہ زندہ گیسوں آہ اودا سی کیا پیا

آزادگی ۔ ۶ آزادہ گی سوں آج ہوئی اوسکوں رستگی وغیرہ

(۹) ہ کو حرف ماقبل سے ملا کر محض ایک شوشہ سے ۔ ظاہر کیا ہے۔

دیدہ و جانکا ۔ ۶ اوس گرد کوں میں کحل کروں دیدہ و جانکا وغیرہ

(۱۰) بوجھ، دیکھ وغیرہ کو بوجہ، دیکہہ وغیرہ کی طرح لکھا ہے۔

بوجھ ۔ ۶ یوں بوجہ کے بلبل ہوں ہر ایک غنچہ دہانکا

دیکھ ۔ ۶ مجہ صدق طرف عدل سوں اے اہلِ حیا دیکہہ وغیرہ

(۱۱) زیر کے لئے "ی" کا استعمال۔

خراباتِ دو عالم ۔ ۶ خراباتے دو عالم میں سدا ہے وہ خراب اوسکا

دِکھا ۔ ۶ ٹک اپس کا کھ دیکھا اے راحتِ جان و جگر

اضطرابِ دل ۔ ۶ اضطرابے دل گیا ہے پیو کے مکھ کوں دیکہہ کر وغیرہ

(۱۲) ی کے نیچے کبھی کبھی دو نقطے لگائے گئے ہیں۔

نے ۔ ۶ نے شوق اوسکے میں کدہی لالہ زار کا وغیرہ

(۱۳) ٹ کو ٹ، ٹ وغیرہ سے ظاہر کیا ہے۔

ٹ ۔ ۶ مجہ کٹ میں اے نگھر کٹ سے شوق تجہ گنگٹکا

ٹ ۔ ۶ اگر بخت میرے کریں ٹکہ مد وغیرہ

(۱۴) ک کو کہ لکھا ہے۔

ٹک ۔ ۶ ٹکہ اپسکا مکھہ دیکہا اے راحتِ جان و جگر

	۶	اگر بخت میرے کریں ٹک مدد	وغیرہ

(۱۵) "کے" کو "کر" کی صورت میں استعمال کیا ہے۔

پی کے	۶	جو تجھ نین کے جام سوں مد پکے متوالا ہوا	وغیرہ

(۱۶) س، ص، ث میں امتیاز نہیں۔

تاثیر	۶	دل میں جب عشق نے تاسیر کیا
نثار، سرِ چمن۔	۶	اے ولی ہونا سرِ چمن پر نسار
اسراف۔	۶	حق شناسوں کے نزیک اصراف ہے

(۱۷) اُ کو محض مفتوح ہ سے ظاہر کیا ہے۔

پیا	۶	اگر جاوے پیہ کے گھر طرف بخت آزمائیکوں	وغیرہ

(۱۸) "ہ" کا حذف

سدھ۔	۶	اس بیخودی کے گھر کی طرف سد کوں ڈال چل	
ساتھ۔	۶	حسن صورت کے سات حسن ادا	
سرہانے۔	۶	تکیہ میرے سرانے ہر چند مخملی ہے	وغیرہ

(۱۹) بعض اوقات حرف ماقبل کے زیر کے ساتھ ہائے مختفی سے "ے" کا کام لیا ہے۔

اسواسطے۔	۶	دامن صد چاک گل اسواسطہ پرخوں ہوا
سینے۔	۶	میرے سینہ کی آگ بوجھایا نہیں ہنوز

(۲۰) ت کا املاء پر دو نقطے دے کر لکھا ہے۔

بشارت	۶	ہاتف نے یوں دیا ہے مجکوں ولی بشارۃ	
حقیقت	۶	کیونکر چھپا سکوں میں تجہ درد کی حقیقتہ	وغیرہ

(۲۱) ہائے مختفی کے نیچے کے زیر کے لئے ی کا اضافہ کیا ہے

نگہ چشم	۶	نگہی چشم سرمگیں کی ادا	وغیرہ

(۲۲) ں کا حذف

نہیں۔	۶	اطراف آسماں کے ہجوم شفق نہیے
مجنوں۔	۶	مثل مجنو نہیں بیاباں گرد وحشت کی قسم
ہیں۔	۶	زخمی ہے مجاں تیری شمشیر جفا کے

(۲۳) بعض جگہ مد کا لکھنا ضروری نہیں سمجھا۔

آئینہ۔	۶	باندھا ہے جو دل ادس رخ آئینہ نما پر	
آگے۔	۶	ہم پاس اکہ بات نظیری کی مت کہو	
آہ۔	۶	روشن ہے بزم عشق سدا شمع اہ سوں	وغیرہ

(۲۴) جہاں ی کے ساتھ ہمزہ استعمال کرتا ہے وہاں ی پر ایک شوشہ کا اضافہ کیا اور پھر اس پر ہمزہ لکھی ہے۔

جدائی۔	۶	ہے جدائی میں زندگی مشکل	
جوئے شیر	۶	کوہ کن کوں فیض کب پہنچا ہے جوئی شیر سوں	وغیرہ

(۲۵) "ہ" کا استعمال۔

دیکھ۔	۶	اگر ادس دہیہ تیں آوے چمن میں	
پلک۔	۶	مدت ہوئی پاکہہ سوں پلک آشنا نہیں	وغیرہ

(۲۶) "نبھ" کو ہمیشہ "م" کے ساتھ "ہ" لگا کر لکھا ہے۔

سنبھالے۔	۶	تیری مژگاں نے تب سنبھالے بھال	
سنبھال۔	۶	اس راہ اریپچ میں اے دل سنبھال چل	وغیرہ

(۲۷) و کا حذف

تعلیم و تعلم۔	۶	ہوا ہے سو تعلیم تعلم	
وصل و جدائی۔	۶	ولی وصل جدائی سوں صنم کی	وغیرہ

(۲۸) ی کا حذف

پڑینگے۔	۶	گل پڑینگے گل جو یو بیشک گلستان کے بھتر
رہینگے۔	۶	جیوں برق بیقرار رہینگے کفن میں ہم
بچہ۔	۶	اضطراب دل گیا ہے ہو کے کہہ کوں دیکھ کر

(۲۹) ناموزوں لفظ

نزک	۶	ہمن سیں بے سرو ساماں نزدیک اس راہ قاصد نہیں	
دلبراں	۶	دلرباں کا حسن جس مسند کا پا انداز ہے	وغیرہ

(۳۰) حرف کہیں کہیں چھوٹ گئے۔

ہوا	۶	وہ صنم جیسوں ہو عانی دماغ بزم حسن	وغیرہ

(۳۱) پورے لفظ لکھنے سے رہ گئے۔

آوے	۶	اوجالا تب ہوی مجہ گھر میں کہ جب وہ مہ جبیں آوے	
پیدا	۶	صنوبر گر میرے سایہ سوں ہوی تو بجا ہے	
ہے	۶	ہوا دل نشیں دو سرو قامت بسکہ مجہ دل میں	وغیرہ

(۴۲) ہمزہ کا حذف

تختۂ خارا	۶	ہو سنگدلی تختۂ خارا پہ لکھا ہوں
طاؤس	۶	کوہ و صحرا صورت طاؤس ہے
صفحۂ کاغذ	۶	بے تکلف صفحہ کاغذ پہ بیضا کروں

(۴۳) ایک ہی غزل کی ردیف میں "نیں" اور "نہیں" دونوں کو جائز سمجھا ہے

نیں	۶	اگر گلشن میں وہ رنگیں ادا نیں	
نہیں	۶	متاع حسن کا دو جا بہا نہیں	وغیرہ

(۴۴) لفظوں کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔

شکستگی	۶	تجہ زلف کی شکنج نے دیا مجہ شکستگی
خستگی	۶	بیطاقتی میں ہوش نے پایا ہے خستگی

جامع مسجد کا دوسرا مخطوطہ نشان ۱۱۸۶

اس کے صفحوں کا سائز ۹ x ۶ ہے۔ ہر صفحہ پہ سرخ روشنائی سے دُہری جدول بنی ہوئی ہے۔ جدول کا سائز ۷ x ۳ ہے اور ہر صفحہ پر ۱۷ سطریں ہیں اور سیاہ روشنائی میں اوسطاً ۱۵ شعر ہیں۔ اس کا خط نستعلیق ہے۔ کاغذ کا رنگ ہلکا بادامی سا ہے۔ کیڑوں نے اسے بھی یہاں وہاں سے کھا رکھا ہے۔ مرمت کی غرض سے ان جگہوں پر کاغذ چپکا دیا گیا ہے جس سے پڑھنے میں کافی دقت ہوتی ہے۔ بعض اوقات حاشیہ میں غلطیوں اور کبھی چھوٹے ہوئے لفظوں کو لکھ دیا گیا ہے۔ ایک آدھ جگہ نسخہ ۱۱۸۵ کی طرح ایک غزل ختم نہیں ہو پاتی کہ دوسری غزل اسی وزن اور ردیف کی غزل کے اشعار کبھی مطلع کے ساتھ اور کبھی بغیر مطلع کے درج کر دیے گئے ہیں۔ کاتب یوں تو ایک ہی شخص معلوم ہوتا ہے لیکن نہ تو اس کا نام کہیں لکھا ہوا ہے اور نہ ہی سنہ کتابت کہیں تحریر ہے تاہم قیاس یہ کہتا ہے کہ یا تو یہ بارھویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں لکھا گیا ہوگا یا پھر کسی ایسے نسخے سے اسے نقل کیا گیا ہے جو انہیں تاریخوں کا ہے۔ اس نسخہ کی جلد میں انتخاب دیوان ناصر علی اور اخبار نامۂ نرائن وغیرہ بھی مجلد ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی تاریخ کتابت نہیں ملتی۔ پرانی فہرست چونکہ مجھے نہیں ملی اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ نسخہ ۱۱۸۵ کی طرح ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی نظر سے یہ نسخہ گزرا ہے یا نہیں۔

اس نسخہ میں بھی پہلی غزل وہی ہے جو کالا برمدی اور جامع مسجد کے اور ان کے نسخے میں ہے۔ تاہم

دونوں کے مقابلہ میں زیادہ غزلیں پائی جاتی ہیں۔

"ماں مچھ صدق آشا کی قسم" والے مخمس کے بعد کے کچھ اوراق نہیں ہیں۔ اور ترجیع بند ؎

گہر کی طرح جگ میں نایاب ہوں   ترے غم کے دریا کا بیتاب ہوں

کے دو بند ملتے ہیں۔

ایک غزل میں دوسری غیر متعلق غزل بھی ہے۔ مثلاً ایک غزل کا مطلع ہے ؎

تجہ عشق کی اگن میں سجن جل گیا ہوں میں   تیری گلی کی خاک میں جا رل گیا ہوں میں

اس کے تین شعر کے بعد ایک دوسری پوری غزل لکھی ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

باندھا ہے جب سیں شوخ نے خنجر کمر منیں   سب کلرخاں کے جیو پڑے ہیں خطر منیں

اس میں کوئی ۱۸۲ غزلیں ہیں۔ مطبوعہ مخمسات میں سے علی الترتیب ۶، ۱۶، ۱۷، ۱۲، ۱۱، ۱۴ اور ۱۰ واں مخمس ہے۔ تاہم ساتواں مخمس مکمل نہیں ہے۔ اس کا پہلا بند اور دوسرے بند کے چار ابتدائی مصرعے ہی ملتے ہیں۔ اس کے بعد کے اوراق غائب ہیں جو غالباً جلد بندی کے وقت غائب ہوگئے ہوں گے۔ آخر میں مذکورہ ترجیع بند کا دوسرا اور تیسرا بند بھی ہے۔ قراتوں میں کچھ اس قسم کا اختلاف ہے کہ اس سے زبان کو صاف کرنے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے۔

املا کی خصوصیات

اس کے املا کی مندرجہ ذیل خصوصیات چونکہ کاما لائبریری کے نسخہ اور جامع مسجد کے نسخہ اول میں بھی پائی جاتی ہیں اس لئے محض ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے، مثالیں نہیں دی ہیں۔

(۱) ی کے نیچے دو نقطے دیئے ہوئے ہیں

(۲) ک اور گ میں کوئی امتیاز نہیں

(۳) ی اور ے میں فرق نہیں رکھا

(۴) کھایا کو کہایا، کچھ کو کچہہ، مجھ کو مجہہ اور تجھ کو تجہ لکھا ہے۔

(۵) لفظ چھوٹ گئے۔

(۶) حرف چھوٹ گئے۔

(۷) ٹ کو ت لکھا ہے

(۸) ، کے ساتھ ی ہونے پر اسے ئی لکھا ہے۔

(۹) پیش کے لئے واؤ کا استعمال۔

(۱۰) زائد نقطے۔

(۱۱) نقطے کہیں کہیں کم بھی لگائے ہیں
(۱۲) افعال کے ساتھ اور ویسے قدیم املا کے واسطے لفظوں کے آخر میں "ں" بڑھایا ہے۔
(۱۳) گ کے لئے کہیں کہیں محض ک کا استعمال
(۱۴) ؤ کا حذف
(۱۵) مد کا حذف
(۱۶) لفظوں کو ملا دیا ہے۔
(۱۷) کہ اور کے کا املا کہیں کہیں ایکساں ہے
(۱۸) لفظوں کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

اب میں اس کے املا کی اُن خصوصیات کو لیتا ہوں جن میں سے اگرچہ بعض مذکورہ نسخوں میں مشترک ہیں لیکن نسخوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے میں نے اِن سے الگ کر لیا ہے۔ تاہم بیشتر ایسی ہیں جو اسی نسخہ کے ساتھ مختص ہیں۔

(۱۹) غلط املا

ذ رہ	۶	ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی
نفع	۶	بوجھے ضرر کو جو نفا اور نفع سوں بوجھے ضرر
تلاطم	۶	اٹھا امواج دریاج بن طلاطم
ادا	۶	کیفیت بیار عدا تب سوں ہے عیاں
تجہ ر	۶	بجان و دل ہو کو مشتاق ہیں تجہ ہور پیکر کے
اِرم	۶	تماشا دیکھنے کوں چھوڑ گلزار عرم نکلے
حرام	۶	فجر کے وقت گر دلبر چلے ہام کی جانب وغیرہ

(۲۰) مفتوح ہ کی جگہ الف کا استعمال

تحفہ	۶	کہ یہ تحفا ہے سالک کوں نزیک حق دکے۔ لینے نیکا
مرتبہ	۶	دل کو کرمرتبا ہے درپن کا وغیرہ

(۲۱) زیر کے لئے ی کا استعمال

پر پروانہ	۶	پر پیر پروانہ اوپر لکھہ سخن مجھ جانفشانیکا وغیرہ

(۲۲) زیر سے ی اور ی سے مکسورہ ہ کا کام لیا ہے

بھبھوتی، پیہ	۶	بھبوت منہہ پی لا دم مارتے ہیں خاکساریکا

گل معنی ۶ دلی اس طبع کا گلشن گلے معنی سوں ہور وشن وغیرہ

(۲۳) یو کے لئے یُہ ۶ ترا یو قد ہوا ہے مجکوں باعث فکر عالیکا وغیرہ

(۲۴) کوئی کے لئے کو ۶ جو کو تیری سیہ چشاں کوں سمجھاوی مروتکر وغیرہ

(۲۵) و کا حذف

صبح و شام ۶ تصور دل میں میرے جلوہ گرہے صبح شام اس کا وغیرہ

(۲۶) بے ضرورت لفظ

تا کی ضرورت نہیں ۶ کہاؤں تا آخر دم لگ بجاں منت غلام اس کا وغیرہ

(۲۷) حرف مفتوح کے بعد ئی کی جگہ ہ لکھا ہے

دعوئی ۶ محبت کے میرے دعوہ اوپر تا ہو سند مجکوں

دعوے ۶ حسن کے دعوہ کی دست آویز ہے وغیرہ

(۲۸) غلط لفظ

سے ۶ اگر فرہاد دل جاں کیے سنے شیریں کلام اسکا

بنانے ۶ پیا نی غم کے گھر کوں مجہ دو جا معمار کرنا کیا وغیرہ

(۲۹) نے کے لئے کبھی کبھی نہ استعمال کیا ہے۔

نے ۶ پیا کے ابروے کج نیں کیا ہے دلکوں سرگرداں وغیرہ

(۳۰) ی کا زائد استعمال

عزت افزا ۶ عزت افزای ہوا ہے گلشن کا

(۳۱) ہ کا شوشہ نہ ہونے سے لفظ بدل گیا

ہیں ۶ امن میں تجہ نگہ سوں میں بی درد (کذا) وغیرہ

(۳۲) زائد واو

دل و جاں سب ۶ فدا کیا ہے یو قامت اوپر دل و جان و سب

(۳۳) ن کا بیجا استعمال

ایجاد ۶ روز اینجاد تیری چشم سوں اے نور نظر وغیرہ

(۳۴) زیر ظاہر کرنے کے لئے حرف آخر کی رعایت سے ایک لفظ کا اضافہ کیا ہے

عاشق جانباز ۶ اس عاشق کے جانباز کوں اوس بیخبر سوں کام کیا

(۳۵) ن کا حذف

نیناں ۶ جو پیو سے نیر نیناسوں اسے کیا کام پانی کا وغیرہ

(۳۶) ر کا حذف

ادر ۶ مجھے تب لگ کسی سیں بات ادگفتار کرنا کیا وغیرہ

(۳۷) ی سے د کا کام لیا ہے۔

پائمال ۶ نور خورشید پای مال ہوا وغیرہ

(۳۸) ط کی جگہ ت۔

نمط ۶ جو عشق کے بازار میں مجنوں نمت رسوا ہوا

(۳۹) ناموزوں مصرعے

(۱) ۶ تیری انکھیاں مدہ پکی کیونکر نگہہ یک آ سکے (کذا)

(۲) ۶ بلبل باغ وفا ہوں ولی میں وغیرہ

(۴۰) ہ کا زائد استعمال

بگولا ۶ سراوپہ اسکے بہگولا تاج سلطانی ہوا

(۴۱) واو عطف کی جگہ وہ کا استعمال

حقیقی و مجازی ۶ کیا حقیقی وہ کیا مجازی کا

(۴۲) ہ کسورہ سے ی ظاہر کی ہے

نے ۶ آج تیری نگہ نہ مسجد میں

(۴۳) امرت کا قدیمی املا انبرت

۶ زلف ہے کشن رخ پیرای لب مصری سخن انبرت (کذا)

(۴۴) مکسورہ د سے ی کا کام لیا ہے۔

بہائے قدح۔ ۶ صنم کے لعل سے یاقوت بی بہای قدح

تماشائے باغ گل۔ ۶ اے شوخ آکہ دیکھہ تماشاء باغ گل وغیرہ

(۴۵) کہ کی جگہ ک کا استعمال

بلکہ ۶ غلط ہو لالہ چمن کیا بلک جنات عدن بہتر وغیرہ

(۴۶) لفظوں کی نشست بدل دی۔

گیا ۶ ہر جنس کا معاملہ پوچھا گیا ہے اما

(۴۷) امرت لال والی غزل میں پہلے انبرت لال لکھا بعد میں کسی نے انبرت کو امرت بنانے کی کوشش کی

ی ہے۔ اسی طرح کہیر لال والی غزل میں گوہر لال تھا بعد میں اسے بھی کسی نے (ہو سکتا ہے کہ امرت والے کاتب نے)
د ہیرالال بنایا ہے۔

(۴۸) کہتا ہوں کی جگہ کہاؤں ؎ میں صورت اخلاص ترے رو سیں کہاؤں
جس غزل میں بھی "کہتا ہوں" ردیف ہے وہاں اس مخطوطہ میں ہمیشہ "کہاؤں" لکھا گیا ہے۔

(۴۹) محض د سے دہ کا کام لیا ہے۔

دہ ؎ گر نازسوں بازار میں نکلے و اہ عاشقاں وغیرہ

(۵۰) عربی الفاظ کا املا عربی قاعدے سے لکھا ہے۔

انشاء ؎ خوبی اعجاز حسن یار اگر انشاء کروں
بیضاء ؎ بے تکلف صفحہ کاغذ ید بیضاء کروں وغیرہ

(۵۱) یو کا املا یوہ بھی ہے۔

یوہ ؎ ولی یوہ مصرعہ رنگیں ہوا ہے ورد جان و دل وغیرہ

(۵۲) لفظوں کے ٹکڑے کر دئے ہیں۔

اپنی ؎ دکھا اپ نی جھلک اے لالہ رخسار وغیرہ

غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابت کے وقت بڑی بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ مقطعوں کے لئے ہر صفحے پر جگہ بنائی گئی ہے اور عموماً وہیں پر مقطعے لکھے بھی گئے ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ مقطعے کے شعر غزل کے اور شعروں کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں۔ اس طرح مقطعوں کی پہلے سے بنی ہوئی جگہیں خالی رہ گئی ہیں، ایک دو جگہ مصرع کا مصرع ہی نہیں لکھا ہے۔

اب میں اختلافات نسخ دکھا کر ان زائد غزلوں وغیرہ کو لوں گا جو کلیات ولی طبع دوم میں نہیں ہیں۔

اختلافات نسخ

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے مطبوعہ کلیات (طبع دوم) سے جب میں نے بمبئی کے مخطوطوں کو ملایا تو مجھے بہت سے اختلافات نسخ معلوم ہوئے لیکن میں نے ان میں سے صرف وہ چنے ہیں جنھیں میں نے اہم سمجھا ہے۔ چنانچہ کتابت و طباعت کے اختلافات کو بھی بہت سا چھانٹ دیا ہے۔ ذیل میں کوئی ۹۶ اختلافاتِ نسخ اور ۱۳ کتابت و طباعت کی غلطیاں پیش کی جاتی ہیں۔ اختلافات دکھاتے ہوئے میں نے مندرجہ ذیل مختصرات استعمال کئے ہیں:

(۱) کاما = کاما انسٹی ٹیوٹ کا مخطوطہ۔
(۲) ج-ا = جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے کا مخطوطہ نشان ۱۱۰۵۔

(٣) ج۔٢ = جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ کا مخطوطہ، نشان ١١ ٨٦

(۴) ق ل ۔ قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی کا وہ مخطوطہ جس کا انھوں نے اپنے مضمون "کلیات ولی، طبع دوم پر ایک نظر" مطبوعہ رسالہ اردو بابت ماہ اکتوبر ١٩۴٦ء میں حوالہ دیا ہے۔

(۵) "ن" کے ساتھ مختلف نمبر انجمن ترقی اردو کے مختلف نسخوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(٦) طبع اول = کلیات ولی، طبع اول

(٧) مطبوعہ نسخہ = کلیات ولی، طبع دوم

نمبر شمار	صفحہ نمبر	غزل / شعر نمبر	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
١	٣	۴		؎ در و دیوار سب گھر کے ہوئے ہیں آرسی مجکوں جدھر دیکھوں ادھر مجکوں فنا اندر بقا دستا ج۔١ میں یہ شعر زائد ہے۔
٢	١٢	٢٣/٢	؎ تجھ حسن و انتخاب کا لکھتے تھے جب حساب موہوم یک نقطہ ہے سرج اس حساب کا	دوسرے مصرعے میں "موہوم یک نقطہ" (ج۔١، ج۔٢، ق ل، ن ١ تا ٧) چاہیئے۔
٣	١٣	٢۵/١	؎ مجھ گھٹ میں اے نگر گھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا دیکھیں سوں لٹ گیا دل تیری زُلف کا لٹکا	نگر گھٹ (ج۔١، ق ل)
۴	١٧	٣٠/۴	؎ شرمندہ ہو تجھ مکھ کے دِکھے بعد سکندر بالفرض بنا دے اگر آئینہ قمر کا	دکھے نور سکندر (کاما)۔ ایک اور قرأت
۵	٢٣	۴۴/٦	؎ امن میں تجھ نگہ سوں ہیں بیدار خوف نئیں مفلسوں کوں رہزن کا	بے ڈر (ج۔١، طبع اول)
٦	٢۴	۴١/٣	؎ ہے ترے ہر موسوں روشن جلوہ گر رنگ وقار کیا عجب گر تجھ سے پیوے درس نت تمکین کا	تجھ سوں لے درپن سبب (کاما) اگرچہ ج۔١ میں بھی وہی قرأت ہے جو مطبوعہ نسخہ میں ملتی ہے۔ تاہم کاما کی قرأت بہتر معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ان دونوں میں "درس" لینے والے کا کوئی ذکر نہیں۔
٧	٢۴	۴١/۵	؎ صورت تسکیں نہیں دستی مگر اس حال میں اے ولی جب پیو نہ پوچھے حال مجھ مسکین کا	پیو پوچھے (ج۔١، کاما، ن ٢ تا ۵) تسکین کی صورت پیو کے پوچھنے ہی سے ہو سکتی ہے۔

نمبر شمار	صفحہ	شعر	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
۸	۲۶	۴۲/۵	ہوئی ہے آرسی جوگن ترے مکھ کے تصور میں بجھوتی مو پہ پیا دم مارتی ہے خاکساری کا	مکھ لگا (ج - ۱، کاما)، مو پہ لا (ن ۲ تا ۵) "پیا" کے معنی ذیلی حاشیہ میں "لاکر" دیئے ہیں مگر اس شعر میں "لاکر" کی نہیں بلکہ "لگاکر" کی ضرورت ہے۔
۹	۲۸	۴۸/۲	ترا قد مصرع برجستہ دیوان عالی ہے تری یو بیت ابرو شعر دست ہلالی کا	دیوان خوبی (ج - ۱، ج - ۲، طبع اول)، دیوان خوبیہا (کاما، ن ۲ تا ۵)، اسے بھی ایک دوسری قرأت سمجھنا چاہیئے۔
۱۰	۲۹	۴۸/۷	رنگیلے شعر کا بناکیا مثا ترک سادت سوں ترا یو قد ہوا ہے پھر کے باعث فکر عالی کا	ترا قد پھر ہوا ہے مجکوں (ج - ۱)، ترا یو قد ہوا ہے مجکوں (ج - ۲، کاما، ن ۲ تا ۵)۔ پہلا مصرع "پھر" چاہتا ہے۔ اس لئے ج - ۱ قرأت قابل ترجیح ہے۔
۱۱	۳۰	۵۰/۶	برہ کی آگ میں دھسنے کی نئیں ہے کچھ فکر دل کوں کہ جیوں غم نئیں ہے ابراہیم کو آتش میں جانے کا	دہشت نہیں ہے (کاما)۔ دستا نہیں ہے (ج - ۱، ج - ۲)، مگر "دہشت نہیں ہے" ان دونوں میں بہتر ہے۔
۱۲	۳۱	۵۱/۳	عزیزاں بعد مرنے کے نہ پوچھو تم کہ تنہا ہوں لکھا ہوں پردۂ دل پر خیال اس یار جانی کا	نہ پوچھو (ج - ۱، ج - ۲، ۲ و طبع اول)، پوچھنے کا نہیں بلکہ مقام بوجھنے ہی کا ہے۔
۱۳	۳۲	۵۲/۳	مرے دل کی حقیقت یوں ہوئی ہے شہرۂ عالم کہ جیوں مذکور ہو ہے جگ میں تیری دل ربائی کا	مشہور ہے مذکور (ج - ۱، ج - ۲، کاما) اس میں روانی ہی نہیں پائی جاتی بلکہ "ہو ہے" کا تنافر بھی رفع ہو جاتا ہے۔ اور "شہرہ" سے تعلق بھی نمایاں ہے۔
۱۴	۳۳	۵۳/۶	جو کئی تیری پشماں کوں سمجھا بے مروت کر بھروسا کیونکے ہووے اس کوں تیری آشنائی کا	سمجھانے مروت سوں (کاما)، دکھیا نے مروت کر (ج - ۱)
۱۵	۳۴	۵۴/۴	نکالے وہ ستم گر تیغ ادا کوں لے کر سینے ہا عاشقاں کے اب فتحیاب ہوئے گا	سینہ میں عاشقاں کے اب فتح باب ہوئے گا (ج - ۱)
۱۶	۳۵	۵۷	ذیلی حاشیہ میں غزل کو غیر معتبر بتایا ہے	کاما میں یہ غزل موجود ہے
۱۷	۳۵	۵۷/۲	خوش آب حیاتی ستی ہے یو لبالب سبزۂ تیر اس لب کوں انظر کون لگے گا	خوش آبحیات سیتی یو لب ہیا (کاما)

نمبر شمار	صفحہ نمبر	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
١٨	٣٥	٥٧/٥	؎ دریائے پردغم میں مجھے آیونس دن اس بحر میں دل باچ سوپڑ کون سکے گا	کاما میں پہلا مصرعہ یوں ہے ع دریا ہے پردغم ہے مجھے دل ہے سو یونس جو مطبوعہ قرأت سے بہتر تو ہے مگر پھر بھی صاف نہیں ہے۔
١٩	٣٩	٦٢/٥	؎ مور ضعیف ہے دکی خاک قدم شمارا سے بلکہ ضعیفی منیں اس تے نبل بولنا	اس تھیں نبل بولنا (کاما، ن ١، ٤، ٦، ٧)
٢٠	٣٩	٦٣/٣	؎ جس وقت سوں تجھ قد کے تیں لائے ہیں شاعر فکر کر اس وقت سوں عالم منیں نرخ سخن بالا ہوا	لایا ہے شاعر فکر میں (ج-١) لائے ہیں شاعر فکر میں (کاما، ن ٢، ٤، ٧، ٨)
٢١	٤٠	٦٥/١	؎ تجھ مکھ کا یو تل دیکھ کر لالے کا دل کالا ہوا تجھ دور خط سوں طوق جیوں ہتاب کے بالا ہوا	کوں بالا ہوا (ج-١، کاما، ن ١، ٤، ٧)
٢٢	٤٠	٦٥	—	ج-١ میں یہ شعر زائد ہے ؎ سورج تیرا مکھ کر (کذا) دیکھ جلتا ہے شعلہ کے نمط (کذا بجائے نمط؟-ج) تجھ نور کے آثار سوں یو چاند پر ہالا ہوا (آثار سے؟-ج)
٢٣	٤٤	٧١/٢	؎ اے گل باغ ردا، سرو ترے رہ ڈانکے دل پہ ہزار ارّہ کر صورت سوہاں ہوا	دل پہ دھر آزادگی (ج-٢)۔ دل پہ ہر آزاد کے (کاما)، تاہم کاما کی قرأت بہتر معلوم ہوتی ہے۔
٢٤	٤٨	٨٠/٤	؎ بادشاہ نجف ولی اللہ پیر کامل علی رضا پایا	؎ نقد شاہ نجف ولی اللہ پیر کامل علی رضا پایا (ج-١ طبع اول کا ضمیمہ اول) مطبوعہ قرأت میں دونوں مصرعے تام ہوتا ہیں۔ پہلے مصرعے میں بادشاہ نجف، ولی اللہ (حضرت علی علیہ السلام) کا ذکر ہے اور دوسرے میں "علی رضا" کا۔ لیکن ج-١ کے "نقد" کے معنی چونکہ اولاد کے ہیں، دونوں مصرعوں میں ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اس غزل کا ن اور ٦ میں ہی ہونا بتلایا ہے۔ ج-١ کی وجہ سے اس کی توثیق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

نمبر شمار	نمبر نظم	صفحہ/سطر	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
۲۵	۲۸ و ۲۹	۸۱/۱۴	ذیلی حاشیہ میں لکھا ہے: ش ۲۸و۲۹ قدیم نسخوں میں نہیں ہیں	یہ دونوں شعر ق-۱، ق-۲، اور کا ۱ میں موجود ہیں۔
۲۶	۴۹	۸۲/۴	ہ خجالت کی گرد انجھو اں کے پانی سوں گلا بی میں بنانے غم کے گھر مجکوں دو جا معمار کرنا کیا	——— منی ——— گلایا میں (ق-۱) ——— گھلایا ہے میں / گھلاتی ہیں (کا ۱)۔ کا ۱ میں یہ غزل دو جگہ درج ہے۔ میں نے دونوں مقاموں کی قرأتیں دے دی ہیں۔ 'گھلا ہے میں' کے معنی ہیں 'میں نے گھولا یا گھلایا ہے'، اور 'گھلاتی ہیں' کے معنی ہیں 'گھلاکر'۔ ان دونوں کے مقابلہ میں ق-۱ کی قرأت زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے۔ مخطوطہ حبیب گنج میں یہ مصرع یوں ہے ۶ - ——— ملا کر۔ (معارف جلد ۵۶ نمبر ۲)
۲۷	۵۰	۸۴/۴	ہ دے عین، شین، قاف تو مجھ دال لام میں مجھ پر اپس کے گھر میں اکاسی کیا پیا	ق-۱ میں ایک مخمس ہے جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے۔ اس کے تیسرے بند کا پانچواں مصرع یوں ہے۔ ع مجھ پر اپس کے گھر کیتیں کاسی کیا پیا جو زیادہ بہتر اور با مفہوم ہے۔
۲۸	۵۱	۸۷/۲	ہ بند کرنے دل وحشی زدہ کوں دام رہ زلف گرہ گیر کیا	ہ بند کرنے دل وحشت زدہ کوں دام رہ زلف گرہ گیر کیا (ق-۱، ق-۲، کا ۱، مخطوطۂ حبیب گنج، معارف جلد ۵۶ نمبر ۲)
۲۹	۵۲	۸۹/۴	ع فدا کیا ہوں یو قامت اوپر دل وجاں سوں کہ مجھ کوں شور قیامت سوں بے نیاز کیا	دل وجاں کوں (ق-۱) دل وجاں سب (ق-۲، کا ۱، ن ۲ ۳ لم، ۶، ۷ ا مطبوعہ قرأت میں فدا کی جانے والی چیز نہیں ہے۔
۳۰	۵۴	۹۱/۲	ہ کاملیت کا تجھ کوں تھا دعویٰ حق نے دعویٰ ترا تام کیا	دعویٰ ترا تام کیا (ق-۱، ق-۲، کا ۱، طبع اول) 'تام' سے مصرع ناموزوں ہوجاتا ہے۔
۳۱	۵۹	۹۸/۵	ہ ولی جنت نہیں رہنا نہیں ہور کار عاشق کوں جو طالب لامکاں کا ہے اسے مسکن سوں کیا مطلب	رہنا (ق-۱، ق-۲، کا ۱، طبع اول)۔ رہند کوئی لفظ نہیں۔ چنانچہ فرہنگ میں بھی نہیں ہے۔

نمبر شمار	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
۴۲	۵۹	۹۹/۱	؎ ہوا تجھ غم سوں جاری شوق کا طومار ہر جانب ہوا ہے اگر ہم تیرے عشق کا بازار ہر جانب	ہے گرم (ج ـ ۱، ج ـ ۲، کا ۱، طبع اول)۔ ورنہ شعر ناموزوں ہی نہیں بلکہ بے معنی بھی ہو جاتا ہے۔
۴۳		۱۰۷/۴	؎ دبلے سوکے سوں تجھ انکھیاں کی پود یع کر جیوں برچھی پکڑ نکلا ہے رجپوت	دسے شوخی سوں (ج ـ ۱، جا ـ ۲، کا ۱) ـ سوکھنا خشک ہونے اور مجازاً دبلے ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان میں سے یہاں کسی کا محل نہیں۔ اور پھر دوسرے مصرع کے لحاظ سے "شوخی" ہی موزوں ہے۔ غالباً اسی لئے طبع اول میں "کاجل" استعمال کیا تھا۔
۴۴	۷۰	۱۱۴/ج	؎ ہوں پیا کے شربتِ لب بن مریض جس منیں گل قند سا ہے الغیاث	جس میں گلقند شفا ہے الغیاث (ج ـ ۲) "پیا کے شربت لب بن مریض" کو محض گلقند نہیں بلکہ "گل قند شفا" کی ضرورت ہے اور وہ "پیا کے شربت لب" میں موجود ہے۔
۴۵	۷۷	۱۲۴	—	یہ مقطع کہیں نہیں ؎ اے شمع توں زسخن کر دلی کا دل روشن نہ کر رقیب کوں ظالم توں مبتلا گستاخ (ج ۱۰۵)
۴۶	۷۸	۱۲۶/۳	؎ ترے رخ سوں کہ دائم بے خزاں ہے ہوا ہے زیب ودر گلزار ایجاد	زیب در (ج ـ ۱، طبع اول)۔ زیب پر (ج ـ ۲، کا ۱، ن ۸)۔ "زیب ودر" سے کوئی بات واضح نہیں ہوتی۔ "زیب در" اور "زیب پر" میں دوسرا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔
۴۷	۸۰	۱۲۹/[illegible]	؎ کیا ہے طرز تغافل نے شوق کے جگ میں ہر ایک چشم کوں تسخیر خواب کے مانند	شوخ کے جگ میں (ج ـ ۱، کا ۱)۔ "شوق" کی وجہ سے شعر کا کوئی خاص مفہوم نہیں پیدا ہوتا۔ لفظ "شوخ" سے شعر میں حسن اور لچک پیدا ہو جاتی ہے۔
۴۸	۸۶	۱۴۱	—	کا ۱ میں بھی یہ ایک ہی غزل کے طور پر درج ہے۔ اس کا مقطع یہ ہے، جو ذیلی حاشیہ میں کسی

[illegible]	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
				نسخہ کے ذکر کے ساتھ درج ہے ؎ اے ستمگر غضب سوں رنگ ولی کہر بائی نہ کر خدا سوں ڈر مطبوعہ مقطع اس کے شعر نمبر ۶ کی جگہ درج ہے۔ یہ غزل ج ۔ ۲ اور ج ۔ ا میں سات سات شعر کی ہے مگر ج ۔ ا کے اشعار میں ہلکا سا لفظی اختلاف بھی ہے۔
۳۹	۹۸	۱۴۲/۳	؎ کھول بیاتی ہور اپنے سینے کوں دل میں آتا ہے کچھ کا کچھ دسواس	؎ کیوں چھپاتی ہو اپنے سینے کوں دل میں آیا ہے کچھ کا کچھ دسواس (ج-۲)
۴۰	۱۰۰	۱۷۸	(نوٹ: یہ غزل ن ۱۲، ۱۳ میں ہے)	یہ غزل ج ۔ ۲، ق ل میں بھی ہے۔
۴۱	۱۱۱	۱۸۶/۳	؎ کھُلے دیکھ تجھ لب کوں آب حیات کرے یک نظر گر توں شکر طرف	مزہ دیکھ تجھ لب کا آب حیات (ج ۔ ا) گھلے دیکھ تجھ لب کا آبحیات (ج ۔ ۲، کا ما، ن ا، ق ل)۔ آب حیات کا کھلنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دوسرے مصرع میں "شکر" اس کی متقاضی ہے کہ پہلے مصرع میں لب کے بعد "کوں" نہیں بلکہ "کا" ہونا چاہیئے۔
۴۲	۱۱۳	۱۸۹/۴	؎ تمیز سوں جو اگر مجھ طرف نگاہ کرے تو شان حسن سوں بس ہے مجھے یہی تشریف	شاہ حسن (ج ۔ ا، ج ۔ ۲، کا ما، طبع اول) تشریف ارزانی بادشاہ یا اس کا مثل ہی کرتا ہے "شان حسن" سے بات نہیں بنتی۔
۴۳	۱۲۳	۲۰۷/۴	؎ دے تجھ حسن کے دریا پہ جیوں موج اگر رخسار پر چھوٹے یو تل	؎ دے تجھ حسن کے دریا میں جیوں موج اگر رخسار پہ چھوٹے یو کا کل (ج ۔ ۲، کا ما، ن ا تا ۶ ا ق ل)۔ "پہ" اور "میں" کا اختلاف کچھ اہم نہیں۔ البتہ دوسرے مصرع میں "تل" سے اولاً وزن پورا نہیں ہوتا، دوسرے تل کا چھوٹنا اس کا غائب ہونا ہوگا

[illegible]	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
				اس لئے "کاکل" ہر طرح بہتر ہے۔
۴۴	۱۲۶	۲۱۱/۱	ع تجھ شاہ خوباں کے ہوئے کئی صاحب اکرام رام تجھ حسن کے دیواں سوں پائے ہیں کئی احکام	احکام کام (ج-۱، ن ۱، ۵، ۷، طبع اول) "احکام رام" بے معنی ہے۔
۴۵	۱۳۱	۲۲۰/۷	ع ہر چند جگ کے بخت سیا ہوں ہیں پیں ولے کاجل ہو، جا بسے ہیں سجن کے نین میں ہم	بخت سیا ہوں (ج-۲، کاما)
۴۶	۱۳۲	۲۲۲/۷	ع تیری نگہ کے تیر سوں زخمی ہوا ہے پیر فلک تیری بھواں کے سہم سوں خم ہو کماں آسمان	شیر فلک (کاما)۔ کلیات ولی طبع اول میں بھی یہی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔
۴۷	۱۳۴	۲۲۴/۵	ع ولی یہ دائرۂ خط کا ہے اس حسن کا قطعہ سو اس قلعے منیں دیکھو تجلی ہے شہ شاہاں	تجلی شہ شاہاں (کاما)
۴۸	۱۳۴	۲۲۵/۲	ع جیوں مکھ ترا یو دیکھ کر معشوق سب عاشق ہوئے تب سوں تو ملک حسن میں ہے بادشاہ عاشقاں	جب سوں ترا مکھ دیکھ کر (ج-۱، کاما، طبع اول)
۴۹	۱۳۶	۲۲۸/۳	ع جدائی جب سوں ہوئی ظاہر تد حال سوں پوچھتا ہوں تو ترے بن تیں کے جیوں میل سرمے کی سنی انکھیاں	پوچھتا ہوں میں (کاما، ق ۱) مطبوعہ قرأت میں "پوچھتا" کا فاعل نہیں ملتا۔
۵۰	۱۳۷	۲۲۹/۳	ع قرار کب ہو میسر ترا اے زہرہ جبیں ہر ایک آن ہے مجھ حق میں سو قرآن تجھ بن	قران (کاما، ق ۱، مخطوطہ حبیب گنج)
۵۱	۱۳۷	۲۲۹/۷	ع ولی یہ دل کی حقیقت بیان کیوں کے کروں گرہ ہوا ہے زباں پہ مری سخن تجھ بن	ولی کے دل کی حقیقت (کاما، ن ۱ تا ۷)
۵۲	۱۳۹	۲۳۲/۲	ع انجمن میں تجھ دراں دوجا نہیں کوئی زیب رد زیب رد سو تو نچھ ہے مانند شمع انجمن	زیب در (ج-۱، کاما)
۵۳	۱۴۷	۲۴۶/۴	ع اس وقت ہوش عاشق ثابت قدم رہے کیوں سلطان حسن آوے جب نازکی لٹک سوں	نازکی کٹک سوں (کاما، ن ۱، ۳ تا ۶، ق ۱)
۵۴	۱۴۵	۲۴۳/۵	ع اس لب کی حلاوت ہے ولی طبع میں میری تب شعر مرا جگ منیں میٹھا ہے شکر سوں	یو شعر مرا (ج-۲، کاما، ن ۱، ۵ تا ۷، ق ۱)
۵۵	۱۴۸	۲۴۹/۵	ع دلدار کی گلی سوں کیوں جا سکوں ولی میں لیتا لپیٹ دل کوں جب چہرۂ زری سوں	لیتا لپیٹ دل کوں (ج-۱، ج-۲، کاما، ن ۲ تا ۷)

[illegible]	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
۵۶	۱۴۹	۲۵۱/۲	؎ شبِ غم روزِ عشرت سوں بدل ہووے اگر دیکھے تری جانب دو مہر ذرہ پرور مہربانی سوں	مری جانب (ج-۲، کاما، طبع اول)
۵۷	۱۵۰	۲۵۲/۴	؎ میرے دل گم نام کی کیا قدر پوچھے بے خبر ہے دلبراں کن اعتبار اس گوہر نایاب کوں	کیا قدر پوچھے (ج-۱، کاما، طبع اول)
۵۸	۵۳	۲۵۸/۵	؎ کمر سوں نئیں جدا ہوتی نظر اس شوخ چنچل کی ولی آخر کیا ہے صید چیتے نے چکارے کوں	کمر سوں نئیں جدا ہوتی نظر (ج-۱، ن ۱، ۱۵، ق ۱)
۵۹	۱۶۴	۲۸۰/۳	؎ خط کے تئیں رحل زمرد کہہ کوں تیرے اہل فضل مصحفِ گل بول کر کرسی پہ بیٹھا ہے سخن	بٹھلائے سخن (ج-۱، کاما، ن ۲، ۸)
۶۰	۱۷۰	۲۹۰/۵	؎ یاجوج ہو رقیب جب آیا سجن کے پاس پیدا کیا حجاب سکندر کی سد کے تئیں	سکندر نے (ج-۲، کاما)۔ تاہم کاما کے لحاظ سے پہلے مصرع میں "ہوا آ" اور ج-۲ کے لحاظ سے دوسرے مصرع میں "سکندر نیں" ہے۔ ج-۲ میں "نے" کی جگہ اکثر "نیں" ہی آتا ہے۔
۶۱	۱۷۴	۲۹۹/۶	؎ سرخ روئی ہے عاشقاں کی مدام گر رقیباں کو رو سیاہ کرو	رقیباں کا (ج-۱، کاما، ن ۱، ۱۴، ۱۶، ۷، ق ۳)
۶۲	۱۹۰	۳۲۴/۵	؎ تجھ لب اگے ستی ہے پستے کوں پست کر کر اور شرم سوں لہو میں ڈوبی عنب کی شوخی	ستی ہے (ج-۲، طبع اول)
۶۳	۱۹۰	۳۲۵	(ذیلی حاشیہ: یہ غزل صرف نسخہ ۲ اور ۳ میں ہے جن میں ردیف "گرے" ہے اور بعض اشعار میں یہی صحیح معلوم ہوتی ہے)	یہ غزل ج-۲ و کاما میں بھی ہے۔ البتہ مطبوعہ کا پانچواں شعر ان دونوں میں نہیں ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ردیف "گرے" ہی بعض اشعار میں صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے جس طرح "گوری" کا قافیہ "تھوڑی" جائز سمجھا جاتا تھا اسی طرح ولی نے "گرے" اور "کرے" میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی، اس کا بھی امکان ہے کہ ولی نے "گرے" اور "کرے" کی دو علاحدہ غزلیں کہی ہوں

نمبر شمار	صفحہ نمبر	غزل نمبر	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
				کیونکہ ایک ہی ردیف اور قافیہ کی اس کے ہاں کئی غزلیں مل جاتی ہیں۔
۶۴	۱۹۱	۲۴۵/۹	؎ سجن کی بزم سوں کیوں جا سکوں ولی باہر کہ قید حلقۂ گیسوے پائدار کرے	گیسوے تابدار (ج-۲، کاما)
۶۵	۲۰۴	۲۴۷/۷	؎ ولی سودا زدہ دل کی حقیقت گر سکوں لکھنا تو دیوانہ ہو سا نکل یگ میں باہر یک قلم نکلے	مقطع کی ایک اور قرأت : ؎ ولی دل کی حقیقت بے سیاہی گر لکھے مجکوں تپاں جوں آہ کا شعلہ ہر ایک حرف اور یہ قلم نکلے (ج-۱)
۶۶	۲۰۷	۲۵۳/۵	؎ ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے کوں مجھے فردوس رضواں یاد آئے	دیکھنے سوں (ج-۱، کاما)
۶۷	۲۱۹	۲۶۹/۴	؎ اے سجن تیری پرت کے دوست کے دوستاں کئی دشمن جانی ہوئے	؎ اے سجن تیری پرت کی دوستی دوستاں سب دشمن جانی ہوئے (ج-۱، ج-۲، کاما، ن ا تا ے)
۶۸	۲۱۹	۲۶۹/۹	؎ تجھ دہان کالعدم کی یاد سوں باٹ میں عشاق کئی فانی ہوئے	بات میں (ج-۱، ج-۲، کاما)
۶۹	۲۲۰	۲۷۰/۵	؎ خم ہوئی قوس قزح اس کا خم ابرو دیکھ جس نے محراب میں غم کے کیا گرداب مجھے	جن نے دیوار میں غم کے کیا محراب مجھے (ج-۲، کاما، طبع اول)
۷۰	۲۲۰	۲۷۰/۷	؎ جم کے رتبے سوں ولی مرتبہ اوپر ہے اگر جام میں دل کے میسر ہوے ناب مجھے	جم کے رتبہ سوں بلند ہوگا ولی کا رتبہ جام میں دل کے نصیبا ہوئی مے ناب مجھے ج-۲ و کاما میں پہلا مصرع مثل مطبوعہ ج-۱ و کاما میں دوسرا مصرع وہ ہے جو یہاں درج ہے۔ ج-۲ کے دوسرے مصرع کا اختلاف یہ ہے کہ "نصیبا" کی جگہ "نصیب" ہے جو سہو کتابت معلوم ہوتا ہے
۷۱	۲۲۳	۲۷۵/۷	؎ کیوں سنگدل تمام مسخر ہوئے؟ اگر طالع میں میرے کشف و کرامت نہیں لکھی	۶- کیوں سنگدل تمام مسخر ہوئیں اگر (ج-۱) لیکن ج-۲ میں "اگر" کی جگہ "اکے" یعنی

[illegible]	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
				"آگے" بہ معنی "آگر" اور کاما ہیں "کشف" اور "کرامت" کے درمیان واؤ نہیں ہے۔ یوں گویا تینوں کی قرائتیں ایک ہیں۔ اب اگر سوالیہ نشان کسی نسخہ سے لیا گیا ہے تو وہ یوں درست نہیں کہ اس کا استعمال بہت جدید ہے اور کسی شک کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے تو میرے خیال میں اسے رفع ہو جانا چاہیئے کیونکہ "ہوے" کی جگہ "ہویں" ایک قدیم قرأت مل گئی ہے۔
۷۲	۲۲۳	۲۷۵		ج-۱ میں یہ شعر بھی ہے ؎ کیوں دائرہ سے کفر کے نکلے وہ تیرہ دل جس کے نصیب میں جو ہدایت نہیں لکھی (کنا)
۷۳	۲۲۳	۳۹۰/۵	؎ جو کھول لٹ کوں چلا لٹک کر جھمک جھمک کر جو کھایا سو لٹ کوں دیکھے ولی لٹک کر سجن نمن ہیولا لٹک لیا ہے	دوسرے مصرع میں "لٹک کر" کی جگہ ج-۲، ن ۱ تا ۳، ۶ و ق ۱ میں "اٹک کر" ہے۔ اور "سجن نمن میں اٹک لیا ہے" کی جگہ "سجن نیں اسکوں ہٹک لیا ہے" کاما، ن ۲ تا ۶، ق ۱ کی قرأت ہے۔
۷۴	۲۲۴	۳۹۳/۵	؎ ہوا ہے جو جبیں فرسا تری محراب ابرو میں صف عشاق میں اس کوں امامت ہوا امامت ہے	بہ حکم عشق اسے عشاق کی صف میں امامت ہے (ج-۱، ن ۱، ۶، ۷)
۷۵	۲۲۴	۳۹۳/۹	؎ ولی جو عشق بازی میں حقیقت سوں نہیں واقف سخن اس کا قیامت میں گل باغ ندامت ہے	عشق بازی کی حقیقت سوں (ج-۲، کاما، ن ۲ تا ۷)
۷۶	۲۲۹	۴۰۲/۳	؎ محبت ترک مت کر اے پری رو محبت میں مروت معتبر ہے	مروت ترک مت کر (ج-۱، ج-۲، کاما و طبع اول)
۷۷	۲۳۲	۴۰۶/۵	؎ اے ولی کہتی ہے بلبل اس کا سن رنگیں سخن غنچۂ گل کے اُپر جیوں بوسے گل تقریر ہے	غنچہ لب کے لب اُپر۔ غنچہ لب کے (ن ۲ تا ۵)، لب اُپر (ن ۱، ۶، ۷)
۷۸	۲۳۴	۴۰۸/۹	؎ نکلتا ہے جب کٹاری اٹھا لے کر دو عالم اس کٹاری سوں ہوا دو دھڑ کر	؎ نہ میں بسمل ہوا ہوں تجھ نگہ سوں دو عالم اس کٹاری سوں دو دھڑ ہے (ق-۲)

نمبر شمار	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
۷۹	۲۴۴	۴۰۹/۳	؎ جس کوں نہیں ہے بوجھ ترے حسن پاک کی تکا نزیک کس کے مثال پہا ڑ ہے	تکا نزیک اس کے (کاا)۔ ج ۱، ق ۔ ۲ میں "اس کے" کی جگہ طبع اول کا "تنکے" ہے۔
۸۰	۲۴۰	۴۱۲/۶	؎ کرنے کوں سیر راہ حجاز و عراق عشق عشاق پاس سازِ نوا سب نیاز ہے	سازِ نوا (طبع اول)
۸۱		۴۱۲/۷	؎ تو اصل دائرے میں ہے جگ کے اوجے فرع اوج و حضیض بیچ تو ہی یکہ تاز ہے	دجے ہیں فرع (کاا، ن ۲، ۳، ۴)
۸۲	۲۵۰	۴۱۶	—	ج ۔ ۲ میں یہ شعر زائد ہے ؎ درکار نہیں کہ دیکھوں ہر یک ادا کوں تیری تجھ خال کا تماشا نازک نہال بس ہے
۸۳	۲۵۲	۴۲۱/۷	؎ وسوسے سوں دل کے مت کر زر قلب سینہ صافوں کی نظر صراف ہے	؎ وسوسے سوں دل کوں مت کر قلب توں سینے صافوں کی نظر صراف ہے (کاا)
۸۴	۲۵۶	۴۲۵/۴	؎ دل کوں جمیعت ہی جب جاتا ہوں دنبال صنم آرسی کے ساتھ میں سیماب کوں آرام ہے	آرسی کی پشت میں (ج ۔ ۱، ن ۵)
۸۵	۲۵۹	۴۳۲/۲	؎ دشمن دیں کا دین دشمن ہے راہزن کا چراغ روشن ہے یہ (دوسرا) مطلع تذکرۂ میر میں ہے اور معاصر کے نسخہ میں بھی ملا ہے۔ اور ذیل کے دو شعر بھی نسخہ معاصر میں ملتے ہیں ؎	دوسرے مطلع کے ساتھ دو جگہ یہ غزل ج ۔ ۲ میں درج ہے۔ ایک جگہ اس مطلع کے ذیل میں نسخہ کے دو شعر اور نسخۂ معاصر کا مقطع اور دوسری جگہ ان کے علاوہ ایک مزید شعر بھی درج ہے ؎ باغ گل راستی کا ہے سر سبز سرو گلشن میں حسنِ گلشن ہے
	۲۶۰		؎ ترش روئی حسن اہل لباس زیب دامن کا زیب دامن ہو	ترش روئی ...... الخ کی قرأت ج ۔ ۲ میں دونوں جگہ مختلف ہے ؎ (۱) زشت روئی ہے حسن اہل لباس چین دامن کوں زیب دامن ہے (۲) ترش روئی ہے حسن اہل لباس زیب دامن کا زیب دامن ہے
	۲۶۰		؎ پاکبازی میں دل کی ہے لذت صافی درپن آپ درپن ہے	

نمبر شمار	صفحہ	صفحہ	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
				نسخۂ معاصر کی قرأت سے مائل ہونے کے سبب چاہیں تو (۲) اختیار کرلیں ورنہ (۲) کے پہلے مصرع اور (۱) کے دوسرے مصرع کو لے کر اس شعر کی قرأت اختیار کر لینے میں بھی کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔
				مندرجہ بالا مطلع و اشعار کے علاوہ اس غزل کے تمام شعر ایک جگہ ایک علاحدہ غزل کی صورت میں درج ہیں۔
۸۶	۲۴۰	۲۳۳/۲	؎ ہوا ہے جیوں شہید لالہ رویاں بہ رنگِ داغ دل خونیں کفن ہے	۶۔ ہوا ہے جو شہید لالہ رویاں (ک۔ ۱، ج۔ ۲، طبع اول)
۸۷	۲۴۲	۲۳۵/۴	؎ خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر کہ عاشقاں کے نزک شیشۂ پری یہ ہے	ایک قرأت ؎ خیال یار کو رکھ اپنے دل میں محکم کر کہ عاشقاں کے قریں شیشہ و پری یہ ہے (ج۔۲)
۸۸	۲۴۲	۲۳۶	—	ج۔۲ میں یہ شعر زائد ہے ؎ ہزاراں لاکھ خوباں میں نگاہ گرم محبوبم خنجر ہے، پانک ہے، کھانڈو دھار آسا دیکھ دوسرے مصرع میں "دو دھارا" کے بعد "سیے" ہے جو "ہے" بھی پڑھا جاسکتا ہے اور اضافت کے خیال سے اسے "سیے" بھی پڑھ سکتے ہیں۔
۸۹	۲۴۴	۲۳۹	—	ج۔۲ یہ غزل دو جگہ درج ہے پہلی دفعہ میں یہ شعر زائد ملتے ہیں ؎ بسکہ یکدم مجھے قرار نہیں میری انکھیاں سوں جوئے جاری ہے آہوں سوں بسر گئی ہے رم آج اس شوخ کی سواری ہے

[illegible]	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
				کیوں نہ ہو چاک چاک میرا دل شوخ کے ہاتھ میں کٹاری ہے دوسرے مقام پر یہ شعر زائد ملتے ہیں تجھ بتاں مجکو بیقراری ہے میری انکھیاں سوں اشک جاری ہے یکہ نگہ سوں کیا ہے مست مجھے تیری انکھیوں میں کیا خماری ہے تیرے ابرو نے مجکوں قتل کیا کیا بلا اس میں آبداری ہے اے ولی نے تری یہ صورت حسن صفحۂ دل اوپر اوتاری ہے
۹۰	ضمیمہ	۱۴	ضمیمہ اس نوٹ کے ساتھ شروع ہوتا ہے "ذیل کی غزلیں وہ ہیں جو صرف کسی ایک نسخہ میں ملتی ہیں اگر بعد کو ان کی تصدیق کسی دوسرے معتبر نسخہ سے ہوگئی تو اصل کلیات میں شامل کردی جائیں گی۔"	چنانچہ نمبر ۱۴ کے لئے لکھا ہے کہ یہ ن۔ ا میں ہے اولاً تو مجھے یہ کہنا ہے کہ محض ہئیت کے اعتبار سے اسے غزل کہدینا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ہئیت کے ساتھ موضوع کے پیش نظر اسے سلام یا نوحہ کہنا بہتر ہے۔ دوسرے یہ کہ ج ۔ ۲ میں یہ مکمل طور پر موجود ہے۔ کلیات ولی طبع دوم میں یہ شعر رہ گیا ہے ؎ سارے فلک میں ملک غم میں ہے (کذا) سرپانگ جب سوں ہوا یوہ (کذا) بیاں آہ دریغا دریغ (ج-۲) جیب نے اپنے مضمون (اردو، اکتوبر ۱۹۲۶) میں قاضی اختر صاحب نے طبع اول سے یہ شعر نہ صرف اس کی قرأت کیساتھ نقل کیا بلکہ اپنے مخطوطہ کی مدد سے درست بھی کیا ہے ؎ سارے فلک میں ملک غم میں ہیں سرپا نونگ جب سوں سنے یہ بیاں آہ دریغا دریغ

[illegible]	[illegible]	[illegible]	مطبوعہ قرأت	بہتر قرأت
				ج-۲ میں "غم میں" کے بعد "ہے" نہیں بلکہ "ہیں" چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس کی قرأت میں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔
۹۱	ضمیمہ[۴]	۱۴/۳	جب سوں گئے وہ شہاں آہ و دریغا دریغ غم میں ہے دونوں جہاں آہ و دریغا دریغ	غم میں ہے ہر دو جہاں (ج-۲، طبع اول) ایک دوسری قرأت ہے۔
۹۲	״	۱۴/۷	سو دین کا ہی خالص وہ زر، غم کے پتے کے اُپر حق نے کیا امتحاں آہ دریغا دریغ	غم کی کسوٹی اوپر (ج-۲، ن ۱) طبع اول کا "غم کے پتے کے اپر" بھی قابل اعتنا ہے۔
۹۳	۲۹۶	مخمس[۲] بند[۱]	ہر یک حرف نہایت بنا لب پہ لب ستی پایا ہوں علم عشق معانی قطب ستی پیدا ہوا ہے عشق کہو کس سبب ستی دیکھا ہوں قد و زلف و دہن پی کا جب ستی کیتا ہوں جب سوں ورد الف لام میم کا	مجکوں ہوئی جب سوں عطا فضل رب ستی (ج-۲) پایا ہوں علم عشق معانی قطب ستی ... الخ (ن ۱) پہلا مصرعہ مطبوعہ قرأت کے ساتھ کوئی مفہوم پیدا کرتا نظر نہیں آتا۔
۹۴	۳۰۵	مخمس[۲] بند[۲]	نشانی حق کے پانے کی جہاں کی بے نیازی ہو کشائش کام اپنے کی جگت کی کارسازی ہے تواضع خاکساری ہو ہماری سرفرازی ہے حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے وہ پلے شرح میں مطلب نہ بوجھے جو فن ہرگز	چوتھا مصرع ک ۱ میں اس طرح ہے۔ ۶ حقیقت کے لغت کا ترجماں عشق مجازی ہو
۹۵	۳۱۱	مخمس[۲] بند[۱]	معرفت حق کی کام مشکل ہے چشم ظاہر نیا اس سوں غافل ہو اے ولی علم سوں یہ حاصل ہے علم انسان کوں مکمل ہے گل گلزار ہاں اتی کی قسم	پہلے دو مصرعے ج-۱ و ک ۱ میں اس طرح ہیں: معرفت حق کی کار مشکل ہے اہل پندار اس سوں غافل ہے (اہل پندار ن ۲ تا ۵ و ۷ میں بھی ہے)
۹۶	۳۲۲	مستزاد[۲] شعر[۱]	سو تجھ عشق کی کرتی ستی بے تاب ہیں یو دل جیوں آگ پہ اسگند تجھ یاد کے گلزار میں عشاق ہیں نالاں پھولاں میں جیوں بلبل	پہلے مصرع کے مستزاد کا ٹکڑا ج-۱ میں یوں درج ہے: جیوں آگ پہ اسپند مزید یہ کہ اس پر "تصدیق طلب" کا نوٹ ہے۔ اور یہ مکمل طور پر ج-۱ میں موجود ہے۔

کتابت و طباعت کی غلطیاں

نمبر شمار	نمبر صفحہ	نمبر غزل / شعر	غلط	صحیح
۱	۱۸	۳۳/۱	؎ سناوے مجکوں گر کنتی مہربانی سوں سلام اس کا کہاؤں آخر دم لگ بہ جاں سلت غلام اس کا	منت (ج-۱، ج-۲، کاما و طبع اول)
۲	۸۶	۱۴۲/۲	؎ ترے ملنے سوں تا روشن کرے دل کی مجالس کوں ہوی ہے شعلہ زن سینے میں خوشی م بدم آکر	خواہش (ج-۲، کاما)
۳	۹۷	۱۶۲/۴	؎ نور تجھ رخسار کا سینے میں ہے نت جلوہ گر منجھ دل آتشِ نمرود رکھتا ہے ہنوز	مجمر دل (ج-۲، کاما)
۴	۱۱۰	۱۸۵/۱	؎ دل تجھ نگاہ گرم سوزاں ہے جیوں چراغ اس سوز شعلہ خیز سوں خنداں ہے جیوں چراغ	نگاہ گرم سوں سوزاں (ج-۲، کاما)
۵	۱۱۲	۱۸۸/۲	؎ عجب نہیں جو فلک پر خطِ شعاعی دیکھ اگر ورق پہ مُرَج کے لکھیں تری تعریف	اگر ورق پہ سُرج کے (ج-۱، ج-۲، کاما)
۶	۱۱۷	۱۹۵/۴	؎ مفلساں کوں عاقبت کے گھر میں نئیں در کار زر حق کی بخشش سوں انھوں کوں بس ہے نیک اعمال ال	اعمال مال (ج-۲، کاما)
۷	۱۳۱	۲۲۰/۸	؎ فرہاد تب سوں تیشہ زن سر کیا تلے باندے ہیں جب سوں جیوں کوں شیریں بچن نیں ہم	ــــ تیشہ زن ــــ (ج-۱، ج-۲، کاما)
۸	۱۳۱	۲۲۱/۱	؎ شراب شوق میں سرشار ہیں ہم کبھو بے خرد کبھو ہشیار ہیں ہم	کبھو بے خود کبھی ہشیار ہیں ہم (ج-۱، ج-۲، کاما) مگر کاما میں "کبھو" کا املا "کبھوں" ہے۔
۹	۱۶۳	۲۷۶/۷	؎ (ولی) کے ہر سخن کا دو ہوا ہے مو بہ مو خواہاں جو کئی پایا ہے لذت تجھ بھواں کے شعر حالی مین	دو ہوا ہے مو بہ مو خواہاں (ج-۲، کاما)
۱۰	۲۲۷	۳۸۲/۳	؎ یا لفظ ہے رنگین ہم آغوشِ معانی یا بر میں گل اندام کے گل رنگ قبا ہے	رنگین (ج-۱، کاما)
۱۱	۲۲۸	۳۸۳/۳	؎ کہا مژگاں نے اس کی سوزاں سوں عاشق پہ ستم کرنا روا نہیں	سو زباں سوں (ج-۲، کاما)۔ ج-۱ میں "صد زباں سوں" ہے۔ دوسرا مصرع ج-۱، ج-۲، کاما میں اس طرح ہے۔ "کہ عاشق پہ ستم کرنا روا نہیں

صحیح	غلط	[illegible]	[illegible]	[illegible]
بستۂ زلف پری رویاں پر (ج - ۲، ۱۷۱)	؎ بس کہ بے درداں ہوئے ہیں مجتمع چاروں طرف بستۂ زلف پری رویاں پہ مارا مار ہے	۳۹۹/۲	۲۱۷	۱۲
زنگی (ج - ۱) - ج - ۲ میں "رنگین" ہے جو ظاہر ہے قابل اعتنا نہیں۔	؎ یوں زنگی و خط مشک ختن ہے سخن مصری و لب کان یمن ہے	۱۳۱/۱	۱۵۹	۱۳

اب میں وہ غزل، رباعی، مخمس اور مفرد شعر پیش کرتا ہوں جو ج - ۱، ج - ۲ میں ہیں لیکن مطبوعہ نسخہ میں یعنی کلیات ولی طبع دوم میں نہیں ہیں۔ اختلافات نسخ کے سلسلہ میں جو "زائد شعر" دئے ہیں ان پر یہ مستزاد ہیں۔

غزل

(۱)

مکھ دکھا کے چھپانا کون طرح جھانکی سے مارجانا کون طرح

دل لگایا تمہن رقیبوں سے مجھ سے کہ کر چھپانا کون طرح

بات سن کر تغافلی نہ کرو ہونٹوں میں بڑ بڑانا کون طرح

اور سیں ہنستے ہو ہم کوں غم میں جلانا کون طرح

ہے ولی زندگی کی مشرب میں (زندگی کے)

آگے پھر جھک مکانا کون طرح (جگ مگانا) ج - ۲

(۲)

بزیر پائے تو یہ جاں نہیں ہزار افسوس نہ آیا سیر چمن کی تو نو بہار افسوس

جہاں میں ہے چمن میں چو بلبل و قمری (؟) مری ہیں یاد نہیں میں می کوں ہزار افسوس (؟)

اگر چو چاہتا آکے رقیب سرکش ہے (؟) کہ بر رخ تو زدہ نالہ بے افسوس (؟)

میں اس سوں آگے ہیں درد اپنے کوں سنایا ہوں (؟) سنہیں درد کے گھر گھر چو لالہ زار افسوس (؟)

ولی یوں داغ سوں دلکوں نہیں جلاتا ہے

موہن کے سوز سوں نہیں ہیں داغدار افسوس (ج - ۲)

جیساکہ ظاہر ہے، اس غزل کے اکثر شعر صاف نہیں ہیں

(۳)

کہوں کیا حال اپسکا توریاں داد (کذا نسوح ہی؟) ہوا ہوں چاک گریباں تو آہو انسوں ترس (؟)

ہوا ہوں بلبل مستانہ نغمہ زن تیرا ہوا ہے خون گل صد برگ باغبانسوں ترس
ترے فراق میں رو رو ہوا ہوں سرگرداں نہیں ہے معتبر از مرد جادو انسوں ترس
چوں ماہ نو ہوا ہوں از فراق تو لاغر کیا ہوں سجدہ بمحراب ابروانسوں ترس
ولی کیا ہے ترے نام کا وظائف صبح (وظائف)
ثنا، تسبیح صد دانہ زاہد انسوں ترس ج۔۲

(۴)

صفحہ ۰۷ (کلیات ولی، طبع دوم) کی غزل ۱۱۶ "دکھیا معنی" کی ردیف کے ساتھ ج۔ ا میں ملتی ہے۔ دو، تین شعروں میں ہلکے سے لفظی اختلاف بھی ہیں۔

مخمس

مجکوں یو تیرا عشق اوداسی کیا پیا آخر توں میری سیج کوں باسی کیا پیا
دی آس اولاً و نراسی کیا پیا کفنی پہنا کے مجکوں لباسی کیا پیا
یکجو دکھا کر دل میں دو بھاسی کیا پیا

باکر بھاکر یو بندگی کا دو کانوں میں مندرا سرن مجھے ہوا ہے ہمیشہ پیا پیا
سن کیا ہوں آہ سوں دلسوز خوش نوا آسن فراق یار بھبوت عشق کی چھڑا (کذا)
مٹ میں برہ کے مجکوں ستاسی کیا پیا

پایا ہوں دانہ لطف کا شب رنگ خال میں دل جا پھنسا ہے طرز محبت کے جال میں
آتش لگی ہے نیہہ کی مجھ بال بال میں دسے مین و شین و قاف سو مجھ لام دال میں
مجھ پر اپس کے گھر کتیں کاسی کیا پیا

وہ من ہرن کہ جس کا دیوانہ ہے کائنات روشن ہے جس کے نور تجلی سوں شش جہات
جس کی نگہ کی تیغ میں ہے چشمۂ حیات اپنی نگہ کی تیغ سوں مجھ دل کو کاتکا ست (کذا)
مجھ زندہ گیسوں آہ اوداسی کیا پیا (زندگی سوں)

میرے یو ساتھ بول سخن اپنے عشق کا محرم تو کر یو مجکوں سجن اپنے عشق کا
تیر نگہ کا مار جو دہن اپنے عشق کا تا حشر دے ولی کوں کوں کفن اپنے عشق کا
ہے ہے برہ نے قبر میں پھانسی کیا پیا

جس غزل کی یہ تخمیس ہے وہ مطبوعہ نسخہ میں صفحہ ۰ ۵ پر دی ہوئی ہے۔ اور چونکہ ولی نے عموماً اپنی ہی غزلوں کی تخمیس کی ہے اس لئے اس غیر مطبوعہ مخمس کو بلا جھجک ہم ولی ہی کی تخمیس قرار دے سکتے

ہیں۔ اختلافات قرأت تو کئی ہیں تاہم "اکاسی" بہت نمایاں ہے۔ اسی لئے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اس مخمس کے ساتھ ساتھ ولی کے دوسرے مخمسات کے پیش نظر خیال ہوتا ہے کہ ضمیمہ ص ۲۰ شعر ۲۲ کی غزل ولی ہی کی ہے۔ دوسرے مخمس ۱۸ (ص ۳۱۹) کے پہلے بند کا چوتھا اور پانچواں مصرع مل کر یہ پورا شعر بھی بن جاتا ہے۔

رباعیات از ج-۱

(۱)

حق نے تجکوں دیا ہے عقل و شعور　　　یاد میں دل کوں رکھ تو اپنے حضور
مت ہو غافل کہ وقت جاتا ہے　　　عمر جاتی ہے جیوں ندی کا پور

(۲)

اے دل تو ہنس آج سدا رونا ہے　　　اور خاک مٹی بیچ تجھے ہونا ہے
اے نیند کے متوالے کیتا سوویگا　　　ٹک جاگ ٹیکہ جاکہ بہوت سونا ہے (کذا)

دوسرے مخطوطہ میں "سدا" کی جگہ "مبا" اور "ہونا" کی جگہ "سونا" ہے۔

(۳)

یک روز تجھے قبر منیں بھاونگے (یا دنگے)　　　تنہا مجھے سب چھوڑ کر گھر جاونگے
اوس وقت ولی کام نہ کوئی آویگا　　　اعمال ترے ساتھ ترے جاونگے (کذا)

فردیات از ج-۱

۱　تیغ ہے تیز تیرے ابرو کی　　　جسکوں لگتی ہے خوب لگتی ہے
۲　تجھ دہن کی دیکھ خوبی گوہراں　　　جا صدف میں سر بسر پانی ہوے
۳　ڈوبا ہے نیلیں نیلم مسی تجھ لبکی لالی سوں　　　گیا یاقوت کا پانی ترے یو پان کھانے سوں (کذا)
۴　پیا کے پان کھانے نے دکھو سب کی شرم راکھی　　　وگرنہ جلتے تھے یاقوت لب اوں پر سخن آتا
۵　یار گھر جاتا ہے یارا کیا کروں　　　آہ کر جاتا ہے میرا کیا کروں (کذا)

مضمون ختم کرنے سے پیشتر بمبئی کے مشہور صحافی محبی ن م شیخ صاحب (مہتم کھتری میونسپل لائبریری) و محبی محمد ابراہیم صاحب نصرت (مہتم کتب خانہ جامع مسجد بمبئی) و جناب کاؤس فیروز صاحب دستور (مہتم کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ لائبریری) کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ اگر ان کی عنایتیں شامل حال نہ ہوتیں تو میں یہ مضمون نہیں لکھ سکتا تھا۔ مذکورہ مخطوطوں تک میری رسائی انھیں کی رہین منت ہے۔

(نوٹ) یہ مضمون تقریباً پورا لکھا جا چکا تھا کہ مجھے بمبئی یونیورسٹی لائبریری کے کھٹکھٹے کلکشن میں دیوان ولی کے دو تین نسخے مل گئے لیکن سبھی اول و آخر سے ناقص تھے۔ اس لئے میں نے اس مضمون میں انھیں شامل نہیں کیا۔ کبھی آئندہ انشاء اللہ ان پر کچھ لکھوں گا (ع - ج)

تبصرہ!

عورت اور اسلامی تعلیم | از مالک رام، ملنے کا پتہ نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مالک رام صاحب کی ہر تحریر مطالعہ کی وسعت، اسلوب کی متانت اور علمی تحقیق کی آئینہ دار ہوتی ہے، ذکر غالب کے صفحات ہوں یا تلامذۂ غالب کے اوراق اپنے مصنف کے شستہ مذاق اور بالغ نظری کی غمازی کرتے ہیں، ان کے بہار آفریں قلم میں روانی کے ساتھ ساتھ ایک قابل تعریف ضبط بھی پایا جاتا ہے جس کی بدولت وہ جادۂ اعتدال سے سر مو انحراف گوارا نہیں کرتے، ان کی تازہ تصنیف 'عورت اور اسلامی تعلیم' بھی ان خوبیوں کی حامل ہے، عورت کے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر جس جامعیت سے انہوں نے نظر ڈالی ہے اس کی جتنی تعریف بھی کی جائے کم ہے، عورت کی بڑی حیثیتیں تین ہیں بیٹی، بیوی اور ماں کی، ان میں سے ہر ایک کے اہم پہلوؤں سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے، نکاح کے مقاصد ہوں یا طلاق کی حدود یا ورثہ کی تقسیم ہر ایک سے متعلق اسلامی تعلیم کو عالمانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے، مزید برآں ان کے بیانات زیادہ تر قرآن حکیم اور صحیح احادیث پر مبنی ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں زیر تبصرہ کتاب گوناگوں محاسن سے آراستہ ہے اور اہل علم اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی خوبیوں کی داد دیں گے، ہمارے نزدیک اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت جستجو سے حق اور انصاف پسندی کی وہ روح ہے جو اس کے ہر ہر صفحے اور ہر ہر سطر میں نمایاں ہے، اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح کے ادراک میں جس فیاضی اور ہمدردی سے انہوں نے کام لیا ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، جس عقیدت مندانہ انداز میں انہوں نے رسول کریم، صحابۂ کرام، قرآن حکیم اور کتب حدیث کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی انصاف پسندی اور کشادہ دلی کا ثبوت ملتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ایک بیدار مغز اور روشن خیال عالم کی طرح اسلامی تعلیمات کو صحیح صورت میں پیش کیا ہے اور عورت کے احترام اور اس کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں اسلام کے احسانات کو بڑی کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

مالک رام صاحب ہر روایت کو بلا چون و چرا ماننے کے قائل نہیں، وہ اپنی خداداد ذہانت سے کام لے کر قوی اور ضعیف میں امتیاز کر سکتے ہیں اور قرآن کے مقابلے میں کسی بزرگ کا قول یا عمل ان کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں، مصنف نے بعض ضمنی مسائل مثلاً قرآن کے مقابلے میں حدیث کی حیثیت پر بڑے جچے تلے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

نیاز صاحب نے اپنے تعارف میں اس اندیشہ کا اظہار کیا ہے کہ بعض حضرات کو مالک رام صاحب کے ترجمۂ آیات سے اختلاف ہوگا، خود مالک رام صاحب کو بھی اس امر کا احساس ہے لیکن وہ اسے تعبیر و تفسیر کے اختلاف پر محمول کرتے ہیں لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ دو ایک مقام پر یہ محض اختلاف تعبیر کا معاملہ نہیں، بحیثیت مجموعی 'عورت اور اسلامی تعلیم' اسلامیات کے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

(م۔ا۔ڈ)

مذہبیات

۱۔ ابوالجلال ندوی، اصحاب الفیل کا واقعہ اور اس کی تاریخ (معارف اکتوبر ۱۹۵۲ء ۲۴۶ - ۲۶۲)

اصحاب الفیل کی تاریخ اور حملہ کی وجہ مفصل طریق پر بیان کی گئی ہے۔

۲۔ ادارہ: اسلامی تاریخ کے معجزے (فیض الاسلام ۵۱ نومبر ۳)

جنگ یرموک میں عین معرکہ کے وقت جرجہ کے خالد بن ولید سے مذہب اسلام کے بارے میں استفسار کرنے اور ان کے جواب دینے کے بعد اول الذکر کے مشرف بہ اسلام ہونے کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔

۳۔ ادارہ: نبیوں کی باتیں (فیض الاسلام ۵۱ نومبر ۲۲-۲۳)

حضرت سلیمانؑ کے اقوال پیش کئے گئے ہیں۔

۴۔ صدیقی۔ نعیم بلفقہ احوالِ زکوٰۃ و مستحقین زکوٰۃ (چراغ راہ ۵۲ جنوری ۱۷ - ۵۷)

احوال زکوٰۃ، مقدار نصاب، وقت وجوب اور مستحقین زکوٰۃ کی چارٹ کی صورت میں تفصیل،

۵۔ لاہوتی: الاربعین فی عظمۃ الکتاب المبین (فیض الاسلام راولپنڈی ۵۱ دسمبر ۱۵ - ۲۴)

مضمون نگار نے قرآن مجید سے چالیس دلایل پیش کئے ہیں جو قرآن کی اہمیت، عظمت اور فضیلت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۶۔ مشکوٰۃ: صحبت اولیاء (فیض الاسلام ۵۱ نومبر ۱۹ - ۲۰)

فریدالدین گنج شکر کے مجموعۂ ملفوظات راحت القلوب مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی میں درویش کی مختلف صفات بتائی گئی ہیں مضمون میں ان صفات کو پیش کیا گیا ہے جو حضرت گنج شکر نے جو راہ سلوک میں دل کی صلاحیت پر زور دیا ہے اسے بھی قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

۷۔ ملک جمال الدین: فدیہ صیام (فیض الاسلام ۵۱ نومبر ۳۹ - ۴۰)

فیض الاسلام ماہ اگست (۵۱) میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا ایک "فدیہ صیام" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بلاعذر فدیہ دے کر روزہ ترک کیا جا سکتا ہے اور اس کی تائید میں قرآن سے چند مثالیں دی ہیں۔ مضمون نگار نے ان کے دعویٰ کی انہیں مثالوں سے تردید کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ و سیاست

۸۔ ابوالخطیب: اسلام کا سماجی تصور اور کمیونسٹ ڈپلومیسی (چراغ راہ ۵۲ جنوری ۱۵ - ۱۷)

مضمون میں کمیونسٹ ڈپلومیسی کا تفصیلی جائزہ لینے کے بجائے اس کے پروپیگنڈے کی چند قسموں کو متعارف کرایا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ پاکستان اور دیگر بلاد اسلامیہ میں کمیونزم اس لئے قوت نہیں حاصل کر سکا کہ مسلمان اس تحریک سے متاثر نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے قرآن کے دستور

سے امید ہے کہ وہ اسے سارے معاشی اور سماجی الجھنوں سے نجات دلادے گا۔ (باقی آئندہ)

۹۔ ابوالمحاسن حسین سعادت نظیر: دنیا میں تمدن کی بنیاد (سب رس دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۹)

دنیا کی بعض قدیم اقوام کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے تمدن کے ارتقا پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں تمدن میں حسن کاری کے درجے سے بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے چونکہ تمدنی عناصر میں انقلاب ہوتا رہتا ہے اس لئے کسی عنصر کو تمام اقوام وملل کے تمدن کا عام معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۰۔ برق رضوی تستانی: امن عالم اور انسانی مساوات — (فیض الاسلام راولپنڈی ۱۹۵۱ء دسمبر ۴۔ ۴۳)

سیاست سابقہ وسیاست حاضرہ کا تاریخی بیان ہے کہ دنیا کے قدیم وجدید ہلاکت خیز تمدن کی تین بنیادیں ہیں یعنی شخص پرستی، قوم پرستی، اور جماعت پرستی چنانچہ اشتراکیت بھی امن کا حل نہیں پیش کر سکی بلکہ وہ بھی تباہی کا باعث ہوئی۔ ان تباہیوں سے بچنے اور امن عالم اور انسانی مساوات کا واحد ذریعہ اسلام اور اس کے اصول ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر سید محمود۔ ہندوستانی ثقافت (ہندوستانی کانفرنس منعقدہ حیدرآباد دکن کا خطبۂ صدارت)، شاعر اکتوبر ۱۹۵۱ء ص ۹۔ ۱۸۔

سب سے پہلے ثقافت اور قومی زندگی سے اس کے تعلق سے بحث کی گئی ہے اور پھر بتایا گیا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے پرانے کلچر میں ترکی، عربی اور ایرانی عناصر کے انضمام سے ایک مشترکہ کلچر وجود میں آیا جو ہندوستان کے موجودہ باشندوں کا مقدس ورثہ ہے۔

۱۲۔ کوثر چاندپوری: اطبائے عہد مغلیہ کی ملکی وسیاسی خدمات (آج کل ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۴۔ ۷) بابر سے لے کر آخری مغل تاجدار کے زمانہ تک فنی انہماک کے ساتھ ساتھ اطبا نے ملکی اور سیاسی مسائل میں حکومت کے ساتھ ہر موقعہ پر تعاون کیا ہے اور بعض اوقات جنگوں میں کامیاب حصہ بھی لیا ہے۔ غرض ان اطبا کے کارناموں کا ہندوستان کی معاشرت، ثقافت، سیاست اور اس کے تمدن پر گہرا اور نمایاں اثر پڑا ہے۔

۱۳۔ محمد شاہ پھلواروی: ہماری تاریخ کی تین بنیادی غلطیاں (فیض الاسلام راولپنڈی، ۱۵ دسمبر ص ۲۔ ۳۱)

موجودہ اسلامی تاریخ پورے طور پر اسلامی تاریخ نہیں ہے۔ اس میں اسلامی عنصر کے ساتھ مسلمانی تاریخ بھی شامل ہے چنانچہ اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن اس کا تاریخ نویسوں کو احساس نہیں۔ دوسرے فرمانروائی کے پیش نظر ظاہری بادشاہوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مگر ان کا نہیں جو معنوی طور پر اسلام کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ دوسری غلطی ہے۔ اور تیسری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مورخ در اصل ناقل ہوتے ہیں ناقد نہیں۔

۱۴۔ مسعود احمد برکاتی: تاریخ کی مادی تعبیر (معاشیات ۱۵ اکتوبر ۵۰۱۔ ۵۱۰)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخی واقعات وحالات اور انسان کے اکثر افعال کی تہہ میں اسباب ومحرکات کی طرح معاشی عوامل بھی پنہاں ہوتے ہیں اور زندگی پر اس کے اثرات بھی پڑتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف معاشی عوامل ہی تاریخ کے بروائے اور انسان کے ہر عمل میں کارفرما ہوتے ہیں۔

۱۵۔ نصیر الدین ہاشمی۔ لفظ "سامری زیمورن" کی تحقیق بعض فارسی اور عربی تاریخوں سے (سب رس اکتوبر ۱۹۵۱ء ص ۱۲۔ ۲۳)

بعض فارسی اور عربی تاریخوں کے حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ "سامری زیمورن" میں سے ایک لفظ ملیبار کے راجہ کا خاندانی نام تھا اور دوسرا اس کا ذاتی نام۔

۱۶۔ نظیر صدیقی۔ عہد حاضر میں حجری دور کا انسان۔ نگار نومبر ۱۹۵۱ء ص ۴۴۔ ۴۶)

آسٹریلیا کی شمالی اطراف کی آبادی کا اب بھی "حجری" دور سے گزر رہی ہے۔ ان باشندوں کی طرزِ رہائش، عقائد اور رسم و رواج سے بحث کی گئی ہے۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۱۷۔ حافظ محمد مظہر: دارالعلوم کے سپوت (سب رس اکتوبر ١٩٥٢ء ص ۱۷۔۲۲)

بہ سلسلۂ گذشتہ دارالعلوم حیدرآباد کے ان افراد کے حالاتِ زندگی اور علمی سرگرمیوں کا تذکرہ جنھوں نے قومی اور علمی خدمات میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

۱۸۔ حافظ محمد مظہر۔ دارالعلوم کے سپوت (سب رس نومبر ١٩٥٢ء ص ۳۳۔۴۰)

بسلسلۂ سابق دارالعلوم حیدرآباد کے بعض نامور فرزندوں کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی علمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۔ حافظ محمد مظہر۔ دارالعلوم کے سپوت (سب رس دسمبر ١٩٥٢ء ص ۴۳)

بسلسلۂ گذشتہ دارالعلوم حیدرآباد بعض افراد کے مختصر حالاتِ زندگی اور علمی سرگرمیاں پیش کی گئی ہیں جو قومی و علمی خدمات میں پیش پیش رہے ہیں۔

۲۰۔ ذکیہ سلطانہ: جہاں آرا (آجکل ۱۵ دسمبر ۴۲۔۴۴)

جہاں آرا بڑی لائق فائق، عالم اور متدین خاتون تھی۔ شاہجہاں کو یہ بیٹی بہت عزیز تھی۔ ممتاز محل کے بعد سارے امور کی یہ نگراں تھی۔ دانش مندی و دور بینی اور فکری صلاحیتوں کے سبب شاہجہاں کی مشیر اور مجوز بھی تھی۔ دارا کو حقیقی حقدارِ تخت سمجھتی تھی لیکن اورنگ زیب کا بھی خیال رکھتی تھی۔ باپ بیٹے میں اسی نے صلح صفائی کرائی تھی۔ خود عمر بھر شادی نہیں کی لیکن دوسروں کی شادیاں کروائیں۔ آگرہ کی جامع مسجد، دلی کا ملکہ باغ، درگاہ اجمیر کا بیگمی دالان اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں بچ رہے ہیں۔ "مونس الارواح" کی مصنف، شاعرہ و شاعر نواز اور طبعاً فقیر منش تھی۔ نظام الدین اولیا کی درگاہ میں مدفون ہے۔

۲۱۔ قادری۔ حامد حسن: منشی حیات بخش رسا مرحوم۔ (آجکل ۱۵ نومبر ۱۰۔۱۳)

ضلع فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ شعر و سخن کا ذوق فطرت میں لے کر آئے تھے۔ داغ کے شاگرد تھے۔ گلدستۂ پیامِ یار میں ان کا کلام چھپتا تھا۔ ریاست رامپور کے دو عظیم الشان مشاعروں میں انھیں عام شہرت حاصل ہوئی۔ مضمون میں ان مشاعروں کا تفصیلی ذکر ہے۔ اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔

۲۲۔ محمد مصلح الدین احمد: مسٹر نصر اللہ انتظام (آجکل ۱۵ نومبر ۲۳۔۲۵) مضمون میں مسٹر نصر اللہ انتظام کی سیاسی کارگذاریوں کا جائزہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت لیا گیا ہے (۱) ممالکِ غیر میں ایران کی نمائندگی (۲) وزیرِ مواصلات ایران (۳) وزیرِ خارجہ ایران کی حیثیت سے (۴) سان فران سسکو کانفرنس میں شرکت (۵) جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت (۶) صدر ٹرسٹی شپ کونسل (۷) صدر ایڈہاک کمیٹی (۸) جنرل اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے (۹) اقوامِ متحدہ مسٹر انتظام کی نظر میں اور (۱۰) ایرانی تیل اور مسٹر انتظام۔

۲۳۔ مناظر احسن گیلانی: ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی (معارف اکتوبر ١٩٥٢ء ۲۴۴۔۲۸۲)

مولوی حکیم محمد حسن امروہہ کے رہنے والے نقوی خاندان کے سید تھے، وہ اردو میں ایک تفسیر غایۃ البرہان کے مصنف تھے۔ اس کے مقدمے سے ان کی تعلیم اور دوسری سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے، حکیم صاحب مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین کے شاگرد تھے، طبابت کا پیشہ چھوڑ کر گورنمنٹ کالج اجمیر میں اول مدرس ہو گئے، ان کی تفسیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدید علوم و فنون سے اچھی طرح واقف تھے۔

تنقید، ادب و لسانیات

۲۴۔ ابراہیم یوسف: فنِ ڈراما نویسی (نگار، ۱۵ اکتوبر ۲۱۔۲۵)

اس قسط میں کردار نگاری، مکالمے، ڈراموں کی قسموں سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ڈراما زندگی کی تنقید ہے۔ (پہلے سے جاری)

۲۵۔ اثر محمد علی رامپوری۔ شاہ نصیر دہلوی۔

(اردو ادب ۱۵ جولائی ۴۴ — ۱۷۲)

نصیر الدین نام، نصیر تخلص، وطن دہلی، شاگرد محمدی مائل اپنے عہد کے چوٹی کے شاعروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ استعداد کم تھی لیکن شاعرانہ صلاحیتیں بہ حد کمال۔ بعید الفہم استعاروں، مشکل اور سنگلاخ زمینوں کی غزلوں کے علاوہ صاف اور رواں شعر بھی کافی ہیں۔ روزمرہ کی پابند محاورہ کا صحیح استعمال اور سادگی نصیر کی خاص خصوصیات ہیں۔

۱۲۵۴ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ اور وہیں کسی شاگرد نے غزلوں پر مشتمل ان کا دیوان چھپوا کر اسے محفوظ کر دیا۔ مخمس وغیرہ کسی کو مل نہیں سکے تھے اس لئے شائع نہیں ہوئے تھے۔ نصیر کی وفات کے بعد حسین تسکین کے بیٹے عبدالرحمٰن نے محنت سے ان کا کلام مرتب کیا جس کے اقتباسات اس مضمون میں شامل ہیں۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مختلف صورتوں میں نصیر نے ۴۲ قصیدے، ۱۲۱ رباعیاں، ۷ قطعے اور ۳۵ تاریخیں لکھی ہیں۔

۲۶۔ ادارہ: ادب الکاتب والشاعر

نگار نومبر ۱۹۵۱ء ص ۳۷ — ۴۰

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

جس طرح گانے میں آواز اور جسمانی حسن میں اعضا کا تناسب ضروری ہے اسی طرح شعر و ادب میں تناسب الفاظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اہل فن کے منضبط کئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں الفاظ و تراکیب کے حسن و قبح سے بحث کی گئی ہے۔

۲۷۔ ادارہ: ادب الکاتب والشاعر

(افادات علی حیدر طباطبائی نظم مرحوم)

(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۲۷ — ۴۴)

دہلی اور لکھنؤ کے لسانی اختلاف اور تذکیر و تانیث کے فرق سے دلچسپ پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔

۲۸۔ ادارہ: نوائے عرب

(چراغ راہ ۵۲ جنوری ۸۱ — ۸۹)

عربی شعراء مصطفیٰ صادق الرافعی، عبدالوہاب عزام، زہیر بن سلمیٰ، سموؤں، قطری ابن الفجاۃ، شوقی اور ابو الاسود دؤلی کی عربی نظمیں اور ان کے ترجمے مترجمین محمد طٰہٰ صدیقی، محمد عاصم اور منہاج الدین ہیں۔

۲۹۔ اعظم حسین اعظم: آرزو لکھنوی

(آج کل ۱۵ اکتوبر ۵ — ۷)

آرزو اُردو زبان کے ماہر خصوصی تھے۔ اسی مہارت کی وجہ سے بعض لغات کے سلسلہ میں ان سے لوگ رجوع کیا کرتے تھے اور ایک لغت ترتیب دینے کی لوگوں نے ان سے خواہش کی تھی۔ عربی و فارسی کے بیجا استعمال سے ہٹ کر آرزو نے "خالص اردو" میں شعر و شاعری کے علاوہ اصطلاحی چیزیں بھی لکھیں۔ جن میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم آرزو کا بیشتر سرمایہ غیر مقید اُردو میں ہے۔ خالص اُردو کا نمونہ سریلی بانسری۔ اور غیر مقید اُردو کے نمونے فغانِ آرزو، جہانِ آرزو اور دوسری غیر مقید غزلیں ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے آرزو کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ ملکی اور قومی واقعات پر بھی نظمیں لکھیں۔ قصیدے اور مرثیے وغیرہ بھی کہے ہیں۔ ان کے فلمی گیت بھی ایک مقصد رکھتے تھے۔ نثر بھی عمدہ لکھتے تھے۔ اصلاحِ سخن خاص فن تھا۔ اخلاق کے لحاظ سے بھی عمدہ آدمی تھے۔ کراچی کے علی باغ میں مدفون ہیں۔

۳۰۔ بلونت سنگھ: حضرت چھچھوندر چھچھوروی

(آج کل ۱۵ دسمبر ۳۳ — ۳۶)

یہ ایک طنزیہ اور مزاحیہ مضمون ہے جو تحقیقی مقالہ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

ین کاظمی : امراؤجان ادا و مرزا رسوا۔
آج کل ۱۵ اکتوبر ۲۳ — ۲۸)۔
۔ مرزا رسوا اور ان کی فرانسیسی محبوبہ صوفیہ سے متعلق
کے اشعار اور جہاں سلسلہ ٹوٹ گیا ہے وہاں امراؤجان
ری اوٹ درج ہیں۔ مرزا رسوا کی محبوبہ نے فرانس
جاتے اپنی لکھنؤ کی ملکیت ان کے نام بیع کر دی۔ ان کی
کو دیکھتے ہوئے اس عشق کی داستان کو صحیح ماننا پڑتا
مضمون نگار کو یہ مثنوی " نالۂ رسوا" چونکہ مرزا کی زندگی
ں ملی اس لئے ان سے تصدیق نہ ہو سکی ورنہ وہ صاف گو
ب کردار شخص خود تفصیلات بتانے سے گریز کرتا۔
جعفر علی خاں اثر۔ لکھنؤ کی زبان
شاعر اکتوبر ۱۹۵۱ء ص ۱۹ — ۳۲)
ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی کے مضمون " دہلی اور لکھنؤ
ن کا فرق" مطبوعہ سالنامہ شاعر ۱۹۵۱ء کی بعض
شتوں سے بحث کی گئی ہے۔
جلیل احمد قدوائی : اصغر کی یاد میں
اردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۴۶ — ۵۹)
ں مقالہ کا کچھ حصہ ۔ ۲۰ نومبر ۱۹۵۱ء کو اصغر کی چودہویں
ے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ اس میں جلیل نے اصغر کے
پنے تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی اصغر کی شخصیت
عری سے متعلق اپنے احساسات پیش کئے ہیں۔ غالب
اصغر نے اردو غزل کو زندہ کیا۔ خیال و بیان کی نفاست
ان بہت ہے اور یہی نفاست ان کے لباس اور
ن کے طریقوں میں رکھ رکھاؤ کی صورت میں تھی
نہ کے پابند تھے۔ تصوف سے گہری دلچسپی اور
سے دلی عقیدت تھی۔ دل دکھانے یا جواب میں
ے قائل نہیں تھے۔ دوسروں کو بھی اس سے روکنے
بہت خیال رکھتے تھے۔ باوصف متانت
لطیف ظرافت کے بھی جوہر تھے۔ اصغر کی بلند شاعری

کا اعتراف علی گڑھ یونیورسٹی نے بی اے میں نصاب درج
داخل کر کے کیا۔ اقبال کے بعد یہ دوسرے زندہ شاعر تھے
جس کا کلام یونیورسٹی نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔

۳۴۔ جلیل عابدی ۔ آزاد فنکار۔
(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۱۹ — ۲۲)

وہ کیا چیز ہے جو ایک فنکار کو آرٹ کی خدمت پر ابھارتی
ہے وہ اس کی انانیت ہے۔ اس کے نظام فکری کا ایک فطری
زور ہے، اس کی عظیم انفرادیت کا ایک پرجوش اثبات ہے۔
بتایا گیا ہے کہ کس طرح مختلف نظام حیات فن کار کی انانیت
اور انفرادیت پر قید و بند لگاتے ہیں۔ آخر میں ایک ایسے نظام
کے قیام کی دعوت دی گئی ہے جہاں یہ پابندیاں نہ ہوں تاکہ ایسے
فنکار بھی آزادانہ تخلیق کے عمل کو انجام دے سکیں جن کی انانیت
زیادہ پرجوش نہیں ہے۔

۳۵۔ حبیب احمد صدیقی : نسخۂ حمیدیہ
(اردو ادب ۱۵ جولائی ۵۴ — ۷۷)

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے غالب کی عظمت گھٹی
نہیں بلکہ بڑھ گئی۔ ان کے خطوط کی طرح اس نے بھی بہت
سے پردے غالب کی شخصیت پر سے اٹھا دئے۔ غالب
کی کافی غزلیں پچیس برس کی عمر میں کہی جا چکی تھیں، گویا اس
دور کے کلام میں دس پندرہ شعر ہی لائق اعتنا نہیں تھے۔
دوسرے آزاد کے بیان میں ترمیم بھی کرنی ہوگی۔ کیونکہ مروجہ
دیوان اور نسخۂ حمیدیہ میں ۴۶۴ کے قریب شعر مشترک ہیں
غالب کے مذہبی عقیدہ پر بھی اس سے معتدبہ روشنی پڑتی ہے۔
(مضمون نگار نے جابجا نسخۂ حمیدیہ سے حسب ضرورت
اشعار انتخاب کئے ہیں۔ اور آخر میں " لائق انتخاب" اشعار
کی خاصی تعداد درج کی ہے)

۳۶۔ حبیب اللہ خاں غضنفر : معیات جامی
(اردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۸۳ — ۱۰۱)

اردو میں سودا، مومن اور محسن کاکوروی کے ہاں کچھ

مثنے ملتے ہیں۔ لیکن درباری شاعری کی یہ صنف نظم فارسی شعراء کے ہاں مقبول رہی۔ اس کی تحریک کبھی اور کبھی یوں ہی ہوتی تھی۔ وقت پسند طبیعتیں اس میں تفاخر محسوس کرتی تھیں مولانا جامی کے کلیات میں ۸۶ مثنے ہیں جن کے حل معہ ان معموں کے اس مضمون میں درج ہیں۔

۳۷۔ حسام الدین راشدی: سندھ کے اُردو شعرا۔

(اُردو ۵۱ اکتوبر ۵ — ۲۵)

اُردو مراکز سے دُور رہنے کے باوجود سندھ اُردو کی خدمت کرتا رہا۔ ویسے اُردو کی پیدائش میں جو اس کا مقدم حصہ ہے وہ ظاہر ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں میر محمد فاضل بکھری اُردو میں شعر کہتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ہر زمانہ میں جبکہ دہلی اور لکھنؤ اساتذہ کا گہوارہ بنے ہوئے تھے، سندھ اس پایہ کے نہ سہی تاہم قابل قدر شعرا ضرور پیش کرتا رہا ہے مضمون نگار نے "کلہوڑا" اور "تالپور" حکومتوں کے عہد کے شعرائے ملکی و غیر ملکی کا تذکرہ اور بعض اوقات انتخاب پیش کیا ہے۔ مقابلہ کے لئے متوازی زمانہ کے دہلوی اور لکھنوی اساتذہ کے نام گنائے ہیں۔ ۱۷۰۰ء سے شروع کرکے ۱۹۰۰ء تک سندھ کے اُردو شعرا کے تین دور قائم کئے ہیں۔ اس مضمون میں میر علی شیر قانع کے تذکرہ سے مدد لی ہے۔

۳۸۔ حفیظ الرحمٰن واصف: ترادف الفاظ

(آج کل ۵۱ نومبر ۱۸—۲۲)

یہ ایک معرکتہ الآرا مسئلہ ہے کہ ترادف الفاظ کا وجود ہے یا نہیں بعض علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ ترادف کا وجود ہی نہیں۔ مضمون نگار نے اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اُردو زبان میں انھیں جو جو مترادف اور مشترک الفاظ ملے ہیں ان کی ایک فہرست پیش کی ہے اور اس طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ترادف ایک حقیقت ہے جس کا انکار بڑا ظلم ہے۔"

۳۹۔ خلیق نقوی: یونانی المیہ کا خالق، الیس کیلس

(اُردو ادب ۵۱ جولائی ۴۷ — ۵۳)

سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یونانی ڈرامے کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنی فنی اصلاحوں اور سماجی ماحول پر اپنے فلسفیانہ سوچ بچار کرنے والے دماغ کے ذریعہ الیس کیلس نے یونانی المیہ کی تخلیق کی۔ اس نے لگ بھگ نوّے ڈرامے لکھے تھے جن میں سے صرف سات باقی بچے ہیں۔ "اورسٹیا" اور "قیدی پرومیتھیوس" اس کے شاہکار ہیں۔ اور ان پر مضمون نگار نے تفصیلی تبصرہ بھی کیا ہے۔ یہ ۵۲۴ ق م میں پیدا ہوا اور ۴۵۶ ق م میں انتقال کر گیا۔

۴۰۔ خواجہ احمد فاروقی:

میر تقی میر کی سیرت — نکات الشعرا میں

(آج کل ۵۱ اکتوبر ۳۹ — ۴۴)

اُردو میں تنقید کا شکوہ بیجا ہے۔ ہماری ذہنی ساخت اور ماحول کے لحاظ سے معتدبہ تنقیدی مواد ہمارے تذکروں خصوصاً نکات الشعرا میں ملتا ہے یہ اور بات ہے کہ میر کی بعض زہرناک اور تلخ تنقیدوں کی وجہ سے ان کی بہت مخالفت ہوئی لیکن میر کے ہاں تنقیص کے ساتھ تعریف اور عموماً بے باکی اور صاف گوئی ملتی ہے۔ میر نکات الشعراء کے آئینے میں ہنسنے والے نظر آتے ہیں۔ بسورنے والے نہیں۔ وہ بہت ہی ملنسار، یار باش، محفلوں میں جانے والے تھے۔

۴۱۔ خورشید الاسلام: فسانۂ آزاد

(اُردو ادب ۵۱ جولائی ۶۸ — ۸۴)

فسانۂ آزاد اپنے زمانے خصوصاً لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کی تصویر ہے۔ قدیم اور جدید کو خوجی اور آزاد کے روپ میں سرشار نے پیش کیا ہے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں میں موجودہ زمانے اور خود سرشار کی فنی خوبیاں اور خامیاں جھلکتی ہیں زمانے کے تقاضوں اور اثرات کے

سبب فسانۂ آزاد انسانوں کا ایک جنگل ہے۔ اور اس کے واقعات میں کوئی منطقی ربط اور تسلسل نہیں ہے۔ تاہم داستان پر اضافہ کرنے کے ساتھ فسانۂ آزاد نے اس ناول کی داغ بیل ڈالی جو رزمیہ کی وسعت کا دھندلا سا تصور پیش کرتا ہے۔ سرشار نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو دیکھا اور ناول سے تنقید کا کام لیا اور اس میں طنز و ظرافت کو شامل کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔

۴۲۔ ڈاکٹر محمد اشرف: روس میں ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ

(اردو ۵۱ اکتوبر ۱۱۱-۱۱۶)

اٹھارویں صدی میں جرمن مستشرق باثیر جو پیٹرس برگ (روس) کی شاہی اکادمی میں ملازم تھا اردو کو تقریباً محتریر کی زبان کہتا ہے، جیسا کہ اس کی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے۔ البتہ وہ اس کا نام "ملتانی ہندوستانی" بتاتا ہے جس کی مثالیں مضمون کے آخر میں درج ہیں۔ اس کے پچاس برس بعد اسی اکادمی نے دنیا کی تمام زبانوں کی ایک بڑی بھاری "تقابلی لغت" چھاپنی شروع کی۔ اس میں سنسکرت، ریختی ملتان کی ہندوستانی، بنگال کی ہندوستانی، دکن کی ہندوستانی تامل، تلگی، کنڑی وغیرہ شامل تھیں۔

۴۳۔ راشدی، محمد مطیع اللہ برہانپوری: ملا محب علی سندی

(اردو کراچی ۵۱ اکتوبر ۷۰-۸۲)

اس سے قبل مولانا حسام الدین راشدی نے رسالہ اردو میں ملا محب علی سے متعلق ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ شائع کیا تھا۔ موجودہ مضمون میں ملا کی ولادت، وفات، جہانگیر و شاہجہاں سے توسل خانخاناں وغیرہ سے تعلقات، اور قیام برہانپور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے خاندان کی ایک قلمی بیاض سے مدد لی ہے۔ ملا بلند پایہ شاعر، عارف کامل عالم متبحر، فیض رسان خلق، مبلغ اسلام، تارک الدنیا، خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ "مونس یزدان" (۹۱۲ء) اور "جامع الفضل" (۱۰۵۵ھ) مادۂ تاریخ ولادت و وفات ہے۔

۴۴۔ راجیندر ناتھ شیدا: کامائنی اور اس کی اہمیت۔

(آج کل ۵۱ دسمبر ۴۸-۵۱)

ہندی شاعری کے دور جدید کی سب سے اہم طویل نظم "کامائنی" ہے۔ اس کے خالق جے شنکر پرشاد ہیں۔ یہ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ منو، شردھا اور ایڑا اس کے تین کردار انسانی من، عقیدت اور عقل کے نمائندے ہیں۔ واقعات کی تخلیق اور ترتیب میں اعلیٰ فنی صلاحیتوں سے کام لیا گیا ہے۔ پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات سے تقریباً پاک ہے اور تجسس انجام ہر جگہ ملتا ہے۔ پوری نظم پندرہ حصوں میں ہے ہر حصہ کی بحر، قوافی و ارکان الگ الگ ہیں، شعروں میں نغمگیت اور رکیلاپن ہے۔ جے شنکر پرشاد جی قدیم تہذیب کے حامی ہیں لیکن نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی کامائنی میں دلچسپی محسوس کریں گے۔

۴۵۔ ریاض الرحمٰن شروانی:

مجنوں گورکھپوری بحیثیت افسانہ نگار

(آج کل ۵۱ دسمبر ۲۳-۲۶)

مجنوں کی افسانہ نگاری کا اصلی زمانہ اگرچہ ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۸ء ہے تاہم اب بھی انھیں پرانا نہیں کہا جا سکتا۔ پلاٹ، اسلوب نگارش، اور کردار نگاری مجنوں کے ہاں اعلیٰ پیمانہ پر ملتے ہیں۔ مجنوں پر قنوطیت پسند، زندگی سے فرار کوشش، اور انگریزی ادیبوں کے چربہ نگار محض یا سارق کا الزام لگانا غلط ہے۔

۴۶۔ سید محمد رشید درد: فانی بدایونی (تقابلی مطالعہ)

(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۳۵-۴۰)

فانی نہ میر ہیں، نہ غالب، نہ مومن ہیں، نہ امیر و داغ مگر پھر بھی سب کچھ ہیں اگر میر کا درد و غم، غالب کا فلسفہ و تصوف، مومن کی بلند خیالی، اور نزاکت، ندرت اور ترکیب الفاظ، امیر و داغ کی شوخی ان سب کو ملا دیا جائے تو فانی کی شاعری کا درجہ بہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

میر، غالب، مومن، امیر اور داغ سے [illegible] کا مقابلہ

یا گیا ہے اور ثبوت میں فانی کے کلام سے مماثل اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

۴۷۔ سید محمد عقیل: ہماری ادبی تاریخیں

(نگار نومبر ۱۹۵۰ء ص ۲۱-۲۶)

اُردو ادب کی تاریخ زیادہ تر خیالی اور بیشتر روایتی ہے بتایا گیا ہے کہ اُردو کی تاریخیں شعراء کے تذکروں کو سامنے رکھ مرتب کی گئی ہیں اور سوائے اُردو کی پیدائش سے متعلق تفتیش و بحث کے ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ ادیب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے اور اس کے نفسیاتی تجزیہ اور صحیح تنقید کی کہیں کوشش نہیں ملتی۔

۴۸۔ شارق میرٹھی: ادب میں اظہارِ شخصیت

(شاعر دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۲۰-۲۱)

ادب میں حسن کار کی شخصیت کو نمایاں ہونا چاہئے یا نہیں۔ اگر حسن کار اپنی شخصیت کا اظہار مناسب نہ سمجھے تو کیا یہ ممکن ہے۔ یہ بات بعید از فہم ہے۔ شخصیت کا اظہار ہر صورت ہوتا ہے۔ حسن کار اپنی تخلیق سے شخصیت کو کتنا ہی علیحدہ رکھے پھر بھی اس کی شخصیت کا جلوہ کار فرما ہوتا ہے۔ سخن فہم ایک نظر میں بتا سکتے ہیں کہ کون تصویر کس آرٹسٹ کی ہے۔

۴۹۔ شوکت بلگرامی:

انیس اور امیر کا ابتدائی اور انتہائی کلام

(نگار ۱۵ اکتوبر ۲۹-۳۰)

اُردوئے معلی ۱۹۱۰ء سے انیس اور امیر کا ابتدائی کلام پیش کیا ہے۔

۵۰۔ شوکت سبزواری: اُردو الفاظ کی حالت صرفی

(اُردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۰۲-۱۱۰)

عام صرف و نحو کی کتابوں میں اُردو اسماء کی تین حالتیں ہیں: فاعلی، مفعولی، اور اضافی۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے اُردو ۱۹۳۳ء میں اس کی دو صورتیں: قائم اور محرف بتائی تھیں۔ ویسے اُردو میں اس کی آٹھ حالتیں ہیں ندائی، آلی، بعدی، اور ظرفی بھی اس کی حالتیں ہیں۔ اور یہ سب مل کر اس کے مزاج کے موافق ہیں۔ عربی صرف و نحو کے مطابق اسے ڈھالنا غلط ہے۔ اُردو اسماء کی ظرفی حالتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد مضمون کے آخر میں مضمون نگار نے سہولت کے لئے پانچ شقوں میں اس کو پیش کر دیا ہے۔

۵۱۔ عبد الرزاق ملیح آبادی:

عربی زبان میں عشق و محبت کے الفاظ

(آج کل ۱۵ اکتوبر ۵۱-۵۴)

عربوں میں عشق و محبت کے جذبہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسے برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بوسہ، ہم آغوشی معیوب نہ تھی۔ شادی کے باوجود ایک عورت محبت کر سکتی تھی شوہر اس کا علم رکھتے ہوئے بھی مانع نہ ہوتا۔ اور شادی اختتام محبت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ عورت کا بالائی حصۂ جسم عاشق کا اور باقی شوہر کا ہوتا۔ عربوں میں یہ جذبہ اتنا رچا ہوا تھا کہ اس کے لئے ان کے ہاں بے شمار الفاظ ہیں جو محبت و عشق کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ عشق البتہ اچھا مفہوم نہیں رکھتا۔ مضمون نگار نے مختصراً ۲۸ الفاظ مع تشریح کے پیش کئے ہیں۔ تاہم یہ محبت کے درجے نہیں ہیں۔

۵۲۔ عرشی: علم و تیغ۔ اقبال کے ایک شعر کی عکاسی

(فیض الاسلام ۱۵ نومبر ۲۴-۱۷)

قرآنی آیات کی روشنی میں اقبال کے مندرجۂ ذیل شعر کی تشریح کی گئی ہے

من آں علم و فراست با پرکاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

۵۳۔ عشرت حسن انور: فلسفہ۔

(آج کل ۱۵ دسمبر ۴۱-۴۳)

فلسفہ کے متعلق لوگوں میں عجیب عجیب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ یہ غور و فکر، صحیح غور و فکر کرنے

کا دوسرا نام ہے ۔ چنانچہ کائنات کے سارے علوم میں اس سے ، اس کے طرز غور و فکر سے بالیدگی ہے ۔

۵۴۔ عشرت حسن انور، اقبال اور جیمس وارڈ (۲۹)
(معارف اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۸۳ ـ ۲۹۳)

جیمس وارڈ کا خیال ہے کہ عالم کی ہم آہنگی، توازن اور نظم و نسق خود بخود اس طرح پیدا ہو گیا ہے جس طرح کہ کسی معاشرتی، ملی یا ملکی نظام میں مختلف افراد کے مابین ملنے جلنے سے ایک نظام فکر و عمل وجود میں آجاتا ہے۔

اقبال جیمس وارڈ کی طرح کثرت وجود کے قائل ہیں اور انھوں نے اس کثرت کو حقیقی سمجھتے ہوئے اپنے فلسفہ کی ابتدا کی ہے ، اقبال جیمس وارڈ کے اس خیال کے بھی مؤید معلوم ہوتے ہیں کہ کثرت وجود کو حقیقی ماننے کے بعد ہی تکمیل ذات کی جد وجہد قائم اور ارتقا کی کوشش برقرار رہ سکتی ہے ، البتہ بعض چیزوں میں اقبال وارڈ سے اختلاف کرتے ہیں۔

۵۵۔ فرمان فتحپوری: زبان اور رسم الخط
(نگار ۵۱ اکتوبر ۳۱ ـ ۳۳)

اس سلسلہ میں پروفیسر احتشام صاحب نے جو مضمون نگار میں پہلے لکھا تھا۔ اس سے مضمون نگار نے اختلاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ زبان اور رسم الخط میں باطنی تعلق ہے اور ایک زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں نہیں لکھا جا سکتا۔ انگریزی اور ہندی سے اس کی مثالیں دی ہیں۔

۵۶۔ فروغ احمد : اقبال پر ایک ترچھی نظر
چراغ راہ ۵۲ جنوری ۷ ـ ۳ ـ ۱۴۳

مذکورہ بالا عنوان سے چراغ راہ جون ۵۱ میں س۔ا تبسم کا ایک تنقیدی مقالہ شائع ہوا تھا مقالۂ ہذا میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

۵۷۔ فطرت حسن عباس : قدما اور تقلید فارسی
(آجکل ۱۵ نومبر ۵۰ ـ ۵۱)

مقالۂ ہذا میں سودا، میر، قائم، درد اور راسخ عظیم آبادی کے وہ اشعار پیش کئے ہیں جو انھوں نے فارسی شعرا حافظ سعدی، بیدل، نظیری، عرفی، فغانی وغیرہ کے اشعار کو یا تو سامنے رکھ کر کہے ہیں یا پھر ان کا ترجمہ کیا ہے۔ اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کے ترجمہ کی جو فراوانی ہے وہ بقول مقالہ نگار شاید اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے۔

۵۸۔ کلام حیدری: اُردو رسم الخط اور اس کی اہمیت
(شاعر ۵۱ دسمبر ۱۵ ـ ۱۸)

اُردو رسم الخط پر اٹھائے ہوئے بے بنیاد اعتراضات سے بحث کی گئی ہے اور اس کی اصلاح کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

۵۹۔ کیفی برجموہن دتاتریہ :
بہار اُردو کانفرنس کا ایک خطبہ
(اُردو ادب ۵۱ جولائی ۵ ـ ۱۴)

شہید الہند مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے لسانی مسئلہ کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہیں کے ایما پر ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے بابو راجندر پرشاد اس وقت کی اُردو کانفرنس پر ملے اور زبان کے مسئلہ پر گفتگو کی جس کا نتیجہ پٹنہ پیکٹ کی صورت میں نمودار ہوا۔ وار دھا میں ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی کانفرنس کی جس میں بہت سے مقتدر علما شریک ہوئے اور ڈاکٹر تاراچند کو ہندوستانی کی ڈکشنری تیار کرنے کے لئے کہا گیا۔ تقسیم کے بعد گاندھی جی نے اس مسئلہ کو اور زیادہ شد و مد کے ساتھ آگے بڑھایا لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی لوگوں نے ان کے منشا کے خلاف عمل کیا یعنی علمی خزانہ کے اُردو کو نظر انداز کر دیا گیا۔ تاہم اُردو دوست اسے فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور یہی وقت تنظیم کے ساتھ کام کرنے کا ہے۔

۶۰۔ لطیف الدین احمد : وسط ایشیا کی کلچری ترقی

(نگار ۱۵ اکتوبر ۵ — ۱۲)

۱- فارسی زبان وادب، سائنس وغیرہ کے کئی سربرآوردہ ادیب شاعر اور مفکر وسط ایشیا کے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں زار روس کے زمانہ میں یہاں کے باشندے انتہائی طور پر زار و زبون تھے۔ تعلیم و تعلم برائے نام تھا۔ ہاں لوک گیتوں کے ذریعہ کسی قدر غیر تحریری ادب ضرور تھا۔ اور کلاسکی شاعری سے کسی حد تک دلچسپی پائی جاتی تھی۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے برابر کا مرتبہ اور سہولتیں مہیا کر کے وسط ایشیا کی بعض بے نام و لامعلوم قوموں کو ابھارا۔ مدرسوں، پریس اور اخباروں کے ذریعہ تعلیم و تہذیب میں یہ قومیں کہیں آگے بڑھ چکی ہیں اور ان کے بہت سے شاعر، ادیب، ڈراما نگار روس کے عظما میں گنے جاتے ہیں۔ (باقی)

۶۱- لطیف الدین احمد۔ وسط ایشیا کی کلچری ترقی

(نگار نومبر ۱۹۵۱ء ص ۵)

وسط ایشیا کی قوموں کی اقتصادی ترقی، اور ان کی علمی ادبی، اور ثقافتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا کہ وہاں کے کلچر اور ادب میں کس حد تک بین ملیت اور اشتراکی عنصر کارفرما ہے۔

۶۲- لطیف الدین احمد: وسط ایشیا کی شاعری کے نمونے

(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۲۳ — ۲۶)

نمونۂ کلام پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ کس طرح انقلابِ روس نے وسط ایشیا کے شاعروں کے ہاتھوں پر پڑے ہوئے تالوں کو توڑ دیا ہے اور وہ زندگی کے نئے ہنگاموں سے ہم آہنگ ہو کر نئے نئے راگ الاپ رہے ہیں۔

۶۳- مالک رام: تلامذۂ غالب

(اردو ادب ۱۵ جولائی ۸۵ - ۱۴۳)

۲- اس مضمون کی پہلی قسط اردو ادب، جنوری و اپریل ۱۹۵۱ء میں چھپی ہے۔ اس قسط میں غالب کے ۴۰ شاگردوں کے جستہ جستہ حالات، جو کچھ مل سکے ہیں، درج کئے ہیں۔ جن کے دیوان یا شعر فراہم ہو سکے ہیں ان کا انتخاب بھی حالات کے بعد پیش کیا ہے۔ بعض شاگرد جنوب مغربی، اور جنوب مشرقی ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

۶۴- محمد عزیز حسن مراد آبادی:
زبان اور رسم خط کا باہمی تعلق

(نگار ۱۵ اکتوبر ۲۳ — ۳۵)

ہر قوم کا مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر زبان کا تلفظ محض اپنے ہی حرف ہجا کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ دوسری زبان کے حروف کبھی پورے طور پر اس کے لہجہ کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ اور پھر لکھاوٹوں کا فرق و طرز بھی اس سلسلہ میں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔

۶۵- محمد محمود: مصری ادب کا ارتقاء

(آج کل ۱۵ اکتوبر ۸ — ۱۰)

مصری تہذیب و تمدن کے ساتھ مصری ادب بھی تبدیل ہوتا اور نئے رُخ اختیار کرتا رہا ہے۔ مصر کے نئے ادیبوں نے ماضی سے کم اور مغربی ادب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ ترکی حکومت نے ان کے وراثتی ادب کو قسطنطنیہ بھیج کر انھیں کنگال کر دیا تھا نپولین اور اس کے ساتھ ماہرین خصوصاً پریس کے آنے سے مصری ادب ایک ترقی کے راستہ پر گامزن ہوا اسمٰعیل پاشا کا زمانہ مصری ادب و زندگی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ برطانیہ کے قبضہ نے انھیں پیچھے رہنے پر مجبور کرنا چاہا لیکن مصری آگے بڑھتے گئے اور نئی یونیورسٹی قائم کر لی۔ موجودہ مصری ادب کو فروغ دینے والوں میں طٰہٰ حسین، حسین ہیکل پاشا، محمود تیمور، احمد شوقی اور بہرام التنسی قابل ذکر ہیں۔

۶۶- منظور الامین: پروفیسر تھور

(سب رس اکتوبر ۱۹۵۱ء ص ۱۰-۱۴)

پروفیسر شور کا تعلق اردو کے جدید شعراء کے اس گروہ سے ہے جس نے اسلوب کے سلسلہ میں پرانے اصول کی پابندی گوارا کی ہے مگر رسمی مضامین کی زنجیروں کو توڑ کر موضوع سخن میں انقلاب پیدا کیا ہے۔ شور کی شاعری ہیئت اور مادّہ۔ تخیل اور احساس کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔ ان کی شاعری خود فراموشی اور بےخودی کی منزلوں سے گزر چکی ہے۔ شور کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۶۷۔ میکش اکبر آبادی: شاعری میں وحدۃ الوجود

(آج کل ۱۵ دسمبر ص ۵-۹)

ایرانی شعراء اور ہندوستان کی فلسفیانہ آب وہوا کی وجہ سے اردو شعراء بھی اور بغیر سمجھے دونوں نے وحدۃ الوجود کو موضوع شاعری بنایا ہے اور کبھی کبھی اس کے برعکس بھی باتیں کی ہیں۔ غالب، اقبال، فانی سبھی کے ہاں ہمیں یہ ملتا ہے وحدۃ الوجود کے نظریہ کو رجعی کہنا غلط ہے۔ عوام نے اسے اپنایا اور اسی پلیٹ فارم پر انسان متحد ہو سکتا ہے۔ یہ کمیونزم کے خلاف نہیں ہے۔

۶۸۔ نصیر الدین ہاشمی۔

دکن میں اردو کے ساتویں دور کا اختتام

(سب رس نومبر ۱۹۵۱ء ص ۹-۱۴)

دکن میں اردو کے ارتقا کا ساتواں دور ۱۳۴۶ھ سے شروع ہوا جب جامعہ عثمانیہ کا منشور خسروی نافذ ہوا اب یہ دور ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء کو ختم ہوتا ہے کیونکہ جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی زبان کے تغیر اور دیگر کئی اسباب کے باعث اردو کی ترقی کی رفتار بند ہو چکی ہے۔ دور مختتم کی شاعری اور نثر نگاری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

۶۹۔ نصیر الدین ہاشمی۔

مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم کی تصانیف

(سب رس دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۱۸-۲۲)

مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم درانی قبیلے کے پٹھان تھے۔ ان کے اجداد نے دہلی میں مغلیہ دور میں وزارت جیسی اہم خدمت کو انجام دیا۔ مولوی عبدالغفور صاحب کی ولادت رامپور میں ہوئی۔ وہ کئی ایک قابل قلمی کتابوں کے مصنف ہیں اس کے باوجود گوشۂ گمنامی میں ہے۔ ان کی بعض تصانیف شائع ہو چکی ہیں لیکن ان پر مولف کی حیثیت سے بھی ان کا نام درج نہیں عصر حاضر کے بہت کم اہل قلم ان کے کارناموں سے واقف ہیں۔ یہاں مختصر طور پر ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔

۷۰۔ نصیر الدین ہاشمی۔ بانو طاہرہ سعید

(شاعر دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۱۱-۱۴)

بانو طاہرہ سعید دیبات (ایران) کی باشندہ ہیں اور اب کئی سال سے کرنل ہے۔ ایم۔ سعید کی شریک زندگی کی حیثیت سے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ فارسی ان کی مادری زبان ہے۔ اس کے ساتھ وہ اردو اور انگریزی میں کافی دستگاہ رکھتی ہیں اور تینوں زبانوں میں شاعری کرتی ہیں۔ اس مضمون میں بحیثیت شاعرہ ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۷۱۔ نعیم صدیقی: ایں ہمہ سرمایۂ بہار

(چراغ راہ کراچی ۱۵ اکتوبر و نومبر ۲-۸)

یہ مشترکہ پرچہ اس رسالہ کا شعر نمبر ہے۔ جس میں شعراء جاہلیت کے علاوہ حالی و اقبال کے ہاں سے انتخابات کے ساتھ عصر حاضر کے شعراء کا وہ کلام چھاپا ہے جو "اسلامی نظریہ" اور "اسلام پسندی" کے تحت آتا ہے۔ اور مدیر بالاعنوان قائم کر کے اس مخصوص نظریہ کی تشریح کی ہے۔ اس کا خلاصہ یا اس کا نعرہ "ایک خدا — ایک انسان — ایک نظام ہے" اسلام، مسلمانوں کی گزشتہ و موجودہ زندگی، قدیم و جدید افکار معاشراکیت کے ان شعراء کا موضوع سخن ہیں۔ ان پر ملائیت کی پھبتی کسی جاتی ہے جو درست نہیں۔ مخالفت اور دشنام طرازی کا طوفان جو اس نظریہ شعر اور اس ادب کو ڈبونے کے لئے اٹھایا جاتا ہے وہ ختم ہو جائے گا اور سیلاب

ترقی پسند ادب کی طرح پھیلتا اور بڑھتا چلا جائے گا۔

۷۲۔ نعیم صدیقی: اکبر کا تصور مذہب
(چراغ راہ ۲۰ جنوری ۴۹ ۔ ۵۷)

اکبر کے سامنے کبھی بھی اسلام کا ہمہ گیر انقلابی تصور نہ تھا۔ وہ اسلام کے اصل تصور کے لئے نہیں بلکہ مسخ شدہ روایتی باقیات کے لئے مغربی طوفان سے لڑتا ہے۔ جس کی بنیاد جذبات پر ہے۔ وہ مشرقی تہذیب و معاشرت کے ٹوٹتے ہوئے قلعہ پر نوحہ گر ہے۔ اکبر کے مذہبی تصور کی یہی وہ نوعیت ہے جس کے زیر اثر وہ پردہ کا مخالف ہے۔

۷۳۔ وحید قریشی: مثنوی سحر البیان
(اردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۲۶ ۔ ۳۳ و نامعلوم)

وقائع نعمت خاں، حسن و عشق، سکندر نامہ، الف لیلہ اور دوسرے ادب پاروں کا اثر جذب کرکے اور اپنے ماحول سے بصیرت حاصل کرکے میر حسن نے سحرالبیان کو زندگی عطا کی۔ کہانی کے اجزا کی ترتیب پر محنت کی اور شعوری کوشش سے واقعات کا ربط برقرار رکھا ہے۔ قاری کو چوکس رکھنے، صنعت برائے استہلال، مافوق الفطرت عناصر سبھی سے فائدہ اٹھایا ہے مگر احتیاط ہر جگہ ملتی ہے۔ نفسیات انسانی کا اچھا مطالعہ بھی کارفرما ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک دلچسپی و دلآویزی باقی رہتی ہے۔ (رسالہ میں مضمون نامکمل ہے۔ پتہ نہیں یہ خود پورا مضمون ہے یا اس کی پہلی قسط کیونکہ رسالہ میں دو صفحے سادے رہ گئے ہیں)

۷۴۔ یوسف حسین خاں: اردو غزل
(اردو ادب ۱۵ جولائی ۳۱ ۔ ۳۶)

۱۔ آرٹ زندگی، اس کی وسعتوں اور گہرائیوں سے قریب ہو کر ابدیت حاصل کر لیتا ہے۔ فارسی غزل کی طرح اردو غزل انسانی زندگی، جذبات، حسیات و نفسیات میں ڈوب کے ابھرتی اور وہ موتی لاتی رہی ہے جن کی آب رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔ اس کا عشق عشق ہے ہوس نہیں۔ حقیقت اور مجاز دونوں ہی رچے انداز میں اس میں جلوہ گر ہوتے ہیں خالص غم اور رچی ہوئی مسرت اس کی دنیا ہے۔ ہماری بدلتی ہوئی زندگی اور اس کی قدروں کے ساتھ یہ تبدیل ہوتی رہی ہے اور اسی لئے زندہ بھی رہے گی (باقی)

آرٹ (علوم و فنون)

۷۵۔ ادارہ: آئس کریم کی قدامت
(نگار ۱۵ اکتوبر ۳۸ ۔ ۳۹)

تاریخی نقطہ نظر سے آئس کریم پانچ ہزار سال قبل کی چیز ہے۔ چین میں تین ہزار ق م تک اس کا استعمال عام تھا یورپ میں اسے راز رکھنے کی کوششیں کی گئیں۔ فی زمانہ امریکہ میں اسے بہت مقبولیت حاصل ہے۔

۷۶۔ ادارہ: اہل ایران اور موسیقی
(نگار ۱۵ اکتوبر ۳۹)

فن موسیقی پر ایرانیوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ زمانہ وار اس فن میں مشہور موسیقی نویس ادیبوں کی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۷۷۔ کیلاش ماہر: مرادآباد میں ظروف سازی
(آج کل ۱۵ نومبر ۲۶ ۔ ۲۸)

مرادآباد میں ظروف سازی کی ابتدا مغلیہ حکومت میں شروع ہوئی۔ محمد حسین مرادآبادی ظروف سازی کی صنعت میں سب سے قدیم آدمی تھا۔ مضمون میں ظروف سازی کے مختلف طریقوں اور اس کی تکنیک پر روشنی ڈالنے کے بعد مرادآبادی برتنوں کی بنیادی خصوصیتوں، اور مرادآبادی قلعی کا ذکر کیا گیا ہے اور موجودہ دور کی کشمکش نے اس صنعت پر جو اثر ڈالا ہے اس کا بھی مع اعداد و شمار ذکر کیا گیا ہے۔

۷۸۔ نیاز فتحپوری: علم جفر
(نگار ۱۵ اکتوبر ۳۶ ۔ ۳۷)

علم جفر کو بعض دانیال نبی اور بالعموم لوگ امام جعفر صادق

سے منسوب کرتے ہیں لیکن مضمون کی روشنی میں یہ خیال صحیح نہیں ٹھہرتا۔

معاشرتی حالات

۷۹۔ آغا حیدر حسن مرزا:
میرے بچپن کی دلی
(آج کل ۱۵ اکتوبر ۴۸ء — ۴۹)

۱۔ چھوٹے بڑے سبھی کی زندگی اور اس کے لوازمات مثلاً زیور، پگڑیاں، ٹوپیاں، جاڑے میں اوڑھنے کا سامان، عطر، کھلونے، غرض ہر اس چیز اور اس مقام کا ذکر کیا ہے جہاں یہ چیزیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ غدر سے قبل اور بعد کی دلی اور اس کی زندگی کے متعلقات اس طرح اس میں آجاتے ہیں۔

۸۰۔ انوار الحسن انور:
بے پردگی کے اسباب اور مدارج
نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے
(فیض الاسلام راولپنڈی ۱۵ دسمبر ۳۲ — ۳۹)

انگریزی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر مسلمانوں نے انگریز بننے کی کوشش کی جس کے لئے انھیں اپنی معاشرت، مذہب اور تعلیم سے کنارہ کشی کرنا پڑی۔ اور دنیا چونکہ نمائش پسند ہے۔ اس لئے انھوں نے اس کے نتائج اور عواقب پر نظر نہیں ڈالی اور گڑھے میں گرتے رہے۔ بعضوں نے اس کے جواز میں قرآن اور حدیث و شریعت سے دلائل پیش کئے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اسلامی تعلیم اور پردہ کے ساتھ بھی مسلمان عورتیں ملکی و ملی کام میں برابر کا حصہ لے سکتی ہیں۔

۸۱۔ یحییٰ دولت آبادی: زندگی کے چار دور
(فیض الاسلام ۱۵ نومبر ۳۰ — ۳۴)

زندگی کے چار حصوں (۱) بچپن (۲) جوانی (۳) ادھیڑ اور (۴) بڑھاپا۔ پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ زندگی کی تمام سعادتیں اس شخص کے حصہ میں آتی ہیں جو زندگی کے پہلے حصہ کو اس کے بعد آنے والے حصہ کی بہتری کے لئے صرف کرتا ہے۔
(ترجمہ قمر امرتسری)

اقتصادیات

۸۲۔ احمد حسین دہلوی:
پاکستان میں سیمنٹ کی صنعت...
(معاشیات ۱۵ اکتوبر ۴۹ء — ۵۰)

موجودہ ضروریات کے پیش نظر اگرچہ سیمنٹ میں پاکستان خود کفیل ہے لیکن مستقبل کے خیال سے اس صنعت کو چونکہ کلیدی حیثیت حاصل ہے، زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی ضرورت ہے خصوصاً مشرقی پاکستان میں۔

۸۳۔ ادارہ: آزادی کے چار سال
(آج کل ۱۵ نومبر ۴۷ — ۴۸)

اس مدت میں حکومت نے مضبوط، خوشحال اور ترقی پسند جمہوریت قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس سلسلہ میں اسے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض مشکلات قدرتی تھیں اور بعض اچانک رونما ہوئیں۔ مضمون میں ان مشکلات کا ذکر اور انھیں دور کرنے کی سرکاری کوشش کا ذکر کیا گیا ہے اور حکومت کی دوسری کارگزاریوں کو سراہا گیا ہے۔

۸۴۔ ادارہ: ہندوستان میں خوراک کا مسئلہ
(آج کل ۱۵ نومبر ۵۲ — ۵۳)

جنگ کے بعد خوراک کی صورت حالات بہت نازک ہو جاتی ہے، اس کی ہندوستان میں غذائی قلت کی وجہیں الگ الگ بیان کی گئی ہیں اور اسے دور کرنے کے طریقے اور حکومت کے کام کا ذکر کیا گیا ہے۔

۸۵۔ ایس۔ آر سرنا: ایران کا تیل
(آج کل ۱۵ اکتوبر ۱۷ — ۲۲)

تیل آج کل معمولی ضروریات زندگی سے اٹھ کر عالمگیر نظام زندگی کی اہم کڑی بنا ہوا ہے۔ اور چونکہ تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے زمین سے نکالا ہوا تیل کافی نہیں ہوتا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اس کی ضرورت اور اہمیت زیادہ بڑھ گئی ہے اس لئے یہ تیل، خصوصاً ایران کا تیل ایک بین اقوامی اہمیت کا مالک ہے اور مغربی بلاک والے روس کی وجہ سے اسے اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے ہر طرح کوشاں ہیں۔ ایک طرح ایران کا تیل ایران کی ماضی قریب وحال کی سیاسی زندگی اور اہمیت کا نمائندہ ہے۔ مضمون نگار نے تفصیل کے ساتھ برطانوی اور ایرانی نقطۂ نگاہ پر روشنی ڈالی اور مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

۸۶۔ رشید احمد خاں: ٹیرف اور پاکستان

(معاشیات ا۵ اکتوبر ۷۷-۴۷-۴۹۴)

اس مضمون میں ٹیرف پالیسی کی ابتدا مختلف ملکوں میں ٹیرف نظام، پاکستان میں کمیشن کے قیام کا تاریخی پس منظر، اس کے اغراض ومقاصد طریقۂ کار اور پاکستان کے دوسرے ملکوں سے ٹیرف تعلقات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

۸۷۔ رضی حیدر نقوی:

پاکستان کی دو اہم تجارتی فصلیں، جوٹ اور کپاس

(معاشیات ۵۱ اکتوبر ۵۱۶ —۵۲۱)

جوٹ پاکستان کی سب سے پُر منفعت صنعت ہے تقسیم کے بعد چونکہ اس کے کارخانے پاکستان میں نہیں آئے اس لئے تکلیف ہوئی۔ اس کا رقبہ اور پیداوار کم ہوتے رہے ہیں جس کی روک تھام ہی نہیں کرنی چاہئے بلکہ اسے ترقی دینی چاہیئے۔ ۸۰۰ ق م سے جوٹ کا نشان ملتا ہے۔ اس کے استعمال کا ذکر آئین اکبری میں بھی ہے۔ کپاس کو پاکستان کی زرعی معاشیات میں دوسرا نمبر حاصل ہے۔ یہ بھی کوئی دو، تین سو سال ق م سے پہلے ہی پاکستان میں موجود تھی۔ موجودہ زمانہ میں پاکستان کو خاصی ترقی یافتہ حیثیت حاصل ہے مگر اسے ابھی اور ترقی دینے کی ضرورت ہے۔

۸۸۔ سری رام سرنا: مصری کپاس

(آج کل ۱۵ دسمبر ۱۸-۲۲)

دورِ جدید میں مصر کی اہمیت کا ایک سبب اس کی اعلیٰ قسم کی کپاس ہے جس کی ہر ملک کو خواہش رہتی ہے۔ کپاس کی پیداوار اٹھارھویں صدی کے آس پاس مصر میں شروع ہوئی۔ لیکن اسے واقعی ترقی محمد علی پاشا کے زمانے میں ہوئی اور پھر محکمۂ زراعت کی نگرانی میں نئے نئے تجربے اور نئی نئی عمدہ کپاس تیار ہوئی اور اس کی ہمیشہ مانگ رہی۔ لیکن خود مصر میں اس کپاس کو استعمال کرنے میں بدرجۂ اتم کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

نفسیات

۸۹۔ ادارہ: زندگی کا عدم توازن

(چراغ راہ ۲ ۸م جنوری ۱۸-۲۰۰)

زندگی کے عدم توازن کی تعریف، قسمیں اور اس سے پیدا ہونے والے بے شمار نفسیاتی خلل کا ذکر کرنے کے بعد اسے دور کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اسلام نے عدم توازن کا سدِ باب کرنے کا پورا اہتمام کیا ہے۔

نسائیات

۹۰۔ اختر علی تلہری:

عورت کے بارے میں شوپنہار، اقبال، اور حقوق

(آج کل ۱۵ نومبر ۳۳-۳۷)

مضمون میں شوپنہار کے ایک مضمون کا جس میں اس نے عورت کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے کچھ اقتباسات پیش کئے ہیں اور یہ رائے دی ہے کہ اس کے یہ خیالات حق سے زیادہ باطل کے ترجمان ہیں۔ عورت کی موجودہ

کس بیسری کا ہمدردانہ جائزہ لینے کے بعد مقالہ نگار نے اقبال اور جوش کے وہ اشعار پیش کئے ہیں جن میں انھوں نے عورت کے متعلق اپنی اپنی رائے دی ہے۔ اور ان سے اختلاف کیا ہے۔ جوش کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ان کے عورت پر پیش کئے ہوئے اشعار اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب ان کے سماجی نظریہ میں فکری پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ خود جوش نے فٹ نوٹ میں ان اشعار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اس زمانے کے ہیں جب میں عورت کو جوانی کی نظر سے دیکھتا تھا۔

تبصرہ و کتابیات

۹۱۔ اڈیٹر: حیات سرسید

(اردو ادب ۱۵ جولائی ۱۷۳۔۱۷۴)

سرسید کے حالات میں کتاب کے مصنف نورالرحمٰن نے کوئی نئی تحقیق یا ترجمانی نہیں کی ہے۔ ان کے خیالات اور کاموں پر بحث کرتے وقت بالغ نظری سے کام لیا ہے نہ ان کے سماجی منصب اور مجموعی اہمیت پر مربوط خیالات پیش کئے ہیں۔ تاہم نورالرحمٰن کا طرز بیان صاف اور سادہ ہے اور انھیں لکھنے کا سلیقہ ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ قابل قدر، ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

۹۲۔ اڈیٹر: مشترکہ زبان۔

(اردو ادب ۱۵ جولائی ۱۷۵۔۱۷۶)

ہندی، ہندستانی اور اردو سے متعلق گاندھی جی کے خیالات کے اس مجموعہ کو شائع کرکے انجمن ترقی اردو (ہند) نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتاب اچھے ٹائپ میں ۲۰۸ + ۸ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے۔

۹۳۔ ر۔ ا: نالۂ ناشاد۔ (اردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۱۹۔۱۲۲)

پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد سے اردو دنیا واقف ہے مشہور رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوا کیا ہے۔ کتابی صورت میں اسے شائع کرکے ان کے ساجزادے کرشن کمار نے بڑا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود اور عبدالمنان بیدل نے اپنے مقدمے اور مضامین میں ناشاد کی زندگی، مزاج، اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے، ناشاد کی زبان صاف ستھری، سلیس اور رواں ہے۔ کھپ جانے والے ہندی کے لفظ بھی استعمال کئے ہیں۔ کلام بہت اچھا ہے اور بعض نظمیں تو بہت حسین ہیں۔ اس کی ضخامت ۱۴۸ صفحے اور قیمت چار روپے ہے۔ اقبال بکڈپو مقابل پٹنہ کالج، ڈاکخانہ مہندرو، پٹنہ نمبر ۶ سے مل سکتی ہے۔

۹۴۔ ر۔ ا: ایم اسلم اور اس کا ادب

(اردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۲۲)

یہ کتاب خواجہ بدر اسلام فروغی کی مرتب کردہ ہے۔ ۲۳۶ صفحے ہیں۔ قیمت چار روپے ہے اور مکتبہ دار البلاغ لاہور سے مل سکتی ہے۔ اس میں خود مرتب کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادی، انتصار حسین، محشر تونسوی، شاہد احمد دہلوی، جاوید اقبال، مرزا احسان احمد، رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر ابواللیث، اور ڈاکٹر محی الدین زور کی تحریریں اور مقالات شامل ہیں جن کا مطالعہ ایم اسلم کے ادبی منصب اور ادب کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

۹۵۔ رفیعہ سلطانہ۔ مہاراجہ کرشن پرشاد

(سب رس نومبر ۱۹۵۱ء ص ۲۱)

مہاراجہ کرشن پرشاد کی سوانح حیات مطبوعہ دارالطبع حکومت حیدرآباد پر مختصر تبصرہ۔

"حیات جاوید" اور "یادگار غالب" کے بعد "اعمال نامہ" سوانح نگاری کا بے مثل کارنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے انفرادی حالات کو اجتماعی ماحول کے ساتھ اس خوبی سے مربوط کیا ہے کہ ان کی زندگی کے ساتھ

ساتھ اس زمانہ کی سوسائٹی کی بھی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ "مہاراجہ کشن پرشاد" کی سوانح حیات اس طرزِ صناعی کی ایک مکمل تصویر ہے۔

۹۶۔ صباح الدین عبدالرحمٰن، پھر معین الارواح
(معارف اکتوبر ۵۶ء ۲۹۹۔ ۳۱۶)

محمد خادم حسن زبیری کی تالیف معین الارواح پر جو تبصرہ صباح الدین عبدالرحمٰن نے کیا تھا اس کا جواب مؤلف نے معارف کے صفحات پر دیا تھا، یہ مضمون اسی جواب کی تردید میں ہے۔

۹۷۔ ع۔م: نالۂ ناشاد
(آج کل ۱۵ اکتوبر ۵۵)

پرنسپل رام پرشاد کھوسلا ناشاد کا مجموعۂ کلام ہے۔ غزلیں، نظمیں ناشاد کے ہاں سبھی ہیں اور خوب ہیں۔ ناشاد نے اپنے کلام کے ذریعہ اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ان کی شاعری کی طرح ان کا کردار بھی بہت خوب تھا۔ اس مجموعہ کو اقبال بک ڈپو، مقابل پٹنہ کالج، پٹنہ نے شائع کیا ہے، قیمت چار روپے اور ضخامت ۲۴۸ صفحے، کتابت و طباعت اوسط اور کاغذ عمدہ ہے۔

۹۸۔ ع۔م: تحقیق و تنقید، تنقید جدید۔
(آج کل ۱۵ اکتوبر ۵۵۔۵۶)

اختر حسین اختر اورینوی کی یہ دونوں کتابیں، شاد بک ڈپو، پٹنہ نے شائع کی ہیں۔ اختر اورینوی اچھے شاعر ممتاز افسانہ نگار، اور برگزیدہ محقق و نقاد ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہیں۔ اور ان کی افادیت کے لئے اختر کا نام ہی ضمانت ہے۔ تنقید جدید میں ترقی پسند ادب، ادبیات عالم، اور ادب اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات، ادب میں روایت اور تبدیلیاں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ اردو کے طالب علم دونوں ہی کتابوں کے مطالعے سے مستفید ہوں گے۔

۹۹۔ ع۔م: کلیات اکبر الہ آبادی ۱
(آج کل ۱۵ اکتوبر ۵۶)

اکبر کا کلام مطبوعہ صورت میں نایاب تھا۔ بزم اکبر کراچی نے بڑے اہتمام سے یہ ذمہ لیا ہے کہ وہ اکبر کے متعلق مطبوعہ و غیر مطبوعہ لٹریچر شائع کرے گی۔ کلیات کی یہ پہلی جلد اس ارادے کی تکمیل کی طرف پہلا قدم ہے۔ اردو ادب کے اور خاص طور پر اکبر کے پرستاروں کے لئے یہ کتاب ایک نادر تحفہ ہے۔ قیمت چھ روپے، ضخامت ۴۴۴ صفحے جلد دیدہ زیب، اور کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

۱۰۰۔ ع۔م: کریسنٹ (آج کل ۱۵ اکتوبر ۵۶)

اسلامیہ کالج لاہور کے ماہنامے کریسنٹ کا یہ خاص نمبر تاثیر کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ چنانچہ تاثیر کی زندگی سے متعلق بہت سے مضامین شامل ہیں۔ ہر مضمون بلحاظ خاص دلچسپ اور تاثیر کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایم۔ اسلم کا مضمون "لڑکپن کے دن" تاثیر کی نظم ناتمام افسانے، اور منتخب خطوط خاص چیزیں ہیں بالخصوص حفیظ کی نظم جو مرثیۂ غالب (حالی) کے بعد ایک لاجواب شاہکار بلکہ حالی کے مرثیۂ غالب سے کئی صورتوں میں بہتر ہے۔ یہ نمبر اردو ادب کے نوادر میں شمار ہوگا جو پروفیسر حمید خاں کی نگرانی میں تیار ہوا ہے۔

۱۰۱۔ ع۔م: نورنگ (آج کل ۱۵ اکتوبر ۵۶)

آغا سرخوش قزلباش کراچی سے اسے نکالتے ہیں۔ زیر تبصرہ پرچہ "جشن استقلال پاکستان نمبر" ہے جو بہت سے دلچسپ مضامین اور افسانوں پر مشتمل ہے مقالہ نگاروں میں احتشام حسین، ممتاز حسن احسن، شاہد احمد دہلوی، عبدالرحمٰن چغتائی، شعراء میں جوش، جگر، جعفر علی خاں اثر، فیض احمد فیض اور عدم، افسانہ نگاروں میں منٹو، عصمت، مہندر ناتھ اور ممتاز مفتی کے

نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ پرچہ ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ نو رنگ پاکستان کے ادبی رسالوں میں سے ہے اور کتب محل، القشتن اسٹریٹ کراچی سے مل سکتا ہے۔

۱۰۲۔ع۔م: شعر و سخن (ہندی)

(آج کل ۱۵ نومبر ۵۴)

ناشر بھارتیہ گیان پیٹھ کاشی اور مرتب ایودھیا پرشاد گوئلی ہیں یہ اُردو شاعری کا ہندی میں ایک دلچسپ تذکرہ ہے جس میں ابتدا سے ۱۹۵۰ء تک کی غزل گوئی کی تاریخ ہے۔ آخر میں ایک دلچسپ باب " بادشاہ دو رنواب شاعر" کے عنوان سے ہے۔ اُردو میں جدید تنقید جس منزل پر پہنچ چکی ہے اس کی جھلکیاں بھی اس کتاب میں کہیں نہیں ملیں گی لیکن ہندی میں یہ نقشِ اوّل قابلِ تعریف ہے۔

۱۰۳۔ع۔م: یادگار فرحت

(آج کل ۱۵ نومبر ۵۴ - ۵۵)

ناشر فرحت میموریل کمیٹی حیدر آباد دکن۔ مرتب ڈاکٹر غلام یزدانی اس میں فرحت اللہ بیگ کے شاہکار مضامین پر تنقیدی تبصرے اور ان کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔ مرتب نے خود جو کچھ فرحت کے باب میں لکھا ہے وہ سیرت نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے لکھنے والوں میں مرتب کے علاوہ محی الدین زور، عبدالقادر سروری، آغا محمد اشرف اور عزیز احمد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۰۴۔ع۔م: ولی گجراتی

(آج کل ۱۵ نومبر ۵۵)

ناشر انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مرتب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی۔ یہ کتاب بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے اس میں تازہ معلومات کی بنا پر ثابت کیا گیا ہے کہ ولی احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ اس سلسلے میں ولی کے حسب نسب تاریخ وفات وغیرہ کے باب میں مفید معلومات بھی کتاب میں درج ہیں۔ کلامِ ولی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ولی گجراتی مفید تنقیدی ادب کی بڑی اچھی مثال ہے۔

۱۰۵۔ع۔م: معیار (آج کل ۱۵ نومبر ۵۵)

یہ رسالہ میرٹھ سے، اصغر علی عابدی اور نجم الاسلام کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ماہ ستمبر ۱۹۵۱ء کا شمارہ بیسیوں ہوئے مضامین و منظومات کا حامل ہے۔ فکر و تحقیق، طنز و مزاح، مسائلِ زمانہ اور دیگر موضوعات پر آپ کو ادب کے اچھے نمونے اس شمارے میں نظر آئیں گے۔ کتابت و طباعت قابلِ تعریف ہیں۔

۱۰۶۔ع۔م: الحمرا

(آج کل ۱۵ نومبر ۵۵)

حامد علی خاں سابق مدیر مخزن و ہمایوں کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے پہلے شمارے کے لکھنے والے سید فیاض محمود، اثر لکھنوی۔ آثر صہبائی۔ پروفیسر حمید احمد خاں وغیرہ ہیں، موخر الذکر کی تمثیل " اسد اللہ خاں تمام ہوا" ایک نئی جدت ہے۔ یہ رسالہ ادبی خوبیوں کا حامل ہی نہیں بلکہ سنجیدہ ادب کا ایک عمدہ مرقع ہے۔

۱۰۷۔ق۔ا۔م: دیوانِ اوحدی

(اُردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۷)

مشہور فارسی مثنوی جامِ جم کے شاعر شیخ رکن الدین مراغی اصفہانی (م ۷۳۸ھ) صوفی شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ اوحد الدین کرمانی کے مرید تھے اسی لئے تخلص اوحدی رکھا جس کی وجہ سے بعضوں کے یہاں تشابہ پیدا ہو گیا ہے۔ مثنوی چھپ چکی ہے۔ دیوان نایاب تھا جسے مدراس یونیورسٹی کے مخطوطہ کو سامنے رکھ کر سید یوشع صاحب نے اسے شائع کیا ہے۔ اس میں قصائد ترجیع بند، غزلیات اور متفرقات ہیں۔ شروع میں مرتب کا مقدمہ ہے جو اوحدی کی زندگی اور کلام سے بحث کرتا ہے۔ ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں ایک غزل اور رباعیاں تذکروں سے لی گئی ہیں۔ آخر میں مشکل اور غیر مانوس

الفاظ کی فرہنگ اور اسمائے بلاد و رجال کا اشاریہ بھی شامل ہے۔ قیمت بیس روپے ہے۔ مدراس یونیورسٹی سے مل سکتی ہے۔

۱۰۸۔ ق ۱۱۔ م: کلیات امجدی حصہ سوم

(اُردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۱۸)

یہ محمد علی خاں بہادر والاجاہ اول کے ملک الشعرا میر محمد اسماعیل خاں امجدی کے کلیات کا تیسرا حصہ ہے جسے مولوی محمد حسین محوی لکھنوی نے مرتب اور مدراس یونیورسٹی نے "تصانیف اسلامی" کے سلسلے میں شائع کیا ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مثنوی راغب و مرغوب اور مثنوی زبدۃ الافکار بھی (نظامی کی مخزن الاسرار کے تتبع میں) شامل ہے۔ شروع میں باقر آگاہ کی مختصر تقریظ بھی ہے۔ امجدی کا کلام بہت پختہ اور فارسی شاعری کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ کتاب مجلد اور گرد پوش رنگین ہے۔ قیمت بارہ روپے اور ملنے کا پتہ مدراس یونیورسٹی ہے۔

۱۰۹۔ م۔ ن۔ ب: اقبال نامہ

(اُردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۲۳۔۱۲۴)

اقبال کے مجموعہ مکاتیب کا یہ دوسرا حصہ ہے جسے شیخ عطاء اللہ سے مرتب کرا کے شیخ محمد اشرف نے شائع کرایا ہے۔ اس میں ۳۴ اصحاب کے نام خطوط ہیں۔ جن میں مہاراجہ کشن پرشاد، محمد عبداللہ چغتائی، ندوی، محمد صالح، محمد ایوب تونسوی، اکبر الہ آبادی، عطیہ بیگم فیضی، قائد اعظم، محمد اکرام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بعض خطوط انگریزی میں تھے جنھیں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ان خطوط سے اقبال کی شاعری، اقبال کی علوم قرآن سے واقفیت اور ان کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ خطوط سیاسی، علمی، ادبی، تحقیقی اور تعلیمی نکات کا گنجینہ ہے۔

۱۱۰۔ م۔ ن۔ ب: دیوان فانی

(اُردو کراچی ۱۵ اکتوبر ۱۲۵۔۱۲۶)

حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش علیمی رشیدی المتخلص بہ فانی گورکھپوری کا مجموعۂ کلام ہے جسے ان کے بیٹے مصطفیٰ علی آنی رشیدی نے شائع کیا ہے۔ قیمت پانچ روپے، کاغذ اور طباعت اوسط درجہ کی ہے۔ فانی شمشاد لکھنوی فرنگی محلی کے شاگرد اور آسی غازیپوری کے مرید ہیں۔ اس لئے لکھنوی انداز بیان اور تصوف کی چاشنی دونوں ان کے ہاں ہیں۔ شاہ صاحب برجستہ گوئی، تضمین اور تاریخ گوئی کے ماہر ہیں۔ زبان و محاورہ سے متعلق ان کا علم بہت وسیع تھا۔

۱۱۱۔ ع۔ م: موج سلسبیل

(آج کل ۱۵ نومبر ۵۵)

یہ کتاب حضرت نظر سیہوری کے سلام و قصائد اور مراثی و قطعات کا مجموعہ ہے بقول آرزو لکھنوی مناقب و مصائب محمد و آل محمد ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ ان کا کلام آہ اور واہ دونوں کا حامل ہے۔ مقدمہ سید ابن حسن رضوی جارچوی نے لکھا ہے اور تقریظ شاعر اہل بیت حضرت نجم آفندی نے لکھی ہے۔

۱۱۲۔ ادارہ: اُردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم سائنس

(فیض الاسلام ۱۵ نومبر ۵۴۔۵۵)

مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق۔ اس رسالہ میں ملک کے ماہرین تعلیم و تجربہ کار معلمین کی آرا اور وہ سوالات درج ہیں جو مرتب نے اُردو کو سائنس اور ریاضی کا ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق دریافت کئے۔ ماہر اساتذہ کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کو سائنس کا ذریعۂ تعلیم بنانے میں بہت کم مشکلات پیش آئیں گی ہمیں جلد از جلد اُردو کو سائنس و ریاضی کا ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیئے۔

۱۱۳۔ ادارہ: فدیۂ صوم

(فیض الاسلام ۱۵ نومبر ۵۵)

مرزا اختر بیگ اختر انجمی نے اس نام سے ایک

رسالہ شائع کیا ہے۔ جس میں انھوں نے قرآن سے یہ استدلال کیا ہے کہ روزے کی طاقت رکھنے والا بھی روزے کے بدلے میں ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے کر روزہ رکھنے کے فرض سے سبکدوش ہو سکتا ہے۔ مولف نے یہ رسالہ مختلف اسلامی فرقوں کے علماء کے پاس بھیجا اور ان کی اس مسئلہ پر رائیں معلوم کیں جو اعتراضات موصول ہوئے وہ بھی مع جواب درج رسالہ ہیں۔ یہ بحث کافی دلچسپ اور تحقیق پسند طبائع کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

۱۱۴۔ ادارہ بہار اردو۔ (نگار ۱۵ اکتوبر ۴۶)

یہ جگن ناتھ آزاد کی ایک طویل نظم ہے جو انھوں نے اردو مجلس دہلی کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں ۱۹ ستمبر ۵۱ء کو پڑھی تھی۔ اور بحالات موجودہ ایک "شہر آشوب" کی صورت رکھتی ہے جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا خلوص اور ان کی دردمندی ظاہر ہے۔ قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ: دہلی کتاب گھر، دہلی۔

۱۱۵: ادارہ۔ شان محفل۔ (نگار ۱۵ اکتوبر ۴۶)

منشی رگھوناتھ سنگھ آجمد ہلوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اب سے ۳۰ سال قبل کی ایک متحدہ ہندو مسلم کلچر کی پیداوار ہیں۔ ان کے ہاں تغزل کی زبان وہی ہے جو دہلی کے اونچے معزز خاندانوں میں رائج تھی اور انداز بیان میں بھی وہی سلاست صفائی پائی جاتی ہے جو ایک زباندان کے کلام میں ہونا چاہئے۔ قیمت: دو روپیہ؛ ملنے کا پتہ: کویراج رگھوندر سنگھ ساحر کناری بازار دہلی۔

۱۱۶: ادارہ: آزادی کے بعد

(نگار ۱۵ اکتوبر ۴۶)

ہاورڈ فاسٹ کے ناول فریڈم روڈ کا اردو ترجمہ ہے جس میں فاضل مترجم احسن علی خاں نے اصل کتاب کے طرز ادا کی خوبیوں کو قائم رکھتے ہوئے سلیس وصاف ترجمہ کیا ہے۔ ہاورڈ فاسٹ موجودہ طرز حکومت کے خلاف اور عالمگیر اخوت اور بھائی چارہ کا مؤید ہے۔

۱۱۷۔ ادارہ: خاورستان (نگار ۱۵ اکتوبر ۴۶)

افسر سیمابی احمد نگری کی ۱۳۵ نظموں کا مجموعہ ہے جسے خود انھوں نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ افسر نے ابتدا ہی سے اقبال کے رنگ میں لکھنا شروع کیا اور اس وقت تک استقلال کے ساتھ اس پر قایم ہیں۔ شکوہ الفاظ حسن تراکیب، بلندی خیال، اور فنی رکھ رکھاؤ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ قیمت، چھ روپے ضخامت ۳۵۲ صفحات، ملنے کا پتہ: افسر سیمابی، جلیس منزل، احمد نگر

۱۱۸۔ ادارہ: نالہ پابند نے

(نگار دسمبر ۵۱ء ص ۴۴)

مجموعہ ہے جناب اختر انصاری اکبر آبادی کی غزلوں اور نظموں کا۔ اس مجموعہ میں بڑا حصہ غزلوں کا ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زمین بالکل نئی ہے۔ اختر چونکہ اپنے میلانات کے لحاظ سے جدید دور کے شاعر ہیں اس لئے ان کے جذبات میں بھی کافی اپج پائی جاتی ہے۔ اخیر میں چند گیت بھی ہیں جو زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔

۱۱۹۔ ادارہ۔ لسان العصر

(نگار دسمبر ۵۱ء ص ۴۴)

اس مجموعہ میں تمام ان قطعات و منظومات کو یکجا کردیا گیا ہے جو حضرت اکبر الہ آبادی کی وفات پر لوگوں نے لکھی تھیں اور جن کی تعداد ۸۰ کے قریب ہے۔ یہ کتاب بزم اکبر کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اختر انصاری اکبر آبادی نے اسے مرتب کیا ہے۔ کتابت طباعت نہایت پسندیدہ ہے۔

۱۲۰۔ ادارہ۔ ولی گجراتی۔

(نگار دسمبر ۵۱ء ص ۴۴)

نتیجہ ہے جناب سید ظہیر الدین مدنی ایم، اے،

پی۔ ایچ ڈی کی ریسرچ کا۔ ابتدا میں انھوں نے گجرات
کی تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہے
اور یہاں کے اہل فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے اُردو
کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ ولی کو اس وقت تک
دکنی شاعر سمجھا جاتا تھا لیکن مدنی صاحب نے مختلف
ذرائع سے اس کا گجراتی ہونا ثابت کیا ہے۔ ولی کی علمی
استعداد اور اُن کی شاعری پر بھی کافی بسیط گفتگو کی گئی ہے۔
الغرض یہ کتاب معیاری ریسرچ کی چیز ہے۔

۱۲۱۔ ادارہ۔ پشتو لوک گیت۔
(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۹۴)

مجموعہ ہے ان گیتوں کا جو پشتو بولنے والے علاقوں
میں گائے جاتے ہیں۔ اس میں سات قسم کے گیتوں کو
جمع کیا گیا ہے جو مختلف موقعوں پر مردوں اور عورتوں
کی طرف سے گائے جاتے ہیں۔ جناب فارغ بخاری
نے ان گیتوں کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی اُردو میں
درج کر دیا ہے جو بہت سلیس ہے۔ کتابت و طباعت
پاکیزہ ہے۔

۱۲۲۔ ادارہ: نوائے بیدل
(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۹۵)

مجموعہ ہے جناب عبدالمنان بیدل عظیم آبادی کی
غزلوں اور نظموں کا۔ بیدل صاحب پٹنہ کالج میں اُردو
کے پروفیسر تھے اور ان مخصوص استادوں میں سے تھے جو
علمی خدمت خالص علمی حیثیت سے انجام دیتے ہیں۔ ان
کی شاعری ان کے سلیقہ و ذوق کی آئینہ دار ہے۔ بیدل
کی شاعری شاد اسکول کی شاعری ہے اور انھوں نے شاد
عظیم آبادی کے رنگ کو بڑی کامیابی سے نباہا ہے۔

۱۲۳۔ ادارہ: رفیق صحت لاہور
(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۹۵)

یہ ایک طبی رسالہ ہے جسے حکیم اقبال حسن نے لاہور
سے جاری کیا ہے۔ اس وقت تک اس کے دو نمبر تپ
دق اور پایوریا کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور بہر نوع
کامیاب ہیں۔ حکیم صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ
ان دونوں مرضوں کے بارے میں لکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ
اپنے تجربات بھی قلمبند کئے ہیں۔ یہ التزام کہ ہر نمبر کسی خاص
مرض کے لئے مخصوص ہو بڑی سودمند کوشش ہے اور
ملک کو اس سے ضرور فائدہ پہنچے گا۔

۱۲۴۔ ادارہ: ۱۹۵۱ء کا بہترین ادب
(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۹۵)

مکتبہ اُردو لاہور نے حسب معمول امسال بھی پچھلے
سال کے بہترین مقالات و منظومات کا مجموعہ شائع کیا ہے
اس انتخاب میں آٹھ مقالے، دس افسانے، ایک ڈراما
۴۲ نظمیں، ۳۱ غزلیں اور پانچ مزاحیہ مضامین ہیں۔ جس
حد تک مقالات کا تعلق ہے ان کے معیاری ہونے سے
کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ فسانوں اور غزلوں کی بابت
بھی یہی کہا جا سکتا ہے لیکن منظومات میں البتہ بعض ایسی ہیں
جن کے معیاری ہونے کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجموعہ
مجلد نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ
شائع کیا گیا ہے۔

۱۲۵۔ ادارہ: شکست و فتح
(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۹۶)

دوسرا اڈیشن ہے علامہ جمیل مظہری کے طویل افسانہ
کا جو اس سے قبل ایک بار شائع ہو چکا ہے۔ جناب جمیل مظہری
ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو ادب و زبان کی خدمت
کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں اور جن کے قلم سے کبھی
دوسرے درجہ کی چیز نہیں نکلتی۔ اس افسانے میں وہ
سب کچھ ہے جو ایک گہرا سوچنے والے، ایک زبان پر
قدرت رکھنے والے اور ایک جدت طراز ادیب کے
افسانہ میں ہونا چاہیئے۔

۱۲۶۔ ادارہ: چھوٹا خدا۔

(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۴۴)

مجموعہ ہے پروفیسر عندلیب شادانی کے دو افسانوں کا۔ اور دونوں پر "سچی کہانی" ہونے کی مہر ثبت ہے۔ حسن اتفاق سے دونوں افسانے نتیجہ خیز بھی ہیں۔ کاغذ کتابت اور طباعت پاکیزہ۔

۱۲۷۔ ادارہ: نوش و نیش

(نگار دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۴۶)

مجموعہ ہے پروفیسر عندلیب شادانی کے ۱۳ افسانوں کا اور ان میں سے ہر ایک پر سچی کہانی لکھا ہوا ہے۔ دنیا میں کم افسانہ نگار ہوں گے جن کو اتنے صحیح مگر دلچسپ واقعات میسر آجائیں۔ مجموعہ کے تمام افسانے دلچسپ ہیں اور شادانی صاحب کے اندازِ بیان نے ان کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔

۱۲۸۔ ادارہ، انیس اور شیکسپیر، ایک موازنہ

(بزبان انگریزی)

از سید غلام امام

(معارف اکتوبر ۱۹۵۱ء ۳۱۷-۳۱۸)

بہت سے مشترک موضوعوں پر انیس و شیکسپیر کے کلام کے متوازی نمونے پیش کرکے انیس کی برتری اور فوقیت دکھائی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں موازنہ بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں، دونوں کی شاہراہیں الگ ہیں، زیادہ بہتر ہوتا کہ مصنف۔۔ انگریزی کے بجائے اسے اردو میں لکھتے،

۱۲۹۔ ادارہ، ایران کی چار ممتاز شاعر عورتیں

از ڈاکٹر محمد اسحاق

(معارف اکتوبر ۱۹۵۱ء ۳۰۹-۳۲۰)

سہ ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا میں ڈاکٹر اسحاق نے ایران کی چار خواتین شعرا رابعہ، مہستی، قرۃ العین اور پروین اعتصامی پر مقالے لکھے ہیں جن کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اگرچہ مولف کے بعض بیانات محلِ نظر ہیں تاہم مجموعی حیثیت سے یہ کتاب قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے،

۱۳۰۔ ادارہ: فرائض پولیس۔

(چراغِ راہ ۵۲ جنوری ۷۶)

اس نام سے مولوی عبداللہ لغاری (پیش امام مسجد پولیس میرپور خاص) نے ایک پمفلٹ لکھا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انگریزی دور کی پولیس اور پاکستانی پولیس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پاکستانی پولیس کا نقشہ پڑھئے تو بالکل یہ معلوم ہو گا کہ خلافت راشدہ کا دور پلٹ آیا ہے۔ غالباً مولوی صاحب نے "ایسا ہونا چاہیئے" کو "ایسا ہے" کے پیرایہ میں پیش کرکے ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے مگر اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ ترتیب اور زبان کے پہلو بھی کمزور ہیں۔

۱۳۱۔ ادارہ: وزارتِ صنعت کی کارگزاری پر ایک نظر۔

(چراغِ راہ ۵۲ جنوری ۷۶)

یہ ایک پمفلٹ ہے جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس پمفلٹ کے آئینہ میں وزارت صنعت، پاکستان کے متضاد بیانات، تقاریر اور رکھو کھلے وعدوں کا بے رحمی سے "ایکس رے" کیا گیا ہے یہ پمفلٹ قابلِ دید ہے اور انجمن صنعت کارانِ پنجاب (۱۵، دل محمد روڈ لاہور) نے شائع کیا ہے،

۱۳۲۔ ادارہ: اصلاحاتِ اقبال۔

(چراغِ راہ ۵۲ جنوری ۷۶)

اقبالیات کے ذخیرے میں بشیر الحق رضوی کی یہ کتاب ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس کتاب میں اقبال کی ان اصلاحات کو پیش کیا گیا ہے جو مرحوم نے اپنی متعدد نظموں میں جو مخزن وغیرہ میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ بانگ درا

میں شریک کرتے ہوئے کیں۔ اس سے علامہ مرحوم کے شاعرانہ فنی ارتقا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ دین و دانش باکی پور پٹنہ نے شائع کی ہے۔

۱۳۳۔ ادارہ: خدا کی بادشاہت۔

(چراغ راہ ۵۲ جنوری ۷۶۔ ۷۷)

سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے سعید حلیم پاشا کی فرانسیسی کتاب کے انگریزی ترجمہ کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اپنے دور میں یہ کتاب موجودہ دور کے مقابلہ میں زیادہ قدر و قیمت کی حامل تھی تاہم آج بھی قابل استفادہ ہے۔

۱۳۴۔ ادارہ: شاہ ولی اللہ کی دو تصنیفیں۔

(چراغ راہ ۵۲ جنوری ۷۷۔ ۷۸)

شاہ ولی اللہ کی تصنیف خیر کثیر کا ترجمہ مولانا عبد الرحیم پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور نے کیا ہے۔ کتاب نفس مضمون کے لحاظ سے ادق اور وقت کے ذوق سے بعید ہے۔ اس کے ترجمہ کی ضرورت نہ تھی۔ پھر اس کا ترجمہ حد درجہ ناقص اور زمانے کی زبان سے بے نیاز ہے۔ ان کی دوسری تصنیف البلاغ المبین ہے جو شرک اور اس سے متعلقہ مسائل سے بحث کرتی ہے اس لئے نسبتاً اس کی اشاعت زیادہ اہم ہے۔ مترجم کا نام درج نہیں۔

۱۳۵۔ ادارہ: قانونِ شریعت۔

(چراغ راہ ۵۲ جنوری ۷۸)

یہ پمفلٹ عبد السلام خاں ایم اے ایل ایل بی نے لکھا ہے جو سلسلہ مختصر ادبیات اسلامی کی تیسری کڑی ہے اس میں پاکستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں علماء اور جدید طبقہ پر جس انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے اس سے مصنف کی دماغی الجھن کھل جاتی ہے۔ خیالات اور تحریر دونوں میں بے ربطی ہے۔

۱۳۶۔ ادارہ: اشاراتِ قرآن۔

(چراغ راہ ۵۲ جنوری ۷۸)

محکمہ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ نصاب کے تحت اشارات قرآن کے نام سے پارۂ عم کی آخری بارہ سورتوں اور سورۂ فاتحہ کا ترجمہ مکتبہ فروغ اردو بازار کھٹیکاں سیالکوٹ شہر نے شائع کیا۔ نقطۂ نظر درست ہے۔

۱۳۷۔ ادارہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی کی تین بیش قیمت کتابیں۔

(چراغ راہ ۵۲ جنوری ۷۸۔ ۷۹)

(۱) "رسل و رسائل"۔ اس میں ۹۹ مسائل پر وہ تمام اہم سوالات و جوابات یکجا کر دیے گئے ہیں جو ماہنامہ ترجمان القرآن میں گزشتہ کئی سال کے دوران میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ کتاب اسلامی نقطۂ نظر سے بصیرت افزا معلومات فراہم کرتی ہے۔

(۲) "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" اس میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے نہ صرف کتاب و سنت اور خلفائے راشدین کے عملی نظائر سے قتلِ مرتد کی مشروعیت کو ثابت کیا ہے بلکہ یہ بھی واضح کیا ہے کہ زمانہ حاضر تک بھی قوم اور اسٹیٹ کی طرف سے اپنے مرتدین کو یہی سزا دی جاتی ہے۔

(۳) "جماعت اسلامی کی دعوت و تاریخ" یہ کتاب جماعت اسلامی کے پس منظر اس کے مقصد، طریق کار، پالیسی، موجودہ پروگرام اور آئندہ کے مراحل کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر جماعت اسلامی کی ماہیئت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۳۸۔ ادارہ: اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سائنس

(چراغ راہ ۵۲ جنوری ۷۹)

اس رسالہ کے مرتب مولوی عبد الحق ہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اردو سائنس کی تعلیم کا ذریعہ بننے کے قابل

نہیں اس کا جواب اس رسالے میں اس طرح دیا گیا ہے کہ متعدد ذمہ دار اہل علم کو استفسار بھیج کر ان کی حاصل شدہ مفصل آراء کو یکجا شائع کر دیا گیا ہے علاوہ بریں مصر و ترکی وغیرہ کے تجربات کو مثال میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۳۹۔ ادارہ: نفسیات عادات انسانی

(چراغ راہ ۲۵ جنوری ۸۰)

جناب عطا محمد نے نفسیات عادات انسانی پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اس میں مغرب کے علمائے نفسیات کے نظریات کا بیان اور ان کی مثنوی مولانا روم سے تردید کی گئی ہے۔ اس طرح کچھ عجیب سا مخلوط بن گیا ہے۔ بحیثیں سائنٹیفک نہیں۔ زبان اصطلاحات و استدلال معیاری نہیں اور عنوان بندی کچھ پرانے طرز کی سی ہے۔

۱۴۰۔ ادارہ: فقہی مسائل کا حل۔

(چراغ راہ ۲۵ جنوری ۸۰)

مکتبہ یثرب نے تدبر قرآن کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی کی دوسری کتاب اسلامی ریاست میں "فقہی مسائل کا حل" شائع کیا ہے۔ اس میں علمی طریق سے اسلام میں جائز اختلاف کے لئے آزادی کے حدود، اختلافات کے اپنے حدود سے آگے بڑھنے کے اسباب، موجودہ اختلافات کی تاریخ۔ اسلامی نظام حکومت میں اختلافات کی گنجائش، ان کا حل نیز اسلامی ریاست میں فرقوں کی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۴۱۔ ادارہ: خطبات نبوی۔

(چراغ راہ ۲۵ جنوری ۸۰)

عبدالقیوم ندوی نے نبی صلعم کے خطبات کو یکجا کر کے خطبات نبوی کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ ایک قابل قدر خدمت ہے۔ خطبات کے متن کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ ہے ہر خطبے کے ماخذ کا حوالہ بھی درج ہے۔ کتابت و طباعت بہت ناقص ہے۔

۱۴۲۔ ادارہ: "مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند"

(چراغ راہ ۲۵ جنوری ۸۰)

یہ پمفلٹ ہندوستان کی جماعت کے امیر ابواللیث ندوی نے شائع کیا ہے جس میں انتخابات کے سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

۱۴۳۔ ادارہ: سواء الطریق (حصۂ اول)

(چراغ راہ ۲۵ جنوری ۸۰)

یہ حافظ محمد عبدالعزیز محدث رحیم آبادی کے قلم سے صحیحین کی احادیث کا ترجمہ ہے۔ متن ساتھ نہیں ہے۔ احادیث کی ترتیب اور ان کی فصل بندی کتب احادیث کے انداز پر کی گئی ہے۔ یہ بہرحال ایک مفید خدمت ہے۔

پرنٹر پبلشر محمد فضل اللہ فاروقی ندوی نے انصار فائن آرٹ لیتھو پریس سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے چھپوا کر دفتر نوائے ادب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ بارنبی روڈ بمبئی سے شائع کیا

VOL. 31 . JULY - SEPTEMBER 1952 NO. 3

THE NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY LITERARY JOURNAL
OF
The Anjuman-e-Islam Urdu Research Institute

Published Every

JANUARY & APRIL
JULY & OCTOBER

Publishing Agents:

WRITERS' EMPORIUM LIMITED

Proprietors of:

WRITERS' PRESS ★ WRITERS' BOOK DEPOT
WRITERS' PUBLICATIONS ★ RIEMPO ADVERTISING

PEOPLES' BLDG., SIR PHIROZSHAH MEHTA ROAD, BOMBAY 1

Telephone No. **33886**
POST BOX 1411 BOMBAY 1.
Telegraphic address "**WRIEMPO**"

Annual Subscription
Inland & Pakistan:
Rs. 3/-

Price each Copy
Re. 1/-

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

چندہ سالانہ
تین روپیہ
ششماہی
دو روپیہ

قیمت
فی پرچہ
ایک روپیہ

نوائے ادب

جلد ۳ | اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

شذرات

مشرق میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً شاعری یا تصنیف و تالیف عرصہ سے ذریعہ معاش ہی نہیں رہا ہے بلکہ ہم نے دماغی اور علمی کام کرنے والوں سے متعلق یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے کہ آخر وہ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں، ہم اسی کو بڑا احسان سمجھتے ہیں کہ کسی مصنف یا شاعر کی عرق ریزی کی زبانی داد دے دیں، ہمارے سامنے ایسے اہل قلم کی دردناک مثالیں موجود ہیں جن کی ابتدائی کوشش کے لئے دس پندرہ روپے دینا بھی بے کار اور اسراف سمجھا جاتا تھا، منشی پریم چند، مہاشے سدرشن، مولوی راشد الخیری اور نہ معلوم کتنے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اس بے اعتنائی کا مقابلہ کیا، ان میں چند بچ سکے اور باقیوں کا آج پتہ بھی نہیں، حیدرآباد کے نوجوان شاعر و انشاپرداز میکش کا واقعہ تازہ ہے، اس سے بھی زیادہ تازہ حضرت آرزو لکھنوی کا حادثہ ہے، آج بھی بنگال کے شاعر نذر الاسلام کی دردناک حالت ہمارے سامنے ہے، ایسی یاس انگیز فضا میں کسی گوشہ سے کسی شاعر کی ادبی خدمات پر اس کے لئے جبلی کا اعلیٰ پیمانہ پر منانا ایک حیرت انگیز لیکن مسرت زا و ہمت بخش اقدام ہے۔

گجرات نے اردو کی ابتداء سے لے کر اس وقت تک اس کی ارتقاء میں جو حصّہ لیا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اس کی ادبی تعمیر اور اس کے شمالی ہند میں رائج کرانے کا سہرا اسی کے سر ہے، اور اب یہ قابلِ تقلید اقدام بھی اسی علاقہ کے دارالسلطنت احمد آباد میں کیا گیا ہے،

یہاں ہر عہد میں بعض اچھے شاعر پیدا ہوتے رہے ہیں اور آج بھی گذشتہ تمدّن و تہذیب کے اس مرکز میں چند ایسے سخن سنج موجود ہیں جنھوں نے سارے ملک سے دادِ کمال حاصل کی ہے، انھیں میں یہاں کے ایک خاموش نیک سیرت بزرگ جناب منشی عبدالکریم صاحب قریشی کلیم احمد آبادی ہیں، کلیم صاحب ایک اچھے شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک اچھے تمثیل نگار بھی ہیں۔ وہ تقریباً پچاس سال سے شعر و ادب کی خاموش خدمت ہی میں مصروف نہیں ہیں بلکہ اردو کی اشاعت و تبلیغ میں بھی ان کا بڑا حصّہ ہے، عبدالرؤف عشرت مرحوم کی دوکان کی طرح ان کی کتابوں کی دوکان بھی ارباب ذوق کا مرکز رہی ہے اور اکثر و بیشتر وہاں شعر و شاعری کا چرچا رہتا، لیکن حسبِ معمول ان کو کبھی یہ موقع نصیب نہ ہوا کہ وہ اپنے کلام کی ترتیب و اشاعت کی طرف متوجہ ہوں، احمد آباد کے بعض اہل ذوق اور اہل دل لوگوں نے اس کو محسوس کیا اور چند مہینے پہلے یہ طے کیا گیا کہ ان کے اعزاز میں جشن جبلی منایا جائے چنانچہ ۱۸ر، ۱۹ر اور ۲۰ر اکتوبر کو اس سلسلہ میں تین جلسے ہوئے پہلے جلسہ میں گجرات میں اردو سے متعلق

مقالوں کے علاوہ خود جناب کلیم کے کلام اور ان کی دوسری ادبی خدمات پر مقالے پڑھے گئے دوسرے دن اردو کا مشاعرہ ہوا، اور تیسرے دن گجراتی کاکوی سمیلن۔

اس قسم کے جشن جبلی کا انعقاد اُردو کے کسی ایک شاعر و ادیب سے متعلق ہمارے خیال میں پہلا اقدام ہے، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ہمت افزا اور خوش کن حقیقت یہ ہے کہ اس جبلی کے منانے میں نہ صرف وہ لوگ شریک تھے جن کو اس کی محبت کا دعویٰ ہے بلکہ گجراتی کے تمام شاعر اور ادیب، اُن کی ادبی جماعتیں اور ان کے اخبارات بھی عملی حیثیت سے شریک تھے۔ اب جبکہ احمد آباد نے ہمیشہ کی طرح ہماری رہنمائی کی ہے کیا ہم امید رکھیں کہ ہمارے اُردو دوست حضرات اپنے شاعروں اور ادیبوں کی خدمات کا اس سلسلہ میں عملی اظہار کریں گے۔ ہمارے یہاں ابھی بہت سے ایسے خدامِ ادب موجود ہیں جن کی خدمات کا بڑے سے بڑے پیمانہ پر اعتراف نہ کرنا گناہ عظیم ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے مخدوم محترم پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی مدظلہ اور بزرگ محترم جناب تلوک چند محروم، حضرت مولانا ابو الکلام آزاد بالقابہ کی وہ شخصیتیں موجود ہیں جو نہ صرف اُردو کی نظم و نثر کی ترقی کے ذمہ دار ہیں بلکہ اپنے عہد کے امام ہیں، یہ تو ہندوستان کا حال ہے، پاکستان کی فہرست تو شاید خاصی طویل ہو۔

کیا ہم امید رکھیں کہ اُردو کے دعوے دار اس طرف متوجہ ہوں گے۔

اسی سلسلہ کی دوسری چیز جو ہم کو یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہے، صوبہ بہار کے دار السلطنت عظیم آباد (پٹنہ) سے تین شعراء کے کلام کی اشاعت ہے، اس میں اولیت کا فخر جناب کرشن کمار رگھو سلا صاحب کو ہے جنھوں نے اپنے والد بزرگ جناب رام پرشاد کھوسلا متخلص بہ ناشاد کا دیوان بڑے اہتمام اور حوصلہ سے شائع کیا، حضرت ناشاد علمی اور تعلیمی دُنیا میں محتاج تعارف نہ تھے، اگرچہ انھوں نے ہندوستان اور انگلستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں اور صوبہ بہار میں وہ پہلے ہندوستانی تھے جو وہاں کے سرکاری پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے پھر بھی وہ عمر بھر سچے ہندوستانی رہے، زبان میں، تمدن میں اور تہذیب میں، ان کا دیوان اس کا بڑا ثبوت ہے، اس دیوان پر ڈاکٹر سید محمود صاحب کا جو بہار کے وزیر تعلیمات تھے ایک تبصرہ اور پٹنہ کالج کے فارسی کے استاد پروفیسر عبد المنان بیدل کا مفصل دیباچہ ہے۔

ناشاد کے دیباچہ نگار خود ایک اچھے شاعر ہیں، اور "نالۂ ناشاد" کی اشاعت نے شاید ان کے شاگردوں اور دوستوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حضرت بیدل کا کلام بھی مرتب کر کے شائع کریں چنانچہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی، ان کا دیوان "نوائے بیدل" ہے، ابتداء میں ان کے دو شاگردوں پروفیسر سید حسن ایم، اے اور پروفیسر اختر اورینوی کا پیش لفظ اور دیباچہ ہے پٹنہ کالج کے اسی بزم کے تیسرے روشن ستارے جناب پروفیسر حافظ شمس الدین احمد شمس منیری ہیں، ان کی تابانی ان کے نام، ان کے تخلص اور ان کے وطن کی سہ گونہ درخشندگی ہی سے ظاہر ہے، ان کا مجموعہ کلام ہی دو معنی پہلے "نالہ" اور "نوا" کے بعد گلبانگ کے نام سے ہم تک پہنچا ہے اس دیوان کے شروع میں بھی پروفیسر اختر اورینوی اور جناب جمیل مظہری کی ناقدانہ تعارفی تحریریں ہیں؛ پٹنہ میں یہ فضا اور صحیح ذوق پیدا کرنے میں سب سے زیادہ ہمارے محترم بزرگ ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا حصہ ہے۔ ان کا دیوان عرصہ ہوا "گل نغمہ" کے نام سے شائع ہو چکا۔ ہم انشاء اللہ "اتحاد ثلاثہ" کے شعری و فنی فتوحات پر کسی قریبی اشاعت میں مفصل عرض کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ تینوں کتابیں، اقبال بکڈپو، محلہ سبزی باغ، ڈاکخانہ ہندر و پٹنہ ۴ سے مل سکتی ہیں۔

ہمارے صوبہ میں خاندیش کا علاقہ وہ اہم علاقہ ہے جو لسانی حیثیت سے اُردو کو اپنی ہر سمت پھیلانے کا ذمہ دار ہے خواہ یہ گجرات کا علاقہ ہو یا مہاراشٹرا اور حیدر آباد دکن کا، صوبوں کی برطانوی تقسیم سے پہلے برہان پور کو بھی اس سلسلہ میں بڑا دخل رہا ہے اور آج بھی خاندیش میں اُردو بولنے اور لکھنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے، اور ہم خوش ہیں کہ ان اُردو دانوں اور اُردو دوستوں میں بھی اپنے علاقہ میں ادبی زندگی پیدا کرنے کا شوق جنم لے رہا ہے، اور مشاعروں، مذاکروں اور مباحثوں کے علاوہ اس کا سب سے بڑا ثبوت ان

اثیمہ

مدراس کی ایک جیّد شاعرہ

(از جناب مولوی سخاوت مرزا بی۔ اے ایل ایل بی عثمانیہ)

اُردو اور خواتینِ ہند | شمالی ہند میں عورتوں میں اُردو شاعری سے دلچسپی وسط تیرھویں صدی ہجری سے ہوئی ہے امرا و رؤسا کے محلات[1] نے معتد بہ حصّہ لیا ہے جن میں نواب اختر محل اختر کیفی تیموریہ ۱۲۸۱ھ نواب بیگم نواب، غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی پوتی۔ اور محل واجد علی شاہ عالم تخلص، امراؤ بیگم عابد بنت نواب یوسف علی خان والی رامپور، شمس النساء شرم تلمیذ خواجہ وزیر صاحب دیوان گذری ہیں۔ اور عالم اور عابد نے چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ البتہ بنگال[2] میں ایک شاعرہ شرف النساء گذری ہے جس کا تعلق نواب فریدوں جاہ والی مرشد آباد کے دربار سے تھا اس کی ایک چار ہزار اشعار کی مثنوی دلدار شاہ کا ذکر پروفیسر محفوظ الحق صاحب مرحوم نے کیا تھا جو اثیمہ کی ہمعصر ہے، مگر اثیمہ کی کئی مثنویاں اور دیوان بھی ہیں جس کے اشعار دس بارہ ہزار سے کم نہیں، جس سے پروفیسر صاحب مذکور غالباً لاعلم تھے۔

مگر دکن میں عورتوں نے یوں تو آٹھویں صدی[3] میں بزمانہ سلطان محمود اور فیروز بہمنی ہندی موسیقی میں کمال اور دکھنی غزلیں گائیں جن میں دختر[4] قفچین غلام محمود بہمنی (محمد شاہ) اور پریکھال اور راجہ دیو رائے حاکم بیجانگر کے بیٹے کی محبوبہ ہے نیز خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ نے عورتوں کی زبان میں بعض چکی[5] نامے لکھ کر خاص دلچسپی پیدا کی تھی مگر اُردو ادب کی ترقی میں گیارھویں صدی ہجری سے عورتوں نے مستقل حصّہ لیا ہے۔ اس کی ابتدا، عادل شاہی خاندان کی مشہور خاتون ملکہ خدیجہ سلطانہ شہر بانو حرم محمد عادل شاہ بیجاپور نے کی اور خاورنامہ[6] ابن حسام کا ترجمہ (رستمی) سے ۱۰۵۹ھ میں کرایا جس کے چوبیس ہزار بیت ہیں۔

دوسری دکھنی خاتون جس نے ابن نشاطی کی "پھولبن یا تنبوبر" مرتب کرائی وہ قلعہ سدھوٹ (کڑپہ مدراس) کی ایک جاگیردارنی ہے (۱۰۶۶ھ) جو قطب شاہی معاشرت کا آئینہ ہے۔ مگر کسی عورت کا ذاتی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ مگر بارھویں صدی ہجری میں دکن میں ایک خاتون گنا بیگم المتخلص بہ شوخ

عہ۱ مشاہیر نسواں مولفہ محمد عباس ایم اے مطبوعات پنجاب۔ عہ۲ اورنٹیل کالج میگزین ۱۹۳۰ء۔ عہ۳ منتخب اللباب مولفہ خافی خاں مطبوعہ کلکتہ۔ عہ۴ فہرست مخطوطات ادبیات اُردو حیدر آباد مطبوعہ۔ عہ۵ ص۱۹۵ اُردو شہ پارے ڈاکٹر زور مطبوعہ۔ عہ۶ تذکرۃ النساء مولفہ درگا پرشاد مطبوعہ۔

سودا کی شاگرد اور نواب عماد الملک نبیرۂ آصف جاہ اول کی حرم محترم تھیں جو بلحاظ حسن وجمال شہرۂ آفاق اور بلحاظ کمال شاعری سخن سنجی وسخن فہمی نہایت مشہور تھیں۔

دوسری مشہور عورت مہ لقا بائی چندا[1] ہے جس کے کمال شاعری کے بڑے بڑے اساتذۂ فن شاہ علی تجلی، ایمان، غلام حسین جوہر، معترف تھے، صاحب دیوان گذری ہے۔

تیسری ایک نہایت باعصمت وعفت پاک باطن شرم وحیا کی پتلی عالم فاضل جس نے مثنوی نگاری میں ہندوستان کے مشہور شاعر "میر حسن" کا مقابلہ کیا ہے وہ اثیمہ بنت نجف[2] علی خاں یعنی والاجاہ محمد علی کی نواسی ہے جس کے ادبی کارنامے اب تک پردۂ گمنامی میں ہیں اس لئے ہم یہاں مختصر حالات کے ساتھ ان کی تصانیف پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

مدراس کے مشہور تذکرے اثیمہ کے حالات سے خالی ہیں ہم نے مختلف تواریخ مثلاً تزک والاجاہی[3] برہان خاں اِنڈی تذکرۃ الانساب[4] مصطفیٰ علی خاں خوشدل سوانحات ممتاز سے اور خود اثیمہ کی داخلی شہادتوں سے کچھ حالات جمع کیے اور بالآخر بہ تلاش بسیار حسن اتفاق سے (نظم دلچسپ امیر[5]) مولفہ محمد منور گوہر سے کچھ حالات خاندانی دستیاب ہوئے جس سے یہ پتہ چلا کہ اثیمہ، گوہر[6] اور عبدالرحمٰن شاطر[7] کی جدہ امجدہ تھیں جن کے خاندان کی غیر معمولی ذہانت اور علمی وادبی دلچسپی کا حال مولانا سلیمان ندوی نے رسالۂ معارف نومبر ۲۵ء میں اس طرح کیا ہے۔

"مدراس میں جو سب سے عجیب چیز دیکھی وہ ایک شاعری کا گھرانہ تھا۔ شاطر صاحب کے والد مرحوم فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے شاطر صاحب خود اردو وفارسی کے برجستہ گو شاعر ہیں ان کی اہلیہ محترمہ اور ان کی دو صاحب زادیاں بھی فارسی کی شاعرہ ہیں حسب ایماء شاطر صاحب ان خواتین کو یہ مصرعہ طرح دیا

"بہ شہر خود روم و شہریار خود باشم"

اس پر اہلیہ نے تین شعر اور چھوٹی صاحب زادی نے پانچ شعر لکھ کر بھیجے میں دنگ رہ گیا۔ بڑی صاحب زادی نے نثر کو نظم کیا سیرۃ النبی حصہ دوم سے حضرت جابرؓ اور یہودی قرض خواہ کا واقعہ نکال کر دیا تھوڑی دیر کے بعد شاہنامہ کی بحر اور زبان میں مثنوی کے دس پندرہ شعر میں نظم کر کے بھیج دیا"

"بارک اللہ فی بیت العلم ہذا"

---

[1] حالات مہ لقا بائی چندا مولفہ غلام صمدانی گوہر مطبوعہ حیدر آباد۔ [2] سوانحات ممتاز مخطوطہ آصفیہ۔ [3] مخطوطہ دفتر دیوانی ومال سرکاری۔ [4] مخطوطہ دفتر دیوانی ومال سرکاری۔ [5] مطبوعہ مطبع حیدری مدراس ۱۲۸۱ھ۔ [6] محمد منور گوہر مؤلف نسخہ دان بلند فکر۔ [7] شاطر، دیکھئے خمخانہ جاوید مولفہ سری رام دہلوی مطبوعہ۔

غرض گوہر اور شاطر کے والد ماجد عبدالغنی خاں امیر اثیمہ کے بڑے صاحب زادے تھے۔ گوہر امیر کے حالات کے ضمن میں اثیمہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"حضرت[1] قبلہ گاہی کی والدہ ماجدہ نفسی والاجاہ جن کی نانی دوست علی خاں کی نواسی تھیں علم و عمل کی حیثیت سے عجیب خاتون تھیں ایسی قابل قدر ہستیاں کبھی کبھی اور کہیں کہیں پیدا ہوتی ہیں بارہ سال تک مکہ معظمہ میں رہیں بارہ حج کئے۔ آپ کی چار تصنیفیں ہیں (۱) گلشن شاہدان (۲) گلشن مہ خاں (۳) جہا نضرب (۴) نسب نامہ نظم و نثر میں موجود ہیں تخلص اثیمہ تھا۔ والد ماجد امیر کے قادر محی الدین خاں بہادر سکندر جنگ ثانی تھے"۔

مگر گوہر نے اثیمہ کا نام اور تاریخ وفات نہیں لکھی اور نہ ان کے کوئی تفصیلی حالات لکھے البتہ ان کے صاحبزادوں کے علمی کارناموں کا مختصر و جامع ذکر ضرور کیا ہے ہم یہاں اثیمہ کے متعلق خود اثیمہ کی داخلی شہادتوں اور تواریخ کرناٹک سے ان کی زندگی اور علمی کارناموں پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

اثیمہ کے نانا محمد علی خاں والاجاہ تھے جنھوں نے اپنی پہلی بیوی خدیجہ بیگم[2] المخاطب بہ نواب بیگم بنت احسن الدین خاں کے انتقال کے بعد نواب سعادت اللہ خاں نوا ئط کے برادر زادہ غلام مرتضیٰ خاں کی صاحب زادی سے عقد کیا تھا اثیمہ کے والد نجف علی خاں ابن عبدالغنی خاں کو انھیں غلام مرتضیٰ خاں قلعدار ویلور کی نواسی رضیہ بیگم[3] منسوب تھی خان موصوف علی دوست خاں ناظم دوم آرکاٹ کے حقیقی بھتیجہ اور داماد بھی تھے اس طرح نواب صاحب ممدوح بھی اثیمہ کے جد مادری ہوئے چنانچہ اثیمہ نے اشارہ کیا ہے۔

وہ[4] اے شمع کاشانۂ انوری   وہ اے راحت جان والاجہی
علی دوست خاں کی نواسی تو ہے   رئیسوں کے بستاں کی سرو سہی

حاجی نجف علی خاں کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں بڑے صاحب زادے اعتماد الدولہ بہادر[5] اور دوسرے قادر علی خاں بہادر منور جنگ نظیر[6] تھے۔ اثیمہ نے اپنی ایک بڑی بہن[7] کا ذکر کیا ہے جو نواب غلام مرتضیٰ خاں[8] بہادر ثابت جنگ ممتاز الملک رفیع الدولہ سے منسوب تھی اور یہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعرہ تھیں۔

۱۔ نظم دلچسپ امیر مطبوعہ مدراس۔ ۲۔ تذکرۃ الانساب مولفہ خوشدل مخطوطہ دفتر دیوانی حیدرآباد۔
۳۔ سوانحات ممتاز مخطوطہ آصفیہ۔ ۴۔ گلشن ہوشان مخطوطہ آصفیہ۔
۵۔ سوانحات ممتاز مخطوطہ۔
۶۔ نسخہ دل بلند فکر مطبوعہ مدراس، نظیر حبیب اللہ ذکا کے استاد بھائی تھے یہ بھی تلمیذ میر مہدی ثاقب۔
۷۔ گلشن ہوشان مصنفہ اثیمہ کی تاریخ بھی کہی تھی۔
۸۔ سوانحات ممتاز مخطوطہ آصفیہ۔

اثیمہ کی تعلیم تربیت اس کے پدر بزرگوار اور نجف[1] علی خان افتخار کے ہاتھوں ہوئی جو فارسی اور عربی کے بڑے فاضل اور زبردست شاعر تھے مثنوی بہاریہ اور خزانیہ ان کی مشہور و مستند تصانیف ہیں اس نے اپنے ایک اور استاد مولوی لطف علی کا بھی نام لیا ہے اور دونوں کی اسی طرح مدح سرائی کی ہے۔

میرے دو ہیں استاد عالی وقار | کہ لطف علی و پدر نامدار
خذف کو وہ دل کے صدف کر دیے | مرے سینے میں موتیاں بھر دیے
تو کر ان کو اب اپنے احساں سے پُر | تو بھر ادن کے سینے میں عرفاں کے دُر

اثیمہ کا بیاہ | اثیمہ کا بیاہ قادر محی الدین[2] خان بہادر سکندر جنگ ثانی سے ہوا جو اثیمہ کے چچا نواب غلام حسین[3] خان بہادر المعروف بہ شاہ اشرف اللہ سکندر جنگ اول کے صاحبزادے تھے یہ بھی عربی فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ فن خوشنویسی یعنی خط نسخ و نستعلیق شفیعہ و گلزار و خط ناخن و غبار میں بھی بڑا کمال حاصل تھا شہسواری میں چاق اور خودداری میں ضرب المثل تھے مگر عمر نے وفا نہ کی معلوم ہوتا ہے کہ عالم شباب ہی میں ۱۲۶۲ھ سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ اثیمہ کو حافظ محمد علی داعظ[4] رامپوری اور خلیفہ سید احمد بریلوئیؒ سے بیعت تھی۔

---

[1] نجف علی خان ابن محمدی میاں خلف عبدالغنی خان ابن عبدالغنی خاں ابن عبدالواسع خان موصوف کے منجھلے بھائی غلام حسن خان اشرف اللہ سکندر جنگ اول اور چھوٹے فضل حسین خان مدالمدوالاجاہ نجف علی خان کی شادی محمد زماں خاں حیدر کی لڑکی یعنی غلام مرتضیٰ خاں قلعدار دلیور کی نواسی سے ہوئی تھی جس کے بطن سے دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ بڑی لڑکی غلام مرتضیٰ خاں ثابت جنگ سے منسوب تھی، اور دوسری اثیمہ، نواب سکندر جنگ ثانی سے۔ ایک صاحبزادے قادر علی خاں منور جنگ نظیر قابتہ مہدی ثاقب، اور دوسرے قادر حسین خان آصف جنگ تھے۔ نجف علی خاں افتخار تخلص کرتے تھے، فارسی و عربی کے جید شاعر تھے، تصانیف میں مثنوی بہاریہ و خزانیہ اور شرح سکندر نامہ مشہور ہیں۔ مدفن کہ معظمہ (نظم دلچسپ امیر مطبوعہ۔ خلاصۃ الانساب مولفہ قدرت احمد گوپاموی مخطوطہ)

[2] سکندر جنگ ثانی مرحوم اثیمہ کے شوہر تھے (نظم دلچسپ امیر مولفہ محمد منو۔ گوہر مطبوعہ مطبع حیدری مدراس) [3] غلام حسن خاں سکندر جنگ اول (خلاصۃ الانساب، مخطوطہ آصفیہ) (تذکرۃ الانساب مولفہ خوشدل مخطوطہ دفتر ملکی حیدرآباد)

[4] حافظ محمد علی واعظ رامپوری خلیفہ مولوی سید احمد بریلوی وارد مدراس ۱۲۴۵ھ / ۱۲۴۶ھ اثیمہ کو بھی ان سے بیعت تھی۔ عمائد مدراس ان کے مرید تھے۔ نواب غلام عالم خان، فاروق المتوفی (۱۲۷۱ھ) کو خلافت بھی تھی۔ کیونکہ حافظ صاحب سید احمد بریلوی مشہور اہل حدیث کے سلسلہ کے تھے بعض مسائل میں علماء مدراس مخالف ہو گئے اور تکفیر میں ایک کتاب زبان اردو تنبیہ الضالین لکھی گئی اور طبع و شائع ہوئی، مولوی جمال الدین فرنگی محلی نے اس میں بڑا حصہ لیا (ذکر جلی فی الکرامات محمد علی مطبوعہ سکندر آباد و تنبیہ الضالین مطبوعہ مدراس ملاحظہ ہو) محلات آرکاٹ نے ایک مسجد حافظ صاحب کے نام سے جام بازار مدراس میں بنوائی تھی۔

اثیمہ کی تاریخ وفات دستیاب نہیں ہوئی چونکہ ان کی آخری تصنیف گلشن شاہان ۱۲۸۹ھ میں لکھی گئی ہے جس میں اثیمہ نے آصف جاہ ششم نواب میر محبوب علی خاں مختار الملک اُولی سلطان عبد العزیز خاں اور شریف مکہ کی مدح سرائی کی ہے اس سے یہ یقین ہے کہ اثیمہ آخر تیرھویں صدی ہجری تک بقید حیات تھیں۔ اور ان کا انتقال خاصی عمر میں ہوا جب کہ انھوں نے اپنی اولاد کی بہاریں دیکھ لیں بلکہ اپنے ایک پوتے عبد العلی[1] عرف عبد الباری المتخلص بہ موحد کی رونمائی کے لئے آخر الذکر کتاب چھوڑ گئی تھیں اس کا حال نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ اپنے اس پیارے پوتے کے بیاہ تک زندہ تھیں یا نہیں۔

اولاد:۔ اثیمہ کے صرف تین فرزند تھے سب سے بڑے عبد الغنی خاں امیر[2] دوسرے عبد الواسع[3] خاں تیسرے عبد الصمد خاں ماہر[4] اور تینوں عالم فاضل اور جید شاعر اور اپنے باپ اور ماں کے حقیقی جانشین تھے۔ اثیمہ نے کہا ہے ؎

یہی ہیں مرے مایۂ کائنات یہی حاصل زندگی و حیات

---

[1] عبد العلی عرف عبد الباری موحد، ابن عبد الغنی خاں امیر۔ ولادت ۱۲۷۸ھ نبیرۂ اثیمہ، از بطن نبیری نواب عظیم جاہ بہادر مرحوم۔ موحد، محمد منور گوہر اور عبد الرحمٰن شاطر کے بھائی تھے۔ ان کی دلہن کو اثیمہ نے اپنی کتاب گلشن شاہان دینے کی وصیت کی تھی (مثنوی گلشن مہوشان مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد)

[2] عبد الغنی خاں امیر، اثیمہ کے بڑے صاحبزادے (۱۲۵۹ / ۱۳۰۲ھ) عربی فارسی انگریزی کے فارغ التحصیل، دو عقد کیے تھے اولاً نواب عظیم الدولہ کے پوتے داماد، من بعد اعظم جاہ کے نواسے داماد، ڈپٹی کلکٹر بھی رہے۔ مشہور تصانیف میں انوار عظیم، اور عربی قصاید صنعت مہملہ میں لاجواب ہیں جو مدراس۔ بنگال اور شمالی ہند میں قدر کی نظر سے دیکھے گئے۔ ویلور کے مشہور فاضل اجل و عارف کامل سید غلام محی الدین ویلوری سے آپ کو بیعت بھی تھی۔

[3] خان بہادر عبد الواسع خاں، حافظ، حاجی، ولادت ۱۲۶۱ھ تدوین صحیفۂ زرین تک حیات تھے۔ ہماری شاعرہ اثیمہ کے دوسرے فرزند، شکوہ الملک کے پوتے، اور والاجاہ کے نواسے۔ نواب عظیم جاہ کی صاحب زادی طیب النساء بیگم منسوب تھی، عربی فارسی، اپنے نانا افتخار۔ اور ماموں منور جنگ نظیر سے پڑھی اور طب حکیم جلال الدین سے۔ انگریزی بھی جانتے تھے تصانیف میں چند مذہبی کتب ہیں سکونت سعید آباد منیر باغ مدراس۔ (صحیفۂ زرین مطبوعہ نول کشور ۱۹۰۲ء ص ۱۹)

[4] عبد الصمد خاں ماہر۔ اثیمہ کے چھوٹے صاحبزادے ولادت (۱۲۶۴ھ) فارسی عربی و انگریزی کے فاضل۔ حافظ قرآن خطاط۔ فارسی کے جید شاعر، قصاید ماہر و دیوان ماہر طبع ہو چکے ہیں۔ نواب ظہیر الدولہ بہادر کے نواسے داماد۔ ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ رہے اس کے بعد نواب سر محمد منور خاں عظیم جاہ بہادر پرنس آف آرکاٹ کے نائب اور صدر المہام۔ اثیمہ کے یہی وہ صاحب زادے ہیں جن کی دلہن کو "گلشن عاشقاں" رونمائی میں ہماری شاعرہ نے دی تھی، ماہر کی تصویر صحیفۂ زرین مطبوعہ نول کشور کانپور ۱۹۰۲ء کے صفحہ ۷۵ پر موجود ہے۔

تصنیفات:۔ اثیمہ نے اپنی آخری تصنیف گلشن شاہان میں لکھا ہے کہ میرے تخلص اثیمہ کے پانچ حرف ہیں اسی خیال کے مدِ نظر میں نے پانچ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پہلی مثنوی گلبن مہ رخاں دوسری گلشن مہوشان یعنی قصۂ جہاں ضرب تیسری گلشن شاہان، چوتھی گلشن عاشقاں نثر میں اور پانچواں اُردو دیوان ہے۔

گوہر نے ایک اور کتاب نسب نامہ کا حوالہ دیا ہے جو نظم و نثر میں ہے گویا کل چھ تصانیف ہیں۔

ہماری نظر سے اول الذکر صرف تین مثنویاں گذری ہیں جو کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہیں۔ اثیمہ نے اپنی تصانیف کو عرصۂ دراز تک پوشیدہ رکھا اگرچیکہ بیگمات میں اکثر کو ان کا علم تھا۔

<u>مثنویوں کا علم کس طرح ہوا</u> ایک روز اتفاق سے تینوں لڑکے جن کی شادی ہوچکی تھی۔ ماں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حسن اتفاق سے کتابیں بھی وہاں موجود تھیں۔ ہر ایک نے ایک ایک کتاب اٹھائی اور کہا کہ بلا وجہ آپ نے ان کو پوشیدہ رکھا ہے کسی عورت نے اب تک ایسی مثنویاں نہیں لکھی ہیں۔ غرض لڑکوں کے اصرار پر اثیمہ کو اپنی یادگار قائم کرنے کی عجیب تدبیر سوجھی اور کہا کہ لوگ رونمائی میں دولت و ثروت باندی غلام دیتے ہیں۔ جس کو بقا نہیں ہیں تمھاری دلہنوں کو ایک ایک کتاب دیتی ہوں۔ تاکہ میری یادگار ہمیشہ قائم رہے۔ اور اس طرح فوراً ہی ایک مجلس ترتیب دے کر اپنی تینوں بہوؤں یعنی عبدالغنی خاں کی دلہن کو جو عبدالرحمٰن شاطر کی والدہ ماجدہ تھیں گلبن مہ رخاں اور رخان بہادر عبدالواسع کی دلہن کو گلشن مہوشان یعنی قصہ جہاں ضرب اور عبدالصمد ماہر کی دلہن کو گلشن عاشقاں جو نثر میں ہے۔ عطا کی اور چوتھی مثنوی گلشن شاہان کے متعلق وصیت کی کہ یہ میرے پوتے عبدالباری کی دلہن کی رونمائی میں دی جائے۔

غرض یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی نسوانی دنیا میں نظیر نہیں ہے۔

<u>(۱) مخطوطہ مثنوی گلبن مہ رخاں</u> یہ کتب خانہ آصفیہ (۴۴۶) فن مثنویات میں مخزون ہے سنہ کتابت درج نہیں۔ اثیمہ کی یہ پہلی تصنیف ہے جو ۱۲۶۸ھ میں لکھی گئی جس کے جملہ صفحات (۸۸) سطر (۱۷) جملہ اشعار تقریباً (۱۴۹۶) ہیں اور پانچ جشنوں پر مشتمل ہے۔ جو عبدالغنی خاں المتخلص بہ امیر پدر بزرگوار عبدالرحمٰن شاطر کی دلہن کی رونمائی میں ہدیتہً عطا کی گئی تھی۔ جملہ ۱۰ عزہ خاص نے تاریخی قطعات کہے، والد ماجد نے کہا ع

داستاں سراسر بہار
۱۲۶۸

بڑی بہن نے کہا ؎　　"خوش قصۂ جاں فزائے احباب" ۱۲۶۸ھ

بلکہ خوش دامن نے تو عربی مادہ کہا ؎

پسر میرے سکندر جنگ بہادر　　کہ جب لکھے محل نے فال عمرہ
کتاب یک خوبتر دل یول اٹھا سال　　<u>افاض ایدہ اللہ قدرہ</u>
۱۲۷۷ھ ج

تاریخ مادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ؟ یا یہ مادہ گلشن ہوشان تالیف ۱۲۷۷ھ سے متعلق ہے جو گلبن سرخاں میں درج ہوگیا۔ یہ مثنوی عید الفطر کے جشن کے موقعہ پر لکھی گئی۔ جس میں باہمی ضیافتوں اور خلوص و محبت و اتحاد کی سچی تصویر کھینچی ہے۔ اس میں ظرافت و مذہبیت کا پہلو بھی ہے جس سے محلات آرکاٹ کی دینداری نمایاں ہے۔ ایک خاص چیز اس میں یہ ہے کہ مدراسی عورتوں (نواحط) کی سلیقہ شعاری اور خانہ داری۔ دربار آرکاٹ کے رسم و رواج پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ عورتوں کے پکوان خصوصاً سینکڑوں قسم کی مٹھائیاں حلوے۔ اور ایسی زرق برق سنہری و روپہلی مٹھائیاں مثلاً ظروف نقروی صراحی، پیالے۔ سیلا بچی۔ عطردان، پاندان، شمعدان۔ نیز ایسی صاف و شفاف قندیلیں جس سے معلوم ہو کہ ان میں شمع جل رہی ہے اور مرغ و کباب جس سے کھاری و نمکین پیزوں کا دھوکہ ہو۔ اس کے علاوہ انگریزی ایٹ ہوم کے لوازمات، میوے کے باردار درخت حوض جس میں گلاب وغیرہ بھرا ہوا ہو۔ اور ظرافت یہ کی گئی کہ ان میں سے کچھ اصلی اور کچھ مصنوعی سب مٹھائی کہ جس سے محفل میں ایک قہقہہ برپا ہو جائے۔ غرض اس قسم کے دسترخوان چنے گئے اور جس کا ایک مختصر مرقع ہم یہاں پیش کرتے ہیں :-

دہاں سے چلے جبکہ سوم مکاں　　چمن یک نظر سب کو آیا وہاں
روش سرخ قالین کا تھا بچھا　　چمن سبز قالین کا تھا بنا
کٹہرا روپیری چمن کو تھا بس　　جسے دیکھنے سے ہو دل کو ہوس
چمن میں انگیٹھیاں دھریں پُر بہار　　تھے ہر یک شجر میوے کے باردار
طلائی تھا یک درمیاں حوض زرد　　بھرا اس کے تھا درمیاں ماورد
وہ گلشن ہو گل کا تھا منڈوا بنا　　تھے تمام اس کے پھولوں کے سب خوشنما
لگے اوس میں اقسام کے تھے گلاں　　کئی حاشیہ پر کئی درمیاں ۔
بہت چھڑکے تھے اس پہ مشک و عبیر　　ہوا عطر اس آن تھی دل پذیر
بھی اس حوض پر میز کرسیاں دھرے　　ظروف ان میں میوے بھی کاٹے ہوئے
جو بیٹھے ہیں کرسیوں پہ سب ایک بار　　لگیں نوش کرنے انار و کنار
ثمر کو کوئی توڑ کھانے لگا　　کوئی گل کو توڑ آزمانے لگا
کوئی جھاڑ اور پھل تو تھا واقعی　　کوئی تھا شبیہ اس کا از شیرنی
ہوئی سب کو معلوم صنعت گری　　مٹھائی گروں کی ہنر پروری
کہ سب ہوا یہ بھی معلوم تھیں　　یہاں جو کہ ہیں جھاڑ اور جو ہیں بیل

سو یہ سب ہیں نخل ولایت نئے — کہ سن نام دل سب کے حسرت میں تھے
سو وہ ہم کو آنکھوں سے دکھلائے ہیں — مٹھائی کے ہم شکل بنوائے ہیں
تفاوت نہ کچھ دونوں میں آسکے — مگر تب ہو معلوم جب منہ میں لے

اس کے سوا مختلف کھیل تماشے۔ پکنک پارٹی۔ تیراکی۔ رنگ کھیلنا۔ کشتیوں میں تالاب کی سیر جھولنے۔ راگ رنگ۔ غرض تفریح کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جو بچی ہو۔ جن کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

محل اور اس کے آرائش کی تعریف:۔

مکان قصر یکسر تھا عالی نشان — فلک سے کہے ہمسری بےگمان
بچھا فرش اطلس کا تھا جا بجا — کہے تو کہ ہے چرخ اطلس نما
نظر آئیں بلور کے جھاڑ یوں — ثریا کے ہر طرف خوشے ہیں جوں
لگیں آئینے قدِ آدم کہیں — کہیں نقشۂ آسمان و زمین
کہیں راگ مالا تھا بجتا ہوا — کہیں تھے تصاویرِ نازک ادا
کہیں تھے ولایت کے گل اور شجر — طلائی انگیٹھی میں ہر میز پر
تحائف نوادر تھے خوش اختراع — کہیں شمع کا نور کا تھا شعاع

جھولہ کی تعریف:۔

نماز عصر پڑھ کے سب ایک بار — چلیں آئیں گلشن طرف کامگار
جو دیکھو تو اس حوض کے درمیان — ہے یک جھولہ جوں جھولۂ آسمان
ہے خوش وضع منڈوے میں یوں جلوہ گر — فلک پر نبات آوے جیسے نظر

کشتی کی تعریف:۔

پڑی حوض میں کشتی یک بے مثال — کہ جوں آسماں پر ہو پیدا ہلال
روش پر دیئے فرش بانات کر — دھریں سبز مونڈھے وہاں خوب تر
لطافت کے اس سیر پر سب کے دل — بہت یک خوشی سے ہوئے مشتعل
کوئی جا کے جھولے پہ بیٹھی وہاں — کئی[عسہ] آب پر کوئی کشتی رواں
کئی یک مونڈھوں پہ بیٹھی ایک بار — روش پر طوائف تھیں باندھیں قطار
چلی جب وہ کشتی ناز و ادا — کہ جون مطلع خور سے ظاہر ضیا

عسہ کئی = دکھنی لہجہ، کھینی کی، کیا۔

جو تھے جلوہ گر اس میں خورشید رو
کئی شرم سے نیلو فر سر فرو

پڑا آب پر عکس از گلرخاں
بنا آب چشمہ کا آئینہ ساں

پڑا عکس جب ان کا سوئے چمن
گلوں کا مصفا بنا انجمن

چمن ان گلوں سے مہکنے لگا
وے زلفوں سے سنبل مہکنے لگا

حسینوں کے چہروں کو دیکھے ہیں جب
گل و بلبلوں پر پڑا داب سب

خجالت سے غنچے ہوئے در حجاب
ہوئے شرم سے گل رخاں کے گلاب[1]

ہوا ماہ رویوں کا ہے جب ظہور
گل سوری اور چاندنی پا کے نور

انھوں نے دیا مہر اور مہ کو نور
مہ و مہر سے تھا جہاں کو ظہور

ہوا چاندنی سے سما[2] رہا عجب
طرب پر طرب کا ہوا ہے سبب

ادھر راگ گانوں کا باصوت و ساز
ادھر روشنی بھی تھی با امتیاز

باغ کا سماں۔

محل و مکاں بسکہ پُرنور تھا
چمن حوض دیکھو تو معمور تھا

چنبیلی کا یک منڈوہ پُربہار
ہر یک طرف خوشبو سے مثل تتار

اور ایک منڈوہ سیوتی تھا وہاں
وہ دونوں کے یک حوض تھا درمیاں

جو اس حوض کے درمیاں خوب تر
پڑا زینۂ سنگ مرمر نظر

نہیں زینہ تھا بلکہ زیر فلک
تھا آئینۂ ماہ بے ریب رشک

ہوا موج زن ہو کے از حوض و نہر
جو زینہ پہ پہنچا وے پانی کی لہر

وہ عکس ان کا تصویر سازی کرے
تو آئینہ بلور بازی کرے

انگیٹھی میں کونلے کے تھے کئی شجر
بلندی میں تھے نیم گز کے مگر

ثمر اس کو سب تھے رسیدہ لگے
نظر آتے جوں شاخ طوبیٰ کے تھے

انگیٹھی تھی ہر ہر پہ از شاخ گل
لب حوض پر تھے وہ استادہ کل

چمن دونوں جانب تھے دو کامیاب
پُر از نسترن اور پُر از گلاب

ہر یک گل پہ بلبل تھا ہو تا فدا
گلوں کی محبت میں تھا مبتلا

جشن سوم۔

پکنک پارٹی

ہوا تیسرا روز ہے جب شروع
لگا ہونے خورشید جس دم طلوع

[1] یعنی گل آب آب ہو گئے۔ [2] سما یعنی سماں۔

ہوا حکم اس روز یہ آشکار کریں مل کے سب جانور کا شکار
کہو مطبخی مطبخیوں کو جا بنائیں کباب ان سے اقسام کا
کریں اور پکوان کا ابتدا لب نہر جھاڑوں میں ہر ایک آ
شروع زیر سایہ ہوئے ایک بار تلن اور پکوان کے کاروبار
کہ بعضوں نے ترکاری کو جھاڑ پر کئے اس طرح سے ہی سالن مگر
درختوں پہ میوہ مربا کئے ثمر ڈالیوں پر تھے لٹکے ہوئے
بنا ہار و زیور کو اقسام سے وہ پھولوں کے منڈوے میں لٹکائے
کہیں پان کی بیل آئی نظر لوازم وہاں اس کے تھے جلوہ گر
بہت شادمانی سے سب گل رخاں کیے اپنے ہاتھوں سے پکوان وہاں

غرض ادھر مردوں نے شکار کیا اور خود کباب بنا کر کھائے۔

رنگ کھیلنا:۔

لئے کوئی پچکاری پر ہات ہے ہوئی کوئی چنڈول کے سات ہے
کوئی کھیلے میوے سے ہے اس گھڑی لئے قمقمے کوئی گل کی چھڑی
وہ سب نوجواں یک کو یک ٹھیلتے چلے حوض پر مل کے سب کھیلتے
ہوئے جبکہ بازی سے سیر ایک بار گرے حوض پر مل کے سب بے وقار
ہوئے گونگوں پہلے سب کے لباس ہوئے سرخ ایک بار سب خوش اساس

۲۔ مخطوطہ گلشن شاہدان: گلشن شاہدان فن مثنویات اُردو (۴۹۸) پر کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے، جملہ صفحات (۷۱) سطر (۹)، تقطیع متوسط سنہ کتابت ۱۲۹۴ھ ہے۔ نام کاتب ندارد۔ البتہ آخر میں خان بہادر عبدالواسع خاں کا قطعہ تاریخ کتخدائی درج ہے۔ اس کا سنہ تصنیف (۱۲۸۹) ھ ابیات تقریباً ۹۳۶ ہیں۔ اثیمہ نے یہ مثنوی مکہ معظمہ میں نواب سالار جنگ اولی وزیر حیدرآباد کی ایک عزیزہ کی فرمایش پر کہی تھی۔ جن کی رشتہ داری نوابان آرکاٹ سے بھی تھی۔ یہ مثنوی دراصل بعینہ مثنوی دریائے عشق میر تقی میر کا پلاٹ ہے جس کا ماخذ ہمارے خیال میں کوئی دکھنی قصہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کو شاہ تراب نامی ایک بزرگ نے بھی میر صاحب سے بہت پہلے لکھا تھا۔ اس پر ہم نے ایک علیحدہ مضمون لکھا ہے۔ جو عنقریب شائع ہوگا۔

دیوان اثیمہ اور گلشن عاشقاں | اثیمہ کا دیوان اردو اور نثر کی کتاب افسانہ "گلشن عاشقاں" جس کو وہ حکایات شمس الضحیٰ کہتی ہیں اور نسب نامہ جس کا ذکر علامہ گوہر نے کیا ہے ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ گلشن عاشقاں خان بہادر عبدالصمد خاں ماہر کی دلہن کو ہدیۃً دی گئی تھی۔ عبدالصمد ماہر کی تصویر کا عکس صحیفہ زرین مطبوعہ نول کشور کے صفحہ ۵ پر ملاحظہ ہو جو اثیمہ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔

۳۔ مخطوطہ گلشن مہوشان | گلشن مہوشان، کتب خانہ آصفیہ کا نادر مخطوطہ ہے اور یہ وہی مخطوطہ ہے جو اثیمہ کے فرزند خان بہادر عبدالواسع خاں کی شادی کے روز دلہن کی رونمائی میں خوش دامن محترمہ یعنی اثیمہ نے اپنی بہو کو دیا تھا جن کا نام غالباً طیب النساء بیگم تھا۔ صاحب زادہ مذکور کی شادی ۱۲۸۴ھ میں نواب ظہیر الدولہ بہادر اعظم جاہ پرنس آف آرکاٹ کی صاحب زادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نسخہ کے ابتدائی صفحہ پر اوپر کی جانب دونوں طرف دو مہریں اور ختم کتاب پر ذیل میں ایک مہر طیب النساء بیگم ثبت ہے اور مہر کا سنہ ۱۲۸۴ھ ہے۔ مگر مولف صحیفہ زرین نے۔ سنہ شادی ۱۲۸۱ھ لکھا ہے۔ مگر قطعہ تاریخ جو مخطوطہ گلشن شاہان ۴۹۸ آصفیہ کے صفحہ آخر پر درج ہے۔ اُس میں ۱۲۸۴ھ لکھا ہے جس میں کچھ تخرجہ معلوم ہوتا ہے وہ تاریخی قطعہ حسب ذیل ہے ؎

بفضل حق طفیل شاہ کونین   محمد عبدالواسع خان بہادر
چو زیب افزائے صدر نوشہی شد   گہر ایثار شد بروے فدا دُر
بگفتا سال آں دل از سرِ جشن   زہے ایں نوشہ تاج "تفاخر"

۱۲۸۱ + ۳ = ۱۲۸۴ھ

اگر ۱۲۸۴ھ صحیح ہے تو یہی وہ نسخہ ہوگا جو شادی کے روز دلہن کو دیا گیا۔

اور یہ واقعہ تحائف کتب ۱۲۸۴ھ کا ہونا چاہئے، مگر اثیمہ نے یہ اشارہ کیا ہے کہ تینوں دلہنوں کو ایک جلسہ میں یہ کتابیں عطا کی گئی تھیں۔ اور تیسرے صاحب زادے خان بہادر عبدالصمد کا عقد بقول مولف صحیفۂ زرین ۱۲۸۵ھ میں ہوا، اس لئے اب طیب النساء بیگم دراصل کون ہے؟ کیا طیب النساء خود مصنفہ کا نام بھی تھا، اگر فی الواقعی مصنفہ کا نام ہی ہے اور مہر بھی اوسی کی ہے تو پھر اس مخطوطہ کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کہ اصل مصنفہ کا لکھا ہوا یا لکھایا ہوا بھی مسودہ ہے۔ اور ان مثنویوں کے افشاء راز کا معاملہ ۱۲۸۴ھ یا ۱۲۸۵ھ کے بعد وقوع پذیر ہوا، مگر ایک شبہ اور بھی وارد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اثیمہ مغفورہ، ۱۲۸۴ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئیں، اور یہ عبارت گلشن شاہان میں درج ہے کہ گلشن شاہان لکھنے کا واقعہ حج سے چار سال بعد پیش آیا۔ اگر

مصنّفہ ۱۲۸۳ھ کے بعد حج سے واپس آچکی تھیں، تو پھر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، مگر واقعہ یہ ہے یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ مثنوی گلشن شاہدان ۱۲۸۹ھ میں لکھی گئی، اس لئے مثنویوں کو ہدیۃً دینے کا واقعہ ۱۲۸۹ھ کے بعد کا قرار پاتا ہے۔ اس کی تائید اس وجہ سے ہوتی ہے کہ مثنویاں تینوں دلہن کو وقت واحد میں دی گئی تھیں اور مثنوی گلشن شاہدان کے متعلق یہ وصیت کی تھی کہ وہ اس کے پوتے عبدالباری کی دلہن کو دی جائے۔ اس اعتبار سے مخطوطہ زیر بحث پر خود مصنّفہ کی ذاتی مہر ہے؟

گلشن مہوشان کے جملہ صفحات ۲۷۲ ہیں سطر ۲۱ اس طرح اس کے کل ابیات ۵۳۷۶ ہیں جو حسب ذیل تینتالیس ابواب پر مشتمل ہے۔

باب	ابیات
(۱) آغاز داستان	۶۵ بیت
(۲) داستان جواہر شاہ سے پری زاد فیروز شاہ کے ملاقی ہونے کے بیان میں	۸۲ 〃
(۳) داستان لعل شاہ کے تولّد ہونے کے بیان میں	۵۰ 〃
(۴) داستان شہزادہ دادگر کے تولّد ہونے کے بیان میں	۵۱ 〃
(۵) داستان لعل بادشاہ اور دادگر کے تخت نشین ہونے کے بیان میں	۴۴ 〃
(۶) داستان جہاں ضرب دختر جہانبان شاہ تولّد ہونے کے بیان میں	۶۰ 〃
(۷) داستان فقیر احسن الدین کا جہاں ضرب کو تخت نشین کرنے کے بیان میں	۸۵ 〃
(۸) داستان جہاں ضرب اور لعل بادشاہ کے وجہ عناد اور جنگ و فساد کے بیان میں	۱۰۶ 〃
(۹) داستان مہلت کے ایام میں پری نازک بدن کا لعل بادشاہ کو تصویر جہاں ضرب کی دکھلا کر عاشق کرنے کے بیان میں	۴۱ 〃
(۱۰) داستان جہاں ضرب صحرا میں "جہاں رستم" سے ملاقی ہونے کے بیان میں	۶۸ 〃
(۱۱) داستان جہاں رستم بازی گر زد کشتی۔ شاہان سے کرنے اور لعل بادشاہ سبقت لے جانے کے بیان میں	۱۴۱ 〃
(۱۲) داستان لعل بادشاہ فقیر احسن الدین سے ملاقی ہونے کے بیان میں	۹۷ 〃
(۱۳) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب کی تنہائی اوقات پرداز ہونے کے بیان میں	۲۶۲ 〃
(۱۴) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب کو بیدار کرکے ضرب کنارا پانے کے بیان میں	۱۰۷ 〃
(۱۵) داستان فیروز شاہ سلطان فرخندہ فال سے عرض حال کرکے جہاں ضرب کی نسبت لعل بادشاہ سے مخفی (طور پر) کرنے کے بیان میں	۲۱۱ 〃
(۱۶) داستان جہاں ضرب قباد پریزاد کے دیو غالب پر فتح یاب ہونے کے بیان میں	۲۷ 〃

(۳۹) داستان فقیر احسن الدین کا لعل بادشاہ اور جہاں مزب کو ملک دمشق کا تخت نشین کرنے کے بیان میں　　۷۱ بیت

(۴۰) داستان جہاں مزب بزرگوں کی ضیافت کرنے کے بیان میں　　۱۲۷ "

(۴۱) داستان جہاں مزب حاملہ ہونے کے بیان میں　　۱۳۶ "

(۴۲) داستان جہاں مزب داستان تولد سکندر روزگار عرف ابن الفقیر و اختتام کتاب　　۱۳۱ "

ابیات اصل مثنوی　　۵۳۲۶

(۴۳) تواریخ مستخرجہ مقدس آب فیض انتساب والدا جدم حاجی محمد علی خاں بہادر وغیرہ　　۵۰ بیت

جملہ　　۵۳۷۶

اس کا سنہ تصنیف ۱۲۷۷ھ ہے گویا یہ مثنوی پہلی تصنیف گلبن سرورخاں کے نویں سال لکھی گئی چونکہ خود مصنفہ نے اس کی وجہ تالیف کا اشارہ گلبن سرورخاں میں کیا ہے۔ اور اسی وقت والدہ ماجدہ اور والد ماجد اور خوش دامن کے اصرار سے فی البدیہہ چند اوراق لکھ کر سنائے تھے اس لئے اس کی ابتداء ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔ اور چونکہ اس کا سنہ اختتام ۱۲۷۷ھ ہے لہٰذا یہ نو سال میں اختتام کو پہنچی، اس تاخیر کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اثیمہ نے اس درمیان میں گلشن عاشقاں یعنی ایک قصہ نثر میں بھی لکھ ڈالا، نیز وہ اپنے کچھ داغی عارضہ اور خرابی صحت کی وجہ سے مجبور تھی۔ جوں توں اس کام کو جاری رکھا اور حسن و خوبی سے ختم کیا اس کے متعلق بھی بہت سے تاریخی مادے سب اعزہ نے لکھے۔ جس میں جناب افتخار یعنی پدر بزرگوار نے قطعہ تاریخی کہا تھا جس کا آخری مصرعہ یہ ہے "عجب دلکشا مثنوی ارم" والدہ ماجدہ کا تاریخی مادہ ہے ——" دل کہا واہ بے نظیر چمن" مگر اثیمہ کی خوش دامن دختر شکوہ الملک نصیر الدولہ کا تاریخی قطعہ بہت جامعیت رکھتا ہے اور خواتین والا جاہی کی علمی شغف اور خصوصاً آخرالذکر کی حاضر داغی و فصاحت و بلاغت پر دلالت کرتا ہے اس لئے ہم اس کو بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ اثیمہ نے خود اس کو اس طرح نقل کیا ہے ——

پھپھی جو شرع سے ہیں میری مادر	انھوں بھی پڑھ کے اس کو ہو گئے خوش
شتابی سے اٹھا مشکیں قلم وہ	کئے تاریخ یوں زیب رقم وہ
پسر میرے سکندر رجنگ ثانی	محل اون کے بہ لطف خوش بیانی
لکھی سہ داستانِ فرحت انگیز	برنگ زلف خوبانِ دل آویز
وہ ہے اس طور جو ہے پہلے لکھی[1]	جہاں معنی کے آئینہ میں رکھی

[1] یعنی گلبن سرورخاں

دوئم کوزے میں جوں بحر لطافت | سوئم جوں مشت میں شہر بلاغت
رقم سب کا ہے شام عشرت انگیز | مطالب سب کے جوں صبح طرب خیز
کہاں کوئی اس طرح زیب رقم ہے | نوادر داستاں زیر قلم ہے
تمنّی سوم کی جو سب کو انتظاری | ہے تاریخ اس کی "باغ نوبہاری"

۱۲۷۷ھ

مثنوی کا موضوع | مثنوی "گلشن مہوشان" ایک سوشیل افسانہ ہے جس کا ماخذ ایک فارسی قصہ ہے۔ جس کا اشارہ مصنفہ نے خود اپنی سابقہ مثنوی گلبن مہ رخاں میں کیا ہے۔ ماخذ کا نام درج نہیں ہے اس کا ماخذ غالباً قصہ "اگر گل" ہے جس کا ترجمہ فارسی سے نواب محمد تقی خاں ہوس لکھنوی کے کسی شاگرد نے اُردو میں کیا تھا جو ۱۲۸۸ھ میں مطبع نول کشور میں چھپا، جس کی قیمت بالکل معمولی ۲؍ رکھی گئی تھی، غالباً "اگر گل" کا یہی ایک قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اُردو میں ہے۔ جس کی زبان لکھنوی معلوم ہوتی ہے۔ مگر ڈاکٹر زور قادری نے اس کو دکھنی نثر میں بیان کیا ہے۔ اس کے کردار اور معشوقہ "اگر" کا مردانہ پارٹ، اشیمہ کی اس مثنوی کے کردار جہاں ضرب سے ملتا جلتا ہے۔ اشیمہ نے قصہ جہاں ضرب فارسی میں ہوتا بیان کیا ہے۔

اصل فارسی نسخہ افسوس ہے کہ ہم کو دستیاب نہ ہو سکا۔ جس سے صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا تھا کہ اشیمہ نے کہاں تک اس سے استفادہ کیا ہے مگر چوں کہ اس میں تمام خیالات رسم و رواج ہندوستانی ہیں۔ اس لئے اس نے اس کو گویا اپنا لیا ہے اشیمہ کے پیش نظر مختلف مثنویاں رہی ہیں۔ مثلاً یوسف زلیخا۔ تحفۂ اعظم[۲۳]، یعنی مثنوی خجستہ تعاد ہمایوں مزاج، مصنفۂ علی کوکنی۔ جو سحر البیان میر حسن کی تتبع میں لکھی گئی۔ نیز پنجۂ آفتاب[۲۵]۔ جس کا مصنف نامعلوم ہے اور ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ جو نواب رئیس الامراء۔ عبدالحسین خاں دالاجاہ کے ایماء پر لکھی گئی تھی۔ اور مثنوی میر حسن یعنی سحر البیان بھی اشیمہ کو بہت مرغوب تھی مگر ان سب قصوں میں قصہ جہاں ضرب۔ فارسی جو مثنوی زیر تنقید کا ماخذ ہے تمام عورتوں نے بہت پسند کیا اور اپنے والدین کے اصرار سے اشیمہ نے اس کو فارسی سے ہندی یعنی مروجہ آرکاٹی اُردو میں منتقل کیا۔ جو مثنوی سحر البیان کے تتبع میں منجملہ ادنیٰ باکمال شعراء اہل دہلی و لکھنؤ، مثلاً مصحفی، جرأت دیا شنکر نسیم وغیرہ کے ایک مدراسی خاتون کی کدوکاوش کا نتیجہ ہے۔ اور مرد شاعروں کے

[۲۱] گلشن عاشقان۔ [۲۲] گلشن مہوشان۔ [۲۳] تحفۂ اعظم، مخطوطہ آصفیہ، و مطبوعۂ بمبئی، جو کہ علی کوکنی نے غلام غوث خاں اعظم کے نام پر معنون کی تھی ابھی منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ [۲۵] پنجۂ آفتاب مخطوطۂ آصفیہ جس کو کسی مدراسی شاعر نے رئیس الامراء کے ایماء سے لکھا تھا جس کا ماخذ قصۂ بہرام و ماہ مصنفہ مظفر میں بیان کیا ہے۔

مقابلہ میں خود اوس کو اعتراف ہے کہ ؎

کہے والدہ مجھ کو نورالبصر | میرے سے تو یوں عذر و حیلہ نہ کر
ہو کر شاعری سے کسی کو خبر | ہے دیوان لکھنا اسے سہل تر
مگر مثنوی میں ہے دقت بڑی | مسلسل ہو موتی کی جیسی لڑی
وہی کہتی ہوں جو کہی پہلے بات | نہیں ہمسری زن کو مردوں کے سات
اگر ان کی نظروں سے تیری کتاب | جو گذرے انھوں نے زرا صواب
گذرجاویں اصلاح کر عیب سے | تو وے اجر پالیویں گے غیب سے
سبب یہ کہ زن کی کوئی داستان | نہ مردوں کے آئی نظر درمیاں

نیز اثیمہ نے یہ بھی صاف طور پر ظاہر کیا ہے کہ منصف مزاج لوگ میرے مضامین اور اس کی بندش پر نظر کریں اور داد دیں۔

اثیمہ نے خود اس مثنوی کے متعلق اپنی رائے اس طرح ظاہر کی ہے ؎[۵]

نہیں مثنوی بلکہ گلزار ہے | نہیں بلکہ یوسف کا بازار ہے
چلی ہیں حسینان آفاق ہو | انمیں دل و جان عشاق ہو
بہت ہم نے پی پی کے خون جگر | لیئے کان سینے سے لعل و گہر
یہ ہے ایک افسانۂ خوش بیاں | فزا اینده فرحت دوستاں
فصیح البیاں اہل ہندوستاں | سواء ان کے ہیں جو فصیح البیاں
نہ ممکن ہے اون سے کردں ہمسری | مگر اور ہندی ہیں کتنی مثنوی
زن و مرد سے ہوں جو منصف صفات | میری مثنوی کو لگا ان کے سات
مضامین و بندش کتیں لاکلام | کریں غور تو ہو ظاہر تمام
جو کوئی شخص ہو علم سے بہرہ ور | ہے دیوان لکھنا اوسے سہل تر
مگر مثنوی کی ہے دقت بڑی | وہی جانے جس پر ہو محنت پڑی
حسن مرد میدان فضل و کمال | لکھا مثنوی میں ہے یوں حسب حال
جوانی میں جب بن گیا ہوں میں پیر | تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
جو یوں مثنوی سے ہو مردوں کا حال | تو پھر عورتوں کا ہے کیا مجال
اب اے منصفو سامعو ناظرین | مشقت میری ہو نہ ضایع کہیں

---

[۵] دکھنی عورت ہونے کی وجہ سے "نے" کا استعمال غلط کیا ہے۔

خطا کو دلوں میں چھپا لیجئے کرم میرے احوال پر کیجئے

گلشن مہوشان کے مختلف کردار یہ ہیں۔

(۱) جواہر شاہ (شاہ روم)

(۲) مہ لقا محل جواہر شاہ

(۳) فیروز شاہ (شاہ اندر) شاہ جنات

(۴) فرخ لقا۔ محل فیروز شاہ۔

(۵) شہزادہ لال بادشاہ۔ فرزند جواہر شاہ روم یہی قصہ کا ہیرو ہے۔ اور یہ فرزند لطفی ہے فیروز شاہ جن کا۔

(۶) شہزادہ دادگر فرزند فیروز شاہ (اور فرزند لطفی جواہر شاہ)

(۷) جہانبان شاہ (شاہ مصر)

(۸) جہاں ضرب۔ دختر جہانبان شاہ (ہیروئن) معشوق مردوں کے لباس میں۔

(۹) نازک بدن پری (دایۂ جہاں ضرب)

(۱۰) احسن الدین درویش (جن کے اجداد دمشق کے بادشاہ تھے) پدر لطفی جہاں ضرب جنھوں نے جہاں ضرب کو تعلیم و تربیت دی اور دمشق کے تخت پر جہاں ضرب کو بٹھایا۔

(۱۱) جہاں رستم فرزند شاہ یمن۔ (جہاں ضرب کا منہ بولا بھائی جو شہ پہلوان تھا)

(۱۲) روح افزا۔ دختر شہ پری اور معشوقۂ شہزادہ دادگر

(۱۳) زہرہ جبیں۔ والدہ روح افزا (شہ پری)

(۱۴) جہاں قلبانہ، مشاطہ، جو جوگن کا بھیس لے کر کل کے گھوڑے پر سوار ہو کر بین کاندھے پر رکھ کر شہ پری کے پاس جاتی ہے اور روح افزا کی تصویر موم پر نقش کر کے دانتوں میں چھپا کر لاتی ہے اور باوجود سخت نگرانی اور جامہ تلاشی کے راز فاش نہیں ہونے دیتی۔

(۱۵) سکندر روزگار عرف ابن الفقیر۔ جہاں ضرب کا فرزند دلبند

(۱۶) انجم افروز۔ وزیر جواہر شہ۔

(۱۷) مشتری وزیر فیروز شہ۔

(۱۸) شاہ دیو۔ ایک سرکش دیو پر لعل شاہ کا غلبہ اور طلسماتی محلات پر لعل شہ کا قبضہ۔
قصہ کا خلاصہ یہ ہے۔
جواہر شاہ کو اولاد کا غم | ایک درویش کامل کا مشورہ، صحرا میں باغ کا قیام۔ راگ ورنگ، فیروز شاہ نامی ایک پریوں کے بادشاہ سے ملاقات۔ بھائی پیارہ، شاہ جی کو بھی اولاد کا غم ہونا خواب دیکھنا اور سات سمندر پار سے ایک پھل لانا۔ پہلے جواہر شاہ اور مہ لقا کو کھلانا اوس کے بعد خود اور اپنی محل فرخ لقا کو کھلانا اولاد کا ہونا۔ شہزادوں کا باہمی تبادلہ۔ کل کے گھوڑے کے ذریعہ شہزادوں کی آمد و رفت۔
لعل شہزادہ اور دادگر کی تعلیم و تربیت۔ فنون انسانی اور طلسماتی کی تعلیم اور مہارت جہانبان شاہ یعنی مصر کے بادشاہ کو اولاد کا غم۔ ایک روز صبح میں گھسیارہ کی صورت دیکھنا۔ منحوس سمجھ کر قتل کا حکم دینا۔ گھسیارہ کی تقدید کہ مجھ سے بڑھ کر کون منحوس ہے کہ تجھ کو اولاد نہیں، رہائی، بادشاہ کا تخت چھوڑ دینا۔ فقیر احسن الدین سے ملاقات جنگل میں، اولاد کی بشارت۔ لڑکی ہونے سے بادشاہ کا ملول نہ ہونا۔ شکر کرنا۔ جہاں مزب نام رکھنا۔ فقیر سے معاہدہ۔ لڑکی کو لڑکا مشہور کرنا۔ ساتویں سال فقیر کے حوالہ کر دینا۔ فقیر کا پرورش کرنا اور تعلیم تربیت، جہاں مزب کو فقیر کا تخت و مشق دینا۔ شہرہ سخاوت و شجاعت۔ لعل شہزادہ کا رشک وحسد، باہمی جنگ و جدال، جہلت جنگ۔ نازکبدن کا لعل شاہ کو جہاں مزب پر طلسماتی باغ میں اصل تصویر کے ذریعہ عاشق کر دینا لعل شہ کی جہاں مزب کے پاس آمد و رفت۔ جہاں مزب کا چیں بچیں ہونا اور یہ سمجھنا کہ میں در اصل شہزادہ ہوں۔ پیام شادی۔ احسن الدین کا کمال عارفانہ، جہانبان شاہ سے راز معلوم کرانا۔ رضامندی۔ طلسماتی محل میں طلسماتی طور پر شادی۔ رسم گلپوشی۔ طلسم کا ٹوٹ جانا۔ شیش محل میں جہاں مزب کا نسوانی لباس اور زیور سے خود کو آراستہ دیکھ کر نوچنا، کپڑے پھاڑنا مگر طلسم پر غلبہ نہ پا سکنا۔ شاہ دیو ایک سرکش دیو سے جہاں مزب اور لعل شہ کا مقابلہ۔ فتح اس دیو کے طلسمی محلات میں بہت سے طلسمی تصاویر عورتوں کی مردوں کے لباس میں، جہاں مزب کا پریشان ہو کر خود پر شبہ کرنا اور لعل شہ کا طلسم سمجھ کر اوس کو برا بھلا کہنا۔ غرض اس طرح بتدریج جہاں مزب کو اصل فطرت سے واقف کرانا۔ خوش دامن اور شوہر کی خدمت اور بزرگوں کے آداب کی تعلیم اور رخصتی۔ زن و شوہر کی محبت۔ لعل شہ کی عقد ثانی کی خواہش، اور یہ سبق کہ عورت مرد پر کس طرح قابو حاصل کر سکتی ہے وغیرہ جس کے اقتباسات مختصر تبصرہ کے ساتھ ساتھ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

اثیمہ نے مثنوی زیر تنقید میں جا بجا فطرت نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ اخلاقی تمدنی اور مذہبی نقطۂ نظر سے مثنوی بہت مفید ہے۔ قصہ بلحاظ تناسب اچھا ہے۔ اور استعارے اور تشبیہات فطری اور دُور از قیاس نہیں۔ زبان دکھنی عورتوں کی مروجہ روزمرہ ہے۔ مگر صاف ہے اور مدراس جیسے دُور دراز مقام میں ایک عورت کا اسی نود سال پیشتر ایسی فصیح اردو لکھنا قابل داد ہے رسم و رواج بڑی صحت کے ساتھ لکھی ہیں۔ قصہ کا ہر جزو اخلاقی و تمدنی اثر رکھتا ہے۔ نیز مذہبی نکتے بھی چبھتے ہوئے ہیں جو پڑھنے والے کو صحیح راستہ پر لگا دیتے ہیں۔ حمد و نعت منقبت صحابہ بھی ہے مگر اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے البتہ تعریف سخن باکمال شعراء کے نگر کی ہے۔ خوب شعر کہے ہیں :-

پلا ساقیا اب سخن کی شراب	پیالے میں ادراک کے بھر شتاب
معانی کے دریا کا لولوئے تر	سخن کان دل کا ہے روشن گہر
سخن ہے فصاحت کے گل کی بہار	سخن بلبل باغ فطرت شعار
سخن آفتاب سپہر ذکا	سخن نغمۂ سالکان ہدیٰ

مدح عظیم جاہ میں چودہ بیت لکھے ہیں۔

فلک رُتبہ نواب کشور ستاں	رئیس جہاں محمد ہندوستاں
سپہر امارت کا مہر شرف	لقب اس کا ہے جلوہ گر ہر طرف
وہی لائق رتبہ سروری	وہی زینت مسند انوری

وجہ تالیف :- مثنوی خاص طور پر عورتوں کے لئے والدین کے اصرار اور خواہش سے لکھی گئی۔ جو بہ نسبت دوسری مثنویوں کے جو مرد شعراء نے لکھی ہیں نحویت سے بالکل پاک ہے چنانچہ لکھا ہے۔

کہے ہم کو اے لایق آفریں	او اے نور چشمی سعادت قریں
زنوں میں تو نے فن یہ تازہ کیا	حسینوں کے عارض پہ غازہ کیا
مرے حکم پر جو چہئے دوستاں	تو سرسبز کی دل کشا داستاں
منور ہے یک اس میں الفت کدہ	سکندر کا جیسا عبادت کدہ
ہیں سیر سے اس کے مقرون کر	بھی عورات کو شاد و ممنون کر
فقط دیکھنے عورتوں کے لئے	بہت بار خاطر پہ ہم نے لئے
پسندیدہ جس کو ہو پڑھ لیجئے	ہو گر ناپسندیدہ تو رکھ دیجئے

داستان اول - جواہر شاہ شاہ روم کو اولاد کا غم تھا۔ فقیری کو ترجیح دی۔ انجم افروز وزیر نے
تسلی دی اور کہا کہ خدا سے اپنا مقصد طلب کر دیر یا جلد حاصل ہوگا۔ جنگل میں ایک درویش کامل
سے ملاقات ہوئی کہا کہ صحرا میں ایک باغ ترتیب دیا جائے تو مقصد حاصل ہوگا۔ جنوں کے بادشاہ
سے وہاں بھائی چارہ ہوگیا حتی کہ اس نے تاج اپنا شاہ جن کے سر پر اور شاہ جن کا اپنے سر پر رکھا
وزیر نے آداب شاہی اور حفظ مراتب کے ساتھ شربت پہلے اپنے آقا ولی نعمت کو پلایا اوس
کے بعد شاہ جن کو دیا۔ شاہ جنات باوجود درد و غم کے اپنی ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔ بادشاہ
جشن مناتا ہے مگر غم تازہ ہی رہتا ہے جو ایک فطری چیز ہے چناں چہ کہتی ہے ؎

صدا راگ کی یوں تھی غمناک پر — کہ نوکِ سناں سینۂ چاک پر

شاہ جن کا باوجود اسی غم میں مبتلا ہونے کے دوسرے کے غم کو ترجیح دینا اور یہ کہنا کہ
میں تیرے درد کا علاج پہلے کروں گا کمال ایثار اور استقلال و اولوالعزمی کی اعلیٰ مثال ہے
نیز جواہر شہ کا فیروز کو بعد ضیافت، گھر چلنے کے لئے کہنا اور اس کا یہ جواب دینا کہ جب
تک بھائی تجھ کو اولاد نہ ہو میں نہیں آؤں گا فطرت نگاری پر دال ہے ؎

کہا اس نے ہرگز نہ آؤں گا میں — مگر جب ہو اولاد حضرت کے تئیں
یہ روضے میں جب تک ملاقی رہیں — شراب محبت کے ساقی رہیں
بہت اس کی خاطر کہا جستجو — زباں پر تھی دائم وہی گفتگو
بہت اس نے کوشش پہ باندھی کمر — کبھی الٹا دیا دفتر بحر و بر

میر حسن کے یہاں انسانی کوشش ناکام ہوتی ہے۔ مگر یہاں جناتی بھی غرض جن و انس
سب عاجز ہیں۔ شاہ جن اشک باری کرتا ہے۔ آخر کار خواب میں ایک پھل دیکھتا ہے۔
اور اوس کو لاتا ہے خود نہیں کھاتا بلکہ پہلے بھائی کو کھلاتا ہے اور میاں بیوی اوس کا شکر
ادا کرکے پھل کھاتے ہیں اولاد ہوتی ہے تو اوس کو پہلے بھائی کی گود میں ڈال دیتے ہیں جو بڑی
ہمت کا کام ہے اور محبت و خلوص کی اعلیٰ مثال ہے۔ بعد ولادت فرزند منجموں کا آنا
اور یہ پیش گوئی کرنا کہ معشوق مردوں کے بھیس میں پھرے گا تو اس کا یہ کہہ کر ٹال دینا کہ
منجم تو بکا کرتے ہیں، اور انعام و جاگیر دے کر رخصت کر دینا عین عقیدہ اسلامی کے
مطابق ہے، میر حسن نے بھی اس چیز کو ملحوظ رکھا ہے مگر یہ کہا ہے کہ اس سے بادشاہ کو کچھ
خوشی اور کچھ الم ہوا۔ مگر انجمہ نے اس کو ان کی ہمیشہ کی ہوائی باتوں پر محمول کر کے ٹال دیا اور رسم
و رواج کے موافق انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا، انجمہ نے یہاں عورتوں کے لئے

ایک بڑا اچھا سبق دیا ہے وہ یہ کہ گل پوشی کے انتظام کو اوس نے اپنی منہ بولی بہن کے سپرد کر دیا۔ اور اور نومولود کو فوراً اوس کے آغوش میں دے دیا ہے، مگر دونوں کو زچہ بنا کر پٹی سر سے بندھوانا کچھ تصنع معلوم ہوتا ہے، غرض، نذریں، مبارک باد، بزم نشاط، منجموں کا آنا وغیرہ ہندستانی رسومات کے مطابق ہے۔ میر حسن نے بھی اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ پھر شاہ جنات فیروزشاہ کے گھر لڑکا ہونا اور اس کا اس لڑکے کو جواہر شاہ کے حوالہ کر دینا اور یہ کہنا کہ دو گھڑی یہاں رہو، اور دو گھڑی چچا کے پاس، اخوت باہمی کی اچھی مثال ہے۔ اس اخوت باہمی کو قصہ ختم ہونے تک اس خوبی سے نبھایا ہے کہ رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں پایا، گویا ایک موتی کی لڑی ہے کہ پروتی چلی گئی ہے پھر دونوں شہزادوں میں اتفاق و اتحاد زبردست کردار کے حامل ہیں۔

<u>لعل شاہ اور دادگر کی تعلیم و تربیت</u> اس میں بھی دو پہلو رکھے ہیں ایک انسانی علوم اور دوسرا طلسماتی طلسماتی علوم کا تعلق جنات اور پریوں سے ہے، مذہبی یعنی تعلیم قرآن وغیرہ کا بھی لزوم ہے۔ اور ہم سبق بلحاظ مراتب وزراء کے لڑکے بنائے جاتے ہیں۔

<u>لال شہ کی تخت نشینی اور سواری</u> اس میں اکثیمہ نے سیاسی مصلحت یہ رکھی ہے کہ چونکہ لعل شہ ایک انسان ہے جنات نہیں، مگر چونکہ اب وہ فیروزشاہ۔ شاہ اجنہ کا بیٹا بنایا گیا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کا رعب و داب جنات اور پریوں پر قائم رکھنے کے لئے اس طرح سواری نکالی جائے کہ جنوں پریوں اور دیوؤں پر خوف طاری رہے اور آئندہ اس کے محکوم رہیں، چنانچہ کہتی ہے ؎

پری زاد فیروز کے حکم پر   بہ شان و تجمل بہ صد کرّ و فر
چلا فوج لے اپنی حشمت کے ساتھ   شہ روم نے جانب دست راست
نبی جان کی لے فوج فیروزشاہ   چلا دست چپ پر بصد عز و جاہ
جو اس طرح سے شاہ والا گہر   چلا لعل کو لے کے با کر و فر
یہی اس کا منشا تھا ہر آن میں   پڑے رعب اس کا نبی جان میں

غرض تخت نشینی کے بعد شاہ زادہ کو نصیحت کی کہ عدل و سخاوت کرنا اور قیامت کا خوف کرتے رہنا، جو جہانبانی اور حکمرانی کی اصل بنیاد ہے۔

میر حسن نے بے نظیر کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ سیر سے واپس آنے کے بعد بے نظیر کوٹھے پر سو رہا تھا تو اوس کو پری اڑا کر لے گئی، اس وقت پری کا مکالمہ قابل تعریف ہے، مگر اکثیمہ نے بھی لعل شہ کو جہاں ضرب پر عاشق کرانے کی عجیب تدبیر کی ہے جو ڈرامائی ہے

میر حسن نے کہا تھا ؎

خدا جانے تو کون میں کون ہوں　　　مجھے بھی تعجب ہے میں کیا کہوں
پر اب تو تو مہمان ہے میرے گھر　　　لے آئے ہیں تجھ کو قضا و قدر
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں　　　پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اثیمہ کا پلاٹ یہ ہے کہ نازک بدن پری لعل شہ کے محل کے پاس پکارتی ہے کہ ہرن آیا ہرن؛ اور لعل شہ تیر و کمان لے کر محل سے دوڑتا ہوا آتا ہے، اس وقت نازک بدن خود ہرن جاتی ہے اور اوس کو اس قدر دوڑاتی ہے کہ وہ پیاس سے بیتاب ہوجاتا ہے، اور خو غائب ہوجاتی ہے اس طرح لعل شہ کو ایک طلسمی باغ میں لے جاتی ہے جہاں لعل شہ اور جہاں زیب کی تصویریں رکھی ہوتی ہیں، یہاں جہاں زیب کی اصل نسوانی صورت کو بے نقاب کرتی ہے، یہ سب کچھ جنگ کے وقفہ میں ہوتا ہے اس طرح لعل شہ، جہاں زیب پر فریفتہ ہوجاتا ہے چنانچہ اس کا مرقع اس طرح پیش کیا ہے ؎

ہرن آپ ہی بن کے نازک بدن　　　نظر دور سے آئی ہے سیمتن
شتابی سے گھوڑے پہ ہو کے سوار　　　چلا اوس طرف زور وہ کامگار
ہرن بھی لگی بھرنے بس چوکڑی　　　شہ لعل کو ساتھ لے کر چلی
طلسمات سے جو بچھایا تھا دام　　　وہاں لاکے گم ہوگئی والسلام
ہرن تو نہ آیا ہے اوس کو نظر　　　پہ تھا غلبۂ تشنگی خوب تر
وہ جب تشنگی دور کرنے چلا　　　نظر باغ آیا بہت دل کشا
کہا دل میں بے شک ارم ہے یہی　　　پھر اس میں نظر آگیا حوض بھی
بھرا اوس میں تھا شہد و شیر و گلاب　　　ہوا سیر وہ شاہ دانش مآب
مصفٰی تھا ایوان یک پر ضیا　　　شہ لعل جب اوس میں داخل ہوا
تو دیکھا بنا ہے زر لولوئے تر　　　تصاویر ہیں تخت یاقوت پر
تھی تصویر یک اپنی ہی ہو بہو　　　اور ایک اپنے ہمشکل تھی ہو بہو
لکھا نام اوس پر جہاں زیب شاہ　　　کہ بے شبہ عورت ہے وہ رشکِ ماہ
فدا لعل تصویر پر ہوگیا　　　کہا کون ہم دو کو باہم کیا
گلے سے لیا اپنے لعلوں کا ہار　　　گلوگیر تصویر کر ایک بار
دوشالہ اڑا دے کے پھر زود تر　　　بلانے چلا بھائی کو زود تر

غرض جب وہ بھائی کو لے کر واپس آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ تو وہ باغ ہے اور نہ تصویر بھائی اوس کو یہ کہتا ہے کہ جہاں مزب، شہ پہلوان ہے وہ کہیں عورت بھی ہو سکتا ہے؟ ارے یہ سب تیرا خواب و خیال ہے۔

جہاں مزب سے ملاقات اور باہمی جنگ آزمائی جہاں مزب کی جہاں رستم سے اتفاق سے جنگل میں ملاقات ہوئی، جہاں رستم نے اپنا قصہ بیان کیا کہ میرے باپ نے میری شادی کرنی چاہی مگر میں نے کہا کہ میں ہفت اقلیم کی سیر کر کے شہ پہلوانوں سے مل کر زور آمائی کروں گا جب کامیاب ہوں گا تو شادی کروں گا، اس طرح جہاں مزب نے متاثر ہو کر جہاں رستم کو اپنا بھائی بنایا، لعل شاہ، جہاں مزب اور دادگر کے ملکوں کی سرحدوں پر ایک میدان میں آراستہ کر کے خیمے اور فرش اطلس کے بچھائے گئے۔ اور جہاں رستم نے سلاطین کو دعوت دی، چھوٹے رؤساء کو بھی اجازت دی گئی، دیو کے ذریعہ ہر ایک سلطان کے تخت لائے گئے، جہاں مزب کا تخت پہلے رکھا گیا اوس کے بعد سلسلہ سے لعل شاہ، اُس کے بعد رستم، کا، سب رؤسا آئے، حکمت یہ کی گئی کہ سب کے بعد جہاں مزب آئے اور سب تعظیم بجالائیں، مگر لعل شاہ سے چوں کہ جہاں مزب منسوب تھی اور وہ اس قصہ کا ہیرو ہے، اس کی نشست جہاں مزب کے بعد رکھی گئی کہ وہ آئے اور پورا دربار تعظیم بجالائے۔

بہرحال رستم کو دوسرے روز لعل شاہ اور دادگر سے تعارف ہوا اور باہم کھیل کود کی ٹھہری، پہلے جہاں مزب اور جہاں رستم کا مقابلہ ہوا مگر برابر رہے، جہاں مزب کی بڑی تعریف ہوئی۔ مگر رستم، کے لعل شہ کے مقابلہ میں پیر اکھڑ گئے۔ زور کلام ملاحظہ ہو ؎

کیا کشتی یک رستم شیر نر — پسینہ ہوا اس کے سب جسم پر
نہیں لعل کو وہ اٹھا سکتا تھا — رجوع اس طرف لعل نے جب کیا
کف دست پر لے کے رستم کتئیں — پھرا سر پہ، لاکر رکھا بر زمیں
دوبارا جو رستم نے گانٹھا ہے گرز — بڑے زور سے جیکہ جھاڑا ہے گرز
وہیں چھین کر لعل مارا جہاں — زمیں پھٹ اڑی، تھرتا آسماں

لعل شہ سے جنگ کی وجوہات غرض رستم نے ہار مان لی، مگر جہاں مزب کو اس کا بہت صدمہ ہوا اور لعل شہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، لعل شہ کے سپاہیوں نے جہاں مزب کے شب خون اور غضب سے ڈر کر لعل شہ کو صلح کا مشورہ دیا، اور لعل شہ نے فقیر احسن الدین سے مل کر صلح کر لی جہاں مزب کو یہ سمجھا کر کہ ؎

فقیر اس کو فرمائے بابا مرے — اگر سو برس جنگ اس سے کرے
نہ ہووے کبھو اس پہ تو فتح یاب — بھی مر جاوے شمشیر سر پر شتاب الخ

صلح کے بعد لعل شہ، فقیر احسن الدین کے پاس اپنی معشوقہ جہاں مزب کی خاطر سے بطور کورٹ شپ آمد و رفت رہی، اثیمہ نے پہلی مرتبہ، لعل شہ کے فاخرانہ لباس میں آمد کی ایک تصویر پیش کی ہے جو یہ ہے:-

لعل شہ کی آمد و رفت جہاں مزب کے پاس

پس از لعل وارد ہوا خوش اساس — بہی چشم پر نور پر تھا لباس
مکلل شہانی تھا نیمہ عیاں — طرحدار تن پر زر آب رواں
کمربند باندھا تھا یک پانچ کا — گلوگیر تھا نازک بے بہا
کمر بیچ تھا پیش قبض یک لگا — جسے دیکھ دارا کا دل آب تھا
لب لعل پر تھا مسّوں کا بہار — پڑی خاتم انگشت میں آب دار
وہ حسن و جوانی وہ چہرے کا نور — شجاعت اور سلطنت کا غرور
پس پشت تھے دست بستہ وزیر — چلا آگے وہ زیب تاج و سریر
یہ کچھ پیش بینی سے وہ خوش صفات — پدر کے پری زاد لایا تھا سات
مگر خفیہ ان کو تھا رکھا ہوا — جب اس طور سے پیش قدمی کیا
پڑا اس کا دربار پر رعب و داب — دلاں رستموں کے ہوئے آب آب

سب نے تعظیم و تکریم کی مگر جہاں مزب نے پرواہ بھی نہ کی۔ لعل شہ بار بار اوس کے چہرے کو دیکھتا تھا مگر کوئی بات اوس میں بہ ظاہر صنف نازک کی نہ پاتا۔ مگر اوس کو وہ تصویر جو نازک بدن نے طلسمی باغ میں دکھلائی تھی یاد آجاتی اور تڑپ کے رہ جاتا تھا۔

انسان کو عشق دو طریقہ پر ہو سکتا ہے ایک تو دیکھ کر فی الفور، دوسرے اوس کے گفتار و کردار اور حسن کی شہرت کو سن کر۔ یورپ میں جہاں پردہ نہیں ہے ایسے مواقع بہت ہیں مگر ہندستان میں نوشہ کا لڑکی کو دیکھنا سخت معیوب ہے البتہ ایک تیسری چیز بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی تصویر کو دیکھ کر عاشق ہو جائے، مگر اس کا بھی رواج نہیں ہے۔ ایسی صورتیں شاذ ہی ہیں تاہم اگر تصویر پر نظر پڑ جائے تو یہ کوئی جرم نہیں غرض اثیمہ نے اس موقعہ پر تصویر سے کام لیا ہے، اور جہاں عورت کی اصل حقیقت کو بے نقاب کیا ہے، اور اثیمہ کا معشوق مردوں کے بھیس میں علانیہ پھرتا ہے، مگر معشوق اس سے بے خبر ہے کہ وہ در اصل عورت ہے۔ اس طرح اثیمہ نے کورٹ شپ

کا لطف پیدا کیا ہے، عاشق و معشوق ایک دوسرے کو دیکھ کر فریفتہ اور وارفتہ نہیں ہو جاتے،
اور کورٹ شپ کو اس قصّہ میں اس خوبی کے ساتھ نبھایا ہے جو انجمہ کا ہی حصّہ ہے جس میں معشوق
و عاشق کے مضبوط کردار اور انتظار وصل کی پوری شان موجود ہے۔ اور اس میں معشوق کا کردار
بہ نسبت عاشق کے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے، یعنی عاشق ہرچند کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی معشوق
سے ملے اور باہمی میل کا موقعہ ملے مگر وہ اس کو پاس پھٹکنے نہیں دیتی، برخلاف اس کے میر حسن کا
معشوق بھی ایک ایشیائی ہے، اور حقیقت میں میر صاحب نے عورت کی فطرت کو ظاہر کیا ہے
چنانچہ ایک دوشیزہ کسی مرد سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی، اور شرم و حجاب سے پسینہ پسینہ
ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بدر منیر اور بے نظیر کا منظر ملاحظہ ہو ؎

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے — بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے — سجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن — کہ جوں شبنم آلود ہو یاسمن

مگر انجمہ کی نظر میں اس تخیل نے عورت کو بالکل کم ہمّت اور پست بنادیا ہے۔ انجمہ کا
معشوق مردوں کے لباس میں ہے، گویا وہ ہمّت و مردانگی کا آئینہ دار ہے، وہ شرم و
حجاب سے پسینہ پسینہ نہیں ہوتا بلکہ بڑے آن بان کے ساتھ بے باکی سے مقابلہ کرتا ہے، اور
اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرتا ہے۔ اور تیوری میں بل ڈال کر دکھنی زبان میں کہتا ہے ؎

تمھیں روز کیوں آتے ہو ہر گھڑی — کہ شاید اجل ہے گی سر پر کھڑی

باوجود اس کے فطرت نسوانی نہیں بدل سکتی، محبّت پختہ ہوتی جاتی ہے، چنانچہ جب لعل شہ
اس کو سویا ہوا پاکر پنکھا جھلتا ہے اور وہ بیدار ہو جاتی ہے تو غصّہ میں کٹار بھونک دیتی ہے۔ مگر
بعد میں پشیمان ہوتی ہے چنانچہ انجمہ کہتی ہے ؎

جہاں ضرب غصّہ سے ہو منفعل — ہوا لطف سے لعل کے بس خجل
کہا کیا خطا ہو گئی آہ آہ! — جو سلطان شاہوں کو کی میں تباہ
اگر آج کچھ اس کو ہووے ضرر — میں عالم میں ہوں رو سیہ سربسر
بہت آپ میں آپ کھا پیچ و تاب — کہا ایک جاسوس بلوا شتاب
سنا ہوں کہیں لعل ضرب کٹار — جو کھایا ہے اس وجہ سے بے قرار
تو جا جلد مخفی سے آ دیکھ کر — مجھے اس کی حالت سے دیجئے خبر

غرض وہ یہ ظاہر نہیں کرتی کہ میں نے خود اس کو زخمی کیا ہے اور پے در پے سات

جاسوسوں کو بھیج کر دریافت کرتی ہے اپنی محبت کو لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتی، اور روح لعل شہ کو بڑا بادشاہ تسلیم کرتی ہے۔

فقیر احسن الدین جہاں عزب کے منہ بولے باپ نے ایک مرتبہ لعل شہ کو بائیں جانب بٹھایا اور جہاں عزب کو دائیں جانب تو وہ غصہ میں اٹھ کھڑی ہوئی، اور ایک خاص معشوقانہ ادا کے ساتھ اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہوئی کہ لعل شہ اس پر عاشق ہو گیا، اس واقعہ کو اثیمہ نے اس طرح لکھا ہے۔ مگر اشعار میں کچھ فارسیت غالب ہے ؎

چلا تشنگیں وہاں سے یک بار ہو ۔۔۔ بہت جلد گھوڑے پہ اسوار ہو
قضا اصل ہر اس کو تب سے گئی ۔۔۔ ہوا جس سے کہ مبتلا مدعی
وہ برخاست اوس کی وہ چین جبیں ۔۔۔ تکبر سے اسوار ہونا وہیں
نظر آئی گویا کوئی دلربا ۔۔۔ پے قتل عاشق ہے عشوہ نما

اسی قسم کی ادا کو میر حسن نے اس طرح لکھا ہے ؎

غرض وہ مڑی جب دکھا اپنے بال ۔۔۔ تو گویا کہ مارا محبت کا جال
ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی ۔۔۔ چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی
غضب منہ پہ ظاہر دلے دل میں چاہ ۔۔۔ نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں ۔۔۔ میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں ۔۔۔ چھپی جا کے رہنے وہ دالان میں

غرض اثیمہ کا کمال یہ ہے کہ وہ عاشق معشوق کو انتظار میں رکھتی ہے اور کوئی نامطبوع اور خلاف تہذیب واقعہ کو آنے نہیں دیتی، اور واقعہ تو یہ ہے کہ اسی چیز کی مثنوی سحرالبیان میں کمی ہے، چنانچہ شمس العلماء امداد امام اثر کی یہ رائے ہے کہ "مثنوی میر حسن میں سب سے نامطبوع داستان بے نظیر کے آنے اور باہم صحبت کرنے کی ہے کاش میر حسن اس داستان کو داخل مثنوی نہ کئے ہوتے اس طرح بیباکانہ وصل کو رقم نہ کرتے زنہار کسی مہذب ملک میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی صحبت کے بعد کوئی ناکتخدا اپنے عاشق سے ہم آغوش ہونا گوارا کر سکے، اسلامی شہزادے اور شہزادی کی کہانی ہے۔ وصل قبل از نکاح چہ معنی دارد، یہ طور زنان بازاری کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے۔ خوبی تو یہ تھی کہ میر حسن انتظار وصل کو دکھاتے اور محبت کی پختگی کی تدریجی حالتوں کو بیان کرتے جس سے اس قصہ کی وقعت بڑھ جاتی، اس فوری وصل سے تو بدر منیر و بے نظیر کو بے وقر کر دیا، اگر یہ دکھایا جاتا کہ بے نظیر روز آیا کرتا تھا اور بدر منیر کی صحبت میں یک پہر رہا کرتا تھا اور اس کا

موقعہ ڈھونڈتا تھا کہ کسی طرح پری کی گرفتاری سے مخلصی حاصل کر کے بدر منیر سے دستور ملکی کے مطابق مواصلت کی صورت پیدا کرے تو یہ داستان مطبوع صورت ہو جاتی، روزانہ کی حاضری کورٹ شپ کا رنگ پیدا کرتی گو خلاف رواج ہے انتظار میں زیادہ مزہ ہے، وصل کے بیان تک بڑی لغزش مصنف سے ظہور میں آئی۔"

غرض ان حقائق کی روشنی میں میری رائے ہے کہ سحرالبیان کے علاوہ جس قدر مثنویاں شعراء اہل کمال مثلاً دیا شنکر نسیم، سعادت یار خاں رنگین غلام علی ہر وغیرہ نے لکھی ہیں ان سب میں بلحاظ پلاٹ اشمیہ کو تفوق حاصل ہے اور رنگینیٔ بیان اور تسلسل مضمون میں کسی سے کم نہیں اور اس کی مثنوی اخلاقی کمزوریوں سے مبرا ہے۔

جہاں ضرب کا بیاہ | غرض شاہ فیروز نے جواہر شہ سے مشورہ کر کے جہاں ضرب کی نسبت لعل شہ سے کرنی چاہی، فقیر اور جہاں ضرب کو تزک و احتشام سے بلوایا، فقیر سے طلسم کے پردہ میں اصل واقعہ پوچھا کہ در اصل جہاں ضرب شہزادہ ہے یا شہزادی؛ پہلے تو فقیر نے تجاہل برتا، اوس کے بعد کہا کہ فقیروں سے پیوند کیسے ممکن ہے ماں باپ سے راز دریافت کرتا ہوں بالآخر شادی پر رضامند ہو جاتا ہے، ضدی لڑکی کا جس کی طبیعت میں مردانہ پن فطرت ثانی ہو گیا ہے طلسم کے پردہ میں رواج ملکی کے مطابق عقد ہو جاتا ہے لعل شہ پروانہ بنا رہتا ہے، مگر وہ اپنے بھولے پن سے یہی سمجھتی ہے کہ یہ مرد ہو سا آپس میں خوب چوگتی کھیلتے ہیں، جہاں رستم (منہ بولا بھائی) شادی کا راز فاش کرتا ہے، مگر وہ ہنسی ہنسی میں لال شہ کو بے وقوف بناتی ہے، غرض بتدریج کبھی اوس کو قیامت کا خوف دلا کر کبھی بالواسطہ طوطی سے کھلوا کر، نیز ایسے مناظر اور تصاویر جس میں عورتوں نے مردانہ پارٹ لیا ہو، دکھلا کر اوس کو اصل فطرت سے واقف کرایا جاتا ہے، پھر آخر میں لعل شہ فرضی بیمار طلسماتی طور پر بنتا ہے، حکیموں کے ذریعہ جہاں ضرب کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ خود اس کی تیمارداری کرے تو اچھا ہو گا، جہاں ضرب اوس کا سر زانو پر رکھ کر زار زار روتی ہے خود اپنے ہاتھ سے اوس کو دوا پلاتی اور کھانا کھلاتی ہے، اسی طرح خوش دامن بیمار ہو جاتی ہے اور جہاں ضرب اور لعل شہ دونوں مل کر ماں کی خدمت اور تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے ۔ اوس کے بعد وداع کی تقریب عمل میں آتی ہے۔

جشن شادی

پلا ساقی یک جام عناب رنگ تفکر کے عالم میں ہے دل بتنگ
نخلوں پر گلستاں میں پھولی بہار گلے میں ہے گل روکے گل کی بہار

سماں ایک کر مطرب خوش کمال قلم سے بھی نکلے ہے فرخندہ فال
کہا شاہ اندر سے فیروز شاہ شہ لعل کا سب وہ حال تباہ
لکھا رقعہ سلطان فرخندہ فال ہے در خدمت پیر صاحب کمال

محل نوشہانی طلسمات کا کہ سلطان اندر نے بھجوا دیا
وہ ایسا مصفا بہ نقش و نگار در و بام تھے بسکہ آئینہ دار
بچھا فرش مخمل کا تھا سب وہاں جواہر کے تھے اس پہ گلکاریاں
سجادہ صاحب سریر سپے جشن و تیاری دل پذیر
ہوا جب کہ سب کام کا بندوبست جہاں حزب کو خواب سے کرکے مست
کیا دست پریوں نے سہ کامگار لباس زنانی بھی زیور سنگھار
محل بیچ پریوں نے لا زود تر بٹھائیں جہاں حزب کو تخت پر
ددا اور دائی بھی نازک بدن یہی تین تھیں راز دار دلھن
دیے چھوڑ نزدیک پھر ان کو لا سحر جب گیا غلبہ اس خواب کا
جہاں حزب دیکھی ہے کر چشم وا محل لولوئی رشک آئینہ کا
نظر آپ آتی ہے ہر چار سو سنگھار اور زیور سے زن ہو بہو
نہ تھے گرچہ سوراخ پر کان میں نمودار زیور تھا پر کان میں
غضب سے لگی چاک کرنے لباس لگی توڑنے زیور خوش اساس
تھا جوڑا بھی زیور طلسمات سے ضرر اس کے کب پا سکے ہات سے
نہ وہ توڑنے سے کبھی ٹوٹ جائے کسی سے نہ جوڑا وہ نقصان پائے الخ
لباس عروسی میں جب لعل شاہ گیا اپنی دلھن پہ ہے یک نگاہ
ہوا اس کی الفت سے دل باختہ غشی کا سا یک حال بے ساختہ
یہ تھا عشق آموز کئی مہ و سال بجبراً لیا اس نے خود کو سنبھال
تشفی دیا اپنے پھر دل کے تئیں دو شالے کو سر سے نکالا وہیں
جہانبان کو تسلیم لایا بجا وہ کئی شہر دے جو ہر خزائن دیا
دئے ہیں سبھی حسب مقدور تب سلامی ملی اس کے لائق کی سب
جو وہ شاہ دلھن تھی زیب زماں کروں اس کی کیا رونمائی بیاں

رقم ہائے نادر کا انبار تھا
کہ لے جانے مشاطہ دشوار تھا

جواہر وہ ہر دو پہ اتنا نثار
ہوا ہفت رنگ اس طرح بے شمار

فقیروں کو خوانوں سے بھر بھر دئیے
غریبوں نے یکسر غنی ہو گئے

ملا شاہ جما احسن الدین سے
سلامی میں وہ اسم اعظم دئیے

ہوا حکم ان کا تو بس شہریار
اٹھا اپنی دلہن کو لے ایک بار

جو چنڈول میں لعل کے دے بٹھا
زن شاہ فیروز فرخ لقا

جہان مزب کی سی بہو جو ملی
بہ صد آرزو اس میں لے کر رہی

دئے چھوڑ لعلوں کی اس پہ لہر
کہے تو شفق میں ہے خور جلوہ گر

بہو کے چلا شاہ فیروز ساتھ
چلا دولہ کے جواہر افروز ساتھ

چلے کرتے چنڈول پر ایک بار
حمید اور وزرائے جوہر نثار

جہیزی تھے سب فوج آراستہ
جواہر میں ہو غرق دل خواستہ

کنیزوں، غلاماں، بہت ماہرو
ہر اک سیمبر، مُوکمر، خوش گلو

جواہر کے عماریاں کئے ہزار
شتر، فیل اور اسپ جوہر نگار

زر و دُر کے شاہی خزانے چلے
نوادر طلسمات خانے چلے

بہت زر خالص، بہت سیم خام
بہت لعل و الماس و گوہر تمام

بہت سے تھے صندوق لولوئے تر
بہت عطر و عنبر بہت مال و زر

چلے ساتھ لعلوں کے کئے تخت و تاج
پری زاد کو جن کی ہو احتیاج

غرض ان بکھوں سے ہوئے بے درنگ
گذر کرنے خشخاش کو راہ تنگ

کہا پیر تدبیر یوں برملا
شتابی پری زاد کے تئیں بلا

ہوا پر تمامی روانہ کیا
جہاں ایک گویا کہ ہرہ دیا

ادہر شوکت نو شہانی رواں
ادہر سب جہیز شہانی رواں

بیاں کرنے سب اس کا یارا نہیں
بجز کہنے دل کو گوارا نہیں

اسی یک سخن پہ کروں اکتفا
اگٗ شاہ اندر بھی تھا دیکھتا

جلوہ کی رسم | غرض اس جشن شادی میں جلوہ کی رسم جو بالکل ہندوستانی ہے اوس کی اثیمہ نے خوب تصویر کھینچی ہے ۔

وہ خوابیدہ چشم اور ہنسوڑ بیٹھنا   فدا جس پہ تھی دیکھو شرم و حیا
وہ رنگ حنا چست سو ہا لباس   وہ سنگھار و زیور وہ پھولوں کی باس
بھی تھا سُرخ جوڑے پہ عطر سہاگ   بھڑک کر اٹھی تھی حسن طلعت کی آگ
وہ زلف معنبر کی تھی خوشبو بہار   بہی جوں مہ پہ ہالے تھے سہرے کے تار
پکڑ پردۂ لولوی درمیاں   کئی رسم مشاطہ اس کی وہاں
نکالا ہے جب درمیاں سے حجاب   چنا کر نبات اس نے اس دم شتاب
لطافت سے جب منہ دکھانے لگی   تو نوشہ پہ احساں جتانے لگی

شب عروسی

بساشاداں وہ دلھن کی طرف   چلا مثل بلبل کے گلشن طرف
جو دیکھا کہ خلوت ہے آراستہ   منور فلک سے بھی پیراستہ
چھپر کھٹ تھا لعلوں کا جلوہ کناں   مہ و مہر کی جیسے جا ہے قران
وہ مہر جہاں نوشۂ ذی شرف   کیا اس نے گھونگھٹ کو سب طرف
لگا کرنے نظارا ارمان سے   فدا اس پہ ہوتا تھا سو جان سے
ہنوز اس کے دیکھے سے سیری نگر   نتھی اپنے میں باجے ہیں دوپہر

غرض لعل شاہ پروانہ بنا رہتا ہے مگر جہاں مزب چوں کہ ابھی نابالغ ہے اس لئے اس کو جلوۂ محبوب میں محو رکھتی ہے اور صبح ہو جاتی ہے گویا کہ

صبح کیا آئی قیامت آگئی

اثیمہ نے تمدنی اور اخلاقی سبق دئے ہیں جو اس مثنوی کا اہم جزو ہے مثلاً عورتوں کو سوکن سے جلاپا ہوتا ہے، مگر جہاں مزب سوکن سے خوش ہوتی ہے اور شوہر کی مرضی پر اپنے تعیش کو قربان کر دیتی ہے۔ لعل شہ حسین سے حسین عورتوں کی تصاویر طلسماتی محلات و باغات کی سیر کے سلسلہ میں لاکر جہاں مزب کو دکھلاتا ہے وہ بجائے رنج کے خوش ہوتی ہے اور لعل شہ کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ اپنا بیاہ کرلیں بلکہ میں خود بیاہ کر کے لاؤں گی اور اس کو اپنی لطفی بہن بناؤں گی، اور اس ماہ پارہ کی تصویر کو لعل شہ کے تخت پر منقش کر دیتی ہے۔ جہاں مزب کی ادا سے وہ خوش ہوتا ہے اور اس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر کسی دوسری کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرے

آثمہ نے لعل شہ اور جہاں حزب کا مکالمہ اس طرح نقل کیا ہے۔

لعل شاہ ؎

ترے موئے سر پہ سے ایسے ہزار	ہر اک آن میں میں کر دوں گا نثار

جہاں حزب ؎

جہاں حزب تصویر ہاتوں میں لے	کہی شاہ لایق کا جوڑا تیرے
بہ صد لطف بیاہ اوس کو کرلاؤں گی	بھی لطفی بہن اپنی بنواؤں گی

لعل شہ ؎

دیا شاہ قسمیں کہ ایسا نہ کر	میں دوں ورنہ پھونک اسکتیں زود تر
جہاں حزب کی تیر الفت شتاب	لگی دل میں جا شہ کے از پیچ و تاب

غرض جہاں حزب اپنے شوہر کے دل کو اس طرح بھاتی ہے کہ وہ اپنی بوالہوسی کو خیرباد کر دیتا ہے جو عورتوں کے لئے ایک زرین سبق ہے۔

آثمہ نے باکمال شعرا کی طرح لطیف تشبیہات بھی بہت استعمال کی ہیں جو اس کی رنگینی طبع پر دال ہے۔

غروب ماہتاب کی تشبیہہ ؎

قمر پی کے عشرت کی زاید شراب	جھکا تھا نشہ میں گیا بہر خواب

طلوع آفتاب کی تشبیہہ ؎

چلا پھر اُٹھ خواب سے شاد ہو	مسرت کے پانی سے منہ ہاتھ دھو
خوشی سے کھلا روئے گلگوں پہ رنگ	قبائے شہی ہو گیا بر میں تنگ

رقص کی تشبیہہ ؎

نہ تھا رقص یک رشک طاؤس تھا	سماں اس سمائے کا پابوس تھا

راگ کی تشبیہہ ؎

نہ تھا راگ آواز ققنوس تھی	پری زاد کے دل کی مانوس تھی

ساقی نامہ ؎

گلابی میں غنچہ کے بھر ساقیا	مئے کیف کی بزم عشرت میں لا

مطرب نامہ ؎

مغنی ترے لحن ققنوس میں	وہ ڈھب ہے جلے شمع فانوس میں

چنڈول کا پردہ ـــہ

دئے چھوڑ لعلوں کی اس پر طُر | کہے تو شفق میں ہے خور جلوہ گر

زرہ ـــہ

زرہ یک پھن بادشاہ جہاں | ہوا ماہ جوں سنبلہ میں نہاں

لعل شاہ مصنوعی طور پر طلسمات سے بیمار ہو جاتا اور اوس کی دلھن کو تیمارداری ـــہ

طلسمات سے آپ بیمار ہو | محل میں پڑا رہتا بیمار ہو
غرض تخت گہ تک نہ جاتا تھا وہ | غذا شوق سے کچھ نہ کھاتا تھا وہ
ہوا حال ہفتے میں ایسا تباہ | کہ بشکل مجنوں بنا لعل شاہ
حقیقت میں بالکل نہ آزار تھا | وہ دلھن کو دکھلانے بیمار تھا

- - - - - - - - - - - - - - - -

وہ سمجھی محبت کا بیمار ہے | فقط اپنی الفت کا بیمار ہے
نقاہت نظر بیچ لانے لگی | محبت کچھ اک دل میں آنے لگی
شہ لعل رو رو کے دکھلاتا تھا | پریشان ہو ہو کے دکھلاتا تھا
وہ اک روز آنکھ اپنی کھولا نہیں | کسی سے کچھ اک حرف بولا نہیں
کہی دائی شہزادی ذوالکرم | اٹھا اس کو تو آتش لاتے ہیں ہم
جو بیمار ہو اپنا محبوب ہے | نہیں شرم اس وقت پر خوب ہے
حیا و محبت میں جھگڑا پڑا | جہاں ضرب کے دل پہ جھگڑا پڑا
جہاں ضرب دولہ کے نزدیک جا | کہی بادشہ چشم کر اپنی وا
نہیں آنکھ کھولا ہے روٹھے جواب | جہاں ضرب دل بیچ کھا پیچ و تاب
اٹھاتی ہے کر منت و عاجزی | غشی ایک اس وقت طاری ہوئی
وہ بے حس بنا ایسا اس آن میں | کہے تو کہ جی کچھ نہیں جان میں
جہاں ضرب گھبرا کے زانو پہ سر | رکھی اور رونے لگی پُر خطر
تاسف سے دل میں کہی آہ آہ ! | کہی میں نے کیوں لعل شہ کو تباہ
فقط میری الفت میں یہ جاں دیا | مری آہ حسرت میں یہ جاں دیا
کوئی اپنے شوہر کو مارا نہیں | بجز میرے ہے کون ظالم کہیں
چلا میرا دنیا سے محبوب ہے | مجھے موت اس وقت پر خوب ہے

بہر حال ہوش و حواس سنبھال کر — تو جلدی سے پری کو بلا بھیج کر
جہاں مزب گوہر کی چپ چھوڑ کر — طلب کی اطبا کو نزدیک تر

سنگھانے دیئے۔ ایک شیشی شتاب — کہ تا دور ہووے غشی کا حجاب
جہاں مزب شیشی سنگھانے لگی — کچھ اک شاہ کو ہوش آنے لگی
دیا چشم جب اپنے وہ کھول کر — کئی دور شرما کے زانو سے سر
کیا آہ ایک بسکہ غش کر چلا — ہوا حال اول میں پھر مبتلا

سنگھانے لگی جب کہ وہ دلربا — وہ چشم اپنی آہستہ وا کر دیا
حیا و تکبر کو رکھ یک طرف — کھلائی دوا ہاتھ سے ذی شرف
دکھائی نہ کچھ اپنے غصہ کا جوش — وہ نزدیک لیٹے تو ہووے خموش
یہ حرکات گرچہ گوارا نہو — ولیکن محبت سے چارہ نہو الخ

شہزادہ دادگر فرزند فیروز شاہ کی شادی روح افزا سے ہوتی ہے۔ میر حسن کی نجم النساء کی طرح، لعل شہ قلتبانہ کو جوگن کے بھیس میں شہ پری کے پاس بھیجتا ہے۔ اشرف نے قلتبانہ کے مضبوط کردار کو خوب اجاگر کیا ہے، باوجود راز فاش ہونے کے قلتبانہ خود کو ظاہر نہیں کرتی باوجود اس کے کہ قلتبانہ کو گدھے پر سوار کر کے شہر بدر کیا جاتا ہے، مگر وہ اپنے مہم میں کامیاب آتی ہے، قلتبانہ رخصت ہوتے وقت اس طرح وعدہ کرتی ہے ؎

زمین و فلک کو بہم چاک کر — لگادوں گی پیوند با یک دگر
کہو تو بجز نردبان فلک — میں جا لاؤں زہرہ کو اس جا الگ
اگر شاہ کا مجھ سے ہووے نہ کام — جہاں قلتبانہ نہ پھر میرا نام

قلتبانہ روح افزا کا حلیہ پوچھ کر بین کاندھے پر رکھ کر جوگن کا لباس پہن کر لعل شہ کے کل کے گھوڑے پر سوار ہو کر، شہ پری کے باغ کے پاس پہنچتی ہے اور نہر پر اس طرح بین بجاتی ہے ؎

کہیں گوشۂ باغ میں نہر پر — بجانے لگی بین وہ بے خطر

دہ رُو رُو کہی شاہ جوگن ہوں میں بڑے درد و غم کی بروگن ہوں میں
لے آیا ہے کرگس یہاں میرے تئیں شب و روز تھی ورنہ صحرا میں میں
لرزتی تھی روتی تھی اور کانپتی جہاں مزب کے خوف سے ہانپتی

محل میں بُلوایا جاتا ہے تو کہتی ہے ؎

فقیروں کو صحرا میں آرام ہے محلات شاہی سے کیا کام ہے

آخر جاتی ہے اور اس طرح سلام کرتی ہے ؎

کیا جوگیا نہ بی جوگن سلام ہوئی اس سے یوں شہ پری ہمکلام

یعنی حالات دریافت کئے، اور یہ روتی رہی، اور محل کی تمام لڑکیاں آن موجود ہوئیں جس میں شہ پری کی لڑکیاں، روح افزا اور بہار افزا بھی تھیں جن کی اشیمہ نے اس طرح تعریف کی ہے ؎

قمر رشک حوروں پہ کر یک نظر چھپانے کو حسن ان کا تجویز کر
دیا چادر چاندنی بس اڑا تو حسن عروسی نے جلوہ دیا
گُلاں اُن کو دیکھے سو بس ایک بار درختوں سے گرنے لگے ہوشیار

اس مثنوی میں ایک خاص چیز رزم بھی ہے۔ اشیمہ کو رزم و بزم دونوں پر کامل عبور تھا۔ جنگ کے نقشہ یعنی جہاں مزب اور لعل شاہ کی باہمی معرکہ آرائی کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ گویا ایک دکھنی عورت اُردو میں فردوسی اور نظامی گنجوی کی ہم زبان اور ہم نوا ہے جو عورت کے لئے قابل صد آفرین، علامہ سلیمان ندوی نے اشیمہ کی پوتیوں کی تعریف کی ہے ان کی جدہ امجدہ کی رزم آرائی ملاحظہ ہو ؎

یہی عزم پہ ہو کے تیار وہ بہم فوج کر اپنی بسیار وہ
چلا جلد بڑھ کر شہ خوشخصال بروں شہر کے اپنے فرخندہ فال
وسیع ایک میدان پاکیزہ تر دیا بیل داروں نے ہموار کر
وہ لشکر جو اترا ہے ہر سمت پر دئے خار فولاد سب بیٹھ کر
بہت فیل استادہ تھے کوہ وار لے خرطوم[۵۱] میں اپنے فولاد خار[۵۲]
کیا میمنہ میسرہ[۵۳] سب درست یمینی[۵۴] یساری تھے چالاک و چست
ہراول مہیا ہوئے یک طرف عقب میں لئے فوج سب باندھ صف

علہ خرطوم = سونڈ۔ ع۵۲ فولاد خار ایک قسم کا ہتھیار۔ ع۵۳ میمنہ میسرہ، داہیں اور بائیں جانب کی فوج۔ ع۵۴ یمنی یساری۔

بہت قلبگہ کر کے آراستہ — رہا درمیاں شاہ نو خواستہ
زرہ اک پہن پادشاہ زماں — ہوا ماہ جوں سنبلہ میں نہاں
سکندر کے جنگی قوانین سے — لگا بجنے نقارہ آئین سے
کیا کوس[1] نے جب کہ ظاہر صدا — وہیں نائے ترکی نے باہم ہوا؟
تبیرہ[2] و شیپور[3] و تبنک[4] کہیں — دہل چرم گرگین و خمک[5] کہیں
اٹھائے جو یہ ل کے شور و شغب — یلوں[6] نے ہوئے عازم جنگ سب
پہن خود و خفتان[7] خنجر شکن — نکل آیا ہر پہلوان فیلتن
لئے ساتھ تلوار خفتان شگاف — کئے ابتدا رزم کا در مصاف
تبر تیر و شمشیر و خنجر بہم — بھی ژوپین[8] و خشت[9] اور تیغ دودم
سنان اور گوپال[10] اور بید برگ[11] — بھی زنگار[12] شکنندۂ درع[13] و ترگ[14]
ظفریاب[15] ہندی پر از آب سم — تفنگ اور قارورہ[16] ناچخ[17] بہم
جو انان بھی سب مثل افراسیاب — شجیعان تھے رستم نمط بے حساب
ہر اک وار کرتے تھے زہرا شگاف — کہے بلکہ تو سنگ خارا شگاف
فشافش وہ نیزوں کی اور وہ دھمک — اٹھے شعلۂ آتشیں جب بھڑک
ہوئے جس سے تھے گوش گردوں کے کر — حرارت سے اوس کو ہوا دردسر
چقا چاق خنجر پڑی ہر طرف — ہر اک سر بدن سے ہوا برطرف
ہوا دشت صحرائے مقتولگان — ہوئی اس میں یک جوئے خونی رواں الخ

اثیمہ کے عام معلومات بھی وسیع تھے چناں چہ کشتیوں کے عجیب و غریب نام اس وسعت معلومات پر دال ہیں مثلاً پلوار، سنگ چہرہ، ہاتی چہرہ، لچکا، بہرہ، ڈنگی، بجرہ، سوناکھی وتل، کہڑوڑ، بہو لیا، پٹیلا، غراب، بلکٹ بوٹ، سبد، فتح ماری، بغلے وغیرہ ان کے علاوہ جہازوں کے مختلف آلات اور ملاحوں کے انگریزی نام بھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثیمہ

---

[1] کوس = نقارۂ جنگ۔ [2] تبیرہ = ایک قسم کا نقارہ۔ [3] شیپور = قرنا، بگل۔ [4] تبنک = چھوٹا طبل جنگ۔ [5] خمک = ایک قسم کا چھوٹا نقارہ۔ [6] یل بمعنی پہلوان، [7] خفتان = زرہ، [8] ژوبین = گوپن، [9] خشت = چھوٹا نیزہ۔ [10] گوپال = گرز۔ [11] بید برگ = تیر، [12] زنگار مراد پرانی تلوار۔ [13] درع = زرہ۔ [14] ترگ = خود۔ [15] شمشیر ہند۔ [16] قارورہ = ایک قسم کا ہتھیار۔ [17] ناچخ = نیزہ چھوٹا۔

انگریزی سے بھی واقف تھی چوں کہ اس میں جہاں رستم (منھ بولا بھائی) کو رخصت کرنے کا منظر بھی عجیب ہے اس لئے اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے ؎

دو ڈولہ سہ ڈولہ کھڑے تھے جہاز　　معزز ولایت کے بھی سر فراز
دخانی کھڑے اس میں جا خواہ مخواہ　　کہ جوں قلب لشکر میں ہو بادشاہ
جہاز اور کشتی تھی سب خوش وجود　　عجب بحر پر باغ تھا ایک نمود
مسافر غرض جو کہ تھے سرفراز　　وے اسوار ہو ہو گئے بر جہاز
ہوا کامرہ خاصگاں کا مکاں　　سدا کامرانی تھی جس میں عیاں
معلم جہازوں کا مجرا صحیح　　گیا اور کیا اپنا مجرا صحیح
ادھر جلد تنڈیل چیتر کو تان　　ہے پاسنجروں پر کیا سایبان
ہوا تین ڈولوں کا پردہ کشا　　کہ گویا ہوا کے دیے پر لگا
کھلا الغرض جب کہ صبئر براس　　براس کلاں کا ہوا کام راس
دیا کھول نرگس نے اپنی زباں　　ہوا کالی جیبی سے ہمداستاں
ادہر تھے سوائی دکافی براس　　پلا نجیب تھے پیشوا ذی قیاس
نظر کی ادھر ڈوریاں ہر طرح　　بہت تھیں جہازوں کو حبل المتیں
پھر آیا ہے سکاں جب واہ واہ　　جہازاں چلے پل میں اتنی کرہ
جہاں ضرب تھی تب تلک اشک بار　　کہ دیکھ ان کو خوش ہو گئی ایک بار

آتیمہ کی اُردو بلحاظ مدراسی خاتون ہونے کے فصیح ہے، لفظ کتے، اور نکو اس طویل مثنوی میں کہیں پتہ نہیں حالاں کہ اب بھی دکھنی خواتین اور مرد بے تکلف استعمال کرتے ہیں، البتہ نے کا استعمال بہت غلط کیا ہے، کاش کے اس کی اُردو زبان کی اصلاح کسی اہل زبان کے ذریعہ ہوتی، بہرحال اُردو متوسط درجہ کی ہے فارسی کا اثر غالب ہے مگر بلحاظ واقعہ نگاری و فطرت نگاری مرقع کھینچنے میں کمال کیا ہے۔ تسلسل مضمون کا بدرجۂ اتم لحاظ رکھا ہے، باوجود اس کے یہ ساڑھے پانچ ہزار بیت کی مثنوی ہے۔ مدراس کیا بلکہ دکن قابل مبارک باد ہے کہ آج سے تقریباً ایک صدی پیشتر ایک ایسی اچھی شاعرہ پیدا ہوئی، جس کی نظیر نہیں اور اوس نے خصوصاً مثنوی نگاری میں، میرحسن جیسے اہل کمال کی تتبع کی ہے۔ اور عورتوں کے لئے ایک ایسا سوشیل افسانہ لکھا جس کی زمانہ کو

ضرورت تھی، جس کی جھلک متاخرین میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔

ماخذ

۱۔ قصۂ اگرگل مطبوعہ نول کشور کانپور
۲۔ قصۂ اگرگل ادارہ ادبیات حیدرآباد
۳۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور بابتہ فروری ۱۹۳۰ء ص۳
۴۔ اردو شہ پارے، مولفۂ ڈاکٹر زور، مطبوعہ
۵۔ بہارستان سخن مولفۂ شمس العلماء سید امداد امام اثر، مطبوعہ
۶۔ تذکرۂ گلزار اعظم مولفۂ نواب غلام غوث خاں والاجاہ، مخطوطہ آصفیہ
۷۔ تذکرۂ والاجاہی مولفۂ برہان خاں ہانڈی، مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ
۸۔ تذکرۃ النساء، مولفۂ درگا پرشاد، مطبوعہ
۹۔ تذکرۃ الانساب مولفہ مصطفےٰ علی خاں خوشدل، مخطوطہ دفتر دیوانی و مال سرکار عالی
۱۰۔ تذکرۂ شعراء دکن مؤلفہ عبد الجبار خاں ملکاپوری، مطبوعہ حیدرآباد
۱۱۔ تاریخ خافی خاں (منتخب اللباب)۔ مطبوعہ۔
۱۲۔ چکی نامہ مصنفۂ خواجہ بندہ نواز رحمتہ اللہ مخزونہ ادبیات اردو حیدرآباد
۱۳۔ خلاصتہ الانساب قلمی مولفۂ قدرت احمد گوپاموی، کتب خانہ آصفیہ
۱۴۔ رسالہ معارف نومبر ۱۹۲۵ء۔ اعظم گڑھ
۱۵۔ سوانحات ممتاز، مولفۂ خیر الدین خاں، مخطوطۂ کتب خانہ آصفیہ
۱۶۔ گلبن مہ رخاں، مصنفۂ اقیمہ، مخطوطہ آصفیہ
۱۷۔ گلشن ہوشاں " " " " "
۱۸۔ مشاہیر لنسواں، مولفۂ محمد عباس ایم اے، مطبوعہ لاہور
۱۹۔ نظم دلچسپ امیر، مولفۂ محمد منور گوہر، مطبوعہ مطبع حیدری مدراس

* * * * * *

"لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" پر ایک نظر

(از جناب وحید قریشی)

"لکھنؤ کا دبستان شاعری" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا وہ تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر اس موضوع کے ماہرین کی سفارش سے علی گڑھ یونیورسٹی نے انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی، اسے بعد میں یونیورسٹی نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ کتاب میں ایک دیباچہ۔ دس ابواب اور دو ضمیمے ہیں۔ شروع کے دو ابواب اودھ کی تاریخ اور "لکھنویت" کی توضیح و تشریح کرتے ہیں۔ چوتھا باب اودھ کے حکمرانوں کی شاعری پر ہے اور باقی ابواب میں لکھنؤ میں بسنے والے شعرا کے مفصل، حالات اور ان کے کلام کا جائزہ ہے۔

کتاب کی ترتیب میں یکسانی نہیں۔ سب شاعروں کے حالات کا التزام ہے، لیکن میر انیس اور مرزا دبیر کے حالات اس میں نہیں پائے جاتے، اگرچہ "فہرستِ ماخذات" میں "حیاتِ دبیر" (سید افضل حسین ثابت لکھنوی) اور "حیاتِ انیس" (امجد علی شہری) کے نام موجود ہیں۔ ویسے بھی موضوع کے اعتبار سے شعرا کے حالات کتاب میں نہیں ہونے چاہئیں۔ کیوں کہ اس کا موضوع "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ہے، لکھنؤ کے شعرا نہیں۔ لیکن چوں کہ کتاب کا دو تہائی سے زیادہ حصہ لکھنؤ میں بسنے والے شعرا کے حالات پر صرف ہوا ہے۔ اس لئے اب اسی کو کتاب میں بنیادی چیز سمجھنا چاہیئے، محتویات کے اعتبار سے لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں تحقیقی پہلو اہم ہے۔ آج کی نشست میں اسی پہلو کی چھان بین مقصود ہے۔

تحقیق کے کچھ بنیادی اصول ہیں جن سے روگردانی ہمیشہ غلط تاریخ تک پہنچاتی ہے۔ تحقیقی مقالے کے لئے ضروری ہے کہ واقعات وسنین کی درستی کے لئے معاصر شہادتوں پر بھروسا کیا جائے نوابانِ اودھ کی تاریخ کے لئے ایسے ڈیڑھ سو کے قریب ماخذ موجود ہیں۔ جن میں معاصر اور موخر دونوں طرح کی کتابیں شامل ہیں۔ ان میں کی چند کتابیں ڈاکٹر صدیقی نے بھی گنائی ہیں۔ او صاف الآصف، انعام اللہ

انشائے فیض بخش - اقبال نامہ وزیر علی - عمادالسعادت (سید غلام علی) تاریخ فرح بخش
ی فیض بخش) کا ذکر کتاب کے آخر میں موجود ہے - اگرچہ متن اور حواشی میں موخرالذکر دو کتابوں
سوا کسی کتاب کا حوالہ موجود نہیں۔ اور نہ ان میں سے کسی ایک کے مواد کو بھی استعمال کیا گیا ہے
یخ فرح بخش اور عمادالسعادت کو شرر (گزشتہ لکھنؤ) اور نجم الغنی (تاریخ اودھ) کی مدد
، دیکھا گیا تاریخ اودھ از گور سہائے کا ـــــ حوالہ صرف ایک جگہ دیا گیا ہے اور وہاں فٹ
ٹ میں اس کا ذکر بحوالہ نجم الغنی موجود ہے۔

عمادالسعادت اور تاریخ فرح بخش سے بہت تھوڑا کام لیا گیا ہے۔ لیکن انھیں بھی
ہر کتابوں کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا اور جہاں کہیں اُن سے مواد لیا گیا ہے وہاں شرر اور
الغنی کی پیروی میں جہاں کہیں اِن کتابوں کا حوالہ آیا ہے، وہی صفحات اصل کتابوں میں دیکھ کر
ل کر دئے گئے ہیں مثلاً تاریخ فرح بخش سے مواد اس طرح حاصل کیا گیا ہے۔

لیٹ صاحب کی کتاب	گزشتہ لکھنؤ	تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ میرے پیش نظر ہے)
ص ۳۰ پیراگراف ۲	ص ۲	ص ۲۱
ص ۳۰، ۳۱ ،، ۲	ص ۳	ص ۲۱
ص ۳۱ ،، ۳	ص ۳، ۴	ص ۲۱
ص ۳۲ ،، ۲	ص ۸، ۹	ص ۹
ص ۳۳ ،، ۲	ص ۹، ۱۰	ص ۱۰
ص ۳۳ فٹ نوٹ تا ص ۳۵	ص ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ کا خلاصہ	ص ۵ تا ۲۲ کا خلاصہ

متن میں جس قدر اقتباسات ڈاکٹر صاحب نے دئے ہیں وہ تاریخ فرح بخش کے انگریزی ترجمے
کی دوسری جلد کے ص ۱ تا ص ۲۲ سے باہر نہیں ہیں اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں
کہ تاریخ فرح بخش کو ڈاکٹر صاحب نے ص ۲۲ سے آگے نہیں دیکھا۔ یہ تاریخ اور جگہ جہاں کارآمد
ہو سکتی تھی مثلاً شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد کی ترقی اور لکھنؤ کی بربادی۔ شجاع الدولہ
کے زمانے میں عارضی طور پر لکھنؤ کا دارالخلافہ بنایا جانا۔ آصف الدولہ کے فیض آباد چھوڑنے کے
بعد فیض آباد میں رہنے والے امرا اور بیگمات کی فہرست - سالار جنگ کا لکھنؤ آنا۔ جواہر علی خاں
کے محل کی تعمیر، کہیں بھی اس کے مواد کو کام میں نہیں لایا گیا۔

اس کتاب کی جو عبارتیں لیٹ صاحب اور شرر کے ہاں موجود ہیں ان میں کہیں کہیں ردّو
بدل بھی کیا گیا ہے۔ بعض جگہ لیٹ صاحب کا ترجمہ مختلف ہے۔ کہیں کہیں لیٹ صاحب نے بعض

الفاظ حذف کر دئے ہیں۔ کہیں سے عبارت کا کوئی ٹکڑا ہی غائب ہے۔ اور ایک آدھ جگہ عبارت بدل بھی دی گئی ہے (مثلاً ص۱۳ سطر ۸ پر آصف الدولہ لکھا ہے وہاں صفدر جنگ ہونا چاہیئے)۔ حالاں کہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہوئے (Hoey) کے پیش نظر بھی مصنف کا خود نوشت نسخہ تھا (جس پر شرر نے تکیہ کیا) اور ڈاکٹر صدیقی کے پیشِ نظر بھی مصنف کا خود نوشت نسخہ ہے۔

عماد السعادت سے بانیانِ سلطنتِ اودھ کا حال لیا گیا ہے۔ میر محمد امین (جسے غلطی سے ص۶۹ پر ڈاکٹر صاحب نے نواب امین الدین بنا دیا ہے) صفدر جنگ۔ شجاع الدولہ کے حالات کے لئے عماد السعادت کو معاصر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی کا مصنف تو آصف الدّولہ کے زمانے میں ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ آیا اور اس نے جان بیلی ریزیڈنٹ کے ایما، سے ۱۲۲۳ھ میں یہ کتاب لکھی۔ بانیانِ اودھ کے حالات کے بعد جہاں سے عماد السعادت معاصر ماخذ ہو سکتی تھی وہاں۔ اسے چھوڑ کر شرر اور نجم الغنی پر بھروسا کر لیا گیا ہے، بانیان اودھ کے حالات کے لئے بھی نجم الغنی کی کتاب ہی کی روشنی میں عماد السعادت کو جستہ جستہ دیکھا گیا ہے

اگر زمانۂ حال کی کتابوں ہی پر انحصار کرنا تھا۔ تو اس اعتبار سے نجم الغنی اور شرر کی کتابیں سب سے زیادہ نا قابلِ اعتبار ہیں۔ کیوں کہ دونو لیچّے بڑے ماخذ میں فرق نہیں کرتیں اور نجم الغنی کے ہاں تو معتبر اور غیر معتبر ماخذ کی کوئی تمیز ہی نہیں۔ وہ صرف اپنی کتاب کا حجم بڑھانے کے درپے معلوم ہوتے ہیں، ڈاکٹر سری واستوا نے خوب کہا ہے:

"The author (Najmul Ghani) does not possess any virtue or training of a historian except industry. He does not even know which is a first rate authority and which is secondry or third rate source for his period."

"مصنف (نجم الغنی) محنت کے سوا، ایک مورخ کے نہ کسی دوسرے وصف سے متصف ہے اور نہ اس سے متعلق تربیت سے، حتی کہ وہ ایک عہد کے صحیح ترین ماخذوں کو بھی دوسرے اور تیسرے درجوں کے ماخذوں سے ممتاز نہیں کر سکتا۔"

زمانۂ حال کی کتابوں میں ڈاکٹر آشیر بادی لال سری واستوا کے مندرجہ ذیل مونوگراف تر ماخذ ہو سکتے تھے:

۱۔ اودھ کے دو نواب	1. The first two Nawabs of Oudh.
۲۔ سعادت خاں برہان الملک	2. Saadat Khan Burhan-ul Mulk.
۳۔ شجاع الدولہ (دو جلدوں میں)	3. Shuja-ud Daula (in two-Volumes.)

یہ کتابیں "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" کے لکھے جانے کے وقت تک چھپ چکی تھیں۔ بانیانِ سلطنت کے حال میں نجم الغنی کی تقلید میں عماد السعادت پر بھروسا کر لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیث صاحب نے کتاب کے شروع کے ابواب میں بے شمار غلطیاں کر دی ہیں۔ نمونۃً کتاب کے ابتدائی چار صفحوں کے بعض فقروں کا مقابلہ ڈاکٹر سری واستوا کی پہلی دو کتابوں سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سری واستوا کی کتاب نمبر ۲ چونکہ کتاب نمبر ۱ میں بھی شامل ہے اس لئے اس کے جدا حوالے نہیں دیے گئے بلکہ صرف The first two nawabs of Oudh (اودھ کے پہلے دو نواب) کے صفحات کے حوالے کافی سمجھے گئے ہیں۔

ص۲۳ باب اول (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری)

"میر محمد امین کے والد کی ہندوستان میں آمد کا سال ۱۱۸۰ھ دیا ہے اور لکھا ہے: "یہ بہادر شاہ کا زمانۂ حکومت ہے"۔

افسوس ہے بہادر شاہ کا زمانۂ حکومت اس سال سے بہت پہلے ختم ہو چکا ہے۔ اس دور کے ایک بڑے مورخ اروِن (Irvine) نے اپنی مشہور کتاب Later Mughals کی جلد اوّل میں (جو سر جادو ناتھ سرکار کی نگرانی میں مدّت ہوئی چھپ چکی ہے) بہادر شاہ کا سال وفات ۱۱۲۴ھ دیا ہے [1]

لیث صاحب نے آگے جا کر میر محمد نصیر (والد میر محمد امین) کی ہندوستان آمد کا سال ۱۱۸۰ھ دیا (یہ بیان بحوالۂ عماد السعادت ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں ص۲۴ پر موجود ہے)۔ یہ بھی درست نہیں۔

"Imad rightly says that he (mir mohammad Nasir) came during the reign of Bahadur Shah, but it gives 1118 A.H. as the date of muhammad

---

1. Later mughals, Vol. I Page 143 ص۱۴۳ اردن لیٹر مغلس جلد اول

Naseer's arrival, which is impossible. The date of Bahadur Shah's official coronation was indeed Zil Hij 1118 A.H. (when he received the news his father's deth) but he crowned himself on Muharram 30, 1119 (2nd may 1707. A.D.)(2) and his public coronation took place in Robi 1, 1119. A.H. after his victory over Azam Shah, muhmmed Naseer must have started a few months later. (1)

اصل یہ ہے کہ میر محمد نصیر ۱۱۱۹ھ میں بنگال گئے۔ وہاں کے بارے میں ڈاکٹر صدیقی عماد السعادت کا ایک بیان دیتے ہیں:

> ......بہ سواریٔ جہاز در بنگالہ شرفِ نزول فرمود...... برطبقِ تواتر شجاع الدولہ ناظم بنگالہ متکفلِ مہامِ معاشِ ایشان بودہ است[3]

صاحبِ عماد السعادت کا یہ بیان درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ شجاع الدولہ کی سفارش پر مرشد قلی خاں نے (جو اس زمانے میں ناظم بنگالہ تھا) ان کا گذارہ (الاؤنس) مقرر کیا شجاع الدولہ اس وقت ناظم بنگال نہیں تھے[4]

آگے چل کر لیث صاحب لکھتے ہیں:

---

(1) The first two Nawabs of Oudh P. 40 (foot note)

۲۔ اروِن نے لکھا ہے کہ اس کی تخت نشینی کی تاریخ "شاہِ بے خبر" سے نکلتی ہے (شاہِ بے خبر" سے ۱۱۲۰ھ نکلتے ہیں، شاید "شہ بے خبر" ہو۔

۳۔ ۱۱۱۹ھ لکھنؤ کا دبستان شاعری

(4) The first two Nawabs....... chapter I. P—?

"دہلی پہنچ کر میر محمد امین نے بعض درباریوں سے توسل پیدا کیا اور بقولِ مصنف عماد السعادت جائدادوں کو ٹھیکہ پر لے کر ایمان داری اور دیانت سے کام کیا اور اتنا اثاثہ بہم پہنچا لیا کہ سے دن گذر سکیں۔ اس عرصے میں نواب مبارز الدولہ سربلند خاں صوبہ دارِ گجرات سے ملنا ہو گیا (اس سے لڑنے کے بعد) (۲) میر محمد امین گجرات سے شاہ جہاں آباد پہونچے اور شہزادگانِ ... جائدادوں کا ٹھیکہ لینا شروع کیا۔ اور شہزادوں ہی کے ذریعہ فرخ سیر کے دربار تک رسائی پہ دورانِ ولی عہدی میں ہی فرخ سیر نے انھیں منصب ہزاری (منصبِ والا شاہی) عطا کیا۔ اور شاہزادے کے رفقا میں شامل ہو گئے[۱]"

اب ذرا ایک جھلک نجم الغنی کی بھی دیکھ لیجیے:

"میر محمد امین نے دہلی میں پہونچ کر ایک عمدہ حاکم کی رفاقت اختیار کی۔ اور بعض جگہوں کی حکو... اس کی وجہ سے پائی۔ تھوڑے دنوں بعد نواب سربلند خاں صوبہ دارِ گجرات سے تعارف ہو گیا او... نے اپنی سرکار پر میر منزل کا عہدہ دیا (اس سے لڑنے کے بعد[۲])۔ دہلی چلے آئے۔ اور شہ... کی جاگیر کا ٹھیکہ لیا جو محاصل اس صیغۂ مستاجری سے حاصل ہوتا تھا۔ اس میں سے چہارم بنظر رسو... شہزادوں کو دیا کرتے تھے۔ جب ان کی دیانت اور امانت اور کارگذاری کی شہرت ہوئی تو شاہ... کے ذریعہ سے بادشاہ کی حضوری تک نوبت پہنچی[۳]"

جائدادوں کے ٹھیکے کا تذکرہ صاحبِ عماد السعادت سے لیا گیا ہے جیسا کہ "بقولِ عماد ال... سے ظاہر ہے۔ جس جملے کا مطلب ڈاکٹر صاحب نے یہ لیا ہے وہ یوں ہے:

"(میر محمد امین) با عمال پیشگاں عُمدہ درخوردہ"[۴]

یعنی میر محمد امین نے افسروں سے خوب بنا رکھی تھی۔ فارسی زبان کی کسی تاریخ... میر محمد امین کے کسی زمانے میں بھی تاجر یا ٹھیکیدار ہونے کی سند نہیں ملتی۔ شہزادگان کی جائدادوں کا ٹھیکہ بھی غلط ہے۔ اس موقع پر صاحبِ عماد السعادت کا بیان بالکل صاد...

"بارائے رتن چند کہ دیوانِ وزیر اعظم قطب الملک نواب عبداللہ خاں بودہ است نردِ مودّت باختہ در ہزار و یک صد و بست و ہشت (۱۱۲۸) ہجری سندِ ہندوُن و بیانہ کہ ملکِ ہجدہ لک روپیہ باشد۔ بدست آورد[۵]"

---

[۱] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۲۵

[۲] یہاں پر بیان لفظ بلفظ ملتا تھا بخوفِ طوالت حذف کر دیا ہے — [۳] نجم الغنی۔ تاریخ اودھ جلد ۱ ص ۶

[۴] عماد السعادت ص ۶ — [۵] عماد السعادت ص ۳

اگرچہ یہ بیان بھی زیادہ قابلِ اعتبار نہیں۔ میر محمد امین تقریباً جولائی ۱۷۱۲ء میں سربلند خاں کی طرف سے میر منزل مقرر ہوا۔ اس وقت سربلند خاں مانک پور کا فوج دار تھا جو صوبۂ الہ آباد میں واقع ہے۔ یہ شخص بہادر شاہ کے دوسرے فرزند کی پارٹی کا تھا۔ اور اسی نے اسے یہ عہدہ دیا تھا۔ بہادر شاہ کا فرزند دوم ۱۷ مارچ ۱۷۱۲ عیسوی میں مارا گیا۔ سربلند خاں اپنے نئے آقا جہاں دار شاہ سے سرائے دورا ہہ میں ملا جو سرہند اور لاہور کے درمیان واقع ہے اور یہاں مئی ۱۷۱۲ کو اسے گجرات کا نائب گورنر بنایا گیا۔ ڈاکٹر سری واستوا لکھتے ہیں[1]

Imad wrongly thinks that SARBALAND KHAN was at that time governor of Gujrat. He was appointed deputy governor of Gujrat in May 1712 A.D. Had Muhammed Amin taken service under him after his appointment at Gujrat, the Amir must have remained in poverty for at least three years, which opposed to Imad's own version. In case the Amir had remained in strained circumstances till the middle of 1712, he would have entired FARRUKHSIYAR'S service who had carried out his enthronement at Patna on 6th march 1712, and had been collecting an army to contest for the throne.

گجرات کا چارج لینے کے لئے دہلی سے سربلند خاں احمد آباد گیا۔ اور وہاں نومبر ۱۷۱۲ کو پہنچا۔ میر محمد امین بھی اس کے ساتھ ہی گجرات گیا۔ نومبر ۱۷۱۲ کے بعد اور مارچ ۱۷۱۳ سے پہلے میر محمد امین اور سربلند خاں

1- The first two Nawabs of Oudh P.7 (footnote)

میں اختلاف ہوگیا اور میر محمد امین نے اُس کی ملازمت چھوڑدی اور دہلی چلا آیا۔ یہاں آکر نہ اُس نے ٹھیک لیا نہ شہزادوں کے ذریعہ فرخ سیر تک رسائی حاصل کی۔ معتبر راویوں کا بیان ہے کہ تقرب خاں والاشاہی کی وجہ سے فرخ سیر کے ساتھ تعلق ہوا اور نائب کروڑی کے عہدے تک پہنچا لیکن محمد جعفر تقرب خاں کی وفات سے دربار میں اس کا رسوخ کم ہوگیا اور ساڑھے تین سال تک اُس کے عہدے میں ترقی نہیں ہوئی۔ بعد ازاں فرخ سیر کی وفات کے بعد جب سادات کا زور ہوا اور بالآخر ۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو محمد شاہ تخت نشین کیا گیا تو سادات شاہ گر کے ہاتھوں محمد امین کا ستارہ بھی چمکا ۔ ہنڈ وُن اور بیانہ کی فوج داری اُسے ملی۔ بعد میں سادات سے اُس کا اختلاف ہوا۔ اور در پردہ پوشیدہ طور پر مخالف پارٹی سے مل گیا۔

ڈاکٹر لیث لکھتے ہیں:

ان دنوں دہلی میں سادات بارہہ کا زور تھا۔ بادشاہ اور رعیت دونوں ان کے قیدی کے شکار رہتے۔ چناں چہ میر محمد امین نے نواب حسین علی خاں کے قتل کی سازش کی اور میر حیدر کو اس کام پر آمادہ کیا۔[1]

مخالف پارٹی کا لیڈر محمد امین خاں اعتماد الدولہ تھا۔ ڈاکٹر لیث صاحب نے محمد امین اور محمد امین اعتماد الدولہ کو ایک ہی آدمی سمجھ کر یہ کہہ دیا ہے کہ میر محمد امین نے حسین علی خاں کے قتل کی سازش کی۔ میر محمد امین کا ہاتھ اس میں ضرور تھا لیکن سازش کا سرغنہ نظام الملک کا چچا محمد امین خاں اعتماد الدولہ تھا قاتل میر حیدر نہیں بلکہ حیدر قلی خاں تھا جو میر آتش تھا۔ میر اُس کے عہدے کا حصہ ہے اُس کی ذات کو ظاہر نہیں کرتا جیسا کہ لیث صاحب کو شبہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر صدیقی رقمطراز ہیں:

"حسین علی امیر الامرا اور اس کے رفیقوں کا قلع قمع کرنے میں میر محمد امین سعادت خاں کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس لئے انھیں پنج ہزاری کا منصب اور اکبرآباد کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۱۳۲ھ کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی داروغگی خواصان کا عہدہ عطا ہوا اور عنایت خسروانہ روزافزوں ہوتی گئی اس کے بعد سیدوں نے آخری کوشش خود قطب الملک عبد اللہ خاں کی سیادت میں کی۔ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے معرکہ کا ہوا تھا۔ ... محمد امین سعادت خاں برہان الملک اکبرآباد کی صوبہ داری سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ انھیں اودھ کی صوبہ داری پر جانا پڑا۔"[2]

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۲۵ ، [2] لکھنؤ کا دبستان شاعری صفحہ ۲

اقتباس دراصل نجم الغنی کی کتاب کے دو صفحات سے ہے۔ جس میں سے بعض فقرے خارج کردئے
،، اور خافی خاں کی کتاب کا حوالہ بھی اُسی طرح دے دیا گیا ہے۔ درحقیقت جو واقعات لیث صاحب
دئے ہیں ان میں حالات آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ ۸؍اکتوبر ۱۷۲۰ء کو حسین علی کو قتل کیا گیا۔ ۹؍اکتوبر
اعتماد الدولہ ہشت ہزاری بنا۔ خانِ دوراں میر بخشی ہوا۔ قمر الدین خاں نائب میر بخشی
ہفت ہزاری ہوا۔ حیدر قلی خاں شش ہزار ذات سہ ہزار سوار اور میر محمد امین "سعادت خاں
ر" کے خطاب کے ساتھ پنج ہزار ذات اور سہ ہزار سوار کا حقدار ہوا۔ بعد میں ۱۳؍ذی الحجہ
۱۱۳۲ھ (۱۵؍اکتوبر ۱۷۲۰ء) کو میر محمد امین سعادت خاں کو شش ہزار ذات اور پنج ہزار سوار کا
ہ اور صوبۂ اکبرآباد کی گورنری عطا ہوئی۔ یہ ۱۱۳۲ھ کا واقعہ ہے ۱۱۳۳ھ کا نہیں۔ اس موقع پر
دت خاں (میر محمد امین) فوج شاہی کے ساتھ رہا اور اس نے نیل کنٹھ کو اپنا وکیل بنا کر آگرے
دیا۔ کیوں کہ ابھی قطب الملک عبداللہ خاں کا قلع قمع باقی تھا۔ یہ معرکہ ۱۳، ۱۴؍نومبر ۱۷۲۰ء
ش آیا۔ فتح کے بعد شاہی افواج بادشاہ اور محمد امین سعادت خاں کے ہمراہ دہلی کو لوٹیں تو
۱۷۲۰ء (۲۰؍محرم ۱۱۳۳) کو سعادت خاں کو بہادر جنگ کا خطاب اور ماہی مراتب عطا ہوا۔
ہ بعد ۷؍ربیع الاول ۱۱۳۳ھ (۱۲؍جنوری ۱۷۲۱ء) کو محمد شاہ بادشاہ نے سعادت خاں کو
وغلئ خواصاں کا عہدہ دے کر خلعت و سرپیچ عطا کیا۔ اور فروری ۱۷۲۱ء میں اُسے آگرے
گورنری کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ تقریباً مارچ ۱۷۲۱ء کا واقعہ ہے۔ اس گورنری
ہ یکم ستمبر ۱۷۲۲ء (۲۱ ذی قعدہ ۱۱۳۴ھ) تک رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ گورنری
ہانے بھی نہ پایا تھا درست نہیں۔ آگرے سے اُسے اس لئے ہٹایا گیا کہ وہ جاٹوں
سرکوبی میں ناکام رہا تھا۔ اور راجہ جے سنگھ اُس وقت تک شاہی حکم سے ہم کو ہاتھ میں لینے
ر نہ تھا جب تک اُسے آگرے کی گورنری عطا نہ ہو۔ اس لئے محمد امین کو دہلی بلا لیا گیا۔ بادشاہ ،
سے اس ناکامی پر ناراض تھا۔ اس لئے بار دینے سے انکار کر دیا۔ اور اودھ کی گورنری
در کر دیا۔ یہ ۹؍ستمبر ۱۷۲۲ء (۲۹؍ذی قعدہ ۱۱۳۴ھ) کا واقعہ ہے۔

نجم الغنی کی آنکھ سے عماد السعادت کو دیکھا گیا ہے۔ اس لئے عماد السعادت کے صرف
کے دس صفحات ہی لیث صاحب کے زیر مطالعہ رہ سکے ہیں۔ باقی کتاب سے
ے نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہم مقامات پر عماد السعادت
یانات سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ مثلاً نوابانِ اودھ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب
، ہیں:

"نواب امین الدین (میر محمد امین؟) سعادت خاں برہان الملک بانیٔ سلطنت اودھ سے شجاع الدولہ تک خاندان میں شاعری کا پتہ نہیں چلتا"[1]

عماد السعادت میں لکھا ہے:

"اگرچہ نواب والاقدر ممدوحِ مقدم الذکر (میر محمد امین برہان الملک) مردِ سپاہی بود۔ لیکن چوں طبعش از ازل موزوں بود گاہی فکرِ شعر ہم می کرد۔ و امین تخلص می کرد۔ و چوں اسمش میر محمد امین بود تخلص ہم از نام خود تجویز نمود۔ میر عبدالعلی طالع تخلص۔ در مقطعِ غزل گوید۔ شعر۔

طالع این مصرعۂ نواب دل از دستم بُرد　　دلِ غمگیں بہ کسی دادہ ام و یادم نیست

مصرعۂ ثانی فرمودۂ نواب است۔ و در ریاض الشعرا از علی قلی والہ داغستانی ایں شعر بنام نامی آن والا جناب دیدہ شد۔ شعر

زکدام رہ بیایم کہ بہ چشم تو در آیم　　کہ بہ گردِ چشم مستت ہمہ نیزہ سیاہ است"[2]

اب شعرا کے حالات لیجیے۔

خانِ آرزو

ڈاکٹر صدیقی فرماتے ہیں:

باوجود اس شہرت اور کمالِ سخن دانی کے مختصر حالات ملتے ہیں ــــ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گوالیار ہی میں رہ کر حاصل کی۔ اور سرکاری ملازمت کے سلسلے میں گوالیار میں منصب دار مقرر ہوئے لیکن ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء میں دلّی چلے آئے یہ زمانہ فرخ سیر کا تھا۔ دلّی کا وہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا چنانچہ نادری حملے کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے بعد ہی جب دلّی کی ویرانی سے گھبرا گئے تو فیض آباد چلے آئے۔ رام بابو سکسینہ نے اُن کا لکھنؤ آنا لکھا ہے لیکن شجاع الدولہ اس وقت تک فیض آباد میں رہتے تھے.... میر حسن کے والد میر ضاحک اور خود میر حسن بھی نواب سالار جنگ کے وابستگانِ دولت ہی میں تھے۔ اور ان بزرگوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت فیض آباد ہی میں تھے........ یہ تسلیم کرنے میں شبہ ہے کہ آرزو لکھنؤ بھی گئے ہوں گے"[3]

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۷ [2] عماد السعادت ــــ ص۳۱ ــــ [3] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۸۵

.....آرزو نے عمر کا باقی حصہ فیض آباد ہی میں گذارا اور وہیں ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء میں وفات پائی۔ لیکن لاش دفن ہونے کے لئے دہلی لائی گئی۔[1]

آرزو کے مختصر حالات ملتے ہیں۔ جن پر انحصار کر کے ابھی دو چار سال ہوئے منوہر سہائے انور کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ یہ تحقیقی مقالہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ تذکروں میں اس کے حال میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے:۔

تذکرۂ خوش گو (قلمی)۔ مجمع النفائس (خانِ آرزو۔ قلمی)۔ رقعاتِ آرزو (قلمی) کے علاوہ سروِ آزاد (آزاد بلگرامی)۔ گلِ عجائب (اسد علی تمنا) تذکرۂ بے نظیر (عبدالوہاب افتخار) مخزنِ نکات (قائم) نکات الشعرا (میر) مخزن الغرائب (احمد علی سندیلوی۔ قلمی) انیس العاشقین (رتن سنگھ زخمی) عقدِ ثریا (مصحفی) دستور الفصاحت (احمد علی یکتا کے حواشی مرتبہ عرشی)۔ گلشنِ ہند (علی لطف) ان میں سے عقدِ ثریا۔ دستور الفصاحت۔ تذکرۂ بے نظیر۔ اور سروِ آزاد کی مدد سے لیث صاحب کی بعض اغلاط پیش کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ آرزو فیض آباد میں فوت ہوئے اور لاش دفن ہونے کے لئے دہلی لائی گئی۔ مصحفی عقدِ ثریا میں خانِ آرزو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"در ایامیکہ بعدِ فوتِ موتمن الدولہ اسحاق خاں شوشتری و پسرش نجم الدولہ کہ قدردان و معونت رسانِ او بودند با سالار جنگ[2] برادرِ خوردِ نجم الدولہ اش اتفاق افتاد و ہمراہِ او از شاہجہاں آباد بارِ سفر بربست و خود را بغیر او دہ کہ وطن اصلیٔ بزرگانش بود، انداخت، و بعدِ توقفِ چندی بوساطتِ نواب سالار جنگ بہادر بملازمتِ نواب شجاع الدولہ بہادر رسیدہ بدرماہۂ سہ صد روپیہ عزّ و امتیاز یافت...... الحاصل رحلتش در یک ہزار و یک صد و شصت و نہ واقع شد...... جسدش را در لکھنؤ امانت گذاشتہ بودند۔ بعد انقضائے ایام موعودِ شاہجہان آباد بردند و بخاک سپردند۔[3]"

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ لکھنؤ اس وقت قصبہ تھا۔ وہاں آرزو کیوں جانے لگے۔ لکھنؤ تو آصف الدولہ کے زمانے میں کہیں جا کر مرکزِ سلطنت بنتا ہے۔ لیکن اگر انھوں نے تاریخِ فرح بخش

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔ [2] سالار جنگ کے بارے میں عماد السعادت میں ایک جگہ لکھا ہے:
"سالار جنگ اندکے عیاش بودہ است لیکن او را نیز حالاتی بود کہ صاحبِ آں حالت را درویش می گویند"۔
[3] عقدِ ثریا ص ۸

کو ص۲۲ سے آگے بھی دیکھا ہوتا تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ شجاع الدولہ نے بھی ایک زمانے میں عارضی طور پر لکھنؤ کو دارالخلافہ بنایا تھا۔ تاریخ فرح بخش میں ہے[۲۲]:

After Nawab Safder jang's death all was spoiled and ruined (at Faizabad) Shujaud Daula made Lucknow his permanent residence, but when he went on tour every year, he used to spend one or two nights here (at Faizabad) and go on to Gorakhpure and Benaras, untill he engaged the English army in 1178 A.H. (Left Faizabad that year and made Faizabad his capital in 1179)

صفدر جنگ کی وفات (بحوالۂ ڈاکٹر سری واستوا) ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ ہے اور اس کی تائید تذکرۂ بے نظیر (عبدالوہاب افتخار)[۲۳] سے بھی ہوتی ہے۔ اس لئے آرزو کا آخر عمر میں لکھنؤ میں ہونا مسلم ہے۔

غلام علی آزاد بلگرامی ۱۱۶۹ھ میں اپنے تذکرہ (سروِ آزاد) پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> چوں نواب صفدر جنگ ہفدہم ذوالحجہ سن سبع وستین و مایتہ والف (۱۱۶۷) درگذشت۔ آرزو با شجاع الدولہ خلفِ نواب مذکور کہ قائم مقام پدر شد بسر می برد و در جمادی الاُخریٰ سن (۱۱۶۹) در بلدۂ لکھنؤ فوت کرد۔ و در ہمیں شہر مدفون شد[۲۴]

اسی طرح گلشن ہند میں (جو آرزو کے حال کے لئے زیادہ تر ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر رہا ہے) آرزو کا لکھنؤ میں فوت ہونا صاف لکھا ہے۔ نیز انھیں لکھنؤ ہی میں دفن کیا گیا اور بہ طور امانت کیا گیا کچھ مدت بعد دوبارہ دفن کرنے کے لئے دہلی لے جائے گئے۔

لیث صاحب نے سنِ پیدائش ۱۱۰۱ھ دیا ہے اور مصحفی (عقدِ ثریا) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن غلام علی آزاد جسے آرزو نے اپنے حالات خود لکھ کر بھیجے تھے) ۱۱۰۰ھ کا منتہا صحیح تاریخ بتاتے ہیں[۲۵]۔ اور اسی کو درست سمجھنا چاہیئے۔

---

۲۲ تاریخ فرح بخش (انگریزی سے ترجمہ ہوئے) ۲۳ تذکرۂ بے نظیر ص۲۸ ۲۴ سروِ آزاد ص۲۳۰، ۲۳۱ ۲۵ سروِ آزاد ص۲۳۰

ڈاکٹر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم گوالیار ہی میں ہوئی۔ اس کی تائید کسی تذکرے سے نہیں ہوتی۔ فہرستِ ماخذات میں جن تذکروں کا حوالہ ہے اُن میں سے کسی نے ایسا نہیں لکھا۔ ہمارا خیال ہے چونکہ سب تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے آرزو کچھ عرصہ گوالیار میں ملازم رہے سب نے یہ بھی لکھا ہے کہ آرزو کا ماں کی طرف سے شیخ محمد غوث گوالیاری تک سلسلہ پہنچتا ہے۔ ان دو باتوں کو سامنے رکھ کر لیث صاحب نے قیاس سے کام لیا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ ابتدائی تربیت گوالیار میں ہوئی۔ سید عبدالوہاب نے "از سکنۂ اکبرآباد است" کہا ہے۔ آزاد بلگرامی بھی اُسے اکبرآبادی ہی قرار دیتے ہیں یہی بیان مصحفی کا ہے۔

صدیقی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "آرزو گوالیار میں منصب دار ہوئے لیکن ۱۱۳۰ھ میں دلی چلے آئے"۔ ان کا بیان سکینہ کی تاریخِ ادب اُردو اور گلشنِ ہند سے لیا گیا ہے۔ گلشنِ ہند ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا۔ غلام علی آزاد نے سروِ آزاد ۱۱۶۶ھ میں لکھا (اور ۱۱۶۹ھ تک اس میں اضافے کئے) نیز آزاد کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ آرزو نے اپنے حالات خود لکھ کر بھیجے تھے:

"در اوائلِ سلطنتِ محمد فرخ سیر بخدمتی از خدماتِ گوالیار مامور گردید و در سنہ اثنتین وثلثین ومائتہ والف (۱۱۳۲) بہ دارالخلافۂ شاہ جہاں آباد آمد و ازاں وقت تا زمانِ حال دریں شہر بسر می برد"[1]

آرزو کے دلی پہنچنے کا سال ۱۱۳۲ھ ہے ۱۱۳۰ھ نہیں۔

لیث صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ "نادری حملے کو آرزو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اُس کے بعد ہی فیض آباد چلے آئے"۔

نادری حملہ بہ اتفاقِ مورخین ۱۱۵۱ھ میں ہوا۔ اگر اس کے بعد ہی چلے آئے تو میر کے، نکات الشعرا میں (جس کا سنِ اختتام ۱۱۶۵ھ ہے) اس بات کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ نیز غلام علی آزاد ۱۱۶۶ھ میں آرزو کا دلی میں ہونا بتاتے ہیں[2]۔ گردیزی نے اپنے تذکرۂ ریختہ گویاں میں جو ۱۱۶۶ھ میں لکھا گیا ان کا دلی میں ہونا لکھا ہے:

تا الی یومنا ھذا در دہلی غیر از صرفِ اوقات در تحصیل و افادۂ طلبہ علم نصب العین ندیست[3]

---

[1] سروِ آزاد ص۲۲۳ — [2] آزاد نے ۱۱۶۹ میں (جیسا کہ آرزو کی تاریخ وفات کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے) لکھا ہے: پوشیدہ نماند کہ بعدِ اتمام سروِ آزاد سراج الدین علی خاں آرزو از شاہجہاں آباد برخاستہ رخصتِ سفر بہ دیارِ شرقی کشید — [3] تذکرۂ ریختہ گویاں ص۶

اس لئے ہیں تو خان اتیاز علی خاں عرشی کی بتائی ہوئی تاریخ (محرم ۱۱۶۸ھ[1]) ہی درست معلوم ہوتی ہے۔

سودا

سودا کا حال تقریباً سارے کا سارا شیخ چاند کی کتاب "سودا" سے ماخوذ ہے۔ البتہ سن پیدائش خود لیث صاحب کا مقرر کردہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"لٹن لائبریری مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں کلیاتِ سودا کا ایک نادر قلمی نسخہ موجود ہے اور اس پر کسی صاحب بچھمی نرائن کی مہر اور ۱۱۶۱ھ لکھا ہوا ہے یہ مہر پر کتاب میں تین جگہ موجود ہیں، نسخہ اول و آخر سے مکمل ہے۔ صرف آخری صفحے پر ایک سطر جلد بندی میں کٹ گئی ہے۔ ممکن ہے اسی میں سن کتابت اور نام کاتب وغیرہ درج رہا ہو۔ اسی طرح اس نسخے کی صحیح کتابت کی تاریخ کا تعین دشوار ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ۱۱۶۱ھ کے بجائے (کی بجائے؟) اس کے قریبی زمانۂ مابعد کا ہو۔ اگر سودا کا سنہ ولادت ۱۱۰۶ھ قرار دادیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دس گیارہ سال کی عمر میں سودا نے دیوان کس طرح مرتب کر لیا۔ لیکن شیخ چاند کا یہ استدلال کہ فوجی ملازمت کے وقت سودا کی عمر ۱۸ سال کے قریب ہوگی اور اسی حساب سے سنہ ولادت ۱۱۰۰ھ سے قبل ہوئی ہوگی۔ اور اگر یہ بھی مان لیں کہ دیوان ۱۱۶۱ھ میں ہی بچھمی نرائن کے قبضے میں آیا تو اس وقت سودا کی عمر پندرہ سولہ سال کی ہو چکی ہوگی۔ اور اس مدت میں سودا جیسے قادر الکلام شاعر کا صاحبِ دیوان ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں[2]۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سودا کی ولادت یقیناً ۱۱۰۰ھ سے قبل ہوئی[3]۔"

تعجب کی بات ہے اگر سودا ۱۱۰۰ھ سے پہلے پیدا ہوئے تو اپنے استاد حاتم سے عمر میں گیارہ سال سے بھی زیادہ ہوئے[4]۔

اس حساب سے حاتم اگر ایہام گوؤں کے دور ——————
سے ہیں تو سودا اس سے بھی پہلے کے دور سے سمجھے جانے چاہئیں، میر تقی میر نے ۴۰ سال کی عمر میں یعنی ۱۱۶۵ھ میں اپنا تذکرہ مکمل کیا وہ سودا کے حال میں لکھتے ہیں "جوانی ست خوش خلق و

---

[1] دیباچہ دستور الفصاحت ص ۳۸ — [2] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۸۸،۸۷۔

[3] یاد رہے کہ لیث نے ۱۱۶۱ھ کے ایڈیشن میں غزلیات کے مکمل دیوان کا ذکر کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سودا کا ۱۱۶۱ھ سے ۱۱۹۵ھ تک کوئی غزل نہ لکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۸۹ — [4] حاتم کی پیدائش بقول مصحفی "ظہور" کے لفظ سے نکلتی ہے یعنی ۱۱۱۱ھ۔

خوش خو"[1] اور اس جوان کی عمر لیث صاحب کے حساب سے (۱۱۶۵ — ۱۱۰۰ = ۶۵) ۶۵ سال سے بھی اوپر ہوئی۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ۱۱۶۵ھ تذکرے کے تو خاتمے کا سال ہے۔ ممکن ہے سودا کا حال بہت پہلے لکھا گیا ہو۔ تو چلئے اندازاً جوانی کے زمانے کو ۳۰ سال کے قریب فرض کر لیجئے۔ اس حساب سے (۱۱۰۰+۳۰ = ۱۱۳۰) ۱۱۳۰ھ میں میر تقی میر نے سودا کا حال لکھا۔ میر کا سن پیدائش (بحوالہ مقدمۂ کلیاتِ میر۔ عبدالباری آسی جس کا حوالہ ایک دو جگہ لیث صاحب نے اپنی کتاب میں خود بھی دیا ہے) ۱۱۳۵ھ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ میر تقی میر نے اپنی پیدائش سے پانچ سال پہلے سودا کے بارے میں لکھا کہ وہ جوان آدمی ہے۔

قائم کے جس بیان سے شیخ چاند نے استدلال کر کے [illegible] نکالا تھا اس کا مطلب چاند صاحب صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے۔ حالاں کہ دکن کے لشکر کے ساتھ جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ سودا نہیں بلکہ سودا کا چچا ہے[2]

صدیقی صاحب نے لچھمی نرائن کی مُہر کی کھُدائی کی تاریخ کو نسخے کی کتابت کا سال بنا دیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے مُہر پر ۱۱۸۶ھ لکھا ہو اور لیث صاحب ۱۱۱۶ھ پڑھ گئے ہوں[3]

لیث صاحب لکھتے ہیں:

"اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ سودا ۱۱۷۳ھ اور ۱۱۷۵ھ کے مابین فیض آباد پہنچے"[4]

سودا کے فرخ آباد چھوڑ کر فیض آباد آنے کی تاریخ بقول شیخ چاند ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان پڑتی ہے[5]۔ اس کی تائید مختار الدین آرزو کے بیان سے بھی ہوتی ہے[6]۔ لیث صاحب کو غالباً سہو ہوا ہے۔

میر حسن

"میر حسن لکھنؤ کس سنہ میں آئے؟ اس کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا

---

[1] نکات الشعرا ص۳۱ — [2] اورینٹل کالج میگزین۔ آبِ حیات پر تنقید (محمود شیرانی) نومبر ۱۹۴۱ء ص۴۳ —
[3] قلمی نسخہ کی مہر ۱۱۶۶ھ کی ہے اس میں قصیدۂ تضحیک روزگار بھی ہے، جس کا موضوع دہلی پر مرہٹوں کا حملہ ہے جو ۱۱۴۹ھ میں ہوا (مکتوب مختار الدین احمد بنام راقم ۲۴/۵/۵۲) — [4] لکھنؤ کا دبستان ص۸۹۔
[5] (چاند) سودا ص۵۶ — [6] (اعتراض نمبر ۵۳) ادبی دنیا دسمبر ۱۹۴۰ء۔ (مختار الدین آرزو) اغلاطِ تاریخِ ادبِ اردو از سکسینہ۔

وہ خود بحرف اتنا لکھتے ہیں کہ شروع جوانی میں ترکِ وطن کرکے لکھنؤ اور فیض آباد آیا مؤلفِ گل رعنا کا خیال ہے[1] کہ اس وقت بارہ تیرہ سال کی عمر ہوگی۔ وفات ۱۲۰۱ھ میں ہوئی۔ اور اس وقت عمر تقریباً ۵۰ سال کی تھی۔ اس حساب سے ۱۱۶۳ھ یا ۱۱۶۴ھ میں پورب آئے ہوں گے۔"[2]

پچاس سال والی بات صحیح نہیں یہ بیان شاید انھوں نے آب حیات (آزاد) سے لیا ہے۔ آب حیات میں ہے:

"عمر کا حال نہ کھلا۔ لکھتے ہیں کہ ۵۰ برس سے زیادہ پائی"[3]

لیکن جو ترمیم اس میں ڈاکٹر صاحب نے کر لی ہے ظاہر ہے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے عمر کا تعین مصحفی کے بیان سے کیا ہو اور "شصت" کا مطلب "پچاس" سمجھا ہو ان کے فارسی نہ جاننے کی مثالیں آگے آتی ہیں مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں:

"عمرش از شصت متجاوز خواہد بود　　فقیر تاریخِ رحلتش چنیں یافتہ:
چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں　　رو ازیں گلزارِ رنگ و بو بتافت[5]
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی　　"شاعرِ شیریں زباں" تاریخ یافت"
۱۲۰۱ھ

۱۲۰۱ میں سے ۶۰ نکالیں تو ۱۱۴۱ برآمد ہوتے ہیں میر حسن اس تاریخ سے پہلے پیدا ہوئے "متجاوز بود" کی قید عبد الباری آسی کے پیش کردہ سن ۱۱۴۰ھ کی تائید میں ہے جوانی میں لکھنؤ سے ہوتے ہوئے فیض آباد آئے لیکن تاریخ کا تعین ممکن نہیں۔ یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو میں "بیدار" کا حال دیکھتے ہیں:

"قریب چہار دہ سال شدہ باشد کہ فقیر او را در لباسِ درویشی در شاہجہان آباد دیدہ"[6]

میر حسن کا تذکرہ ۱۱۸۴ھ میں شروع ہوا اور ۱۱۹۲ تک[7] ـ یا شاید ۱۱۹۵ھ تک اس میں اضافے ہوتے رہے اگر بیدار کا حال ۱۱۸۴ میں لکھا گیا ہے تو دہلی میں میر حسن کا قیام ۱۱۷۰ھ تک ہونا چاہیے

---

[1] یہ بیان مصنف گل رعنا کا اپنا نہیں بلکہ مصحفی کا ہے۔ یہ خیال مصحفی کو شاید سحر البیان کے ہیرو کی نسبت سے آیا ہے اور انھیں گلزارِ ارم اور سحر البیان میں التباس ہوا ہے۔ ورنہ میر حسن خود اپنے حال میں لکھتے ہیں شروع جوانی میں آیا۔ [2] لکھنؤ کا دبستان ص ۹۳ — [3] آب حیات ص ۲۵۷ — [4] تذکرۂ ہندی ص ۶۹۔

[5] جناب عرشی سے استفسار پر معلوم ہوا کہ رام پور کے نسخۂ تذکرۂ ہندی (مصحفی) بخط محسن میں بھی "عمرش از شصت متجاوز خواہد بود" ہی لکھا ہے (مکتوب عرشی بنام راقم، ۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء)۔ [6] تذکرہ شعرائے اردو ص ۳۱۔

[7] دیباچہ دستور الفصاحت ص ۶۶ تا ۶۹

جو قرین قیاس نہیں۔

"۱۱۹۲ھ میں میر حسن نے اپنا تذکرہ ختم کیا اور اس وقت تک وہ فیض آباد ہی میں تھے۔ غالباً اسی زمانے میں میر حسن فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔"[1]

لیٹ صاحب کا یہ قیاس درست نہیں۔ میر حسن سالار جنگ اور اُن کے بیٹے کے ملازموں میں سے تھے۔ ان کے ہاں میر حسن کا زمانۂ ملازمت ۱۱۸۹ھ ہجری سے شروع ہو کر ۱۱۹۹ھ تک تو ثابت ہے۔[2]

اب دیکھنا چاہیئے کہ سالار جنگ لکھنؤ میں کب آئے؟ تاریخ فرح بخش سے معلوم ہوتا ہے کہ شجاع الدولہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو فوت ہوئے۔ آصف الدولہ نے محرم ۱۱۸۹ھ میں لکھنؤ جا کر قیام کر لیا اور نواب سالار جنگ بھی اُن کے ساتھ ہی تھے۔ سالار جنگ کے ہاں شیر علی افسوس کی ملازمت کی مدت جیسا کہ گلشن ہند میں ہے گیارہ سال ہے[3]۔ ۱۱۸۸ھ میں فیض آباد میں شیر علی افسوس سالار جنگ کی ملازمت میں آیا۔ اب یہ باور کر لینا آسان ہے کہ میر حسن سالار جنگ کے ساتھ ہی ۱۱۸۹ھ میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے ہوں گے۔

میر حسن کے بارے میں آگے جا کر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مثنوی (قصرِ جواہر) ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۷ھ کے درمیان لکھی گئی (ص۱۰۶)"

یہ مثنوی میر حسن نے جواہر علی خاں خواجہ سرا کے نو تعمیر محل کے بارے میں لکھی ہے۔ تاریخ فرح بخش میں محرم ۱۱۸۹ھ کے ضمن میں لکھا ہے:

About this time Jawahir Ali Khan rebuilt his house with burnt bricks. It had before been made of mud.

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۹۵

[2] ۱۲۱۸ھ ہجری میں میر شیر علی افسوس کے دیباچے کے ساتھ مثنوی سحر البیان کا ایک ایڈیشن نکلا تھا۔ شیر علی افسوس (جو میر حسن کے بڑے گہرے دوست تھے) دیباچے میں لکھتے ہیں:

راقم کو اس سے دوستی دلی تھی ...... دس برس تک دن رات ایک جگہ رہے ....

آخر چرخ تفرقہ پردازنے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سے ننانوے

میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔

مثنویاتِ میر حسن۔ دیباچہ میر شیر علی افسوس ص۸ (نولکشور ایڈیشن)

[3] گلشن ہند ص۵۶، ۵۷ ــــ ص۴ تاریخ فرح بخش ص۲۱۔

میر حسن نے یہ مثنوی محرم ۱۱۸۹ھ ہی میں لکھی ہوگی یا اس کے بعد ایک آدھ سال کے اندر ۱۱۹۲ء کے قریب تو اس کا موقع نہیں نکل سکتا کیونکہ اس کے بعد سیاسی معاملات الجھ جاتے ہیں۔ جواہر علی بہو بیگم کا ملازم ہے اور آصف الدولہ کے زیر عتاب۔ سالار جنگ غیر جانب دار اور محتاط ہے اس لئے ۱۱۹۲ کے بعد میر حسن کے لئے ایسی مثنوی کا موقع نہیں نکل سکتا۔ اگرچہ وہ اس زمانے میں فیض آباد میں اکثر آتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا باپ میر ضاحک وہیں مستقل طور پر رہنے لگا۔[1]

"موسیقی کی اصطلاحات (میر حسن نے) جس سلیقہ اور صحت کے ساتھ استعمال کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن سے بقدر ضرورت واقف تھے"[2]

اس پر تبصرے کی ضرورت نہیں کیونکہ ۱۹۴۷ء میں رسالہ آجکل میں ایک خاتون اس پر روشنی ڈال چکی ہیں اور ثابت کر چکی ہیں کہ میر حسن موسیقی کے آلات سے بھی واقف نہ تھے۔

"مثنوی تہنیتِ عید (میں) لکھا ہے کہ اب انھیں کے (جواہر علی خاں کے) دامن سے وابستہ ہوں"[3]

یہ اس مثنوی سے ثابت نہیں ہوتا، اس سے تو صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ جواہر علی بنگلے (فیض آباد) میں بڑا علم دوست اور ادب پرور شخص ہے اور یہ کہ میر حسن دو سال فیض آباد سے باہر گذار کر آئے ہیں اس حساب سے یہ مثنوی ۱۱۹۱ء کے قریب جب میر حسن فیض آباد آئے ہوں گے لکھی ہوگی اس میں جواہر علی کے دامن سے وابستگی کا ذکر نہیں۔ اس لئے "۱۱۹۲ء کے بعد"[4] کی تخصیص بیجا ہے۔

"وہ (میر حسن) اپنے صاحب زادے خلیق کو ناسخ کی شہرت کے باوجود مصحفی کا شاگرد کراتے ہیں"[5]

پھر میر خلیق کے حال میں لکھتے ہیں:

"اس وقت مصحفی لکھنؤ پہنچے۔ یہ واقعہ ۱۱۸۵ھ کے بعد کا ہے میر حسن سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے خلیق کو انھیں کے سپرد کیا"[6]

یہاں ڈاکٹر صاحب کو دو مغالطے ہیں ایک تو مصحفی کے لکھنؤ میں قیام میں ۱۱۸۵ھ کا ذکر کیا ہے

---

[1] الحال کہ سالِ ہزار و صد و نود و شش ہجری باشد شنیدہ شد در فیض آباد بوارستگی می گزارند گلزار ابراہیم ص۱۷۲ — [2] لکھنؤ کا دبستان ص۹۶ — [3] لکھنؤ کا دبستان ص۱۰۳

[4] لکھنؤ کا دبستان ص۱۰۳ — [5] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۱۱۲

[6] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۱۱۳۔

حالاں کہ میر حسن اس وقت لکھنؤ میں نہیں تھے وہ تو ۱۱۹۸ھ کے قریب آئے دوسرے ان کا خیال ہے کہ خلیق کے شاگرد مصحفی ہونے کے وقت مشہور ہو چکے تھے۔

مصحفی کے لکھنؤ میں قیام کا سن ۱۱۹۸ھ ہے؟ (مفصل بحث مصحفی کے تحت دیکھئے) اس وقت تک ناسخ اتنے مشہور نہ تھے۔ ناسخ کا ذکر شعرا کی فہرست میں سب سے اول چیف رامپوری کی ڈائری میں آتا ہے یعنی ۱۲۲۹ ہجری میں[1] دوسرا بیان مصحفی کا ہے۔ مصحفی تذکرۂ ہندی میں تو اس کا ذکر نہیں کرتے (کیونکہ ۱۲۰۹ھ سے ۱۲۲۶ھ تک ناسخ مشہور نہیں ہوا تھا) البتہ ریاض الفصحا میں (۱۲۲۱ھ سے ۱۲۳۶ھ) اس کے حال میں لکھتے ہیں:

"عمرش سی و ہفت سالہ است از سنِ بست سالگی بمقتضائے موزونیٔ طبع فکر ہندی می کند"۔

شاعری کا شوق بیس سال سے ہے(؟) لیکن شہرت ۱۲۲۹ کے قریب ہی شروع ہوئی۔ اس لئے ۱۱۹۸ھ میں ناسخ کا شاگرد کرانا بے معنی تھا۔

میر قمر الدین منت

ان کے حال میں لیث صاحب نے تمام ماخذوں کی ورق گردانی نہیں کی۔ یہی حال جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیراں کا کیا ہے۔ یہاں بھروسہ محض گلشن ہند پر کر لیا گیا ہے حالاں کہ لیث صاحب کے سامنے جتنے تذکرے تھے ان میں تقریباً سب میں ان کا حال موجود تھا۔ منت کے حال میں تفحص کرنے پر انھیں مصحفی کے تذکرۂ ہندی[2] اور عقد ثریا[3] میں بڑا تفصیلی حال ملتا۔ اسی طرح تذکرۂ میر حسن[4] سے انھیں منت کے قیام فرخ آباد کا پتہ چلتا ان کے استاد کے بارے میں لیث صاحب نے لکھا ہے:

"شاعری میں میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے"[5]

مصحفی لکھتے ہیں:

"چندے استفادۂ ریختہ از محمد قائم نمودہ۔ چناں چہ مشارٌالیہ اورا در تذکرۂ خود ہمیں جہت بہ شاگردی یاد کردہ۔ ہرگاہ ...... بہ فارسی گوئی برآورد در آں زماں خود را شاگردِ میر شمس الدین فقیر می گوید و چندے پیشِ فتوت حسین خاں ہم آمد و شدی داشت"۔

---

[1] دستور الفصاحت (فٹ نوٹ) ص۱۱۴

[2] تذکرۂ ہندی ص۲۰۳ — [3] عقد ثریا ص۵۴

[4] تذکرہ شعرائے اردو ص۱۵۸ — [5] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۱۱۰

حسرت

حسرت کا دل مصحفی کے تذکرۂ ہندی اور میر حسن کے تذکرے میں بھی موجود تھا۔ لیکن اس جگہ ان سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ جو بیانات مرقوم ہیں ان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"غلام قادر کے ہاتھوں شاہ عالم پر جو گذری اُسے حسرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا...... اس مصیبت میں دلّی سے باہر نکلے اور فیض آباد پہنچے..... فیض آباد پہنچے تو نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب کے سامنے حسرت نے اپنا قصیدہ پڑھا اور صلے میں کچھ وظیفہ ہوگیا شجاع الدولہ کے بعد آصف الدّولہ کی بدولت..... حسرت بھی لکھنؤ پہنچے .... اس زمانے میں شاعری کے علاوہ ان کی دولت بھی معاصرین کی نظروں میں کھٹکتی تھی۔ چنانچہ بہ کثرت نظمیں ان کی ہجو میں لکھی گئیں جن میں سودا نے بھی حصہ لیا"[1]

شاہ عالم کی آنکھیں ۷ ذی قعدہ ۱۲۰۲ ہجری کو نکالی گئیں[2]۔ اور شجاع الدولہ (بحوالہ تاریخ فرح بخش) ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو فوت ہوا۔ اب اگر پہلا بیان صحیح ہے کہ شاہ عالم کی کوری کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تو شجاع الدولہ کے سامنے قصیدہ پڑھنے کا واقعہ درست نہیں۔ اسی طرح سودا کی ہجو پر بھی نظر رہے اور یہ بھی کہ سودا ۱۱۹۵ھ کو فوت ہوجاتے ہیں۔ شاہ عالم کا آنکھوں دیکھا حال درست نہیں معلوم ہوتا ۱۱۹۶ھ میں ہم حسرت کو لکھنؤ میں مقیم پاتے ہیں۔ خلیل گلزارِ ابراہیم میں لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۱۹۶ھ میں ان کے اشعار کو لکھنؤ سے بنارس طلب کیا[3]۔

میر تقی میر

"در ۱۱۹۷ھ میں رایاتِ عزم اس صاحب لشکرِ مضامینِ تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ تشریف لائے"[4]

لیکن یہ درست نہیں۔ میر تقی میر ۲۳ ربیع الاوّل ۱۱۹۶ھ سے پہلے اور ۱۶ محرم کے بعد لکھنؤ گئے[5]۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک سال کا فرق ڈال دیا ہے۔

۱؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۲۰ — ۲؎ دیباچۂ نادراتِ شاہی (عرشی)، ص ۲۹

۳؎ گلزارِ ابراہیم ص ۱۰۱ ، ۷ ذیقعدہ ۱۲۰۲ھ = ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء ۴؎ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۲۹ (بحوالہ گلشن ہند)

۵؎ تفصیل کے لئے مختار الدین آرزو کا مضمون ادبی دنیا دسمبر ۱۹۴۰ء ملاحظہ فرمائیے۔ جہاں ثابت کیا گیا ہے کہ میر ۱۶ محرم ۱۱۹۶ھ کے کئی ہفتے بعد اور ۲۳ ربیع الاول ۱۱۹۶ھ سے کچھ پہلے دہلی چھوڑی اور لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔

"میر کی (خاتمہ بالخیر کی) آرزو ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں پوری ہوئی۔ ۸۸ یا ۸۹ سال تک
اس دورِ قیامت میں میر نے زندگی بسر کی"[1]

یہاں پر عمر کا تخمینہ درست نہیں۔ فہرستِ ماخذات میں لیث صاحب نے کلیاتِ میر مرتبہ آسی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس سے رجوع کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ میر ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے اس حساب سے اُن کی عمر ۸۸ یا ۸۹ نہیں بلکہ پورے ۹۰ سال کی ہوتی ہے۔

جرأت

"بچپن میں ہی لکھنؤ چلے آئے"[2]

تذکرۂ میر حسن سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں فیض آباد آئے[3] جوانی میں لکھنؤ آئے ہوں گے۔

انشا

"یہ تذکرہ (اشرف علی خاں کا تذکرہ) ۱۱۷۸ھ / ۶۵-۱۷۶۴ء کی تصنیف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انشاء اللہ خاں فیض آباد میں موجود اور شجاع الدولہ کے متوسلین میں تھے"[4]

شجاع الدولہ ۱۱۷۸ھ تک لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اسی سال وہاں سے نکلے اور سال بھر اِدھر اُدھر پھرتے رہے ۱۱۷۹ھ میں فیض آباد میں رہائش کی۔ اشرف علی خاں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا ہوگا[5]

اب "لکھنؤ کا دبستان شاعری" سے ایک طویل اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے ڈاکٹر صاحب کی فارسی دانی پر روشنی پڑے گی (اور اس کے بالمقابل مجموعۂ نغز کی اصل عبارت بھی لکھی جاتی ہے)

لکھنؤ کا دبستان	مجموعۂ نغز
چنانچہ یہ لوگ (عظیم اور انشا) ایک دوسرے	برائے تجہین وتذلیل بہر یکے ازما (عظیم وقاسم)
کے درپے آزار رہا کرتے تھے اتفاقاً ایک روز	قابو می جستند تا روزے مرزا مذکور غزلے طرح
عظیم، انشا کے والد سے ملاقات کو گئے اور	انداخت و بنا بر غرورے کہ در سر داشت لا
اپنی ایک تازہ غزل سنائی۔ غزل بحر رجز میں	ابالیانہ بفکرِ مضمون ومعانی افتادہ در عینِ شاعری
تھی لیکن لاپروائی کی وجہ سے کہیں بحرِ رمل میں	بحر رجز غوطہ خوردہ بہ بحرِ رمل افتادہ و بعدِ انصرام

۱۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۳۱ —— ۲۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۳۳ ۳۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۸
۴۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۵۱، ۵۔ لیث صاحب کی تقلید میں یہی غلطی رحمت بنی، خاں صاحب سے بھی ہوگئی ہے، دیکھئے انشا کی حیات نگار اکتوبر ۱۹۴۷ء ص ۲۷۔

لکھنؤ کا دبستان

یں بھی لکھ گئے تھے۔ انشا نے اپنی طباعی سے فوراً دریافت کر لیا۔ لیکن موقع غنیمت سمجھ کر خوب تعریف کی اور مشاعرے میں پڑھنے کا مشورہ دیا۔ مرزا مینڈھو کے ہاں مشاعرہ منعقد ہوا اور عظیم نے غزل پڑھی۔ انشا کی طرف دیکھا تو انشا نے مسکرا کر تقطیع کرنے کی فرمائش کی۔ . . . . . . عظیم اور ان کے موالیوں کو بڑی ندامت ہوئی۔ انشا کو جو موقع ہاتھ آیا تو ایک مخمس جو غالباً پہلے سے لکھ کر لائے تھے پڑھ ڈالا . . . . ان واقعات کو لکھتے ہوئے قاسم کہتے ہیں:

مجموعۂ نغز

غزل بے آں کہ رو برسے محبان و دوستان بخواند بے تحاشا بحضورِ میر ماشاءاللہ خان مرحوم کہ دوست و محسنِ مرزا سے مغفور بود برخواند قضارا میرِ موصوف مجلس نشین پدرِ بزرگوارِ خود بود۔ حریفانہ تحسینِ بلیغ نمودہ کمرر بگوشِ ہوش شنودہ یاد گرفتہ۔ بافواہِ یاراں انداخت و در عینِ مجمعِ شعرا تکلیفِ تقطیع نمودہ مرزا را ملزم ساخت . . . . .

"ناخوشئ صاحباں بہ مرتبہ رسید کہ در ہر غزل فخرِ خود و اہانتہا رمز و کنایہ می کردند۔ گاہے چند لفظ تازی را ایہام دادہ موزوں می نمودند گاہی غزلیات صناعی انشا می فرمودند"

اس کے بعد انشا اور اُن کے ساتھیوں نے شاہ زادے کو عظیم اور اُن کے دوستوں کے خلاف بھڑکایا اور یہ خبر پہنچائی کہ قاسم اور اُن کے دوسرے ساتھی ایک محفل میں شہزادے کے اشعار کا مذاق اڑا رہے تھے۔ شاہ زادے کو قدرتی طور پر ناگوار گذرا اور انھوں نے حکم دیا کہ آئندہ سے ان کے اشعار مجلسِ سخنوراں میں نہ پڑھے جائیں۔ انشا نے ہجو لکھنے کی اجازت بھی چاہی مگر شاہ زادے نے درگذر کی۔

قاسم اور ان کے دوستوں نے اس

رفتہ رفتہ ناخوشئ صاحباں بمرتبۂ رسید کہ در ہر غزل فخرِ خود و اہانتہا برمز و کنایہ می کردند گاہے چند لفظِ تازی را التیام دادہ موزوں می نمودند گاہے غزلیات سناعی انشا دمی فرمودند ناچار چوں کار پیش نمی رفت و نقش بدست نمی نشست حرکتے از ایشان سرزد کہ شائستۂ ہیچ عامی صاحب غرض نبود تا بہ خاصانِ خود چہ امکان دارد روزی بعرضِ اعلیٰ اقدس حضرت سلیمان مکانی ظلِ سبحانی دام ملکہٗ رسانیدٗ کہ فلاں فلاں سببے چارگاں در مجمعِ عام شعرا وغیرہا بر اشعارِ آب دارِ حضورِ پر نور بے محابا بہ قاہ قاہ می خندند . . . . . . حضرت قدر قدرۃ کہ آفتابِ عالم تاب ذرہ نوازند از مرِ دیدہ دری و ذرہ پروری بہ عرض گوئی

کا جواب ایک عربی نظم میں دیا۔ اب مخالفت نے بھی شدت اختیار کی۔ انشا اور اُن کے ساتھیوں نے ایک جلوس مرتب کیا اور راہ میں ایک جگہ بیٹھ کر اشعار اور سنان و تیغ سے جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ شیخ ولی اللہ محب وغیرہ نے اس کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی اور واقعہ کی خبر شہزادے تک پہنچا دی۔ اس کے بعد جلوس مشاعرہ میں پہنچا۔ انشا اللہ خاں نے اپنی غزل بڑے دھوم دھام سے پڑھی جس میں اپنے کو بحرِ بے کراں اور مخالفین کو سیلِ بیاباں قرار دیا تھا۔ اور اپنے اشعار کو الم ترکیف اور مخالفین کے اشعار کو الفیل و ماالفیل کہا۔ شاہ زادے اور شیخ ولی اللہ وغیرہ نے بہت چاہا کہ انشا غزل نہ پڑھیں لیکن یہ لوگ باز نہ آئے یہاں تک کہ خود قاسم کی ہجو کی نوبت آئی۔ یہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ اس سیدِ بے چارہ نے کیا قصور کیا ہے جو اپنے عزیز مسیلمہ کذاب کا خطاب دیتے ہو۔ قاسم چاہتے تھے کہ ہجو کا کچھ جواب دیں۔ لیکن شاہ زادے نے روک دیا اور آپس میں ملاپ کرا دیا۔[1]

ایشان بے پردہ فرمودند کہ اشعارِ حضورِ والا ازیں باز بمجلسِ سخنوراں نخوانند...... ایشاں باز معروض داشتند کہ ما ہجو ایں بے ادباں خواہیم کرد۔ حکمِ ارفعِ اعلیٰ عزِ صدو ریافت کہ زینہار ازیں خیالِ محال در گزرند...... (ما) از ارواحِ مقدسہ..... غوث...... استعانت جستہ باہم استشارہ بمیان آوردہ۔ آنچہ در جوابِ صاحبان اشعارِ عربی وغیرہ رطب و یابس سر انجام یافتہ۔ مہیا ساختہ۔ نظر بہ پاسِ آبروے چندرا از یارانِ یک دل فراہم آوردہ۔ بعضی در کمیں گاہ نشاندہ و برخے ہمراہ گرفتہ۔ بہ عزم بالجزم رزم زبان و بیان و تیغ و سناں بہ بزمِ سخن طرازاں حاضر شدیم۔ اتفاقاً شیخ ولی اللہ محب..... ثالث بالغیب بود۔ بسببِ قرب و جوار برایں گفتار و کردار اطلاع یافتہ در اطفاءِ نائرہ ایں فتنہ کہ سر بہ بالا کشیدہ بود بدرجۂ اعلیٰ کوشید و قبل از وقوعِ واقعہ بنواب معلی القاب رسانید و ایں بزرگان (انشا وغیرہ) بغرورِ خود سری بمجلس رسیدہ بودیہ کہ داشتند انشادِ غزلیاتِ فخریہ آغاز نہادند۔ میر معزالیہ غزلے بہ شدو مدِ تمام برخواند کہ در روے خود را بحرِ بیکراں و دیگراں را سیلِ بیاباں قرار دادہ و اشعارِ عربیٔ خود را الم ترکیف تنزیل حضرتِ وہاب و گفتۂ حریفاں را الفیل و ماالفیل مسیلمہ کذاب مقرر نمودہ بود۔

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴

مجموعۂ نغز

نواب والا جناب و شیخ ولی اللہ محب الاحباب
برمز و کنایہ ہر چند مانع می آمدند ایشان از
خواندن منع نمی شدند .... آتش غضب
دو بالا می شد و زباں نہ می زد ..... خاموش
نشستہ پیچ و تاب می خوردم تا دورۂ سخن
بمن رسید۔ بامیر صاحب تدبیر، غافل از تقدیر
قدیر خطاب نمودہ معروض داشتم کہ اندکے
گوش دارند ایں سیدِ بیچارہ کہ از بنی اعمام
خود وسیلۂ خطاب یافتہ انفیل و افیلِ خود
می خواند۔ ساعیاں اطفاء نائرۂ فساد چوں
در عینِ خواندنِ شعرائے دیگر بگوشِ ہوش ایں
سخن سنجان صراحۃً صورت حال رسانیدہ
بودند۔ بمجرد خطابِ ایں احقر یقیں خاطرِ عاطرِ
ایشان و نوابِ عالی بیان شد کہ ہجوے رکیک
می خواند و حاش للہ کہ ایں ہیچ مدانِ سراپا
نقصان ہجو کسے خاصہ سیدے اہلِ علم و ہنر
پردازد۔ بے اختیار نوابِ کامیاب بزرگی
را کار بستہ با ایں صاحبان و محبِ مہربان
از جائے خود جستہ بجائے ما رسیدہ دلجوئی
ما فرمود ...... (۱)

شروع کے پیراگراف میں مجموعۂ نغز کا ترجمہ آبِ حیات کی مدد سے کیا گیا ہے اس لئے وہ رنگ آمیزی جو آزاد نے کی ہے شامل کرلی گئی ہے۔ البتہ "اتفاقاً" کا لفظ لیث صاحب نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ "مشاعرے میں پڑھنے کا مشورہ دیا" کا ٹکڑا آبِ حیات (ص ۲۶۲) سے لیا ہے۔ "مسکراکر" کا اضافہ خود ان کا اپنا ہے۔ بعد کا حصہ مجموعۂ نغز کا ترجمہ ہے۔

۱۔ مجموعۂ نغز ص ۸۳، ۸۴، ۸۵

فارسی کا اقتباس جو لیث صاحب نے دیا ہے۔ اس میں 'بہ رمز' کی جگہ 'رمز'، 'التیام' کی جگہ 'ایہام'، 'انشاد' کی جگہ 'انشا' کر دیا ہے۔ جو درست نہیں نیز جا بجا شاہ زادے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً شاہ زادے کو عظیم اور ان کے دوستوں کے خلاف بھڑکایا۔" "شیخ محب نے شہزادے کو خبر دی۔" "شہزادے اور محب نے انشا کو غزل پڑھنے سے منع کیا" شہزادے نے آپس میں ملاپ کرا دیا۔" دونوں بیانوں کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انشا نے جس سے شکایت کی وہ شہزادہ نہیں "ظلِ سبحانی دام ملکہٗ" ہے یا بہ الفاظِ دیگر شاہ عالم بادشاہ ہے۔ محب نے جسے خبر دی اور جس نے آپس میں ملاپ کرایا وہ شہزادہ یا شاہ عالم نہیں بلکہ (جیسا کہ قاسم نے لکھا ہے) "نوابِ معلیٰ القاب" اور "نوابِ والا جناب" یعنی امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر مرزا امیڈو صاحب امیر تخلص ہے جس کی مجالس میں یہ فساد ہوئے

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اقتباس میں جلوس کے نکلنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ حالاں کہ قاسم کے فقروں میں جلوس کے نکلنے کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں اور نہ صاحبِ آبِ حیات نے ایسا لکھا ہے ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انشا نے جب ہجو پڑھی اور پڑھتے پڑھتے قاسم کے خلاف کہنے لگے تو قاسم اٹھ کھڑے ہوئے۔ حالاں کہ قاسم کہتا ہے کہ انشا کے پڑھ چکنے کے بعد جب میری باری آئی تو میں نے کہا "مجھ سید بیچارہ سے [جسے میرے چچا زاد بھائی (انشا اور قاسم دونو سید تھے) نے مسیلمہ کا خطاب دیا ہے] اب الفیل و ما الفیل شنیدہ لوگوں نے سمجھا کہ میں ہجو کرنے لگا ہوں۔ حالاں کہ میں کسی کی ہجو نہیں کرتا اور پھر ایک سید کی" ۔ لیث صاحب نے قاسم کے بیان کو الٹ دیا ہے۔ قاسم نے نہ "میرا کیا قصور ہے" کہا۔ اور نہ وہ "چاہتے تھے ہجو کا جواب دیں" یہ صحیح نہیں کہ "قاسم چاہتے تھے ہجو کا کچھ جواب دیں لیکن شاہ زادے نے روک دیا۔"

"انشا ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء کے قریب لکھنؤ گئے۔"[1]

انشا کے کلیات میں ایک قصیدہ الماس خاں کی مدح میں موجود ہے۔ جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ میں وارد ہوئے۔[2]

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں نواب سے بگڑ گئی۔ اس کے بعد واقعات میں بڑا اختلاف ہے سب سے دل چسپ بیان آزاد کا ہے۔ جو تنخواہ بند ہونے۔ جوان لڑکے کا انتقال اور دیوانگی

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری [2] تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے "تحقیقی نوادر" آمنہ خاتون (مقالہ انشاد کے مربی)

کا بیان کر کے انشا کی حالت کو بہت دردناک بناتے ہیں۔ حیاتِ دبیر کے مصنف۔ اوج کی زبانی
اُن امور کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہ تنخواہ بند ہوئی اور نہ دیوانے ہوئے صرف نواب کا
یہ حکم تھا کہ سوائے دربار کے کہیں نہ جائیں اور دربار میں بھی بلائے بغیر نہ آئیں [1]
افسوس ہے بعد کے بیانات میں اتنا اختلاف نہیں جتنا ڈاکٹر صاحب نے خیال کر لیا ہے۔ اگر وہ
تلاش کرتے تو دیکھتے کہ انشا آخر عمر میں دیوانہ ہوئے نیز نواب کی طرف سے تنخواہ بھی بند ہوئی۔
انشا کے بارے میں خاصے حالات ان کے گہرے دوست مرزا محمد حسن قتیل کے رقعات میں
ملتے ہیں [2] (یاد رہے کہ قتیل دریائے لطافت کی تالیف میں بھی شریک تھے) وہ اپنے ایک رُقعے میں
۱۳ جمادی الاول سنہ ۱۲۲۲ھ (آزاد کو خط کی تاریخ میں مغالطہ ہوا ہے اور انھوں نے ۱۲۲۵ھ
لکھ دیا ہے) لکھتے ہیں:

"احوالِ خانِ مذبور این است کہ از دو ماہ برطرف شدہ و بہ سبحان قلی بیگ رباب
کہ آشنائے پنہاں سالہ اش بود اُو را در تمام شہر رسوا نمودہ چند ہجو برانش
گفتہ کہ جا بجا نقل برداشتہ شدہ"

اسی طرح یہ خیال کہ انشا پاگل نہیں ہوئے تھے درست نہیں۔ اسد علی یکتا جنھوں نے اپنی کتاب
دستور الفصاحت ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰ھ میں مکمل کی اور اس پر ۱۲۴۹ھ میں نظر ثانی کی۔ لکھتے ہیں:

آخر آخر مجنوں شدہ۔ چند سال گذشتہ بود نہ کہ بہاں مرض در گذشت [3]۔

ان صریحی بیانات کی موجودگی میں لیث صاحب کے بیان کی وقعت کم ہو جاتی ہے۔ اور معاملہ
اتنا اختلافی نہیں رہتا۔

مصحفی

مصحفی کے حال میں بہت زیادہ اغلاط ہیں اور خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی نئی کتاب "مصحفی
اور اس کا کلام" میں ان کی اصلاح کریں گے لیکن کتاب دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف
وہ اغلاط برقرار ہیں جو لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں کی گئی تھیں بلکہ بہت کچھ نقائص اور اغلاط میں
اضافہ ہو گیا ہے (مصحفی اور اس کا کلام، ہمارے موجودہ موضوع سے خارج ہے) ہم مصحفی کے
حال میں دو چار بڑی غلطیوں کی نشان دہی پر قناعت کرتے ہیں۔

---

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۶۲ ۔۔۔ [2] تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کا مقالہ "مرزا محمد حسن قتیل"
ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۴۸) ص ۲ و ص ۳ ۔۔۔ [3] دستور الفصاحت ص ۱۰۶ یاد رہے کہ
یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں مولانا عرشی کے حاشیوں کے ساتھ رام پور سے چھپ چکی تھی۔

مصحفی کے حال کے لئے موجودہ زمانے میں "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" کی تدوین سے پہلے ۱۹۴۰ء میں بڑے معرکے کے دو مقالے چھپ چکے ہیں۔ نگار کا مصحفی نمبر (خاص کر امیر احمد علوی کا بےنظیر مقالہ[۱]) اور مختار الدین آرزو کا سکسینہ کی اغلاط پر مضمون (ادبی دنیا دسمبر ۱۹۴۰) اس موضوع پر اچھے مقالے تھے۔ لیث صاحب کی اہم اغلاط یہ ہیں:-

(i) مصحفی ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) میں پیدا ہوئے[۲]

(ii) مصحفی ۱۱۶۶ھ کے قریب دلی آئے ہوں گے[۳]

(iii) مصحفی ۱۱۸۵ھ کے بعد لکھنؤ آئے[۴]۔ (ایک جگہ ۱۱۸۰ھ بھی لکھا ہے)[۵]

(iv) مصحفی ۱۱۹۷ھ میں دوبارہ لکھنؤ آئے[۶]

(v) مصحفی ۱۲۴۱ھ میں فوت ہوئے[۷]

مصحفی کے سنِ پیدائش پر بحث کرتے کرتے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی عبدالحق ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۶ھ کے درمیان دیتے ہیں اور حسرت موہانی ۱۱۶۴ھ۔ اور یہ کہ ۱۱۵۶ھ اور ۱۱۶۴ھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان کے خیال میں آٹھ سال کی مدت کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونو بیان صحیح نہیں۔ مصحفی ۱۱۶۲ھ کے قریب پیدا ہوئے[۸]

دوسرا بیان اُن کے چوتھے بیان کی روشنی میں مضحکہ خیز ہے۔ مصحفی پہلی بار لکھنؤ کب گئے؟ اور دوسری بار ان کا جانا کب ہوا؟ اور دہلی میں ان کا قیام کس سن سے کس سن تک رہا؟ اس کی کیفیت یہ ہے کہ مصحفی عقدِ ثریا میں لکھتے ہیں:

"بےتاب۔ محمد حیات نام دارد۔۔۔۔۔ در ایامے کہ فقیر ہمراہِ غلام علی خاں ولد بھکاری خان کہ مشارٌ الیہ از پیش گاہِ خلافتِ جہاں بانی خلعتِ نوازشِ شاہانہ برائے بندگانِ عالی وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر در سرِ ہشتن گورنر بہادر بود۔ در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و ہشت صعوبتِ سفر کشیدہ از شاہجہاں آباد در لکھنؤ رسیدہ۔۔۔۔۔"[۹]

۱۔ حیاتِ مصحفی ص ۶۷ تا ۶۹۔ نگار مصحفی نمبر ص ۲ ——— ۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۶۹

۳۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۱۷۱ ——— ۴۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۷۵ ———

۵۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۷۳ ——— ۶۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۸۰ ———

۷۔ (آرزو کا مقالہ) ادبی دنیا اور نگار (مصحفی نمبر) ص ۹ ——— ۸۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۸۳

۹۔ عقدِ ثریا ص ۱۴

یہیں پر مصحفی نے قتیل کے کہنے پر مستقل قیام کر لیا۔ اب لکھنؤ کی دوبارہ آمد کا سال ۱۱۹۸ھ ہوا۔ دیکھنا یہ ہے کہ مصحفی دہلی میں کتنا عرصہ رہے۔ لیث صاحب مصحفی سے نقل کرتے ہیں کہ بارہ سال دہلی میں قیام پذیر رہے[1]۔ مصحفی کا بیان ہے:

دوازدہ سال در شاہجہاں آباد بہ دورِ نجف خاں مرحوم بگوشۂ عزلت گزیدہ[2]

نجف خاں کے بارے میں لیث صاحب لکھتے ہیں کہ دہلی میں ۱۱۸۵-۹۶ھ تک ان کا دور دورہ تھا[3] اب یہی بارہ سال مصحفی کے قیامِ دہلی کے قرار پاتے ہیں[4]۔ حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے تذکرۂ ہندی اور عقدِ ثریا پر نظر نہ کی۔

مصحفی کوئی ۲۴ سال کی عمر میں دلی آئے[5] اور ۱۱۹۸ھ تک عموماً دلی ہی میں رہے۔ اس دوران میں آنولہ۔ ٹانڈہ اور لکھنؤ بھی دیکھا (پہلی بار لکھنؤ آنے کی تاریخ ۱۱۸۵ھ ہے[6]) اور ایک سال ہی میں واپس دلی لوٹ گئے۔ دوبارہ لکھنؤ ۱۱۹۸ھ میں آئے ہیں ۱۱۹۷ھ میں نہیں۔

مصحفی کا سالِ وفات ۱۲۴۱ھ نہیں ۱۲۴۰ھ ہے۔ اور مصحفی کے شاگرد غلام اشرف افسردہ اشرف کے قطعۂ تاریخ

مصحفی نے سجا مقامِ بہشت
۱۲۴۰ھ

سے اس کی تائید ہوتی ہے[7]۔

مصحفی کے حال کے ساتھ کتاب کا پانچواں باب ختم ہوتا ہے اور ہمارا جائزہ ۲۱۳ صفحے تک پہنچا۔ کل کتاب کے ۶۱۲ صفحات ہیں۔ اس تھوڑے وقت میں تمام کتاب کا جائزہ ممکن نہیں۔ اس لئے مضمون کو ایک چھوٹے سے لطیفے کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے۔ اس لطیفے کا تعلق چھٹے باب کے ابتدائی حصے سے ہے جو ناسخ کے حال پر مشتمل ہے۔ قطعِ نظر اس بات کے کہ لیث صاحب ناسخ کو نواب محمد تقی خاں ترقی کی سرکار میں فیض آباد میں ملازم کراتے ہیں[8]۔ حالاں کہ

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص۱۸۰ — [2] تذکرۂ ہندی ص۲۴۸

[3] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص۱۵۱ نیز مختار الدین آرزو لکھتے ہیں کہ نجف خاں کی قبر پر جو کتبہ قطعۂ تاریخ کا کندہ ہے اس سے ۱۱۹۶ھ برآمد ہوتا ہے ..... نجف خاں نے ۲۴ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ کو انتقال کیا۔

[4] نگار (مصحفی نمبر) ص۱۷ — [5] نگار ص۳ — [6] ۱۱۶۱ھ کو تاریخ پیدائش مانیں تو ۱۱۸۵ھ تک ۲۴ سال ہوئے۔ آرزو کا خیال ہے ۱۱۸۴ھ میں آئے۔ اس حساب سے ۲۳ سال کے تھے۔

[7] (ادبی دنیا) مختار الدین آرزو (بحوالہ قاضی عبدالودود) نگار ص۵۵

[8] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۲۱۷۔

مصحفی کا بیان ہے کہ "بہ لکھنؤ بہ سنِ تمیز رسیدہ"[1] اور پھر یہی کہتے ہیں کہ "لکھنؤ میں ہی تعلیم اور شاعری کی طرف متوجہ ہوئے"[2] اور ساتھ ہی یہ بھی کہ "ابتدا ہی سے شاعری کا شوق تھا غالباً نواب محمد تقی خاں کی ملازمت میں پیدا ہوگیا تھا"[3]۔ مزے کی بات تو آگے جاکر ہوتی ہے:

"آٹھ سال تک ناسخ کی قسمت کا ستارہ بلند رہا۔ ۱۲۴۳ھ ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر مسند نشین ہوئے۔ سب سے پہلے انھوں نے معتمد الدولہ کو معزول کیا۔ اور میر فضل علی کو اعتماد الدولہ کا خطاب دے کر وزیر بنایا۔ یہ وہی فضل علی ہیں جو بادشاہ بیگم کی سرکار میں داروغہ تھے اور جن کی شکایت ناسخ کی تحریک پر محسن الدولہ نے نواب مرحوم سے کی تھی۔ اب ناسخ کے زوال کا زمانہ آیا۔ شاید مصائب ان کے مقدر میں تھے۔ ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۰ء میں حکیم مہدی بلائے گئے جن کے لکھنؤ سے نکلنے پر ناسخ نے غزل کہی تھی۔ سارے پرانے واقعات تازہ ہوگئے۔ ناسخ طلب کئے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ چوب دار پہنچا تو انھوں نے دے دلاکر اُسے راضی کیا اور گھر سے نکل بھاگے۔ اس کی وجہ آزاد کچھ اور بیان کرتے ہیں:

> "غازی الدین حیدر نے آغا میر سے کہا کہ شیخ ہمارے دربار میں آکر قصیدہ پڑھیں تو ہم ملک الشعرائی کا خطاب دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ سلیمان شکوہ بادشاہ ہوجائیں تو خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے۔ میں ان کا خطاب لے کر کیا کروں گا، اس پر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔"

لیکن ناسخ کی طبیعت سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے دربار میں قصیدہ خوانی کو اپنے مرتبے سے گراہوا خیال کریں۔ جب کہ وہ اس سے پہلے معمولی امرا اور وزراء کے دامنِ دولت سے وابستہ رہنے پر فخر کرتے تھے۔"[4]

اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ لیث صاحب نصیر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر کو ایک ہی آدمی سمجھتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

---

1. ریاض الفصحا ص ۲۳۴
2. لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ص ۲۱۷
3. " " ص ۲۱۷
4. " " ص ۲۲۰

دہلی سوسائٹی

از سجن لال صاحب ــــــــــــ مترجم۔ اطہر ملک

(بہ سلسلۂ اشاعت ماہ اپریل ۱۹۵۲ء)

سوسائٹی اپنے وقت کے اہم مسائل اور اختلافی امور پر بھی بحث کیا کرتی تھی۔ حکومت کی جانب سے عائد کردہ انکم ٹیکس ایک مباحثہ کا موضوع بنا۔ سوسائٹی اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی تھی لیکن تعجب کی بات ہے کہ جب اس پر رائے شماری ہوئی تو تیرہ ممبروں نے احتجاج کی مخالفت میں اور گیارہ نے موافقت میں رائے دی۔ چناں چہ احتجاج کی تجویز کو ترک کردیا گیا۔

اسی طرح سوسائٹی نے ہندو قانونِ تبنیت پر بحث کی۔ سوسائٹی اس قانون میں بعض تبدیلیوں کی خواہاں تھی۔

دہلی کالج کے پرنسپل کالج کے لئے ایک وظیفہ کی درخواست لے کر سوسائٹی کے پاس پہنچے۔ انھوں نے بتایا کہ چوں کہ شرفائے دہلی کی جانب سے کافی عطیے موصول نہیں ہو رہے ہیں طلباء وظائف کی کمی کی وجہ سے اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے اور کالج چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

اس صورتِ حال سے سوسائٹی کو بڑا صدمہ ہوا۔ سوسائٹی کے صدر نے بتایا کہ سوسائٹی اپنے طور پر وظائف دینے سے قاصر ہے لیکن انھوں نے اراکین سے فرداً فرداً استدعا کی وہ کالج کو عطیات پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں۔ انھوں نے رؤسا کے دستِ اعانت نہ بڑھانے پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے کہا کہ انھیں زیادہ فیاضی سے کام لینا چاہیئے۔ نیز یہ بھی کہا کہ گورنر صاحب کی تشریف آوری پر ہم رؤسا سے بیش بہا عطیات کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

پادری سمتھ نے کہا کہ رؤسا کے لئے یہ بات باعثِ شرم ہے کہ وہ محض گورنر صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے عطیات دیں۔ ان کا تو دراصل 'سخاوت برائے سخاوت' پر عمل ہونا چاہیئے۔

سوسائٹی جہاں دیسی زبانوں میں تراجم سے متعلق امور سے بحث کرتی تھی وہاں دوسرے امور پر بھی بحث کیا کرتی تھی جیسے ایک یونی ورسٹی کا قیام یا حکومت کی مجوزہ اصلاحات

وغیرہ۔ اس قبیل کے دو ایک موضوع کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔
دیسی زبانوں کو وسیع پیمانے پر ذریعۂ تعلیم بنانے اور ایک یونی ورسٹی کا قیام عمل میں لانے سے متعلق برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا مراسلہ خصوصیت کے ساتھ ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ اگست ۱۸۶۷ء میں شمالی مغربی صوبہ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے وائسرائے کی خدمت میں ایک عرض داشت روانہ کی تھی جس میں متداول طریقۂ تعلیم پر اٹھائے ہوئے اعتراضات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور شمال مغربی صوبہ میں ایک ایسی یونی ورسٹی کے قیام کی سفارش کی گئی تھی جس میں بطورِ خاص مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کی پوری پوری ہمت افزائی کی جائے۔
ہم اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے اس سلسلہ کے مراسلات میں سے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کا مراسلہ مفصل طور پر یہاں نقل کرتے ہیں[1]۔ ساتھ ہی وہ بحث بھی پیش کرتے ہیں جو سوسائٹی کی جانب سے اس پر ہوئی تھی۔

راجہ جے کشن داس بہادر
سکریٹری برٹش انڈیا ایسوسی ایشن
شمال مغربی صوبہ
علی گڈھ

بخدمت

جناب ای۔ سی۔ بیلی
سکریٹری حکومت ہند
محکمۂ داخلہ۔ شملہ

علی گڈھ
۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء

جنابِ والا
عرض ہے کہ ہزاکسی لنسی وائسرائے (اور گورنر جنرل) کے پرائیوٹ سکریٹری کا مرسلہ مورخہ ۱۲ اگست اور محکمۂ داخلہ کا مرسلہ نمبر ۲۱۷۴ مورخہ ۵ ستمبر دونوں برٹش

[1] اس خط کی تلخیص سوسائٹی کے جریدہ میں شائع ہوئی تھی۔ ہم نے یہ خط ہندوستانی تاریخی ریکارڈ کی نمائش (منعقدہ ناگ پور) میں رکھے ہوئے خط سے نقل کیا ہے۔ یہ نمائش نیشنل ارکیوز آف انڈیا کی جانب سے منعقد ہوئی تھی۔ ہم اس کے لئے ان کے ممنون ہیں۔

انڈین ایسوسی ایشن اور علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبوں کے سامنے رکھے گئے ہیں اور وہ ان پر غور کر رہے ہیں۔ دونوں انجمنوں کے ارکان ہزاکسی لنسی G. G. in council کی خدمت میں مخلصانہ ہدیۂ امتنان پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے ایسوسی ایشن کی جانب سے پیش شدہ تعلیمات عامہ سے متعلق عرض داشت پر از راہِ نوازش اپنی توجہ منعطف کی۔ آپ کے مراسلہ کے پیرا ۸ کے مضمون کے مطابق ممبران چند عملی تجاویز پیش کرتے ہیں جن کو وہ اپنے تجویز کردہ مقصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف ضروری سمجھتے ہیں بلکہ جن کے بارے میں انھیں یقین ہے کہ ہزاکسی لنسی وائسرائے (اور گورنر جنرل) انھیں اپنی توجہ خاص کا مستحق پائیں گے۔

تعلیماتِ عامہ سے متعلق حکومت کی خدمت میں اپنی معروضات پیش کرنے سے قبل ہی ایسوسی ایشن کو اپنی تجویز کردہ اسکیم کی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کا اچھی طرح علم تھا۔ یہ موانع و مشکلات حاشیہ میں مندرج ملیں گی۔ لیکن چوں کہ اس وقت حکومت کی جانب سے ایسوسی ایشن کے پیش کردہ دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیماتِ عامہ کی اشاعت کے اصول کے تسلیم کئے جانے کے بارے میں شک تھا اس لئے انھوں نے ان اصولوں کی تشریح پر اکتفا کی اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں تجاویز کو آئندہ پر اُٹھا رکھا۔ اب چوں کہ

(۱) یورپ کے مفید علوم و فنون پر دیسی زبانوں میں کتابوں کی عدم موجودگی

(۲) یونی ورسٹی امتحانات کے لئے نصابی کتابوں کے تراجم کی ضرورت بلکہ خود دیسی زبانوں میں مستقل تصانیف کے ایک ترقی پذیر سلسلہ کی ضرورت

(۳) متذکرہ بالا کتابوں کی دیسی زبانوں میں تالیف و اشاعت اور اخراجات کی کفالت کے ذرائع۔ حکومت کے لئے جملہ مصارف کا متحمل ہونا ایسوسی ایشن کے نزدیک ممکن نہیں۔

(۴) سرکاری و خانگی مدارس میں ان کتابوں کو متعارف کرنے کا طریقہ

(۵) ان مضامین کی تعلیم کے لئے لائق اساتذہ اور پروفیسروں کی خدمات کا حصول

آخر میں ایسوسی ایشن آپ سے التماس کرتی ہے کہ آپ از راہِ نوازش اس مراسلہ کو ہزاکسی لنسی وائسرائے (اور گورنر جنرل) کی خدمت میں پیش کریں اور حکومت اس سلسلہ میں جو بھی احکام صادر فرمائے مجھ تک پہنچائیں۔

آپ کا فرماں بردار
راجہ جے کشن

یہ مراسلہ اور اس سلسلہ کے دیگر مراسلات سوسائٹی کے جلسوں میں پیش ہوئے اور

ان پر مباحثہ ہوا۔ ممبروں کی ایک بڑی تعداد نے بحث میں حصہ لیا۔ سوسائٹی کے سکریٹری کپتان لک نیل نے رائے بنسی لال سے التجا کی کہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی تجاویز پر اپنے تاثرات پیش کریں۔ رائے صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"بے شک ترجموں کے ذریعہ سے یوروپ کے علم پر ہم قادر ہو سکتے ہیں۔ مگر اس قدر کہاں جو اصل زبان یعنی انگریزی میں ان علوم کا مطالعہ کرنے سے ملکہ حاصل ہوتا ہے"۔

نائب کمشنر فٹز پیا ٹرکس نے کہا کہ "ان کاغذات کے سننے سے معلوم ہوا کہ اس باب میں جناب نواب گورنر جنرل بہادر اور لفٹنٹ گورنر بہادر کی رائے میں اختلاف ہے، لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر کی یہ رائے ہے کہ ہندوستان میں کل تعلیم زبان دیسی کے ذریعہ ہو اور نواب گورنر جنرل بہادر یہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ تعلیم ہندوستان میں کچھ دنوں تک زبان انگریزی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے"۔

اس پر جیون لال اور بنسی لال نے کہا کہ "درحقیقت انگریزی کتابوں کے ترجمے ایسے نہیں ہوتے کہ بہ آسانی سمجھ میں آجائیں اور ترجموں میں وہ خوبی بھی نہیں جو اصل میں پائی جاتی ہے"۔

پادری سمتھ نے فرمایا کہ "ترجموں کے ذریعہ سے کبھی کسی ملک میں علم نے جڑ نہیں پکڑی اگر لوگ خود ایک زبان کے علم کو حاصل کر کے اپنی طبع سے اپنی زبان میں کتابیں لکھیں تو وہ زیادہ تر مفید ہوں گی اور لوگوں کی سمجھ میں جلد آجائیں گی"۔

پھر انھوں نے یہ کہہ کر اپنے استدلال کو تقویت پہنچائی کہ "اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی غیر ملک کے پودے کو لاکر اپنے ملک میں بوئے، یہ پودا کبھی پھولے پھلے گا نہیں، بس اس بچارے کو اور پودے لانے پڑیں گے اور وہ بھی سب اسی طرح مرجھا جائیں گے۔ یہی حال ترجموں کا ہے"۔

سکریٹری پیارے لال نے اس سے اختلافِ رائے کرتے ہوئے کہا کہ "یہ امر شاید خلاف واقعہ ہے۔ دیکھو مسلمانوں میں جس قدر علم ہے وہ سب ترجموں کے ذریعہ سے عربی زبان میں آیا۔ عربوں نے زبان یونانی کی کتابیں ترجمہ کیں اور اس امر کی شاہد یہ بات ہے کہ علم طب جو آج تک مسلمانوں اور ایشیائی قوموں میں جاری ہے وہ یونانیوں کا ہی ایجاد ہے"۔

اس پر پادری سمتھ نے اظہارِ حیرت کرتے ہوئے کہا کہ

"ہم نے کبھی نہیں سنا کہ عربوں میں بھی کبھی کچھ علم ہوا ہے وہ تو ایک نہایت وحشی قوم ہے

۱۔ دہلی سوسائٹی ۱۲ نومبر ۱۸۶۷ء صفحہ ۳ تا ۱۰

ن کو علم سے کیا تعلق ؟ .
نائب کمشنر صاحب نے مداخلت کر کے پیارے لال صاحب کے نقطۂ نظر کی وضاحت
ی۔ انھوں نے کہا " عربوں سے سکریٹری پیارے لال کی مراد کل مسلمان ہیں اور نہ وہ لوگ
ں جو اب عرب میں بستے ہیں "۔
پروفیسر رام چندر نے مباحثہ میں شرکت کرتے ہوئے سکریٹری پیارے لال کی رائے سے
اق کیا اور کہا کہ ۔
" یونانی کتابوں کے ترجموں سے کچھ مسلمانوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ کل یورپ میں علم کا
رچا ترجمہ ہی کے ذریعہ سے ہوا ہے مسلمانوں نے یونانیوں سے اور یورپ والوں نے مسلمانوں سے
م حاصل کیا ہے۔ جن کتابوں کا ترجمہ یونانی کتابوں سے مسلمانوں نے کیا تھا اُنھیں کتابوں کا
جمہ عربی زبان سے فرنگیوں نے کیا ہے۔ اور اسی طرح یورپ میں علم پھیلا۔ پس اس امر میں
ری رائے سکریٹری کی رائے سے اتفاق کرتی ہے "۔
پادری وہیٹلے بھی پیارے لال اور پروفیسر رام چندر کے ہم خیال تھے۔ ان کے بعد ہیش پرشاد
ے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ " اگر انگریزی کتابوں کے ترجمے ہو جائیں تو ان سے ہم
بھی فائدہ ہوگا ہم انگریزی زبان نہیں جانتے اور نہ اب ہماری عمر اس لائق ہے کہ اُس زبان کو
صل کریں مگر ہاں اون کے ترجمے زبان اُردو میں ہو جائیں تو ہم اور فقط ہم ہی نہیں کل آدمی
اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں یورپ کے علم سے آگاہی پا سکتے ہیں "۔
ان کے بعد جیون لال نے کہا کہ
" ہمارے نزدیک فضیلت کے القاب صرف ان لوگوں کو دئے جائیں جو زبان انگریزی
ر یہاں کی کسی ایک دیسی زبان سے واقف ہوں "۔
جیون لال کے بیان کے اختتام پر سکریٹری پیارے لال پھر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ
" یہ بات تو اب بھی حاصل ہے۔ پھر نئی یونی ورسٹی سے کیا فائدہ ۔۔۔ اور جو طریق اب
لکتہ یونی ورسٹی کا ہے اس میں تغیر و تبدل کیوں ہو۔ ممالک مغربی کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن
ے ممبر اس بات کے خواہاں ہیں کہ ممالک مغربی میں ایک نئی یونی ورسٹی قائم ہو۔ اور اسس
نی ورسٹی کے ارباب امیدواران القاب فضیلت کا امتحان صرف دیسی زبان میں لیا
ریا۔ زبان انگریزی نے کچھ × × میری رائے ناقص میں یہ امر بالفعل نہ ہونا چاہیئے۔ اور
لادہ × × × یونی ورسٹی کا امتحان دینے میں اُن کو سوائے علوم مروجہ کے دونوں

زبانوں میں امتحان دینا چاہیئے۔ اُن میں سے ایک زبان انگریزی ہے اور دوسری سنسکرت یا عربی ان تینوں زبانوں کو حاصل کرنا ہندوستانیوں کو مشکل ہے۔ پس وہ بات جو انگریزی خوانوں کو اب اس قدر دقت سے حاصل ہوتی ہے دیسی زبان کے جاننے والوں کو اس قدر آسانی سے کیوں دی جائے سوائے اُس کے وہ لوگ جو علوم کا امتحان زبان دیسی میں دیں گے اُن سے یہاں کی کسی مشکل زبان مثل عربی اور سنسکرت میں بھی امتحان لینا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ابھی وہ زمانہ بھی نہیں آیا ہے کہ اس بات پر عمل کیا جائے۔ اُردو زبان میں علوم کی اس قدر کتابیں کہاں ہیں کہ اس بات کو اختیار کریں۔"

اس پر پادری ڈیٹیلے نے کہا کہ

"کلکتہ یونی ورسٹی کو اس بات پر آمادہ کیا جائے، کہ وہ اپنے قوانین کچھ کچھ بدل دے۔ یعنی یہ قاعدہ جاری کرے کہ جو لوگ علوم کا امتحان زبان انگریزی میں دیں اُن لوگوں کا امتحان دوسری زبان یعنی سنسکرت یا عربی میں سہل ہو اور انگریزی میں مشکل۔ اور اُن لوگوں کے جو صرف یہاں کی زبانوں میں امتحان دینا چاہیں زبان کے امتحان میں انگریزی خوانوں کی نسبت مشکل سوال دئے جایا کریں اور علوم کے سوال دونوں کو یکساں ملیں۔"

پیارے لال صاحب نے استفسار کیا کہ

"برٹش انڈین اسوسی ایشن کی عرض داشت میں عوام کی تعلیم کا جابجا ذکر آیا ہے۔ نہیں معلوم اس سے ایسوسی ایشن کی کیا مراد ہے۔"

انھوں نے حاضرین سے اُس بات میں رائے طلب کی کہ "نئی یونی ورسٹی مثل اُس کے جیسا علی گڈھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن چاہتے ہیں ہونا چاہیئے یا نہیں۔"

ماسٹر امیر علی نے تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ

"یونی ورسٹی کی کچھ ضرورت نہیں۔ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا ہے کہ ہندوستان میں لوگوں کو مثل یونی ورسٹی ولائت کے خطاب فضیلت عطا ہوں۔ یہاں کتابوں کی وہ کثرت کہاں ہے جو ہم اس بات کو اختیار کریں۔ فرض کرو کہ یونی ورسٹی کی پڑھائی میں جو کتابیں ہیں اُن سب کے ترجمے بھی ہو جائیں اور لوگ ان ترجموں میں امتحان دے کر پاس بھی ہوں گے۔ مگر علم کا وہ خزانہ کہاں سے لائیں جو یورپ کی زبانوں میں موجود ہے اور جو ولائت میں اور نیز ہندوستان میں انگریزی خوانوں کی وراثت ہے۔ یہاں یہ بات رفتہ رفتہ حاصل ہو سکتی ہے۔ بالفعل یہ بات کافی ہے کہ جس طرح غدر سے پیشتر دہلی کالج سے متعلق یک مدرسہ فارسی و عربی سنسکرت تھا ویسا ہی

مدرسہ اب بھی بنایا جائے، پہلے عربی فارسی اور سنسکرت دانوں کو اُس مدرسہ میں یورپ کا علم اُردو زبان کے ذریعہ سے پڑھایا جاتا تھا۔ اب بھی اسی طرح ہونا چاہیئے۔ اور اُس زمانہ کے بہت سے لوگ مدرسہ سے بہت ہوشیار ہو کر نکلے۱؎"

پیارے لال نے کہا

"دُوسرا سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یورپ کے علم کو دیسی زبانوں میں لائیں کیونکر پیدا کئے جائیں"۔

ممبروں کی اکثریت اس بات کی حمایت میں تھی کہ کلکتہ یونی ورسٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے آئین و ضوابط میں ترمیم کرے انھوں نے مروجہ نظامِ تعلیم کے معائب پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا کہ

"جو دستور اب جاری ہے اُس سے یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ کُتب مقررہ کو مدارس کے طلبا خوب یاد کر لیتے ہیں۔ مگر اصلی مادّہ ان میں کم ہوتا ہے۔ کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنی چاہیئے۔ جس سے اصلی مادہ لڑکوں میں پیدا ہو اور وہ اُن علوم اور زبانوں پر جو مدارس میں سکھائے پڑھائے جاتے ہیں قادر ہو جائیں اور یہ امر اسی طرح ظہور میں آ سکتا ہے کہ کوئی خاص کتاب امتحان کے واسطے مقرر نہ کی جائے جس کو لڑکے حفظ یاد کر کے امتحان دے دیں۔ مطلق زبان دانی اور علوم میں امتحان ہوا کرے"۔

اس پر سکریٹری صاحب نے کہا کہ

"میرے نزدیک داخلہ کا امتحان تو علوم اور زبان دونوں میں ہو اور درجہ کے امتحان میں علوم یا زبان دونوں چیزوں سے طالب علموں کو اختیار ہو کہ وہ کسی کو پسند کریں"۔

پادری وہیٹلے نے کہا کہ اس کا تعلق آرٹس کے ابتدائی امتحان سے ہے۔

پنڈت گنگا جیون نے کہا کہ

"اب مدارس میں یہ دستور بھی بُرا ہے کہ انگریزی زبان تو لڑکوں کو چار گھنٹہ پڑھائی جاتی ہے اور عربی سنسکرت کی پڑھائی فی یوم ایک گھنٹہ ہوتی ہے۔ اس سے کیونکر توقع ہو کہ لڑکے یہاں کی زبانوں کو اچھی طرح حاصل کریں گے وہ انگریزی کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اور یہاں کی زبانوں کی طرف کم۔ بس میرے نزدیک یوں مناسب ہے کہ انگریزی اور دیسی زبانوں کے واسطے برابر وقت مقرر ہونا چاہیئے"۔

۱؎ دہلی سوسائٹی ۱۴ر جنوری ۱۸۶۸ء ص ۱۰۔۱۴۔

چناں چہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع پر ہر پہلو سے گفتگو ہوئی۔ اسی طرح کے ایک اور موضوع پر بھی بحث ہوئی۔ یہ موضوع پنجاب یونی ورسٹی کے قیام سے متعلق تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ جنوری ۱۸۶۵ء میں پنجاب سوسائٹی دو گونہ مقاصد کے پیش نظر قائم ہوئی تھی ایک قدیم مشرقی علوم کا احیاء اور دوسرے دیسی زبانوں کے ذریعہ مفید علوم کی نشر و اشاعت۔ اس تحریک کے بانیوں نے ———— ایک مشرقی درس گاہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اپنی ترمیم شدہ تجاویز لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کی تھیں۔

۱۸۶۶ء میں لاہور و امرت سر کے بعض سربرآوردہ عمائدین نے سر ڈونلڈ مکلوئڈ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ جن کے ہمدردانہ جواب نے ان کی ہمت افزائی کی اور ان کی امیدوں کو تقویت پہنچائی۔ سوسائٹی ۱۸۶۷ء تک (اس موضوع پر) کم و بیش کامیابی کے ساتھ اپنے نظریات کا اعادہ کرتی رہی۔

مسٹر ڈونلڈ مکلوئڈ کی صدارت میں ۱۲ر مارچ ۱۸۶۹ء کو یونی ورسٹی کے قیام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کا ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع نے بمقام لاہور پنجاب کے لئے ایک یونی ورسٹی کے قیام سے متعلق ایک قرارداد منظور کی۔

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن بھی بمقام دہلی شمال مغربی صوبوں کے لئے ایک جامعہ کے قیام کے لئے کوشاں تھی۔

کیپٹن ہالرائڈ ناظم تعلیماتِ عامہ نے ۴ر مارچ ۱۸۶۸ء کو دہلی سوسائٹی کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ لفٹنٹ گورنر کی صدارت میں کس طرح اہالیانِ پنجاب نے بمقام لاہور ایک جامعہ کے قیام سے متعلق ایک قرارداد منظور کی تھی۔ انھوں نے اس یونی ورسٹی کے اغراض اور اس کے فرائض پر روشنی ڈالی۔ یہ حسبِ ذیل تھے۔ (۱) امتحانات (۲) دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم کی اشاعت (۳) یونی ورسٹی میں سکھائے جانے والے جملہ مضامین کی یوروپین کتب کا ترجمہ۔

جناب صدر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ایسی صورت میں ایک طالبِ علم کے لئے جس کی تعلیم دیسی زبانوں میں ہوئی ہو انگریزی کے پرچہ میں شرکت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس پر کیپٹن ہالرائڈ نے کہا کہ ان کے بیان کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے اپنے نکتۂ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ایک متعین مدت تک انگریزی ثانوی زبان کی حیثیت سے قائم رہے گی اور اس طرح اگرچہ دوسرے مضامین کی تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ ہوگی مگر بحیثیت ایک زبان کے انگریزی کی تعلیم جاری رہے گی۔

سوسائٹی کے معتمد پیارے لال نے لاہور کو یونی ورسٹی کے مستقر بنانے کی تجویز کی حمایت نہیں کی۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے طلباء کی جماعت کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ طلباء پہلے ہی کلکتہ یونی ورسٹی کے خلاف شکایت کر رہے ہیں۔ اب کلکتہ کی بجائے انھیں لاہور جانا ہوگا اور اس سے صورتِ حال میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوگا۔

انھوں نے یونی ورسٹی کے قیام کے لئے آگرہ کا نام تجویز کرتے ہوئے کہا کہ اگر لاہور کو یونی ورسٹی کا مستقر قرار دیا جائے تو اس سے لاہور کے لوگوں کے سوا اور کوئی استفادہ نہیں کر سکے گا۔ اس کے علاوہ لاہور علم و ثقافت کا مرکز نہیں ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر یہ مجوزہ یونی ورسٹی کلکتہ یونی ورسٹی کی طرح محض امتحانات لینے والی یونی ورسٹی ہوتی تو مجھے لاہور میں اس کے قائم ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

سوسائٹی کے ایک اور رکن نے لاہور میں ترجمہ شدہ کتب کے معیار پر تنقید کی۔ انھوں نے کہا دہلی اُردو کا مرکز ہے۔ اہل لاہور کے لئے انگریزی کتابوں کے ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ لاہور میں ترجموں کی زبان واسلوب کی تصحیح کے لئے کون ہے؟

مباحثہ اسی طرح جاری رہا۔ ایک اور رُکن نے کہا کہ میں سوسائٹی کی رائے سے واقف ہوں اور مجھے اس سے کامل اتفاق ہے۔

چونکہ سوسائٹی کی سفارشات کو قلمبند کرنے اور ارکان سے ان کی منظوری لینے کے لئے کافی وقت باقی نہیں رہا تھا اس لئے یہ طے پایا کہ معتمد صاحب ذاتی ذمہ داری پر تجویز کا مسودہ تیار کرکے ناظم تعلیمات عامہ کے توسط سے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کو بھیج دے۔ یہ بھی طے پایا کہ لفٹننٹ گورنر کے پاس جو مسودہ بھیجا جائے اس کی ایک نقل سوسائٹی کے ارکان کو بھیج دی جائے اور ارکان سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ اس کو بجنسہ منظور کریں۔[1]

یہ سفارشات کیا تھیں اس کا ہمیں کوئی علم نہیں لیکن مولانا حالی کے جو کہ سوسائٹی کے ایک رُکن تھے کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "اپریل ۱۸۶۸ء والی نشست میں جس میں ناظم تعلیمات عامہ نے شرکت فرمائی تھی سوسائٹی نے تبادلۂ خیالات کے بعد یہ سفارش کی تھی کہ "یہ یونی ورسٹی لاہور میں اور ترجمہ کرنے اور کتابیں بنانے کے لئے ایک کمیٹی دہلی میں قائم کی جائے۔ اور اگر دونوں صوبوں کے لئے ایک یونی ورسٹی قائم کی جائے تو اس کا مقام دہلی ہونا چاہیئے"[2]

---

[1] دہلی سوسائٹی ۱۴ مارچ ۱۸۶۸ء۔ ص ۱۶۔ ۲۰
[2] حیاتِ جاوید۔ حصہ اوّل۔ باب سوم۔ ص ۱۱۸۔

یہ ملحوظ رہے کہ (جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں) یہ جلسہ ۲۴ مارچ ۱۸۶۸ء کو منعقد ہوا تھا نہ کہ اپریل میں۔ ہوسکتا ہے کہ سوسائٹی نے مذکورۂ بالا وجوہات کی بنا پر سفارشات کچھ دیر بعد ارسال کی ہوں جیساکہ سوسائٹی کی کارروائی سے ظاہر ہے۔ اہالیان دہلی نے یا بالفاظ دیگر دہلی سوسائٹی نے مجوزہ یونیورسٹی کے مستقر کے لئے اس قدیم پایۂ تخت کے استحقاق کو منوانے کی غرض سے مناسب اقدام کئے تھے۔

اگرچہ سوسائٹی کے جلسوں میں مختلف موضوع پر مباحثے ہوا کئے لیکن سنسکرت سے متعلق مباحثہ جاری خاص توجہ کا مستحق ہے۔

۱۸ نومبر ۱۸۶۸ء کا ذکر ہے کہ شام کے ۵ بجے ڈاکٹر ہالرائڈ ناظم تعلیمات عامہ نے سوسائٹی کے ایک جلسہ میں تقریر کی اس جلسہ کے صدر کرنل مک نیل تھے۔

ڈاکٹر ہالرائڈ نے ایک واقعہ بیان کیا جو ان کے ہندوستان آنے پر انھیں پیش آیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ لالہ رامی مل سنسکرت کی تعلیم کے لئے دہلی میں ایک مدرسہ کے قیام کی درخواست لے کر میرے پاس پہنچے۔ لالہ صاحب نے مدرسہ کے اخراجات کے لئے ماہانہ پچاس روپیہ دینے کا وعدہ بھی کیا۔ میں نے درخواست لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کی جنھوں نے نہ صرف لالہ صاحب کے اس فیاضانہ اقدام کو سراہا بلکہ انھیں ایک سند بھی مرحمت فرمائی۔

انھوں نے کہا دہلی کے امیر اور ساہوکاروں کی مالی امداد سے لالہ رمی مل کی تجویز کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

ہالرائڈ کی تقریر کے اختتام پر رائے چیناں صاحب نے سوسائٹی کے معتمد صاحب سے دریافت کیا کہ اس مدرسہ کے قیام کے لئے کتنی رقم درکار ہوگی۔ انھوں نے جواباً بتایا کہ ماہانہ دو سو یا تین سو روپیہ درکار ہوگا۔ اس پر رائے چیناں صاحب نے کہا کہ لالہ رمی مل پہلے ہی پچاس روپیہ ماہانہ کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اب اگر عمائدین دہلی نے سو روپیہ کا انتظام کیا اور حکومت کو سو روپئے کا عطیہ دینے پر رضامند کیا گیا تو صرف پچاس روپئے کی کمی رہ جاتی ہے۔ یہ رقم اس قدر معمولی ہے کہ بڑی آسانی سے اس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔[1]

اس پر رائے مہیش داس نے وعدہ کیا کہ میں اس تجویز کی کامیابی کے لئے ہر ممکن امداد بہم پہنچاؤں گا۔

اس کے بعد جناب صدر نے مشرقی زبانوں کی اہم خبریں دیوناگری میں منتقل کرنے سے

---

[1] دہلی سوسائٹی۔ ۱۸ نومبر ۱۸۶۸ء ص ۲۵ ـ ۲۶

علق حکومت ہند کی وہ تجویز پڑھ کر سنائی جو ۱۴ر نومبر ۱۸۶۸ء کے انڈیا گزٹ میں چھپی تھی اور
ں کے لیے حکومت نے ۲۴۰۰۰ روپیہ سالانہ کی منظوری دی تھی۔

		رقم
۲۵ کاتب	بیس روپیہ ماہانہ کے حساب سے	۶۰۰۰
دیگر مصارف	سو روپیہ ماہانہ کے حساب سے	۱۲۰۰
شمال مغربی صوبہ، پنجاب، اودھ، وسط ہند، راجپوتانہ بمبئی، مدراس اور میسور کے دورے کے مصارف		۶۰۰۰
مخطوطات کی فہرست اور دیگر کتابوں کی چھپائی		۱۰۰۰
ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو مزید امداد		۳۰۰۰
متفرقات		۸۰۰
		۲۴۰۰۰ سالانہ مصارف

سوسائٹی نے حکومت کے دوسرے اہم اقدامات پر بحث کی جن کو ہم جگہ کی کمی کی وجہ سے
اں حذف کرتے ہیں۔

سوسائٹی نے جو اہم خدمات انجام دیں ان کا اندازہ ہمیں ان جلسوں اور ان میں پڑھے
ے مقالوں سے بخوبی ہوتا ہے جو ۱۸۶۶ء اور ۱۸۷۰ء کے دوران میں منعقد ہوئے۔ یہ بجلسے
د ایک خراج تحسین اور ثبوت ہے اس جوش و خروش اور دلچسپی کا جو سوسائٹی کے ممبر
ہداسے ہی سوسائٹی کے معاملات میں لیتے رہے تھے۔ ہم ۱۸۶۵ء کے جلسہ کا ذکر کر چکے ہیں۔
۱۸۶۶ء میں ۱۲ جلسے منعقد ہوئے۔ ان کے انعقاد کی تاریخیں حسب ذیل ہیں:- ۵ر مئی،
ر جون، ۳ر جولائی، ۳۱ر جولائی، ۲۴ر اگست، ۴ر ستمبر، ۲۵ر ستمبر، ۹ر اکتوبر، ۲۳ر اکتوبر
ر یکم دسمبر۔

۱۸۶۷ء میں ۱۱ جلسے منعقد ہوئے۔ تاریخیں حسب ذیل ہیں:- ۸ر جنوری، ۲۹ر جنوری، ۱۲ر فروری
ر اپریل، ۱۴ر مئی، یکم جون، ۱۸ر جون، ۱۳ر اگست، ۱۰ر ستمبر، ۲۲ر اکتوبر، ۱۲ر نومبر۔

۱۸۶۸ء دس جلسے ہوئے، ان کی تاریخیں یہ ہیں:- ۱۴ر جنوری، ۷ر مارچ، ۲۴ر مارچ،
ر اپریل، ۲۷ر اپریل، ۱۴ر جولائی، ۲۱ر جولائی، ۲۲ر ستمبر، ۱۸ر نومبر۔ اور ۹ر دسمبر۔

۱۸۶۹ء میں تین جلسے ہوئے۔ ۸ر فروری، ۱۴ر مارچ، ۱۴ر اپریل۔

۱۸۷۰ء میں تین جلسے ہوئے۔ ۱۲ر ستمبر۔ ۹ر نومبر۔ ۲۶ر نومبر

۱۸۷۱ء میں ایک جلسہ ۷ ؍ جنوری کو ہوا۔

۱۸۷۲ء میں ایک جلسہ ۲۸ ؍ جون کو ہوا۔

۱۸۷۳ء میں کئی جلسے ہوئے۔ جن کی تاریخوں کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ البتہ پانچ جلسے حسب ذیل تاریخوں کو منعقد ہوئے ۱۲ ؍ جنوری۔ ۲۴ ؍ جنوری۔ ۱۰ ؍ جون۔ ۸ ؍ جولائی اور ۵ ؍ اگست۔

۱۸۷۴ء میں جریدہ ماہنامہ کی شکل میں نکلنے لگا اور سال بھر تک بلاناغہ نکلتا رہا لیکن اس کی اشاعتیں نایاب ہیں۔ پانچ جلسوں کا جو ۲ ؍ اگست، ۱۰ ؍ مارچ، ۱۹ ؍ مئی اور ۲۴ ؍ نومبر کو منعقد ہوئے ہیں علم ہے۔

۱۸۷۵ء۔ بدقسمتی سے اس سال کی تمام اشاعتیں نایاب ہیں۔

۱۸۷۶ء۔ ۲۴ ؍ اگست ۱۸۷۶ء کی اشاعت کے سوا باقی تمام اشاعتیں نایاب ہیں۔

ان بارہ برسوں (۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۶ء) کی اشاعت کے سوا باقی تمام اشاعتیں نایاب ہیں۔

ان بارہ برسوں (۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۶ء) میں مختلف وجوہات جیسے ترقی۔ تبادلہ اور علیحدگی وغیرہ کی بناء پر سوسائٹی کے عہدے داروں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

کرنل ہیملٹن جو سوسائٹی کے بانی و مربی تھے ۲ ؍ فروری ۱۸۶۷ء کو علیحدہ ہوئے۔ مک نیل ان کے جانشین بنے اور ۱۲ ؍ ستمبر ۱۸۷۰ء تک فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے بعد کرنل تمک آئے اور ان کے بعد کیپری کروفٹ ان کے جانشین ہوئے۔

سوسائٹی کے دو صدر تھے۔ مک موہن اپنے شریک کار مرزا الٰہی بخش کے ساتھ ۱۸۶۷ء تک صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔

ان کے بعد فٹز پیاٹرک ان کے جانشین ہوئے۔ کچھ سالوں بعد ڈبلیو۔ جی۔ ڈیوز اس عہدے پر مامور ہوئے۔ لیکن مرزا الٰہی بخش ابتدا سے آخر تک صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے[۱]

---

[۱] مرزا الٰہی بخش کا بیگم عمدۃ الزماں کی وجہ سے دہلی کے شاہی محل سے تعلق تھا۔ بہادر شاہ کی محبوب بیگم زینت محل سے ان کے دوستانہ مراسم تھے اور ان مراسم کی بناء پر شاہی محل میں ان کا بڑا اثر تھا۔ ان کی ایک صاحب زادی سب سے بڑے شہزادے فتح الملک مرزا فخرو کے ساتھ جن کا انتقال غدر سے پہلے ہوا تھا بیاہی گئی تھی۔

غدر کے ایام میں انھوں نے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔ دہلی کے محاصرہ کے دوران میں وہ شہر سے باہر سے اور دہلی کی افواج کی نقل و حمل سے متعلق خبر رسانی کرتے رہے۔ انھوں نے شہر کے مقابل دریائے جمنا میں بنائے ہوئے کشتیوں کے پل کو برباد کروا کر مشرق کی طرف سے رسد کی آمد اور باغیوں کے داخلہ کو بند کر دیا تھا۔

بہادر شاہ کی پُرامن دست برداری اور شہزادہ خضر سلطان ابوبکر کی گرفتاری بھی ان ہی کی بدولت عمل میں آئی (باقی آگے صفحہ

چوں کہ سوسائٹی کا ایک ہی نائب صدر تھا راے صاحب سنگھ صاحب بھی سوسائٹی کے قیام سے لے کر اس کے خاتمہ تک اس عہدے پر مامور رہے۔

اسی طرح کسی نہ کسی سبب کی بنا پر سوسائٹی کے اعزازی معتمد بھی بدلتے رہے۔ ۱۸۶۵ء میں کپتان کو سٹریم (جج) اعزازی معتمد تھے۔ بعد میں مسٹر بوائلین (جج دہلی) ان کے جانشین کی حیثیت سے ان کی جگہ پر آئے۔ جب ان کا آگرہ کو تبادلہ ہوا تو ۲۳ اکتوبر ۱۸۶۶ء سے مسٹر سمتھ (جج) نے ان کی جگہ لی۔ لیکن جب ۱۴ مئی ۱۸۶۷ء کو بحیثیت جج ان کا بھی امرتسر کو تبادلہ ہوا تو پادری ڈ ہیٹلے ان کے جانشین بنے۔ انھوں نے ۸ جون ۱۸۶۷ء کو معتمد کے عہدے کو سنبھالا لیکن دو سال کے بعد یعنی فروری ۱۸۶۹ء میں کارسٹیفن معتمد اعزازی منتخب ہوئے۔ ۷ اپریل ۱۸۶۹ء کو ان کے مستعفی ہونے کے بعد ۸ سال کے عرصہ تک کون معتمد کے فرائض انجام دیتا رہا یہ اشاعتوں کی نایابی کی وجہ سے ہم کہنے سے قاصر ہیں۔ البتہ ۲۴ اگست ۱۸۷۶ء کو پادری ونٹر نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔

اسی طرح معتمدین ترقی، تبادلہ اور علیحدگی کی بنا پر بدلتے رہے۔ پیارے لال آشوب نے ۱۸۶۵ء سے سوسائٹی کے معتمد تھے مترجم اعلیٰ کی حیثیت سے پنجاب کو تبادلہ ہونے پر ۹ دسمبر ۱۸۶۹ء کو استعفا پیش کیا۔ ان کی جگہ چندو لال نے لی۔ لیکن کمشنر کے دفتر میں مترجم اعلیٰ کی حیثیت سے تقرر ہونے پر وہ بھی جنوری ۱۸۷۱ء کو مستعفی ہو گئے اور مولوی ذکاء اللہ جو ۱۸۶۶ء سے سوسائٹی کے رکن تھے ان کے جانشین بن گئے۔ لیکن الہ آباد کالج میں عربی کے معاون پروفیسر نامزد ہونے پر وہ بھی علیحدہ ہو گئے۔ پادری تارا چند ان کے جانشین کی حیثیت سے آئے اور لچھمن داس معاون معتمد مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۵ء میں لالہ مدن گوپال ایم اے (پیارے لال کے بھائی) وکیل عدالتِ عالیہ پنجاب معتمد کے عہدے پر فائز ہوئے اور لچھمن داس معاون معتمد کی حیثیت سے قائم رہے۔

اس وقت کے اردو اخبارات میں ہمیں ان کی دوسری کارروائیوں ترقیوں اور تبادلوں کی تاریخوں کے ساتھ تفصیل ملتی ہے۔ اگر جگہ کی قلت محسوس نہ ہو گی تو ہم ان میں سے چند کے بارہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۱) غدر کے زمانہ کی ان کی خدمات کے پیش نظر حکومتِ ہند نے ان کے نام یکم مئی ۱۸۵۷ء سے ۲۲۸۰۳۰ روپئے سالانہ پنشن جاری کر دی۔

وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ دہلی سوسائٹی کے اجلاس میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے سب سے بڑے صاحب زادے مرزا سلیمان شکوہ بھی سوسائٹی کے رکن تھے اور اکثر و بیشتر سوسائٹی کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

(سی۔ ایف۔ مسی۔ چیفز اینڈ فیملیز آف نوٹ آف دی پنجاب ص ۱۵۹ — ۱۶۰)

میں لکھیں گے۔ ان کے لئے ایک طویل مقالہ درکار ہے۔

جریدہ

اس قسم کے جریدے مورخ کے لئے خام مواد مہیا کرنے کے اپنے اندر بڑے امکانات رکھتے ہیں
اس جریدہ کا پہلا نمبر ۶ × ۹ انچ کی تقطیع کے چونسٹھ صفحوں پر مشتمل ہے۔ سرورق نیلے، سبز اور زرد
رنگ کے پھول دار کاغذ کا ہے جس کے اوپری سرے پر یہ شعر ہے

صاحبا عمر عزیز ست غنیمت دانش گوئے خیرے کہ توانی بہ از چوگا نش

اس کے بعد شمارہ کا نمبر دیا گیا ہے۔ اس کے نیچے جلی حرفوں میں جریدہ کا نام "رسالہ دہلی سوسائٹی
ہے ـــــ سوسائٹی کے زیر ہدایت اسے مرزا ولایت حسین نے مطبع سراج سے شائع کیا تھا۔
آخری صفحہ پر راجہ دیبی سنگھ طرب کے دو قطعے ملتے ہیں۔ تیسرے اور اس کے بعد کے تمام
شماروں میں فارسی شعر کی جگہ یہیں یہ شعر ملتا ہے

سوسائٹی کی بزم معلیٰ کا ذکر (ہے)
یعنی علوم حکمت و انشا کا ذکر (ہے)

ان شماروں کو فخر الدین نے مطبع اکمل الاخبار سے شائع کیا تھا
سرورق کبھی نیلا (نمبر ۳ ۱۸۶۶ء) کبھی ہلکا سبز (نمبر ۷، اور ستمبر ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۷ جنوری
۱۸۶۷ء تک) کبھی پیلا (نمبر ۱ جنوری ۱۸۶۷ء جلد ۲) اور کبھی سفید (نمبر ۷ جولائی ۱۸۶۳ء جلد ۲
نمبر ۳، ۱۶ مارچ ۱۸۶۷ء جلد ۳ نمبر ۱۱ نومبر ۱۸۶۷ء جلد ۳ نمبر ۴ جولائی ۱۸۶۷ء سے دسمبر ۱۸۶۷ء
تک) ہوتا تھا۔

یہ جریدہ باقاعدہ ماہنامہ نہیں تھا لیکن ۱۸۶۷ء میں ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ چھپتا رہا۔ اس
بنا پر گارساں دتاسی اسے ماہنامہ کہنے میں حق بجانب ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ حسب ذیل شماروں
سے ظاہر ہوگا وہ ۱۸۶۷ء میں باقاعدگی کے ساتھ ماہ بہ ماہ چھپتا رہا[1]

نمبر ۳ مارچ ۱۸۶۷ء جلد نمبر ۳
نمبر ۶ جون ۱۸۶۷ء جلد نمبر ۳
نمبر ۱۱ نومبر ۱۸۶۷ء جلد نمبر (میری نظر سے گذرا ہے)

شماروں میں کبھی ۶۴ سے زیادہ صفحات پائے جاتے ہیں اور کبھی کم۔

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا یہ خیال کہ گارساں دتاسی کا اسے ماہنامہ کہنا غلطی پر مبنی ہے۔ ایک حد
تک صحیح نہیں ہے۔

شمارہ نمبر ۱ (۱۸۶۶ء) ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ نمبر ۲ (۱۸۶۶ء) ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ نمبر ۳[۱] (۱۸۶۶ء) میں ایک سے ۳۲ صفحات پر روداد پھیلی ہوئی ہے، ایک سے ۱۲۶ صفحات پر اردو مضامین حلقہ کئے ہوئے ہیں اور ایک سے ۴۲ صفحے ہندی مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ نمبر ۴ (۱۸۶۷ — ۱۸۶۹) ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ نمبر ۷ (۱۲ ستمبر ۱۸۷۲ء تا ۱۷ جنوری ۱۸۷۳ء) اور نمبر ۱ (۱۸۷۳ء) ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دو مجموعے ایک ۴۴ صفحات پر اور دوسرا ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ نمبر ۷ (جولائی ۱۸۷۳ء) ۲۸، نمبر ۳ (مارچ ۱۸۷۴ء) ۲۵، نمبر ۶ (جون ۱۸۷۴ء) ۲۱، نمبر ۱۱ (نومبر ۱۸۷۴ء) ۲۴ اور نمبر ۲ (جولائی تا دسمبر ۱۸۷۶ء) ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔
مجموعہ میں مندرجہ ذیل مقالے شائع ہوئے۔ یہ مقالے درس آموز ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

سال	مقالہ نگار	موضوع یا عنوان
۱۸۶۵ء	لال صاحب سنگھ	طریقۂ مہاجنی ہندوستان میں
"	جیون لال	فوائد مطالعۂ تاریخ
"	مرزا نواب اسد اللہ غالب	تباہی دہلی
"	رائے بنسی لال	فوائد حروف شناسی
"	نواب شہاب الدین احمد خاں	علم اخلاق
"	لالہ چندو لال	حرفوں کی بابت جو ہندستان میں جاری ہیں
"	شیخ محبوب بخش	
"	لالہ لچھمی نرائن	تعلیم اطفالِ لاوارث
"	منشی حکیم چند	تعلیم نسواں
"	پروفیسر رام چندر	
"	بشیشور ناتھ	
"	نواب علاؤ الدین احمد خاں	زبانِ اردو
"	جیون لال	نوشیرواں
"	پیارے لال	ہندوستانیوں اور انگریزوں کی ملاقات میں
"	الفت حسین	اصلاح طریقہ کاشتکاری اور قواعد زراعت
۱۸۶۶ء	ہزاری نین سنگھ	تعلیم نسواں

۱۔ سرورق غائب ہے اس لئے نمبر نہیں معلوم ہو سکا۔

سال	مقالہ نگار	موضوع یا عنوان
۱۸۶۶ء	پیارے لال	راہ و رسم انگریز و ہندوستانی
″	منشی جیون لال	نیک نیتی
″	منشی الفت حسین	تدبیر کمی رشوت ستانی
″	ولایت حسین	تدبیر منزل
″	بشیشور ناتھ	تعلیم نسواں
″	باپو دیو شاستری	علم ہئیت
۱۸۶۷ء	مرزا غیاث الدین	شادی دختران صغرسنی
″	کولڈ سٹریم	تاجر جہاں کا مربی ہوتا ہے
″	لچھمن نرائن	زراعت اور تقرر مدارس زراعت
″	جیون لال	فوائد علم طب ۔ فوائد تاریخ دانی
″	پنڈت بشیشور ناتھ	مطلق حکومت نہ ہونے کے نقصان اور سرکار انگریزی کی عمل داری کے فوائد۔
″	ہریش چندر شاستری	تبدل رسوم ہند
″	بشیشور ناتھ	مطلق حکومت نہ ہونے کے نقصان اور سرکار انگریزی کی عمل داری کے فوائد۔
″	ہریش چندر شاستری	تبدل رسوم ہند
″	بشیشور ناتھ	قانون تبنّی
۱۸۶۸ء	نواب نبی بخش خاں	قانون وقف
″	بشیشور ناتھ	محاصل ہندوستان میں
″	پیارے لال	تعلیم اہل ہندوستان
″	″	وقف اہل ہنود
″	پنڈت ہریش چندر شاستری	تعلیم سنسکرت ۔ علم سنسکرت
″	بشیشور ناتھ	انسداد قحط
″	چنا لال	مزارعان موروثی
″	بالرائڈ	فوائد مطالعہ زبان سنسکرت

سال	مقالہ نگار	موضوع یا عنوان
۱۸۶۹ء	لچھمن داس	ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی میں علم تحصیل کرنے کے کس قدر مواقع ہیں
؍؍	جیون لال	ملک ہندوستان و شہر دہلی
۱۸۷۰ء	چندو لال	نپولین بوناپارٹ معہ احوال
؍؍	بہارن پرشاد	اثر صحبت بد
؍؍	جیون لال	تغیر و تبدل ہندوستان ۷۰ برس سے اب تک
۱۸۷۲ء	سید میر محمد	حاکم و محکوم کی مناسبت میں
؍؍	سید عبد الکریم	بہبودی اہل ہند
۱۸۷۳ء	پیارے لال	دو آریا بہنیں
؍؍	الفت حسین	اہل ہند کو شوق پیدا کرنے کی تدبیریں
؍؍	لالہ امراؤ سنگھ	ہندوستان والی ؟ کی طرف سے شکایت
؍؍	میر سید محمد	فوائد تعلیم۔ اور فوائد دستور تعلیم متعلمین
؍؍	الفت حسین	فوائد رفاہ عام (نظم) الفت نامہ[1]
۱۸۷۴ء	لالہ رام چندر (پروفیسر)	زلزلہ
؍؍	ماسٹر شیو پرساد (انوپ اینڈ کے)	اخراجات شادی۔ ٹیکہ
۱۸۷۶ء	لچھمن داس	تاریخ امریکہ
؍؍	مدن گوپال (ایم،اے)	علم زبان۔ دار الخلافہ دہلی
؍؍	الفت حسین	گفتگوئے رعائے ہند اور وکیل سرکاری[3]

سوسائٹی کا کتب خانہ

سوسائٹی کے مقاصد میں سے ایک مقصد ایک کتب خانہ و دار المطالعہ کا قیام بھی تھا۔ سوسائٹی نے اس مقصد کو پورا کیا۔ اراکین کی جانب سے بڑی تعداد میں کتابیں بطور عطیہ سوسائٹی کو دی گئیں۔ کچھ کتابیں خریدی گئیں۔ ابتدا میں سوسائٹی کے پاس ایک بھی کتاب موجود نہیں تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کے پاس ہندی، فارسی، اردو اور انگریزی کی کتابوں کا ایک خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا

---

[1] ۲۲ صفحات کا بے حد دلچسپ اور درس آموز مقالہ ۔۔ [2] حالی کے تتبع میں۔ ۵ اور ۷ صفحات بالترتیب

[3] عوام اور سرکاری وکیل کے مابین ایک مکالمہ۔ جو دلچسپ ہونیکے ساتھ ساتھ یہ بتاتا ہے کہ عوام کی رائے میں کس قدر تلخی آگئی تھی۔ انتظامی مشنری سے متعلق اس کے سخت فقرے توجہ طلب ہیں۔

دوربین، نقشے اور دیگر جغرافیائی آلات بھی خریدے گئے[۱]
ارکان مختلف کتابوں کی سفارش کیا کرتے۔ یہ نام بذریعہ گشتی مراسلہ بھیجے جاتے تھے اور بعد میں کتابیں خریدی جاتیں۔
حسب ذیل کتابیں مختلف مواقع پر سوسائٹی کو بہ طور عطیہ پیش ہوئیں۔ خواجہ بدر الدین (المعروف بہ خواجہ امن) نے بوستانِ خیال کی پہلی دو جلدوں کا ترجمہ حدیق الانظار مرحمت کیا۔
کرنل ہملٹن نے ۱۸۶۵ء میں ۶۹ اور ۱۸۶۶ء میں بیس کتابیں عنایت کیں۔ اسی طرح حکیم عبد الصمد خاں نے ۳۰ اور منشی ہدایت اللہ نے گیارہ کتابیں پیش کیں۔ مسٹر سمتھ نے دھرم شاستر، بابو ــــ ؟ نے الفنسٹن کی تاریخ افغانستان اور گلزار ہندی کی دو جلدیں، منشی حکم چند نے ـــــ ؟ کی کہانیوں کی دو جلدیں، مرزا شہاب الدین احمد خاں نے تین جلدیں اور سوسائٹی کے محرر کاشی ناتھ نے مہابھارت کی ایک جلد عنایت کی۔ لفٹنٹ گورنر نے بھی چند کتابیں عطا کیں۔ اس کے علاوہ درج ذیل حضرات نے کتابیں مرحمت کیں۔
ٹامس سٹیفن ـــ ۶ کتابیں، پیارے لال ــ صرف نحو کی دو کتابیں، چندن ۴ کتابیں، تاراچند ـــ مہابھارت، مظہر الحق (نواب پٹودی کے اتالیق) مظہر الحمد۔
سید احمد خاں ـــ رسالہ فقہ شافعی، مرزا غیاث الدین ـــ چند کتابیں، لچھمن سنگھ ـ ہسٹری آف امریکہ، پنڈت بشیشور ناتھ ـــ رتنا کر شیشو، مرزا غالب ـــ سبد چین کی ۶ جلدیں۔

آمد و خرچ

سوسائٹی نے اپنے قیام کے پہلے سال میں عطیات اور چندے کے ذریعہ دو ہزار روپے کی رقم فراہم کرلی (اگست ۱۸۶۶) اس میں ایک روپیہ فی صدی سود کے حساب سے ۱۵۰۰ روپے نائب صدر لالہ سنگھ صاحب کی تحویل میں دے گئے اور ۵۰۰ روپے غالباً ابتدائی لوازمات اور کتابوں پر صرف ہوئے۔
سوسائٹی کے فنڈ میں لفٹنٹ گورنر کے دو عطیوں (ایک سو روپیہ کا اور دوسرا ۲۰۰ روپے[۲]) اور دوسرا چندوں سے رقم ۲۱۲۱ تک پہنچ گئی۔ جس میں سے ۱۸۰۰ معتمد کی تحویل میں دے گئے اور باقی رقم کتب خانے کے لئے کتابوں اور آلات پر صرف کی گئی۔

منتخب شدہ یا خارج شدہ ارکان کی فہرست

۷ ار نومبر کو پانچ ممبر چنے گئے، ان کے نام یہ ہیں، سید احمد خاں، عبد اللطیف خاں، پادری اسمتھ اور

[۱] دہلی سوسائٹی ۸ ر فروری ۱۸۶۹ء۔

فقیر چند، ۱۳ر جولائی ۱۸۶۶ء کو ذکا اللہ، لفٹنٹ ہوکورٹ مولوی جعفر علی اور رکنور پال کنند کے نام ممبری سے خارج کر دئے گئے ان کے بجائے ۱۴ر اگست ۱۸۶۶ء کو سی، ایس، کرک پیٹرک ہیڈ ماسٹر نارمل ہائی اسکول، پنڈت جے نرائن ماسٹر دلی کالج، اور بابو گردھاری لال ممبر منتخب کرلئے گئے۔

۵ ستمبر ۱۸۶۶ء :- لالہ کنہیالال انسپکٹر آف پولیس گوڑگاؤں، لالہ نریندر رانے، وکیل پنجاب دہلی کمشنرز کورٹ، بابو نرائن داس اسسٹنٹ انجینیر۔

۹ر اکتوبر ۱۸۶۶ء :- میجر کیر کرافٹ ڈپٹی کمشنر کانگڑا، منشی رمی چند سپرنٹنڈنٹ ریونیو کانگڑا، پنڈت موتی رام سپرنٹنڈنٹ کانگڑا، مرزا غیاث الدین،

۸ر جنوری ۱۸۶۷ء :- رائے مصری لال تحصیل دار سکندر آباد بلند شہر، نواب خان جہان خان رئیس جادورہ۔

۱۴ر مئی ۱۸۶۷ء :- پادری ونٹر، پنڈت ہرش چندر شاستری، مسٹر فنٹز پیٹرکز، لفٹنٹ ہیک فیرسن،

۱۸ر جون ۱۸۶۷ء :- آنریبل غلام شفیع اللہ خاں نصرت جنگ۔

۱۳ر اگست ۱۸۶۷ء :- لالہ وزیر سنگھ ابن منشی صاحب سنگھ اور رضا علی خاں میرٹھی،

۷ر مارچ ۱۸۶۸ء :- پادری کرافٹ، مسٹر میڈلین، بابو بھاڈدیو مکرجی انسپکٹر آف اسکولز، بنگال، لالہ رادھا کشن، لالہ حکومت رائے،

۱ر جولائی ۱۸۶۸ء :- لالہ اجودھیا پرشاد، لالہ پارس ناتھ، مسٹر گب پرنسپل دلی کالج،

۵ر فروری ۱۸۶۹ء :- چراغ مسیح، ماسٹر گوپال سہائے، ماسٹر اوم راؤ سنگھ، منشی الفت حسین، ماسٹر لچھما داس،

۱۴ر مارچ ۱۸۶۹ء :- لالہ بشمبر ناتھ، بابو مہیندر ناتھ، ماسٹر سری رام بی اے، لالہ بینی پرشاد، لالہ گوری سہائے ماسٹر کنہیالال، الطاف حسین،

ماسٹر وحید الدین ہیڈ ماسٹر ضلع اسکول، بلند شہر کا نام منشی ذکاء اللہ ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول نے پیش کیا۔ لال نہال چند، لالہ حکم چند قرین ماسٹر ضلع اسکول دلی،

۱ر ستمبر ۱۸۷۰ء :- سیما، پرنسپل دہلی کالج،

۲ر نومبر ۱۸۷۰ء :- لالہ تلسی رام، جی، سی، بیدی ہیڈ ماسٹر ضلع اسکول دہلی، اسد یار خاں، لالہ مہاراج لال۔

۱۰ر مارچ ۱۸۷۱ء :- لالہ دیبی سہائے،

۱۴ر نومبر ۱۸۷۱ء :- منشی انور علی،

۲۸ر جون ۱۸۷۲ء :- ڈاکٹر بنٹو، سید احمد،

۱۴ر نومبر ۱۸۷۵ء :- منشی انور علی،

✢ ✢ ✢ ✢ ✢

مقالہ نما

مرتب ــــــــ محمد ابراہیم ڈار

شریک مرتب ــــــ عالی جعفری ــــــ عصمت جاوید ــــــ احمد ملک

مذہبیات

۱۔ ابو الجلال ندوی، اصحاب الفیل کا واقعہ اور اس کی تاریخ (۲)

(معارف نومبر ۱۹۵۲ء ۳۷۶ — ۳۸۴)

اس قسط میں طیر، رمی، سجیل، اور عصف ماکول کی تشریح کی گئی ہے، آخر میں سورۃ الفیل کے مباحث کا خلاصہ درج ہے،

۲۔ برکاتی مسعود احمد: مذہب اور اشتراکیت

(معاشیات ۵۲ مارچ ۴ ۱۳ — ۱۴۰)

کارل مارکس کے معاشی نظریہ کی بنیاد ہیگل کے فلسفہ پر ہے جس میں مذہب (جس کی بنیاد ہی اٹل نظام فکر پر ہے) کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ خود مارکس سیاست قانون اور سائنس کے ساتھ ساتھ مذہب و اخلاق کو بھی معاشی مصالح کا تابع و پابند سمجھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں مذہب کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مضمون میں اشتراکی رہنماؤں اور فن کاروں مثلاً لینن اور سٹروب کے حوالے سے دوسرے اشتراکی رہنماؤں کے افکار پیش کئے گئے ہیں جو مذہب کے خلاف ہیں اشتراکی رہنماؤں کا یہ دعویٰ کہ اشتراکی ریاست میں مذہب آزاد ہوگا محض ڈھونگ ہے۔

۳۔ عبد الحمید ارشد: حدیث نبوی کی دینی حیثیت

(چراغ راہ ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۹ — ۱۴)

۱۔ احادیث کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ احادیث منسوخ نہیں کی جا سکتیں۔ (باقی)

۴۔ عبد الحمید ارشد: حدیث نبوی کی دینی حیثیت

(چراغ راہ کراچی ۵۲ فروری ۱۰ — ۲۰)

۲۔ اس قسط میں قرآن، کتابت حدیث اور نسخ سے بحث کی ہے۔ (باقی)

۵۔ مناظر احسن گیلانی: تدوین حدیث محاضرۂ چہارم (۲)

(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۱۹۷ — ۲۱۲)

عہد عثمانی کے آخری سالوں میں غلط اور بے سروپا روایتوں کا سیلاب مسلمانوں میں بہا دیا گیا تھا حضرت علی مرتضیٰ نے آنحضرت صلعم کے متعلق اپنی ذاتی معلومات کی اشاعت سے اس طوفان کا مقابلہ مناسب خیال کیا اور اسی کے ساتھ صحیح اور غلط روایتوں کے جانچنے کا فطری اور عقلی معیار یعنی معروف و مانوس اور منکر و غیر مانوس باتوں میں تمیز کی کسوٹی مسلمانوں کو عطا کی، حریف حضرت کی زندگی تک خاموش رہے لیکن آپ کی شہادت کے بعد ان لوگوں نے مصنوعی اور جعلی روایتوں کا انبار لگا دیا۔

۶۔ مناظر احسن گیلانی، تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام (۲)

(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۱۳ — ۲۲۶)

مسلمانوں کو بھی چونکا دیا گیا ہے کہ جیسے یہود کو احکام عشرہ سپرد کئے گئے تھے اسی طرح تمہارے حوالے بھی قرآن کے احکام عشرہ کئے جاتے ہیں لیکن اس کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ ان احکام کے ساتھ زندگی کا حقیقی تعلق اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب تک کہ الآخرۃ کا یقین تمہارے

اور صحیح معنوں میں زندہ رہنے گا یہود کا تاریکی نمونہ ہمارے سامنے ہے اچاہیئے کہ اس نمونے سے عبرت و بصیرت کا سبق حاصل کیا جائے۔

۷۔ مناظر احسن گیلانی، تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام،

(برہان نومبر ۱۹۵۱ء ۲۶۱ – ۲۷۲)

قرآن کے دس احکام والی سورہ کی مشہور آیت یسئلونک عن الروح کی تشریح کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ بعض اوقات روحانیت کے مدعی اپنی غلطیوں کے شکار ہو کر اپنی برتری و بلندی کے متعلق طرح طرح کے وسوسے اور بیہودہ خیالات پکانے لگتے ہیں، بعض نوشاہی فقیروں کے اقوال بھی اس سلسلہ میں نقل کئے گئے ہیں،

۸۔ مناظر احسن گیلانی، تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام،

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۲۵ – ۳۳۶)

واقع میں نظریۂ اشتراک اور طریقۂ اشراق دین اور مذہب کے دائرے کی چیزیں ہوں یا نہ ہوں لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے شمار کرنے والے دونوں کو دین ہی کے ذیل میں شمار کرتے چلے آئے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صحیح دین کی روح کو احکام عشرہ کے قالب میں سپرد کرتے ہوئے ان دونوں مغالطوں پر کافی تنقید کی گئی ہے۔

۹۔ میر ولی الدین، قوت ایمانیہ وظہور غیب،

(معارف نومبر ۱۹۵۲ء ۳۶۱ – ۳۷۵)

خدا تعالیٰ کی دعا و ثنا کے نتیجے کے طور پر ہمارے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے، تاریکی دور ہو جاتی ہے، قلب مسرت سے بھر جاتا ہے، اطمینان، سکینہ اور وقار کا مسلسل فیضان مبدء فیاض کی جانب سے ہونے لگتا ہے باطن انوار و کیفیت محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، ایمان ان

اشیاء کی حقیقت یا جوہر ہے جن کی ہم حق تعالیٰ سے توقع کرتے ہیں،

تذکرہ و سیرت نگاری

۱۰۔ خلیق احمد نظامی، مولانا ضیاء الدین نخشبی،

(برہان نومبر ۱۹۵۱ء ۲۷۳ – ۳۰۲)

طوطی نامہ کے مصنف مولانا ضیاء الدین نخشبی کے حالات زندگی اور تصانیف کا تذکرہ ہے، جا بجا ان کے اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے،

۱۱۔ رام پوری۔ محمد علی خاں اثر: جارج فانوم صاحب تخلص۔ اردو کا ایک ممتاز شاعر۔

(آج کل ۵۲ جنوری ۱۴ – ۱۶)

مضمون میں اس نو مسلم فرانسیسی شاعر کے مختصر حالات پیش کئے ہیں اور بابو رام سکسینہ نے تذکرۂ یورپین شعراء میں جو اس شاعر کے اشعار (معہ حالات زندگی) پیش کئے ہیں ان پر مضمون میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۲۔ شروانی۔ محمد وسیم خاں: مجذوب فرنگی

(آج کل ۵۲ جنوری ۴۵ – ۴۸)

نطشے کے خیالات و افکار پیش کئے گئے ہیں۔ وہ ایک پادری کا بیٹا تھا لیکن اس نے یسوع مسیح کو بے تاج کر دیا وہ نحیف و نزار تھا لیکن اس نے فوق البشر کا تصور پیش کیا جس کی اساس قوت ہے۔ وہ دیوانہ تھا لیکن "دیکار خویش ہوشیار"۔

۱۳۔ مناظر احسن گیلانی، ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی[۲]

(معارف نومبر ۱۹۵۱ء ۳۲۵ – ۳۴۴)

مظلوم مولوی نے متداولہ علوم کی تحصیل کے علاوہ اپنے ذاتی مطالعہ و محنت سے یورپ کے جدید افکار و خیالات سے کافی و قیمتی بہم پہنچائی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر کے مقدمہ میں جہاں علم کلام اور تصوف کے پرانے مباحث کا تذکرہ ملتا ہے وہاں تعداد ازدواج

غلامی، جہاد اور اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے سے متعلق بھی بحث پائی جاتی ہے، مقالہ نگار نے اپنے بیان کی تائید میں کئی مثالیں پیش کی ہیں۔

تنقید، ادب، لسانیات

۱۴۔ افتخار اعظمی: لسانی انتقاد
(نگار مارچ ۱۹۵۵ء ص ۲۴۔۲۹)

بعض الفاظ کے اشتقاق اور ان کی وجہ تسمیہ میں نفسیات کے دخل سے بحث کی گئی ہے۔ آخر میں مدیر نگار کی ایک مختصر تحریر ہے جس میں مضمون نگار کے بعض نظریوں سے اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۵۔ حسرت موہانی: افاداتِ حسرت موہانی
موازنۂ امیر و داغ
(نگار مارچ ۱۹۵۵ء ص ۳۰۔۳۵)

امیر کے اشعار میں مضمون کی بلندی خیال کی نزاکت بیان کی متانت اور زبان کی صحت، غرضیکہ پختگی کلام کے تمام لوازمات موجود ہیں لیکن شاعری کی جان یعنی تاثیر کی عدم موجودگی کے باعث ان کی حیثیت ایک حسین مگر بے روح جسد سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی۔ اسی طرح داغ کے اشعار میں زبان کی صفائی، محاورہ اردو کی بے تکلفی، بیان کی شوخی اور الفاظ کی پسندیدہ تکرار یا الٹ پلٹ غرضیکہ شعر کی ظاہری خوبی کا تمام سامان فراہم ہوتا ہے لیکن عشق کے جذبات عالیہ کا نشان نہیں ملتا امیر و داغ کا تقابل پیش کیا گیا ہے اور جا بجا اس موضوع پر حضرت ثاقب کی رائے سے بحث کی گئی ہے۔

۱۶۔ حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی
اردو زبان کے مترادف الفاظ
(نگار مارچ ۱۹۵۵ء ص ۱۳۔۱۸)

ترادف کی مختلف شکلوں سے بحث کرتے ہوئے اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ترادف ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس سے انکار زبان کو محدود دائرے میں بند کر دیتا ہے۔ اردو زبان میں چونکہ بے شمار دخیل اور ہند اور مولد الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اس لئے مترادف الفاظ بھی بہت ہیں۔

۱۷۔ خلیل الرحمان اعظمی: ہماری عشقیہ شاعری
(نگار مارچ ۱۹۵۲ء ص ۱۹۔۲۳)

عشقیہ شاعری میں اور عشق کو بطور علامت یا روایت کے استعمال کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ہمارے یہاں محبت کی جو ماجائی پوری شاعری پر قبضہ جمائے ہوئے ہے لیکن کامیاب عشقیہ شاعری دو چار شاعروں ہی کے یہاں ملتی ہے۔

۱۸۔ خواجہ احمد فاروقی:
نواب صدر یار جنگ کے خطوط
(آج کل ۷ جنوری ۱۰۔۱۳)

مضمون نگار نے نواب صدر یار جنگ سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور نواب صدر یار جنگ کے وہ خطوط شائع کئے ہیں جو مضمون نگار کے پاس تھے جن میں سے کئی ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گئے تھے۔ یہ خطوط حکیم سید شمس اللہ قادری، مولوی عبد الحق، امتیاز علی خاں عرشی، مہتمم کتاب خانہ قلعہ معلی رام پور اور مضمون نگار کے نام ہیں۔

۱۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی،
اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی اہمیت
(معارف دسمبر ۱۹۵۲ء ۵ ۴۰۵۔۴۲۷)

زبان کی ترقی اور کمال کے گوناگوں پہلو ہیں مگر اس مقالہ میں صرف اس کے تین اہم پہلوؤں یعنی لسانی اور لغوی وسعت، علمی درجہ اور تمدنی حیثیت پر بحث کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ان تینوں پہلوؤں سے

ہندوستان کی زبانوں میں اُردو کا درجہ نہایت ممتاز ہے۔

۴۰۔ شوکت سبزواری، لکھنؤ کی زبان،

(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۴۱–۴۵۶)

لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم تو ادب میں ہے، یہ زبان کے ساتھ طرزِ بیان کو بھی شامل ہے، لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو خالص لسانیاتی ہے، اسی مفہوم سے یہاں بحث کی گئی ہے۔

لکھنؤ کی زبان دلّی اور دوسرے مقامات کی زبان سے جہاں اُردو بولی جاتی ہے مختلف نہیں اور جو تھوڑا بہت اختلاف ہے وہ اتنا اہم نہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو جداگانہ اور مستقل حیثیت دی جاسکے، اس اختلاف کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴۱۔ طباطبائی نظم مرحوم: ادب الکاتب والشاعر

(افاداتِ طباطبائی نظم مرحوم)

(نگار مارچ ۱۹۵۳ء ص ۷–۱۲)

شعر کے مؤثر ہونے کے لئے محض تخیل کافی نہیں بلکہ زبان کا شاعرانہ ہونا بھی ضروری ہے۔ شاعر کو ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے لفظ و ترکیب کے انتخاب و اختیار کا اور اس سبب سے اس کا طرزِ بیان غیر شاعر کے طرزِ بیان سے ممتاز ہوتا ہے۔ شاعر لفظ کی خوبصورتی و بدصورتی کو پہچانتا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح شاعر زبان کی تکمیل کرتا ہے اور اس کے بعد صنائعِ شعری سے بحث کی گئی ہے۔

۴۲۔ ظفر عالم گیر: خانقاہ اور خاندان

(شاعر ۲۵ جنوری ۱۲–۱۹)

خانقاہ اور خاندان (دی کلائسٹر اینڈ دی ہارتھ) وکٹوریئن دَور کا مقبول ناول ہے جسے چارلس ریڈ نے لکھا۔ اس ناول نے ریڈ کو انگریزی ناول نگاروں کی صفِ اول میں جگہ دے دی۔ دی کلائسٹر اینڈ دی ہارتھ ایک دلچسپ تاریخی کہانی ہے جس میں ریڈ نے فنکارانہ چابکدستی سے "خانقاہ" کے روپ میں راہبوں اور پادریوں کی زندگی اور "خاندان" کے بھیس میں گھریلو زندگی اور عزیز و اقربا کی محبت کے اثرات کو پیش کیا ہے۔ مضمون میں پوری کہانی مختصراً پیش کی گئی ہے اور اس کی خوبیوں کو سراہا گیا ہے۔

۴۳۔ عبدالحلیم انصاری: آرٹ اور آرٹسٹ

(آجکل ۲۵ جنوری ۳۳–۳۷)

مذکورۂ بالا عنوان پر بھوپال کے مشہور فنکار عبدالحلیم انصاری کے نثر پارے جس میں انھوں نے آرٹ اور کائنات کے باہمی تعلق، آرٹسٹ کی تعلیم و تربیت، اس کے پیغام، مجاہدانہ کردار وغیرہ پر اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔

۴۴۔ عشرت حسن انور، اقبال اور ولیم جیمس،

(معارف نومبر ۱۹۵۲ء ۳۴۵–۳۶۰)

اقبال ولیم جیمس کی طرح خالق و مخلوق کے درمیان سے دوری و مہجوری ختم کرنے کے قائل ہیں، وہ ولیم جیمس کی طرح ہمہ اوست کی تائید کرتے اور عین حقیقت سے زیادہ سے زیادہ قربت اور وصل ڈھونڈتے ہیں، ولیم جیمس ہی کی طرح اقبال اس خیال کے حامی ہیں کہ کثرت اور وحدت کی گتھی ذاتِ نفس کے وجدان کی بناء پر ہی کھل سکتی ہے، اس خیال میں بھی اقبال ولیم جیمس سے متفق ہیں کہ کثرت وجودِ باری تعالی کے وجود سے کسی طرح غیر متعلق نہیں،

۴۵۔ عشرت حسن انور، اقبال اور وائٹ ہیڈ (۷)

(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۲۸–۴۴۰)

وحدت وجود کے اقرار سے ایک دشواری پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کے اقرار سے کثرت وجود غیر حقیقی اور محض اعتباری قرار پاتا ہے، اقبال اس سوال کو حل کرنے میں قدیم صوفیائے اسلام کے بجائے جدید ترین مغربی حکما بالخصوص وائٹ ہیڈ کے بعض نظریات سے متاثر ہیں،

صوفیہ نے صورِ علمیہ اور اعیان ثابتہ کے ذریعے اس مشکل کو حل کرنا چاہا ہے لیکن اقبال کے فلسفہ کی رُو سے بعض وجوہ کی بنا پر یہ ناقابل قبول ہے، یہ وجوہ بھی بیان کی گئی ہیں،

۲۶۔ غزنوی۔ حبیب الرحمٰن:
کارٹون اور اس کے متعلقات
(آج کل ۲ جنوری ۵۲ء ۴۹-۵۲)

کارٹون، اور کیری کیچرس (احتجاجی چہرے) کی مختصر تاریخ پیش کی ہے۔ اور کارٹون اور کیری کیچر کے فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت میں کارٹون کی ترویج پر روشنی ڈالی ہے اور موجودہ دور کے کارٹونسٹوں کا ذکر کیا ہے۔

۲۷۔ فروغ احمد: اقبال پر ایک ترچھی نظر
(چراغ راہ ۱۵ دسمبر، ۲۵ جنوری ۵۲ء ۳۷-۴۰، ۳۶)

س۔ ا۔ تبسم نے جون ۱۹۵۱ء کے چراغ راہ میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت ایک مقالہ لکھا تھا جس کا جواب اگست ۱۹۵۱ء میں معز ز علی بیگ نے دیا۔ موجودہ مضمون بھی اسی کے جواب میں ہے۔ اقبال کے عروضی غلطیوں، قدیم شعرا کے ساتھ موازنہ، تعلی، نطشے کا ترجمہ، اقبالیات، مزب کلیمی، منفی پہلو سے گریز، طبقاتی شاعر، خودی و بے خودی اور من میں ڈوب کر شہ بدلنا، وغیرہ سے بحث کر کے تبسم صاحب کو غلط ٹھہرایا ہے۔ تاہم اقبال کو خطا سے عاری نہیں سمجھا ہے۔

۲۸۔ فیروز آبادی، محمد عظیم: ادب اور مارکسیت
(شاعر ۲ فروری ۵۲ء ۲۴-۲۷)

مارکس و اینگلز کے اقوال کی روشنی میں مارکسیت کی تشریح و توضیح کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ مارکسیت فنکار کو حقیقت کی کلید عطا کرتی ہے۔ اور انسان کی صحیح قدر و قیمت کو متعین کرتی ہے اور اس لئے دنیا کے تمام نظریات میں سب سے زیادہ انسان دوست نظریہ کہلانے کی مستحق ہے۔

۲۹۔ گوالیاری۔ شفا:
نظیر اکبر آبادی کی چند خصوصیات،
(شاعر ۲ جنوری ۵۲ء ۹-۱۱، ۱۴)

اکبر آباد برج بھاشا کا مرکز تھا چونکہ نظیر اسی جگہ سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کے اشعار کی زبان میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو برج بھاشا کے زیر اثر اردو میں ہونے چاہئیں۔ اس کے ہاں برج بھاشا کے ایسے اکثر الفاظ ملتے ہیں جن کو اس نے عطف و اضافت کے ذریعہ ایک بنا لیا ہے۔ وہ قواعد کی اگر پابندی کرتا بھی ہے تو بھاشا کے اصول کے تحت۔ وہ جمع الجمع بے تکان بناتا ہے۔ اسما و صفت بطور عام گڑھتا اور استعمال کرتا ہے۔ دوسری خصوصیت اس کی فطرت پرستی ہے۔ وہ صرف ملکی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے موضوعات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس کے کلام میں ہر صنف موجود ہے۔ اس کے ہاں مذہبی تعصب بالکل نہیں وہ عوام کا شاعر ہے۔

۳۰۔ مرزا جعفر علی خاں اثر! "نشاطِ رفتہ"
(نگار مارچ ۵۲ء ص ۳۸-۴۷)

ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مجموعۂ کلام "نشاطِ رفتہ" پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر صاحب کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور فرداً فرداً بعض اشعار کے حسن و قبح پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے

۳۱۔ مظفر شاہ خاں،
اقبال کا فلسفۂ خودی اور فلاسفۂ مغرب
(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۳۷-)

مقالہ نگار نے بتایا ہے کہ اقبال اپنے فلسفۂ خودی میں کہاں تک حکمائے مغرب سے متاثر ہیں اور کن کن باتوں میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں،

۳۲۔ ملسیانی۔ عرش:
عبدالحلیم انصاری۔ مصور و مفکر
(آج کل ۵۲ جنوری ۲۷ — ۲۸)

بھوپال کے زمانۂ حال کے عظیم فنکار عبدالحلیم انصاری کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ابتدا میں ان کا فن بھوپال کے قدرتی اور تاریخی مقامات تک محدود تھا لیکن بعد میں انھوں نے بھوپال اور سانچی کے علاوہ گوالیار دتیا اندور دیواس رتلام، جاورہ اور ٹونک وغیرہ کے قدیم و تاریخی مقامات کی بھی مصوری کی۔ دہلی کی قدیم و تاریخی عمارات کی بھی انھوں نے مصوری کی ہے۔ بقول مقالہ نگار ان میں تلسی داس، نظیر اکبرآبادی، ٹیگور اور اقبال کی روحیں یکجا ہوگئی ہیں۔ مضمون میں ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت سندر لال کے تاثرات بھی پیش کئے گئے ہیں اور ان لوگوں کی فہرست دی گئی ہے جنھوں نے ان کے فن کو سراہا ہے۔

۳۳۔ نازش پرتابگڈھی: آزاد کی شاعری
(شاعر ۵۲ جنوری ۲۰ — ۲۴)

جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ آزاد نئے ہوتے ہوئے بھی قطعی نئے نہیں ہیں۔ وہ ماضی اور اس کی حسین روایات سے باغی نہیں۔ ان کے یہاں نام نہاد ترقی پسند دل کی بے راہ روی نہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی آواز غیر متوازن نہیں ہونے پاتی۔ آج کی دنیا کے تقریباً سارے کے سارے تقاضے اور موضوعات غزل کے دامن میں نظر آتے ہیں آزاد کی غزلوں میں خصوصیت پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں متانت کے ساتھ ساتھ احساس کی شدت بھی ہے۔ ان کے خیالات میں نفاست جذبات میں خلوص اور لب و لہجہ میں یکسانیت ہے۔ ان کی نظموں میں روانی ہے لیکن فردیت نہیں۔ ان کا سیاسی شعور کافی بالغ اور پختہ ہے۔ وہ کبھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کے موضوع اور انداز بیان میں اجتہاد ضرور ہے لیکن انھوں نے بحر و قوافی اور دوسری فنی پابندیوں سے کبھی عمداً بغاوت نہیں کی۔

۳۴۔ ندوی۔ مسعود عالم: رسالۃ المشرق
(چراغ راہ ۵۱ دسمبر، ۵۲ جنوری ۳۵ — ۳۶)

یہ پیام مشرق کا عربی ترجمہ ہے جو ڈاکٹر عبدالوہاب بک عزام، سفیر مصر در پاکستان کے قلم کا رہین منت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت خوب ہے۔ اسرار و رموز سے متاثر ہو کر اللمعات کے نام سے ڈاکٹر عزام نے ایک مسلسل نظم لکھی ہے جو اس میں شامل ہے۔ مقدمہ میں ڈاکٹر عزام نے اقبال سے تعارف، ان کے کلام سے دلچسپی، اور ترجمہ کے باب میں اپنا اصول اور طریقہ دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ طباعت نفیس، آرٹ پیپر پر ٹائپ میں یہ کتاب ایوب پریس، کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ مع مقدمہ کے ۲۰۰ صفحات ہیں۔ پیش لفظ نذیر احمد صدر اقبال اکاڈمی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی عربی کمزور ہے۔

۳۵۔ نعیم صدیقی: اکبر کا تصور مذہب
(چراغ راہ ۵۱ دسمبر، ۵۲ جنوری ۴۹ — ۵۷)

اکبر الہ آبادی کوئی مزاح نگار ہی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ شاعر بھی ہے لیکن لوگوں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کے ہاں ایک مذہبی تصور ہے۔ مگر یہ تصور مذہب اسلام کی روح سے مطابق نہیں۔ وہ اس کے ہمہ گیر انقلابی روپ کے لئے نہیں بلکہ اس کی مسخ شدہ روایات کے لئے مغربی طوفان سے لڑتا ہے۔

۳۶۔ ہاشمی۔ نصیر الدین:
حضرت اکبر الہ آبادی کا پیغام عورتوں کو
(شاعر ۵۲ فروری ۱۵ — ۲۳)

اکبر الہ آبادی نے عورتوں کو جو پیغام دیا اسے

تین عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے تعلیم نسواں، آزادیٔ نسواں اور پردہ اور ان عنوانات کے تحت مضمون کو ترتیب دیا گیا ہے۔

تاریخ و سیاست

۳۷۔ خورشید احمد فارق،
مختار بن ابی عبید الثقفی
(۷)
(ج) بصرہ میں مختار کی تحریک
(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۲۷ — ۲۳۶)
مختار کے مختصر دور اقتدار میں اس کی فوجیں آٹھ مورچوں پر لڑیں، ان آٹھ لڑائیوں کے مختصر تذکرے کے بعد مختار کی عسکری تدبیر اور طرز عمل کا ذکر ہے۔

۳۸۔ دھولیوری قاضی معراج:
ارباب تاریخ کی بے اعتنائیاں
(شاعر ۲۵ فروری ۹ — ۱۴)
مقالہ میں ان بے اعتنائیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کا تعلق خصوصیت کے ساتھ تاریخ سے ہے۔

۳۹۔ سید اطہر حسین جعفری:
ہندوستان اور چین کے درمیان قدیم تعلقات
(آج کل ۲۵ جنوری ۳۸ — ۴۱)
بدھ مذہب کی تبلیغ کے سلسلے میں ہندوستان سے چین جانے والے پرچارکوں اور چین سے ہندوستان آنے والے سیاحوں کا قدرے تفصیلی ذکر۔

۴۰۔ ص ہ ع، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک
(معارف نومبر ۱۹۵۲ء ۳۸۹ — ۳۹۴)
ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی "ہسٹری آف میڈیول انڈیا" کے آخری باب میں "ازمنۂ وسطیٰ کا تمدن" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس کے خاص خاص حصے کی تلخیص کی ہے۔

۴۱۔ ص۔ ع، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک
(معارف دسمبر ۱۹۵۲ء ۴۵۳ — ۴۵۷)
ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی مشہور کتاب میڈیول انڈیا میں سلطان محمود غزنوی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

۴۲۔ مفتی انتظام اللہ شہابی،
امیر الامراء نواب نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت
(۱۲)
(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۴۴ — ۲۴۷)
اس قسط میں نواب دوندے خاں اور احمد شاہ ابدالی کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں،

۴۳۔ مفتی انتظام اللہ شہابی،
امیر الامراء نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت
(۱۳)
(برہان نومبر ۱۹۵۱ء ۳۰۳ — ۳۰۸)
احمد شاہ ابدالی کی ہندوستان میں سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور عماد الملک غازی الدین کی ناشائستہ حرکات کا بیان ہے۔

۴۴۔ مفتی انتظام اللہ شہابی،
امیر الامراء نواب نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت
(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۶۵ — ۳۷۲)
نواب نجیب الدولہ کے بیٹے نواب ضابطہ خاں کی شکست اور زوال کا مختصر بیان ہے، نواب نجیب الدولہ کے خاندان کا شجرہ دیا گیا ہے اور آخر میں فہرست کتب

درج کی گئی ہے۔

معاشرتی حالات

۴۵۔ ابوالخطیب:
اسلام کا سماجی تصور اور کمیونسٹ ڈپلومیسی
(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر ۵۲ جنوری ۱۵ــ۱۷)
کمیونسٹ پروپیگنڈے کی چند قسموں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ (باقی)

۴۶۔ ابوالخطیب:
اسلام کا سماجی تصور اور کمیونسٹ ڈپلومیسی
(چراغ راہ ۵۲ فروری ۸ــ۹)
۲۔ اس قسط میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کس طرح کمیونسٹ پریس، کمیونسٹ ادیب اور رجعت پسند مسلمان کے ہمہ گیر دینی تصور کو پامال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فروعی مسائل کو اچھال کر مسلمانوں کے ذہن کو مختلف الجھنوں میں گرفتار کرنا ان کا مقصد ہے۔

۴۷۔ ادارہ: جدید چھ سالہ تعلیمی منصوبہ
(معاشیات کراچی ۵۲ جنوری ۳۳ــ۳۴)
۴ دسمبر ۱۹۵۱ء کو پاکستان کے وزیر تعلیم فضل الرحمٰن صاحب کی صدارت میں پاکستان کے تعلیمی مشاورتی بورڈ انٹر یونیورسٹی بورڈ اور صنعتی کونسل کی ایک مشترکہ کانفرنس ہوا جس میں ملک کے دوسرے تعلیمی افسران و ماہرین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا مقصد مروجہ طریقۂ تعلیم کو بدلنا اور تعلیم کو زندگی اور ضروریات کے قریب لانا تھا۔ اس مضمون میں اسی کی تفصیل درج ہے۔

۴۸۔ ادارہ: زندگی کا عدم توازن،
(چراغ راہ ۱۵ دسمبر ۵۲ جنوری ۱۸ــ۲۰)
انسانی نفسیات و کردار کی روشنی میں بتایا ہے کہ عدم توازن زندگی میں کب اور کیونکر رونما ہوتا ہے اور اس کی کیا شکلیں ہوتی ہیں اور اسے ختم کس طرح کیا جانا چاہیے۔

۴۹۔ خواجہ عبدالرشید،
عراقی کردستان میں کھدائی کا کام
قبل از تاریخ کا تہذیب و تمدن
(برہان نومبر ۱۹۵۱ء ۳۰۹ــ۳۱۳)
عراقی کردستان کے کچھ مقامات میں کھدائی تقریباً مکمل ہو چکی ہے، یہ تمام علاقے قبل از تاریخ تمدن رکھتے ہیں، کھدائی کے حاصل شدہ نتائج سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہاں کی تہذیب مغربی ایشیا کی تہذیبوں سے قدیم تر ہے۔
کھدائی کی یہ مہم پروفیسر رابرٹ بریڈ ووڈ کی زیر نگرانی عمل میں آئی ہے۔

۵۰۔ مبارزالدین رفعت: ہاتھ کی لکیریں
(آج کل ۵۲ جنوری ۲۴ــ۲۶)
یہ علم بہت پرانا ہے۔ چین میں اس کا رواج تین ہزار سال ق۔م۔ تھا۔ یونانی فلسفیوں خصوصاً ارسطو کی کتابوں میں اس فن کی تفصیل ملتی ہے۔ اسی طرح مصر، روم اور ہندوستان میں بھی یہ فن رائج تھا۔ آج بھی یورپ امریکہ، شام مصر اور عربستان میں اس کے جاننے والے ملتے ہیں۔ یورپ نے اس علم کو فن بنانے کی کوشش کی ہے۔ فرانس نے پامسٹری کے بڑے بڑے جانکار پیدا کیے ہیں جن میں ہرٹلیب، ڈی آرپنٹنی اور پروفیسر شیرو کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہاتھ دیکھنے کے کئی طریقے ہیں جن کا مضمون میں ذکر کیا گیا ہے۔

۵۱۔ نعیم صدیقی: جنسی نظریہ
(چراغ راہ ۵۲ فروری ۲۳ــ۳۲)
ایک استفسار کے جواب میں قرآن مجید سے اسلامی جنسی نظریہ پر روشنی ڈالی اور مغربی مفکرین کے نظریوں پر مختصراً تبصرہ کرتے ہوئے ان کی خامیاں دکھائی ہیں۔

آرٹ
(علوم و فنون)

۵۲۔ محمد ظفیرالدین، جامع اموی دمشق

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۵۴ — ۳۶۲)

دمشق کی مشہور عالم مسجد کی تعمیر کی مختصر تاریخ دی ہے، مشہور مصنفوں اور سیاحوں کی روشنی میں اس کی عظمت، خوبصورتی اور وسعت کا ذکر ہے اور اس کے مدرسہ کے مشہور اساتذہ کا تذکرہ ہے۔

سائنس

۵۳۔ محمد عبدالرحمٰن خاں، جوہری توانائی،

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۴۷ — ۳۵۴)

جوہری توانائی کے انکشافات اور استعمال سے متعلق ضروری معلومات کا بیان ہے۔

معاشیات

۵۴۔ ادارہ: پاکستان کی بحری تجارت کا جائزہ،

(اکتوبر ۱۹۵۱ء معاشیات کراچی ۵۲ جنوری ۱۹-۲۵)

پاکستان کی بحری تجارت کے اتار چڑھاؤ کو مختلف اعدادی خاکوں سے ظاہر کیا ہے۔

۵۵۔ ادارہ: پاکستان کی چائے کی صنعت،

(معاشیات کراچی ۵۲ فروری ۷۳ — ۷۹)

مشرقی بنگال میں جوٹ کے بعد چائے کی ہی صنعت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا پہلا باغ سلہٹ کے قریب ۱۸۵۴ء میں قائم ہوا۔ چائے کے باغات زیادہ تر سلہٹ کے ضلع میں ہیں۔ چٹاگانگ اور تری پورہ میں بھی چائے کی پیداوار ہوتی ہے۔ پاکستان کی چائے لنکا اور ہندوستان کی چائے کے اتنی عمدہ تو نہیں ہوتی مگر اس کی اپنی خصوصیات ہیں جن کی بناء پر بہت سے علاقوں میں یہ مقبول ہے۔ خاطر خواہ ترقی یافتہ نہ ہونے کے سبب پاکستانی حکومت نے چند منصوبے بنائے ہیں جن پر عمل پذیر ہونے سے اس صنعت کو بہت کامیابی ہوگی۔

۵۶۔ ادارہ:

مشرقی بنگال کا ۵۳-۱۹۵۲ کا موازنہ

(معاشیات ۵۲ مارچ ۱۳۱ — ۱۳۳)

مشرقی بنگال کے ۵۳ — ۵۲ کے موازنہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کا گذشتہ سال کے موازنہ سے مقابلہ کرنے کے بعد آخر میں یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ آئندہ چند سال میں یہ صوبہ فاضل موازانہ والے صوبوں میں تبدیل ہو جائیگا۔

۵۷۔ انصاری۔ انور سعید: تخمین

(معاشیات ۵۲ مارچ ۱۱۵ — ۱۳۰)

تخمین (سٹہ بازی) کے جواز میں دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ جوئے اور تخمین کے فرق کو ظاہر کر کے موخرالذکر کو اول الذکر پر ترجیح دی گئی ہے تخمین کی تعریف اور اس کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ نزولی اور صعودی سٹہ باز (Bulls اور Bears) مبادلہ گاہ پیداوار (پروڈیوس ایکسچینج) سٹہ بازار (اسٹاک ایکسچینج) اور صرافہ (بلین ایکسچینج) اور حصص اسٹاکس تمسکات، ہنڈی فروش، دلال وغیرہ اصطلاحوں کی تشریح بھی کی گئی ہے اور جائز تخمین و ناجائز تخمین کے فرق کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

۵۸۔ انور سعید انصاری: سٹہ بازی

(معاشیات ۵۲ فروری ۷۵ — ۸۶)

کساد بازاری کی توجیہہ چاہے لوگ کسی طرح کیوں نہ کریں، اس کا ایک اہم سبب سٹہ بازی (تخمین) ہے چنانچہ مضمون نگار نے امریکہ و انگلستان (جو دو بڑے سرمایہ دار ملک ہیں) کے معاشی و معیشتی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے سٹہ بازی کے اسباب اور اس کی ترقی پر روشنی ڈالی اور کسی ملک کے لئے نقصان دہ بتلایا ہے۔

۵۹۔ بارہوی جعفر،

ہندوستان میں بنک کاری کی مختصر تاریخ

(معاشیات ۵۲ مارچ ۱۴۱ — ۱۴۷)

ہندوستان کی تاریخ میں بنک کاری کا وجود بہت

قدیم ہے۔ یہاں ہنڈی قبل مسیح رائج تھی۔ دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں بھی زری لین دین کے دھندے کے نشانات ملتے ہیں۔ منو نے قرض کے لین دین کے جو قانون اور طریقے بتائے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں صرف سکے رائج ہی نہیں تھے بلکہ تجارتی نقطۂ نظر سے ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانے کے ساہوکار "رشی" کہلاتے تھے بارھویں صدی عیسوی میں جین ساہوکار بنک کاری بڑے پیمانے پر چلاتے تھے۔ مغلیہ دور میں بھی ہندوستانی بنکاروں کو معاشی نظام میں کافی دخل تھا مضمون میں یورپ میں بنک کاری کی بھی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے اور یورپ والوں نے ہندوستان میں یکے بعد دیگرے جو بنک قائم کئے۔ ان کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

۶۰۔ برکاتی مسعود احمد: طبقاتی نزاع

(معاشیات کراچی ۵۲ جنوری ۱۲ — ۱۸)

طبقاتی نزاع دراصل مارکس کے نظریہ تاریخ کا خاصہ ہے۔ مختصراً پیداوار کے لحاظ سے مارکس نے انسانوں کو بنیادی طور پر ظلم کنندہ سمجھ لینے کے بعد ظالم اور مظلوم کی حیثیت سے تقسیم کر دیا۔ اس نے تاریخ کے پانچ دور قائم کئے اور ہر جگہ یہی صورت حال اس کے پیش نظر رہی۔ تاہم انجیلز نے قدیم انسانوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نظریۂ تاریخ غلط ہے اور اسی طرح طبقاتی نزاع جیسی کوئی شئے نہیں۔

۶۱۔ ت۔ م۔ خ۔ افراط زر اور شرح بنک

(معاشیات کراچی ۵۲ جنوری ۵ — ۱۱)

افراط زر سے مراد زر زیر گردش اور قابل صرف اشیاء میں عدم توازن کی صورت کا پیدا ہو جانا ہے۔ گویا خرید کی قوت کے مقابلہ میں اشیاء ضرورت کا کم ہونا۔ چنانچہ ان اشیاء کی پیداوار بڑھا کر افراط زر کو روکا جا سکتا ہے، مگر یہ کچھ اتنا آسان نہیں۔ اس لئے اس کی روک قیمتوں پر نگرانی، رسد بندی، اور شرح سود میں اضافہ سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک یا ہر ایک کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اسٹرلنگ کی حالت بہتر بنانے اور اندرون ملک بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنے کے لئے انگلستان نے کوئی ۱۲ سال بعد شرح بنک میں ½ کا اضافہ کر دیا۔ اس سے متاثر ہونے کے سبب دنیا کے کئی ممالک نے مناسب طور پر اپنے ہاں بھی شرح بنک بڑھا دی۔ تاہم بڑھی ہوئی شرح بنک خود کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، اصل میں اعتباری سہولتوں کی کمی نفسیاتی طور پر بازار کو متاثر کرتی ہے۔

۶۲۔ ت۔ م۔ خ:

پاکستان میں مرکزی اور صوبوں کے مالی تعلقات

(معاشیات کراچی ۵۲ فروری ۵۵ — ۶۲)

غیر منقسم ہندوستان میں مرکز اور صوبوں کے مالی تعلقات "فیصلہ نیمیر" سے متعین ہوئے تھے لیکن تقسیم کے بعد دفاع، انتظامی معاملات، مہاجرین اور مختلف دفتری اور ان سے متعلق اخراجات کے مقابلے میں مرکز کی آمدنی بہت کم تھی، صوبوں نے عارضی طور پر مرکز کو کچھ رعایتیں دے دیں۔ لیکن یہ عارضی تھا۔ صوبوں کے اخراجات بڑھ رہے تھے۔ اس لئے مرکز سے انھوں نے نئے مالی تعلقات پر زور دیا۔ اس کے لئے سر جیرمی ریزمین کو پاکستان کی مرکزی حکومت نے بلایا اور ان کی سفارشات کو ثالث کی حیثیت سے مان لیا۔ اس سے صوبوں کو خاصی آمدنی ہوگی اور مجموعی طور پر پاکستان ترقی کرے گا۔

۶۳۔ حسین انصاری:

سعودی عربیہ میں زراعت

(معاشیات کراچی ۵۲ فروری ۶۰ — ۶۷)

اب سے ۵۰ سال پہلے سعودی عربیہ امن و چین اور مرکزی وحدت سے ناآشنا تھا۔ لیکن جلالۃ الملک

شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہ ترقی کرنے لگا۔ زراعتی اعتبار سے یہ بہت پیچھے ہے لیکن حکومت ہر ممکن کوشش کر رہی ہے کہ سعودی عربیہ کی زراعت کو ترقی ہو۔ اس مضمون میں حکومت کی اس سلسلہ کی کوششوں کا ذکر ہے۔

۶۴۔ سبزواری۔ محمد احمد:

کل پاکستان معاشی کانفرنس

(معاشیات ۵۲ مارچ ۱۰۷ — ۱۱۴)

۱۱ فروری ۵۲ء کو کراچی میں ہونے والے کل پاکستان معاشی کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس کی روداد جس میں غلام محمد گورنر جنرل پاکستان جناب فضل الرحمٰن وزیر تعلیم و تجارت و امور معاشی، زاہد حسین گورنر اسٹیٹ بنک آف پاکستان وغیرہ نے موجودہ معاشی مسائل پر روشنی ڈالی مضمون میں کانفرنس کی کارروائی کا جائزہ لینے کے بعد یہ توقع ظاہر کی گئی ہے وہ ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کرے گی جو قرآن احادیث و فقہ کی روشنی میں اسلام کے معاشی ضابطوں کی جانچ پڑتال کرے گا اور یہ بتلائے گا کہ وہ کہاں تک مروجہ معاشی اصولوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں

۶۵۔ صدیقی۔ جلیل احمد:

مہاتما گاندھی اور معاشیات

(آج کل ۵۲ جنوری ۵ — ۸)

مہاتما گاندھی ماہر معاشیات نہ تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے معاشیات کے متعلق اپنا انفرادی ردِّ عمل اور ایک مخصوص نظریہ پیش کیا ہے جو رسکن کی مشہور تصنیف "ان ٹو دس لاسٹ" سے بے حد متاثر ہے۔ وہ رسکن کی طرح معاشیات کو اخلاقیات سے جدا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انسانی زندگی کی بھلائی ان کا مطمح نظر تھا اسی لئے وہ مغربی معاشی نظام کے مخالف جس میں صرف طاقت ور ہی کو پروان چڑھنے کا حق حاصل ہے۔ ان کے معاشی نظام میں سودیشی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سودیشی سے ان کی مراد گھریلو دستکاریوں کی حمایت ہے۔ وہ مشینری کے صرف اس حد تک مخالف تھے کہ اس سے بیکاری اور غربت پھیلتی ہے اور وہ چاہتے تھے کہ غیر صنعت یافتہ قومیں بھی اپنی ضرورت کا سامان پیدا کریں تاکہ صنعت یافتہ ملکوں کو اپنے نفع کے لئے بیرونی مارکیٹ نہ ملیں اور اس طرح دنیا سے لوٹ کھسوٹ ختم ہو جائے۔ ان کے کھادی اور سودیشی فلسفہ کا یہی پیغام ہے۔

۶۶۔ نقوی رضی حیدر:

پاکستان میں باجرہ کی فصل پر ایک نظر

(معاشیات کراچی ۵۲ جنوری ۲۶ — ۳۲)

جوار کی طرح باجرہ کو پاکستان کے موٹے اناج میں خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ رقبۂ کاشت کے لحاظ سے باجرہ کی زیادہ اہمیت ہے۔ جانوروں کے چارہ اور غریب عوام کے غلّہ کے لئے بہت کارآمد ہے۔ حیاتین کے لحاظ سے گیہوں وغیرہ سے یہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ کاشت کے رقبہ کے لحاظ سے یہ پاکستان کی فصلوں میں پانچویں نمبر پر ہے۔ بارانی فصل ہونے کے سبب اس کے رقبۂ کاشت میں ہر سال کچھ نہ کچھ فرق ہوتا رہتا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں اس کی فصل کافی ہوتی ہے۔

۶۷۔ نقوی رضی حیدر:

مکا کی فصل..... نباتات دانوں کی کارگزاریاں،

(معاشیات کراچی ۵۲ فروری ۸۷ — ۹۸)

اس مضمون میں مکا کی پیداوار کے بارے میں نباتات دانوں کی کارگزاریوں کا تذکرہ ہے۔ اس سلسلہ میں مختصراً ان اصولوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ جنھیں نباتات داں اپنا کام بخوبی انجام دینے میں استعمال

کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سرسری نظر دیگر معاشی نباتات پر ڈالی گئی ہے۔

تبصرے

۶۸۔ ادارہ، آسان قرآنی کورس
از مولوی عبدالسبحان عظیمی ربانی
(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۸۳ - ۳۸۴)
اس رسالہ میں عربی زبان کے صرفی ونحوی قواعد سے متعلق دس سبق ہیں اور ہر سبق میں مثالوں اور مشق کے لئے الفاظ اور جملوں کا انتخاب زیادہ تر قرآن مجید ہی سے کیا گیا ہے، امید ہے کہ مصنف اسی طرح باقی سبق لکھ کر اس سلسلہ کو مکمل کر دیں گے۔

۶۹۔ ادارہ: اجتہاد
(معاشیات کراچی ۵۲ فروری ۱۰۰-۱۰۱)
خالد انصاری کی یہ کتاب علوی برقی پریس" بھوپال سے شائع ہوئی ہے صفحات ۱۳۸ ہیں۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً خود مولف سے مل سکتی ہے۔ کتاب میں اسلامی فقہ کے ماخذ، فقہ بہ عہد نبوی، فقہ بہ عہد خلفائے راشدین، فقہ بہ عہد بنی امیہ اور فقہ بہ عہد موجودہ کو مختلف ادوار بنا کر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ در اصل مرکزی نکتۂ خیال یہ ہے کہ موجودہ دَور میں قدیم اسلامی فقہ کی کتابیں کافی ہیں یا اجتہاد کے ذریعہ ان میں یہ لچک پیدا کی جا سکتی ہے تاکہ اسلامی فقہ اس دَور کے ساتھ ساتھ ہو۔ مولانا نے بہ دلائل یہ بتایا ہے کہ اسلامی فقہ میں بہت لچک ہے۔ ایسے علمی موضوع پر یہ کتاب آسان زبان میں لکھی گئی ہے جس سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے۔

۷۰۔ ادارہ:
اُردو بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم سائنس
(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر ۵۲ جنوری ۷۹)
یہ رسالہ مولوی عبدالحق کا مرتب کردہ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اُردو سائنس کی تعلیم کا ذریعہ بننے کے قابل نہیں، اس کا جواب اس رسالے میں اس طرح دیا گیا ہے کہ متعدد ذمہ دار اہل علم کو استفسار بھیج کر ان کی حاصل شدہ مفصل آراء کو یکجا شائع کر دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں مصر اور ترکی وغیرہ کے تجربات کو مثال میں پیش کیا گیا۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو، پاکستان، کراچی۔

۷۱۔ ادارہ:
اسلامی ریاست میں فقہی مسائل کا حل
(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر ۵۲ جنوری ۸۰)
مولانا امین احسن اصلاحی کی اس کتاب کو مکتبہ یثرب ۱۰۔اے ذی ال، لاہور، نے شائع کیا ہے۔ مولانا نے بڑے علمی طریق سے بتایا ہے کہ اسلام میں جائز اختلافات کے لئے کہاں تک آزادی کے حدود ہیں، کن اسباب کے تحت اختلافات اپنی حدود سے آگے بڑھے، موجودہ اختلاف کی تاریخ کیا ہے۔ ایک اسلامی نظام حکومت اختلافات کی گنجائش کہاں تک دیتا ہے۔ اور وہ اختلافات کو حل کیسے کر سکتا ہے، نیز فرقوں کی حیثیت کسی اسلامی ریاست میں کیا ہو گی۔ مکتبۂ یثرب سے ۱۲ میں ملے گی۔

۷۲۔ ادارہ: اشارات قرآن
(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر ۵۲ جنوری ۸۰)
محکمۂ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ نصاب کے تحت "اشارات قرآن" کے نام پارۂ عم کی آخری بارہ سورتوں، در سورۂ فاتحہ کا ترجمہ مکتبہ فروغ اُردو بازار کھٹیکاں، سیال کوٹ شہر نے شائع کیا۔ نقطۂ نظر درست ہے۔ کاغذ ہلکا استعمال کیا گیا ہے۔ پیش لفظ پروفیسر عاصی ضیائی کے قلم سے ہے۔ قیمت ۱۲ آنے۔

۷۳۔ ادارہ: اصلاحات اقبال،

(چراغ راہ ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۷۶)

اقبالیات کے ذخیرے میں بشیر الحق رضوی کی یہ کتاب ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کی ان اصلاحات کو پیش کیا گیا ہے جو مرحوم نے اپنی متعدد نظموں میں جو مخزن وغیرہ میں شائع ہوتی رہی تھیں، بانگ درا میں شریک کرتے ہوئے کیں۔ اس مختصر سے تحقیقی کام سے علامہ مرحوم کے شاعرانہ فنی ارتقا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ دین و دانش، بانکی پور پٹنہ نے شائع کی ہے اور ۱۲ میں مل سکتی ہے۔

۷۴۔ ادارہ، اصول دعوت اسلام
از مولانا محمد طیب قاسمی

(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۵۴ — ۲۵۵)

یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں بڑی جامعیت اور خوبی کے ساتھ تبلیغ اسلام کے متعلق جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان سب پر بحث کی گئی ہے، یہ مبلغین کے لئے ایک عمدہ اور مکمل دستور العمل کا کام دے سکتی ہے۔

۷۵۔ ادارہ، پرچم تعزیت نمبر،

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۸۰ — ۳۸۱)

پرچم کراچی کا یہ تعزیت نمبر مرحوم سیماب کی یاد میں مرتب کیا گیا ہے، یہ خاص نمبر جو ایک ضخیم کتاب کی حیثیت رکھتا ہے ہر حیثیت سے قابل قدر ہے، اس کو پڑھ کر ملک کے اس مایۂ ناز ادیب کی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، اس کے سب مضامین محنت اور سلیقہ سے ترتیب دئے گئے ہیں۔

۷۶۔ ادارہ: پیر حرم اور زائرین حرم،

(چراغ راہ کراچی ۵۲ فروری ۴۳ — ۴۴)

شیخ عبد الرحیم ایڈوکیٹ نے حالیہ سفر حج کے تاثرات کو پیش کیا اور دکھایا ہے سفر حج میں سعودی حکومت، معلمین و منتظمین حج اور حرمین کے مقامی باشندوں کے ہاتھوں حجاج کو کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تمام مسلم ممالک کے لئے یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے۔ شیخ صاحب نے ان دقتوں کے دور کرنے کی تدبیریں بھی بتلائی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کی اشاعت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ میسرز گلاب ٹریڈنگ کمپنی ۱۲۸۔ فیروز پور روڈ۔ اچھرہ، لاہور سے یہ کتاب ۱۲ میں مل سکتی ہے۔

۷۷۔ ادارہ:
جماعت اسلامی کی دعوت و تاریخ

(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری، ۷۹)

یہ کتاب اشارات کے اس سلسلہ پر مشتمل ہے جسے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے رہائی کے بعد ترجمان القرآن میں شائع کیا ہے۔ یہ جماعت اسلامی کے پس منظر، اس کے مقصد، طریق کار، پالیسی، موجودہ پروگرام اور آئندہ کے مراحل کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب جماعت کی ماضی کی تاریخ بھی ہے اور مستقبل کی رہنما بھی۔ نیز یہ مخالفانہ پروپیگنڈے کی ایک مثبت اور سنجیدہ تردید بھی ہے۔ جماعت اسلامی کی اہمیت جاننے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ قیمت ۱۲ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ۵، اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے مل سکتی ہے۔

۷۸، ادارہ، جمہور کا صدر یار جنگ نمبر

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۸۰)

دو روزہ جمہور کے ایڈیٹر مولانا عبد الشاہد شروانی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے پوتے ریاض الرحمٰن خاں ہیں، صدر یار جنگ نمبر اسی پرچے کی اشاعت خاص ہے، مضمون نگاروں میں قدیم و جدید دونوں اسکولوں کے ارباب قلم شامل ہیں اس

لئے یہ نمبر نواب صدر یار جنگ جیسی جامع الصفات شخصیت
کے کمالات اور فضائل اخلاق کا ایک دل کش مرقع بن گیا
ہے اور اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

۷۹۔ ادارہ: چند بین الاقوامی اعداد
(معاشیات ۵۲ مارچ ۱۴۹-۱۵۳)
مندرجۂ ذیل عنوانات کے تحت ادارۂ اقوام
متحدہ کے فراہم کئے ہوئے بین الاقوامی اعداد و شمار
پیش کئے گئے ہیں (۱) دنیا کی آبادی (۲) رفتار اموات
میں کمی اور اوسط عمر میں زیادتی (۳) فی کس آمدنی کا
غیر مساوی تناسب (۴) منشیات کی روک تھام اور
(۵) دنیا کے چند ملکوں میں موٹروں کی تعداد۔

۸۰۔ ادارہ، حیات فخر
از مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی
(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۵۵-۲۵۶)
اس مختصر کتاب میں امام فخر الدین رازی کے حالات
زندگی اور فضل و کمال کا تذکرہ ہے، کتاب دل چسپ
اور مفید ہے اور زبان و بیان بھی دل کش اور موثر ہے۔

۸۱۔ ادارہ: خدا کی بادشاہت
(چراغ راہ ۱۵ دسمبر ۵۲ جنوری ۷۶-۷۷)
سید حلیم پاشا کو ترکی کے دین پسند کی صف
میں امتیازی جگہ حاصل ہے۔ ان کے جذبات صالح
میں مگر فکر دھندلی ہے۔ انھوں نے فرانسیسی میں اسے
لکھا تھا جسے پکتھال نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور ہاشمی
فرید آبادی نے مندرجہ عنوان کے تحت ۱۹۲۷ء میں
اردو کا جامہ پہنایا۔ مکتبہ تعمیر انسانیت (۲۵۔ گجر گلی،
موچی دروازہ، لاہور) نے اسے دوبارہ شائع کیا
ہے۔ اپنے دَور میں یہ کتاب موجودہ دَور کے مقابلے
میں زیادہ قدر و قیمت کی حامل تھی۔ تاہم آج بھی قابل
استفادہ ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

۸۲۔ ادارہ: خطبات نبوی
(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۸۰)
مولانا عبد القیوم ندوی نے نبی صلعم کے خطبات
کو یکجا کر کے خطبات نبوی کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ
ایک قابل قدر خدمت ہے۔ خطبات کے متن کے
ساتھ ساتھ اردو ترجمہ ہے۔ ہر خطبے کے ماخذ کا حوالہ
بھی درج ہے، کتابت و طباعت بہت ناقص ہے
ملنے کا پتہ: محمد زبیر، کتب خانہ امجدیہ، قصبہ سترکھ ضلع
بارہ بنکی (انڈیا) قیمت ۱۲ر

۸۳۔ ادارہ: خیر کثیر اور البلاغ المبین
(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۷۷-۷۸)
۱۔ اول الذکر کا ترجمہ مولانا عبد الرحیم، پروفیسر
عربی اسلامیہ کالج پشاور نے شائع کیا اور ابناء مولوی
محمد بن غلام رسول سورتی تاجران کتب (۱۳۲-۱۳۴
جالی محلہ، بمبئی ۳) نے شائع کیا ہے۔ ترجمہ ناقص ہے
قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ۲۔ دوسری کتاب کا
ترجمہ کرنے والے کا نام درج نہیں۔ اس کا چوتھا
ایڈیشن تقریباً لاگت (۳؍) پر مکتبہ تبلیغ۔ آدم کے ناگرہ
براستہ جالکی، ضلع سیالکوٹ نے شائع کیا ہے۔
شرک اور مشرکانہ نظریات و اوہام سے بحث کی بناء
پر اس کی اشاعت زیادہ اہم ہے۔ جلد سادہ اور
صفحات پونے دو سو ہیں۔

۸۴۔ ادارہ: رسائل و مسائل
(چراغ راہ ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۷۹)
مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور نے ماہنامہ
ترجمان القرآن میں شائع شدہ سوالات و جوابات کو
۹۹ مسائل پر تمام اہم چیزوں کو اس عنوان سے کتابی
صورت میں شائع کیا ہے۔ یہ مسائل ہماری روز
مرہ زندگی کے سارے گوشوں پر اسلامی نقطۂ نظر

سے بصیرت افزا معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اسلام اور تحریک اسلامی کے متعلق بے شمار غلط فہمیوں کو صاف کرنے کا کامیاب ذریعہ ہے۔ ان جوابات کے مصنف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ ملنے کا پتہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، ۵، اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے ہر میں مل سکتی ہے۔

۸۵۔ ادارہ: سرزمین عجائب و غرائب

(نگار مارچ ۱۹۵۲ء ص ۳۶-۳۷)

قطب جنوبی کی سرزمین اور وہاں کے عجائب و غرائب کا بیان۔

۸۶۔ ادارہ: سواء الطریق حصہ اول

(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری، ۸۰)

یہ مولوی حافظ محمد عبدالعزیز کے قلم سے صحیحین کی احادیث کا ترجمہ ہے۔ متن ساتھ نہیں ہے۔ احادیث کی ترتیب اور ان کی فصل بندی کتب احادیث کے انداز پر ہی کی گئی ہے۔ یہ بہر حال ایک مفید خدمت ہے۔ شائع کردہ: ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب ایم، ایل، اے، لہریا سرائے، دربھنگہ (انڈیا) قیمت درج نہیں۔

۸۷۔ ادارہ، شاعر سالنامہ ۱۹۵۱ء

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۸۱-۳۸۲)

شاعر ہندوستان کا مشہور و مقبول ادبی ماہنامہ ہے جو مرحوم سیماب کے لائق صاحب زادے اعجاز صدیقی صاحب کی زیر صدارت سالہا سال سے زبان و ادب کی قابل قدر خدمت کر رہا ہے، زیر نظر سالنامہ میں شاعر کی پہلی تمام خصوصیتیں باقی رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، ادبی و تنقیدی مضامین کے علاوہ نظموں، غزلوں اور افسانوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔

۸۸۔ ادارہ، عربی زبان حصہ اول و دوم

مرتبہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۸۲-۳۸۳)

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لائق مصنف نے تین باتوں کی کامیاب کوشش کی ہے ایک یہ کہ صرف و نحو کے قواعد کو آسان اور عام فہم طریقہ پر طالب علم کے ذہن نشین کر دیا جائے دوسرے یہ کہ متداول الفاظ کا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے، تیسرے یہ کہ ایک ہی لفظ کی متعدد شکلیں دل نشین طریق پر مختلف عبارتوں میں کھپا دی گئی ہیں،

۸۹۔ ادارہ: ماہنامہ فردوس، کانپور

(چراغ راہ کراچی ۵۲ فروری ۹۴)

فردوس کے مرتب محمد جلیل خاں نے اس کی ایک اشاعت خاص میں قرآن کی آخری دس سورتوں کا سادہ ترجمہ دے کر ان کے ساتھ حواشی میں بعض امور کی شرح درج کی ہے اور پھر ہر سورت کے ساتھ اس کے مقصد و مدعا کی تفصیلی شرح بھی شامل ہے۔ اور آخر میں بطور خلاصہ وہ نکات نمبروار پیش کر دیے گئے ہیں جنھیں ایک مسلمان کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ چنانچہ یہ ایک اچھی چیز ہے۔ تاہم سورتوں کے ناموں کا ترجمہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ پرچہ کا سالانہ چندہ چار روپے۔ وی پی ۱۰ آنے ہے۔ ترسیل زر "دفتر کوثر" دال منڈی، لاہور کے پتہ پر ہونی چاہیئے۔

۹۰۔ ادارہ: ماہنامہ روح ادب، کراچی

(معاشیات کراچی ۲ ۵ فروری ۱۰۱)

یہ رسالہ پاکستان و ہندوستان کے اردو رسائل و جرائد کا انتخاب ہے۔ اس طرح کے پرچے اردو میں پہلے بھی نکل چکے ہیں۔ اسی قسم کی یہ ایک نئی کوشش ہے۔ اس میں نقد و ادب، منظومات، افسانے، ڈرامے، غزلیات، مستند کتاب، ستم ظریفی اور فلم کے عنوانات قائم کئے گئے ہیں تاہم تنوع میں اضافہ کی غرض سے

"تاریخ و سیر" اور "سیاسیات و معاشیات" کے سے عنوانات بھی ہوں تو بہتر ہے۔ منتخبات اچھے ہیں۔ امید کہ یہ رسالہ ہر حلقے میں مقبول ہوگا۔ اسے انتصار حسین اور محمد طفیل مرتب کرتے ہیں۔ اور یہ ادارہ فروغ اُردو ۱ے، ایم روڈ، کراچی علاسے شائع ہوتا ہے۔ زر سالانہ پاکستان میں دس روپے، ہندوستان میں تیرہ روپے ہے۔

۹۱۔ ادارہ: ماہنامہ کارواں

(چراغ راہ ۱۵ دسمبر ۵۲ جنوری ۷۷)

چند حیدر آبادی اکابر نے حیدر آباد ٹرسٹ قائم کیا ہے، اسی کی طرف سے شاہد حسین رزاقی کی ادارت میں یہ ماہنامہ تاراچند اسٹریٹ لارنس روڈ کراچی سے نکلتا ہے۔ مضامین اور نظمیں معیاری ہیں لیڈروں حکام اور بے پردہ عورتوں کی تصاویر کا فتنہ بھی کارواں کا سامان زینت ہے۔ چندہ سالانہ چھ روپے۔ فی پرچہ ۸ر آنے۔

۹۲۔ ادارہ: مرتد کی سزا اسلامی قانون میں

(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۷۹)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے کتاب و سنت اور خلفائے راشدین کے علمی نظائر سے قتل مرتد کی مشروعیت کو ثابت کیا بلکہ یہ بھی واضح کیا ہے زمانۂ حاضر میں بھی قوم اور اسٹیٹ کی طرف سے اپنے مرتدین کو یہی سزا دی جاتی ہے اور عقل تقاضا کرتی ہے کہ ایسا ہو۔ اسلام بھی یہ سزا ایک مذہب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اسٹیٹ، ایک دین اور ایک اجتماعی نظام حیات کی حیثیت سے دیتا ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جماعت اسلامی، ۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے ۱۲ر میں مل سکتی ہے۔

۹۳۔ ادارہ: مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند

(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۸۰)

ہندوستان کے پچھلے انتخابات کے زمانے میں انڈیا کی جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابو اللیث اصلاحی نے جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

۹۴۔ ادارہ، مشام روح

از تابان القادری

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۸۴)

جناب تابان کلکتہ کے نوجوان اور خوش گو شاعر ہیں اور نظم اور غزل دونوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں، مشام روح میں شاعر کا کلام جمع کیا گیا ہے، ان کے تغزل میں درد و اثر بھی ہے اور سوز و گداز بھی، امید ہے کہ ارباب ذوق اس مجموعہ کے مطالعہ سے مشام روح حاصل کریں گے،

۹۵۔ ادارہ، معلم القرآن

از مولانا محفوظ الرحمٰن نامی

(برہان دسمبر ۱۹۵۱ء ۳۸۳)

افسوس ہے کہ لائق مؤلف نے رسالہ کی ترتیب کو خلط مباحث سے بچانے کی کوشش نہیں کی، اس بناء پر رسالہ کی حیثیت بجائے منظم رسالہ کے ایک نوٹ بک سی ہوگئی ہے، اس خامی کے باوجود بحیثیت مجموعی رسالہ کے مفید ہونے میں کلام نہیں،

۹۶۔ ادارہ: مکتبہ الحسنات رام پور کی کتابیں تعلیم بالغاں کے سلسلہ میں

(چراغ راہ ۱۵ دسمبر، ۵۲ جنوری ۷۸)

تعلیم بالغاں کے سلسلہ میں اس مکتبہ کا مخصوص سیٹ پہلی، دوسری، تیسری کتاب، سورج کا پیغام اور انسان کی کہانی پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں خوبصورت سرورق کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہیں۔ تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب

کے لئے مناسب ہوگا کہ اس سیٹ کا تجربہ کریں۔ ان کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ قیمت پہلی کتاب ۳ر، دوسری کتاب ۳ر، تیسری کتاب ۳ر سورج کا پیام ۵ر انسان کی کہانی ۴ر۔

۹۷۔ ادارہ: ملٹری اٹاچی اِن ماسکو
(چراغ راہ کراچی ۲۲ فروری ۵۲ء)
میجر جنرل رچرڈ ہلٹن کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ اوسط درجہ کا ہے جو بدر جہاں آرا کے قلم کا مرہون منت ہے۔ اس سے روسی عوام کی زندگی کے بہت سے نئے پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ غیر ملکیوں کے بارے میں حکومت کی روش کا پتہ چلتا ہے اور روس کی اندرونی زندگی اور کارروائی بھی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کتابت، طباعت اچھی ہے۔ کاغذ بھی اچھا لگایا گیا ہے۔ جلد رنگین گرد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت تین روپے۔

۹۸۔ ادارہ: نزاعِ برطانیہ و مصر
(نگار مارچ ۱۹۵۲ء ص ۵-۶)
نزاعِ برطانیہ و مصر کا تاریخی و سیاسی پس منظر پیش کیا گیا ہے۔

۹۹۔ ادارہ، نگار کا جولائی نمبر
۵۵ سال کے بعد
(مترجم مسعود جاوید)
(برہان اکتوبر ۱۹۵۱ء ۲۵۴)
"۵۵ سال کے بعد" پٹکن کی مشہور کتاب "بہترین سال" کا آزاد ترجمہ ہے، مسعود جاوید صاحب نے ضروری اضافہ کے ساتھ ترجمہ کو مستقل تصنیف کی صورت دے دی ہے اور دراصل ترجمہ کی خوبی یہی ہے۔
یہ کتاب نہ صرف بوڑھوں کے لئے پیام زندگی ہے بلکہ نوجوانوں کے لئے بھی مشعل راہ ہے۔

۱۰۰۔ ادارہ: نور و نار سالنامہ
(چراغ راہ کراچی ۱۵ دسمبر ۵۲ء جنوری ۵۲ء)
کلثوم رحمٰن، اختر حمید اور محمد اشرف ساجد کی ادارت میں ۱۴۱۔ ایف، ماڈل ٹاؤن، لاہور سے عورتوں کا یہ ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ اس میں ایک طرف اسلام پسند اہل قلم کی تحریریں شریک ہیں اور دوسری طرف وہی گندی کہانیاں کہ جن کے خلاف وہ لوگ اعلان جنگ کر چکے ہیں۔ چندہ سالانہ خاص ۱۰ روپے عام ۷ روپے۔ قیمت سالنامہ درج نہیں۔

۱۰۱۔ ادارہ: ولی گجراتی،
(چراغ راہ کراچی ۲۲ فروری ۵۲ء)
انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی طرف سے پہلی علمی کتاب "ولی گجراتی" کے نام سے پیش کی گئی ہے۔ اس کے مؤلف سید ظہیر الدین مدنی نے ولی سے متعلق اختلافی مسائل کے سلسلہ میں خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ اس کا صحیح مقام، علمی استعداد، زبان، زمانہ، اور مرغوب فارسی شعرا کے عنوانات کے تحت بحث کی گئی اور ہندوستانی عنصر کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے چار آنے ہے اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے مل سکتی ہے۔

۱۰۲۔ ادارہ: ہندوستانی سوشلزم
(چراغ راہ کراچی ۲۲ فروری ۵۲ء)
سید اصغر علی عابدی نے اس نام سے ایک پمفلٹ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ہندوستانی سوشلزم میں "سوشلزم" کا کوسوں پتہ نہیں ہے۔ یہ تو گاندھی ازم، مہا سبھائیت اور ایک خاص قسم کی محدود سوشلزم کا مجموعہ ہے جس کے نتائج خالص گاندھی ازم، مہا سبھائیت اور خالص سوشلزم سے بھی

...یادہ خطرناک اور تباہ کن نکلنے کے امکانات ہیں۔ پمفلٹ
قابلِ مطالعہ ہے۔ مولف کی زبان حیدر آبادی
قسم کی ہے اور پھر موصوف کے کچھ اپنے تصرفات بھی
مخصوص قسم کے ہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ
لتہ فکر نو۔ ۱۳۵۔ شاہ گنج، الہ آباد، یو، پی (انڈیا)

۱۰۴۔ ادارہ: ہمایوں سالنامہ ۱۹۵۲ء
(چراغِ راہ کراچی ۵۲ فروری ۴۴-۴۵)

ہمایوں کا یہ سالنامہ اپنی روایاتی شان کے ساتھ
...توں بعد خود میاں بشیر احمد کے ہاتھوں مرتب ہو کر
سامنے آیا ہے۔ مقالات، افسانے اور منظومات بالعموم
معیاری ہیں۔ کہانیوں میں سے "لاوارث" اور یہ
"چھوٹے چھوٹے پھندے" اپنے اندر اپیل اور جاذبیت
رکھتے ہیں۔ "پردۂ حائل" ایک انگریزی ڈرامہ کا
منظوم ترجمہ ہے۔ مترجم خالد عزیز ہیں۔ اس میں
عورتوں کو پردہ اٹھانے کی ترغیب دلائی گئی ہے
جو پاکستان کی قومی تعمیر کے منافی ہے۔ قیمت درج نہیں

۱۰۴۔ س، ولی گجراتی
از جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
(برہان نومبر ۱۹۵۱ء ۳۱۹-۳۲۰)

فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب میں دکن کے
اہلِ علم کے دعوے کو دلائل و براہین کے ساتھ غلط ثابت
کر کے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ اُردو شاعری کے باوا
آدم کا وطنی و نسلی تعلق بجائے دکن کے سرزمین گجرات
کے ساتھ تھا۔ یہ کتاب ولی اور اس عہد کی زبان اور
اس کی خصوصیات پر معلومات کا ایک اچھا اور
قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔

۱۰۵۔ م، اسلامی اصول انتخاب
از جناب نعیم صدیقی
(معارف نومبر ۱۹۵۲ء ۳۹۸-۳۹۹)

اس کتاب میں حکومت کے بارے میں اسلامی
نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے اور حکومتِ الٰہیہ اور انسانوں
کے بنائے ہوئے نظامات حکومت کا بنیادی فرق واضح
کر کے اسلام کی پہلی اسلامی حکومت کے قیام کے
حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کا نقطۂ نظر
بڑی حد تک صحیح ہے لیکن اس کی تفصیل میں اختلاف
کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

۱۰۶۔ م، تدوین قرآن
مرتبہ مولوی غلام ربانی
(معارف نومبر ۱۹۵۲ء ۳۹۷-۳۹۸)

اس میں قرآن مجید کی داخلی اور حدیث و تاریخ کی
خارجی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید
آج جس ترتیب کے ساتھ اور جس شکل میں موجود
ہے اسی شکل میں وہ عہد نبوی میں آنحضرت صلعم
کی ہدایت و نگرانی میں مرتب اور تحریر ہو چکا تھا اور
خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس میں کوئی ترمیم و
تنسیخ نہیں ہوئی۔

۱۰۷۔ م، حیات اکبر
(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۷۹)

بزمِ اکبر کراچی نے حال ہی میں اکبر الہ آبادی کی یہ
سوانح عمری شائع کی ہے جسے مرحوم کے صاحبزادے
سید عشرت حسین مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ ملا واحدی صاحب
دہلوی نے اس میں ترمیم و اصلاح کر کے از سرِ نو مرتب
کیا ہے اور جا بجا تشریحی حواشی تحریر کئے ہیں۔ اکبر
مرحوم کے کارناموں کے لحاظ سے یہ سوانح عمری
بہت مختصر ہے اور اس سے اُن کی شخصیت اور
کمالات و خدمات کا پورا اندازہ نہیں ہوتا۔

۱۰۸۔ م، خیرِ کثیر، مترجمہ مولانا عبدالرحیم
(معارف نومبر ۱۹۵۲ء ۳۹۷)

حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیفات میں خیر کثیر نہایت اہم ہے، اس میں شریعت کے احکام، دین کے اسرار اور تصوف کے مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اس کے مباحث نہایت دقیق ہیں، ایسے مباحث کا سلیس اور عام فہم ترجمہ بہت مشکل ہے تاہم مترجم نے مفہوم کی وضاحت کی پوری کوشش کی ہے،

۱۰۹- م، داستان ادب حیدر آباد

مرتبہ جناب سید محی الدین زور قادری

(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۷۸)

لائق مولف نے اختصار کے ساتھ اس کتاب میں حیدر آباد کی تین صدیوں کی علمی سرگذشت بیان کی ہے اور حیدر آباد کے بانی محمد قلی قطب شاہ کے عہد ۱۵۸۰ء سے لے کر موجودہ زمانہ تک مختلف ادوار قائم کر کے ہر دور کی علمی و ادبی تحریکات اور نظم و نثر کی تصانیف کا تذکرہ کیا ہے، اس طرح اس میں اختصار و جامعیت کے ساتھ حیدر آباد کی پوری علمی تاریخ آگئی ہے،

۱۱۰- م، کلیات اکبر الہ آبادی حصہ اول

(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۸۰)

اکبر مرحوم کی زندگی میں جو کلیات شائع ہوا تھا اور جس کو انھوں نے خود مرتب کیا تھا اس میں دور سوم کا کلام پہلے تھا اور دوم کا درمیان میں اور دور اول کا سب سے آخر میں تھا، بزم اکبر کراچی کے شائع کردہ اڈیشن میں تینوں دوروں کی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے کردی گئی ہے۔

۱۱۱- م، مشام روح

از تاباں قادری کلکتوی

(معارف دسمبر ۱۹۵۲ء ۴۸۰)

تاباں کا کلام ان کے فطری ذوق کا شاہد ہے اور اور اس میں تغزل کی تمام خصوصیات اور خوبیاں موجود ہیں، اگر ان کی مشق سخن جاری رہی تو وہ نوجوان شعرا میں ممتاز جگہ حاصل کریں گے لیکن ایک مجموعے کے لئے اتنے دیباچوں، تبصروں اور تعارفوں کا انبار ذوق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔

۱۱۲- م، نالۂ شاد

از جناب رام پرشاد کھوسلہ

(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۷۹-۴۸۰)

نالۂ شاد اردو کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر رام پرشاد کھوسلہ کے کلام کا مجموعہ ہے، اگرچہ کھوسلہ جدید تعلیم یافتہ تھے ان کا مذاق خالص مشرقی اور صوفیانہ تھا، وہ نظم زیادہ کہتے تھے تاہم غزلوں کا حصہ بھی خاصہ ہے، نظمیں زیادہ تر باطنی جذبات و تاثرات پر شامل ہیں، غزلوں میں بھی تغزل کے ساتھ ساتھ سوز و ساز کی کیفیتیں نمایاں ہیں، زبان نہایت صاف و شستہ ہے،

۱۱۳- م، ولی گجراتی

مولفہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۷۷-۴۷۸)

فاضل مصنف نے اس کتاب میں ولی کے حالات کی تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے اور ولی کے کلام کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے، اس کے بعد ولی کے گجراتی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا، ان کے کلام پر تبصرہ کے سلسلہ میں اس کی خصوصیات، اس میں ہندوستانی اثرات اور اردو زبان سے متعلق ولی کی اصلاحی خدمات وغیرہ کی تفصیل بیان کی ہے، مجموعی حیثیت سے ولی کے حالات میں یہ کتاب محققانہ اور اردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

۱۱۴۔ ع۔ م: پیشوا،
(آج کل دہلی ۲۵ مارچ ۵۸)
چندہ سالانہ تین روپے، اردو بازار، دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں اچھے مذہبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

۱۱۵۔ ع، م: جذبات بھرتری ہری
(آج کل دہلی ۲۵ مارچ ۵۸)
بھرتری ہری سنسکرت کا غیر فانی شاعر ہے۔ اس کے کلام کا ترجمہ ایبٹ آباد کے مشہور وکیل اور اردو کے پرانے پرستار اور خادم جے کرشن چودھری نے نہایت اچھے اسلوب میں کیا ہے۔ جگہ جگہ فارسی اور اردو شعراء کا کلام بھی موازنے کے طور پر پیش کیا ہے جو ان کے وسیع مطالعہ کا ثبوت ہے۔ ملنے کا پتہ اور قیمت کتاب میں درج نہیں ہے۔

۱۱۶۔ ع، م: حیات اکبر
(آج کل دہلی ۲۵ مارچ ۵۸)
یہ اکبر الہ آبادی کی سوانح عمری ہے جس کی تسوید اکبر کے بیٹے عشرت حسین نے اور ترتیب و تہذیب ملا واحدی دہلوی نے کی ہے۔ بحیثیت سوانح عمری کے ایک اچھی مثال تو نہیں پیش کرتی لیکن آئندہ کام کرنے والوں کے لئے مواد ضرور فراہم کرے گی۔ مولانا ماجد دریابادی نے اس کی تعریف کی اور اسے بہتر بنانے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ بہرحال واحدی صاحب اور ان سے زیادہ چودھری نذیر احمد خاں اردو کی اس گراں بہا خدمت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جلد خوبصورت، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، ضخامت ۲۳۲ صفحے تقطیع ۲۷×۱۷/۸ قیمت درج نہیں۔

۱۱۷۔ ع، م: رنگ و آہنگ
(آج کل دہلی ۲۵ مارچ ۵۷ - ۵۸)
یہ ادیب سہارنپوری کے کلام کا مجموعہ ہے جو کراچی سے چھپا اور تاج آفس بالمقابل میونسپل کارپوریشن بندر روڈ کراچی سے تین روپے میں مل سکتا ہے۔ اس میں غزلیں نظمیں اور قطعات سبھی ہیں۔ لیکن ادیب کا مزاج خالص غزل کا مزاج ہے۔ اور وہ مقبول شعراء میں سے ہیں۔ نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالحق اور جگر مراد آبادی نے کلام کو سراہا ہے۔ اور واقعۃً ادیب خوش کلام ہیں۔ ادیب کسی اسکول یا کسی گروہ سے وابستہ نہیں۔ خالص اور دو بھی حیاتی ادب کی تخلیق میں آنے والوں میں ادیب کا نام پیش پیش رہے گا۔

۱۱۸۔ ع، م: روح ادب
(آج کل دہلی ۲۵ مارچ ۵۸)
روح ادب میں پاکستان و ہند کے اردو رسائل و جرائد کا انتخاب شائع ہوتا ہے۔ ضخامت کے لحاظ سے قیمت زیادہ ہے۔ پاکستان میں فی پرچہ ۱۵ آنے اور زر سالانہ دس روپے، اور بھارت میں فی پرچہ ۱۲ اور زر سالانہ تیرہ روپے۔

۱۱۹۔ ع۔ م: فروزاں
(آج کل دہلی ۲۵ مارچ ۵۷)
جذبی باشعور اور سنبھل کر کہنے والے ہیں۔ غالباً اسی لئے کم کہتے ہیں دوسروں کی طرح جذبی کسی ہنگامی رو کے شکار نہیں ہوئے۔ احساس میں ڈوب کر شعر کہنا جذبی کی خصوصیت ہے۔ نفسیاتِ محبت کا انھوں نے اچھا مطالعہ کیا ہے۔ کبھی کبھی محاکات کا عالم پیدا کرتے ہیں تو لطف آجاتا ہے۔ زمانہ کی اداؤں سے جذبی واقف ہی نہیں بلکہ ان کا صحیح تجزیہ بھی کرتے ہیں اس مجموعہ میں اشعار کی تعداد زیادہ نہیں لیکن ہر شعر

پر نظر رکھتی ہے اور کوئی نہ کوئی نشتر ضرور ملتا ہے۔ فوزانؔ
جندیلی کے کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۳ء میں پہلے چھپا
تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مع اضافہ کے آزاد کتاب
گھر، کلاں محل، دہلی نے ۲۲x۳۶/۱۶ کی تقطیع پر ۱۳۶
کا نکالا ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ جلد، جلد
پوش عمدہ ہے۔

۱۲۰۔ ع۔م: کاروانِ ادب ۱۹۵۱ء
(آج کل دہلی ۵۲ مارچ ۵۸)

سینٹ زیویرس کالج، بمبئی کی بزمِ ادب کا یہ شمارہ
اچھے مضامین کا حامل ہے اس شمارے کے نگراں پروفیسر
گوریکر اور مدیر عبدالقوی دیسنوی صاحب مبارکباد
کے مستحق ہیں۔

۱۲۱۔ ع۔م: ماحول سالنامہ ۱۹۵۱ء، دوماہی سلسلہ،
(آج کل دہلی ۵۲ مارچ ۵۸)

اس کے ترتیب دینے والے ظفر ادیب، حمیدہ
سلطان اور فکر تونسوی ہیں۔ اس رسالہ میں صالح
اور ترقی پسند ادب پیش کیا جاتا ہے۔
قیمت فی پرچہ دو روپے، سالانہ قیمت چھ روپے
ہے۔ دفتر ماحول، دوماہی، اردو بازار دہلی سے مل سکتا
ہے۔

۱۲۲۔ ع۔م:
نورنگ کراچی جنوری و فروری ۱۹۵۲ء
(آج کل دہلی ۵۲ مارچ ۵۸)

نورنگ کا یہ سالنامہ ۱۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے۔
معیاری نظم و نثر سے مالامال ہے۔ تنوع کا خاص طور
پر خیال رکھا گیا ہے۔ کراچی کا یہ ادبی رسالہ ہر ذوق
کی تشنگی کو بجھاتا ہے۔ سلجھا ہوا مذاق ادب رکھنے والوں
سے ہم اس رسالے کے مطالعے کی سفارش کریں گے
یہ رسالہ آغا سرخوش قزلباش کی ادارت میں نکلتا ہے۔
سالانہ چندہ پاکستان میں ساڑھے پانچ روپے اور ہندوستان
میں ساڑھے سات روپے ہے۔

۱۲۳۔ ملسیانی۔ عرش: بیاضِ عابدیہ
(آج کل ۵۲ جنوری ۵۷)

سید ہاشم رضا عابدی سکریٹری انجمن عابدیہ الہ آباد
نے شہادتِ حسین سے متعلق نظموں کا یہ مجموعہ شائع
کیا ہے۔ بارگاہِ حسینی میں ان کا یہ نذرانہ قابلِ وقعت
ہے خاص طور پر اس لئے کہ عابدی صاحب ابھی بہت
کم عمر ہیں۔ بیاض کے شروع میں سید کلب حسین
مجتہد العصر کی تقریظ بھی شامل ہے۔

۱۲۴۔ ملسیانی۔ عرش:
بہترین ادب ۱۹۵۰ء
(آج کل ۵۲ جنوری ۵۶)

ادارۂ ادبِ لطیف سال بھر کے منتخب ادب کو
ہر سال شائع کرتا ہے۔ زیرِ تبصرہ جلد اسی سلسلہ کی چوتھی
کڑی ہے۔ یہ انتخاب زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان
کے ماہناموں سے کیا گیا ہے لیکن اس فہرست میں
ایک روزنامہ، دو ہفت روزہ اخبار ایک نیم ماہی
جریدہ اور پانچ سہ ماہی رسالے بھی شامل ہیں۔ انتخاب
مقالہ، نظم، افسانہ، ڈراما، غزل، انشائے لطیف اور
طنز و مزاح کے تحت کیا گیا ہے۔ مقالات کے انتخاب
میں جو توجہ کی گئی ہے نظموں کے انتخاب میں نظر نہیں
آتی۔ پھر بھی یہ مجموعہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

۱۲۵۔ ملسیانی۔ عرش: پیامِ تعلیم (کشمیر نمبر)
(آج کل ۵۲ جنوری ۵۷)

امید ہے کہ علمی اور معلوماتی حیثیت سے یہ نمبر
جو کشمیر سے متعلق ہے بچوں کے لئے بہت مفید اور
ان کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔

۱۲۶۔ ملسیانی۔ عرش: جمہور، صدر یار جنگ نمبر

(آج کل ۲۵ جنوری ۵۷)

...کے دو روزہ جمہور کا یہ خاص نمبر
...مام سے شائع ہوا ہے۔ نواب صدر یار جنگ
...رحوم سے متعلق خاندانی ادبی اور مجلسی معلومات کا یہ
...سائیکلو پیڈیا ادبی اور تاریخی اعتبار سے ایک قابل
...قدر چیز ہے۔ اس میں مرحوم کا عکس تحریر، تصویر
...خاندانی حالات کلام ادبی اور مجلسی سرگرمیاں غرضیکہ
...علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کو بہت کچھ ملے گا۔

۱۲۰۔ ملسیانی۔ عرش: سرفراز محرّم نمبر
(آج کل ۲۵ جنوری ۵۷)

اخبار سرفراز لکھنؤ کا محرم نمبر، اس میں شہادت
...حسنین اور متعلقہ موضوعات پر مشاہیر و اکابر کے
...مرثیے اور مضامین بڑے سلیقے سے جمع کئے گئے ہیں
...آرٹ پیپر پر بہت سی نادر تصویریں بھی شامل اشاعت
...ہیں چنانچہ دبیر لکھنوی کی نایاب تصویر بھی اسی میں
...شائع ہوئی ہے۔ مدیر سرفراز اسد اللہ صاحب اسد
...لکھنوی اس نمبر کے لئے مستحق مبارک باد ہیں۔

۱۲۱۔ ملسیانی - عرش:
سیاسی معلومات - جلد اول
(آج کل ۲۵ جنوری ۵۶)

زیر تبصرہ کتاب جس کے مولف اسرار احمد آزاد
...ہیں، بین الاقوامی سیاسی معلومات کے نام سے ۱۹۵۱ء
...میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن وہ بہت مختصر تھی۔ اس
...ایڈیشن میں کافی معلومات بڑھادی گئی ہیں۔ یہ بڑے
...سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے۔ بین الاقوامی سیاست
...پر فرہنگ وار معلومات حاصل کرنے میں یہ کتاب بڑی
...معاون ثابت ہوگی۔ سیاست کے ہر طالب علم اور
...جرنلسٹ کے پاس اس کا ہونا ضروری ہے۔ ہر چھ
...مہینے کے بعد اس کتاب کا ضمیمہ بھی چھپتا رہے گا جو

اس مدت میں رونما ہونے والے اہم تغیرات نیز نئی معلومات
پر مشتمل ہوگا امید ہے کہ اُردو کے حلقوں میں اس
کتاب کو خاص مقبولیت حاصل ہوگی۔

۱۲۹۔ ملسیانی۔ عرش: لسان العصر،
(آج کل ۲۵ جنوری ۵۷)

اس کے مرتب اختر انصاری اکبر آبادی ہیں۔
حضرت اکبر الہ آبادی سے متعلق شعرا کی نظموں کا یہ
مجموعہ ظاہری صورت میں بہت ہی دیدہ زیب ہے
لیکن ہندی اعتبار سے چنداں درخور اعتنا نہیں۔
بہتر ہوتا یہ خراج عقیدت نثر میں پیش کیا جاتا تاکہ اکبر
کی شاعری اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر
حاصل و پر معنی تبصرہ اس کتاب میں مل جاتا۔ منظوم قصیدہ
خوانی موضوع سے انصاف نہیں کر سکتی۔

۱۳۰۔ ملسیانی۔ عرش: نالہ پابند نے
(آج کل ۲۵ جنوری ۵۷)

اختر انصاری اکبر آبادی کا مجموعہ کلام۔ نیاز
فتحپوری، علی اختر اور شاعر لکھنوی نے اختر انصاری
کی شاعری کے باب میں اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔
غزلوں میں اکثر اشعار اچھے ہیں۔

۱۳۱۔ ملسیانی۔ عرش: نوائے بیدل
(آج کل ۲۵ جنوری ۵۶ - ۵۷)

پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی کے کلام
کا مجموعہ۔ بیدل صاحب قدیم رنگ سخن سے متاثر
ہیں۔ نظموں میں تغزل نمایاں ہے آپ کا مذاق سخن
پاکیزہ ہے۔ سادہ و سہل زبان سے معنی آفرینی کے
جوہر نمایاں کرنے میں آپ کا قلم مشاقی کا ثبوت پیش
کرتا ہے۔

وفیات

۱۳۲۔ جوش ملیح آبادی:

بابائے نہال سیوہاروی،
(آج کل دہلی ۵۲ء، ص ۲۳)
نہال سیوہاروی کی موت پر ایک دوست کی حیثیت سے جوش نے ماتمی نوٹ لکھا ہے۔

۱۳۲۳۔ سید سلیمان ندوی،
واحسرتا،
(معارف دسمبر ۱۹۵۱ء ۴۵۸-۴۷۵)
مولانا حسرت موہانی کی وفات پر سید صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور حسرت کے گوناگوں اوصاف بیان کئے ہیں۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷

ناشر۔ مولوی فضل اللہ فاروقی نے مطبع
انصار قاسم آرٹ لیتھو پریس بمبئی ۸ سے
چھپوا کر دفتر پبلشرس ایمپوریم لمیٹڈ
پیپلز بلڈنگ سر فیروز شاہ
مہتا روڈ بمبئی
نمبر ۱ سے
شائع
کیا

Vol. 3] October-December 1952 [No. 4

NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY LITERARY JOURNAL

Published by:

The Anjuman-e-Islam Urdu Research Institute

Every

JANUARY & APRIL
JULY & OCTOBER
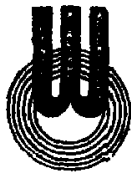
Publishing Agents:

Proprietors of:

— WRITERS' PRESS * WRITERS' BOOK DEPOT
WRITERS' PUBLICATIONS * RIEMPO ADVERTISING

POST BOX No. 1411, BOMBAY 1.

Annual Subscription
Inland & Pakistan:
Rs. 3/-

Price each Copy:
Re. 1/-